الحمد للہ الذی انزل الکتاب علی نذیر للعالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین

سورۃ النساء

ایاتھا ۱۷۶ ۴ سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۲ رکوعاتھا ۲۴

یہ سورۃ، ایک آیت کے سوا باقی تمام مدنی ہے، وہ آیت فتح مکہ کے سال حضرت عثمان بن طلحہ الحجبی کے بارے میں نازل ہوئی، وہ آیت یہ ہے، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ نقاش نے کہا: بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: (یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ) جہاں واقع ہو وہ مکی سورت ہے، یہ علقمہ وغیرہ کا قول ہے، یہ قرینہ ہے کہ اس سورت کا آغاز مکی ہو اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوا وہ مدنی ہو، نحاس نے کہا: یہ سورہ مکی ہے (1) میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرمایا:

سورۂ نساء نازل ہوئی تو میں رسول کے پاس تھی اور اس میں علما کا اختلاف نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے حقوق زوجیت مدینہ طیبہ میں ادا کیے تھے۔ جو اس سورت کے احکام سے واقف تھے وہ جانتا ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے اور جن علماء نے یہ فرمایا کہ جس سورہ میں (یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ) واقع ہوا ہے وہ مکی ہے، صحیح نہیں ہے، سورہ بقرہ مدنی ہے اور اس میں یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ دو جگہ آیا ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ۝۱

”اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں) اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے، وہ اللہ مانگتے ہو تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق) جس کے واسطہ سے اور (ڈرو) رحموں (کے قطع کرنے سے) بے شک اللہ تعالیٰ تم پر ہر وقت نگران ہے“۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ صحیح بخاری، فضائل قرآن، جلد 2، صفحہ 747، وزارت تعلیم اسلام آباد

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ سورہ بقرہ میں النَّاسُ کا اشتقاق، التقوی، الرب، الخلق، الزوج اور البث کا معنی گزر چکا ہے۔ اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں، اس آیت میں صانع (بنانے والا) پر تنبیہ اور آگاہی ہے فرمایا وَّاحِدَةٍ نفس کے لفظ کی تانیث کی بناء پر وَّاحِدَةٍ فرمایا۔ نفس کا لفظ مؤنث ہے اگرچہ اس سے مراد مذکر ہوتا ہے، کلام عرب میں من نفس واحد بھی جائز ہے یہ معنی کی رعایت کے اعتبار سے ہے، کیونکہ نفس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے اور یہ ابن ابی عبلہ کی قرأت میں بغیر (تا) کے واحد ہے (1)۔ وَ بَثَّ اس کا معنی زمین میں بکھیر دینا اور پھیلا دینا ہے اسی سے ہے۔ وزرابی مبثوثة۔ وَ بَثَّ کی تشریح سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مِنْهُمَا یعنی حضرت آدم اور حوا علیہما السلام۔ مجاہد نے کہا: حضرت حوا، حضرت آدم علیہ السلام کی چھوٹی پسلی سے پیدا کی گئی تھی۔ حدیث میں ہے: ''عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے'' (2)۔ سورہ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔ رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد کو دو قسموں میں محصور فرمایا۔ یہ اس کی مقتضی ہے کہ خنثی (ہیجڑا) کوئی نوع نہیں ہے لیکن اس کی حقیقت ہے جو اسے ان دو قسموں کی طرف لوٹا دیتی ہے اور وہ حقیقت اس کا یہ آدمی ہونا ہے پس یہ ان دو اسموں میں سے ایک کے ساتھ لاحق ہوگا جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے اعضاء کی کمی اور زیادتی کے اعتبار سے کسی ایک قسم سے ملحق ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ۔ اتَّقُوْا کو دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ جس کو حکم دیا جا رہا ہے ان کے نفوس کے لیے تنبیہ اور تاکید ہو جائے۔ الذین نعت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ الْاَرْحَامَ معطوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرو اور رحموں کے قطع کرنے سے ڈرو (یعنی رشتہ داروں سے قطع تعلقی سے ڈرو) اہل مدینہ نے تا اور سین کے ادغام کے ساتھ تسّاءلون پڑھا ہے (3) اور اہل کوفہ نے دو تاء کے اجتماع کی وجہ سے ایک تاء کے حذف کے ساتھ اور سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ معنی معروف ہے یہ اس قول کی طرح ہے وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ (مائدہ:2) (نہ معاونت کرو گناہ پر) اور تنزل اور اس کے مشابہ الفاظ جس میں تا حذف ہوتی ہے۔

ابراہیم نخعی، قتادہ، اعمش اور حمزہ نے الْاَرْحَامِ کو جر کے ساتھ پڑھا ہے (4)۔ نحویوں نے اس کے متعلق گفتگو کی ہے۔ رہے بصری نحوی علماء تو ان کے رؤساء علماء نے کہا: یہ غلطی ہے اس کے ساتھ قرأت حلال نہیں اور رہے کوفی نحوی علماء انہوں نے فرمایا: یہ قبیح ہے اور انہوں نے اس پر مزید کچھ نہ کہا اور انہوں نے اس کے قبح کی علت ذکر نہیں کی۔ نحاس نے کہا: یہ میری معلومات کے مطابق ہے اور سیبویہ نے کہا: مضمر مجرور پر عطف نہیں ہوتا کیونکہ وہ تنوین کے قائم مقام ہوتا ہے اور تنوین پر عطف نہیں کیا جاتا۔ ایک جماعت نے کہا: یہ ضمیر پر معطوف ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعے بھی سوال کرتے تھے۔ کوئی کہتا: میں تجھ سے اللہ تعالیٰ اور رحم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔ حضرت حسن، نخعی اور مجاہد نے اسی طرح تفسیر کی ہے (5) اور مسئلہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 3، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ تاریخ بغداد، ذکر النساء من اهل بغداد، جلد 14، صفحہ 431، مکتبہ العربیہ بغداد عراق

3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت 4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت

5۔ جامع البیان، جلد 3-4، صفحہ 280، دار احیاء التراث العربیہ

میں صحیح یہی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ بعض علماء نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے ان میں سے زجاج بھی ہے، اسم ظاہر کا اسم ضمیر مجرور پر عطف قبیح ہوتا ہے مگر حرف جر کے اظہار کے ساتھ جائز ہوتا ہے مثلاً فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص:81) لیکن مررت بہ وزید میں قبیح ہے۔ زجاج نے مازنی سے روایت کیا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں شریک ہیں ہر ایک دوسرے کی جگہ آتا ہے یعنی جس طرح مررت بزید وَكَ جائز نہیں ہے اسی طرح مررت بك وزید بھی جائز نہیں، رہا سیبویہ یہ اس کے نزدیک قبیح ہے اور یہ جائز نہیں ہے مگر شعر میں جائز ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فالیوم قربتَ تهجُونا وتشتِمُنا   فاذهبْ فمابكَ والأيامِ من عَجَبِ

اس شعر میں ایام کا عطف ک پر ہے اور بغیر باء کے ہے اور یہ ضرورت شعری کے لیے ہے۔ اسی طرح ایک شاعر نے کہا:

تعلّق في مِثل السّوَارِي سيوفنا   وبينها والكعْبِ مَهْوَى نَفَانِفُ

اس شعر میں الکعب کا عطف ھا ضمیر پر ہے اور ضرورۃً ہے ابوعلی نے کہا: یہ قیاس میں ضعیف ہے (1)۔ کتاب التذکرۃ المھدیہ میں فارسی سے مروی ہے کہ ابوالعباس المبرد نے کہا: اگر میں کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھوں جو مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ (ابراہیم:22) اور اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامِ پڑھے تو میں اپنے جوتے اٹھا کر چلا جاؤں گا۔ زجاج نے حمزہ کی قرأت اپنے ضعف اور عربی میں قبح کی وجہ امر دین کے اصول میں عظیم خطا ہے (2)۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تحلفوا بابائكم (3)۔ اپنے آباء کی قسمیں نہ اٹھاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی قسم اٹھانا جائز نہیں تو رحم کی قسم اٹھانا کیسے جائز ہے۔ میں نے اسماعیل بن اسحاق کو دیکھا وہ غیر اللہ کی قسم کو ایک عظیم امر سمجھتے تھے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ نحاس نے کہا: بعض کا قول وَ الْاَرْحَامِ قسم ہے یہ اعراب اور معنی کے اعتبار سے خطا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث مروی ہے جو الْاَرْحَامَ کی نصب پر دلالت کرتی ہے شعبہ نے عون بن ابی جحیفہ سے انہوں نے منذر بن جریر سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے حتیٰ کہ ایک قوم مضر آئی برہنہ پا اور برہنہ جسم تھی میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ان کے فاقہ کی کیفیت دیکھ کر آپ کا رنگ بدل گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی اور لوگوں کو خطاب فرمایا اور یہ آیت يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ تک تلاوت فرمائی پھر فرمایا: کسی نے دینار صدقہ کیا، کسی نے درہم صدقہ کیا، کسی نے کھجور کا صاع (چار کلو) صدقہ کیا (4)۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ یہ معنی نصب کے اعتبار سے ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے پر برانگیختہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ جو قسم اٹھائے وہ اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے (5)۔ یہ حدیث اس شخص کے قول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 4، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 4
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 983
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327
5۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، جلد 2، صفحہ 368

کا رد کرتی ہے جو کہتا ہے: اس کا معنی ہے اسالك بالله وبالرحم۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ اور رحم کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں۔ ابو اسحاق نے کہا تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ کا معنی ہے تم اپنے حقوق ان کے واسطہ سے طلب کرتے ہو، اس کے ساتھ جر کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ ہے وہ جس پر میں آگاہ ہوا ہوں کہ علماء نے الْاَرْحَامَ کی قرأت جر کے ساتھ منع کی ہے۔ ابن عطیہ نے اس کو اختیار کیا ہے (1)۔ امام ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے اس کا رد کیا ہے اور عطف کو اختیار کیا ہے اور فرمایا ائمہ دین کے نزدیک اس کلام کی مثل مردود ہے کیونکہ وہ قرأتیں جو قراء ائمہ نے پڑھی ہیں وہ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ اہل صنعت اس کو جانتے ہیں جب کوئی چیز نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو پس جس نے اس کو رد کیا تو اس نے نبی کریم ﷺ پر رد کیا اور اس نے آپ کی قرأت کو اچھا نہ سمجھا اور یہ مقام محذور ہے (یعنی ایسی بات سے بچا جاتا ہے) اس میں ائمہ لغت اور ائمہ نحو کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ عربی زبان نبی کریم ﷺ سے حاصل کی گئی ہے اور کوئی شخص آپ کی فصاحت میں شک نہیں کرتا اور رہی حدیث جو ذکر کی گئی ہے اس میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابو العشراء کو فرمایا: وابيك لوطعنت في خاصرته (2)۔ تیرے باپ کی قسم اگر تو اسے پہلو میں نیزہ مارتا۔ پھر نہی تو غیر اللہ کی قسم کے بارے میں ہے اور یہ رحم کے حق کے ساتھ غیر کی طرف توسل ہے، اس میں نہی نہیں ہے قشیری نے کہا: بعض علماء نے فرمایا: یہ الرحم کے ساتھ قسم اٹھانا ہے یعنی اتقوا الله وحق الرحم جیسے تو کہتا ہے افعل كذا وحق ابيك میں ایسا کروں گا تیرے باپ کے حق کی قسم۔ قرآن میں ہے وَالنَّجْمِ، وَالطُّوْرِ، وَالتِّيْنِ، لَعَمْرُكَ اور یہ تکلف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی تکلف نہیں، کیونکہ کوئی بعید نہیں کہ وَالْاَرْحَامَ اس قبیل سے ہو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قسم اٹھائی ہو جیسے اس نے اپنی ان مخلوقات کے ساتھ قسم اٹھائی ہے جو اس کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرتی ہے اس کی تاکید کے لیے، حتی کہ اپنی ذات کے ساتھ انہیں ملایا اور اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے کہ وہ جس کے ساتھ چاہے قسم اٹھائے اور جو چاہے منع کرے اور جو چاہے مباح کرے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ قسم ہو اور عرب الرحم کی قسم اٹھاتے بھی ہیں اور با کا مراد ہونا بھی صحیح ہے پھر اس کو حذف کیا گیا ہو جس طرح اس شعر میں حذف کیا گیا ہے۔

مَشَائِيمُ لَيسوا مُصلِحِيْنَ عَشِيرةً ولا نَاعِبٍ إِلَّا بِبَيْنٍ غُرَابُهَا

اس شعر میں ناعب کو جر دی گئی ہے اگرچہ با پہلے نہیں ہے۔ ابن الدہان ابو محمد سعید بن مبارک نے کہا: کوئی اسم ظاہر کا اسم مجرور پر عطف جائز قرار دیتا ہے، اس سے وہ منع نہیں کرتا اسی سے یہ قول ہے۔

اَبَكَ اَيَةٍ بِيَ أو مُصَدَّرٍ من حُمُرِ الجِلَّةِ جَأْبٍ حَشْوَرِ

اسی طرح یہ ہے۔ فَاذْهَبْ فمابِكَ والْاَيَّامِ مِنْ عَجَبِ

ایک اور کا قول ہے۔ وما بَيْنِها والكَعْبِ غَوْطٌ نَفانِفُ

ایک اور مصرعہ ہے۔ فحسبُكَ والضَّحاكِ سَيفٌ مُهَنَّدُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 5، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصید والذبائح، جلد 9، صفحہ 246، دار الفکر

ایک اور کا قول ہے:

قَدْ رَامَ آفَاقَ السَّمَاءِ فَلَمْ يَجِدْ　لَه مَصْعَداً فِيهَا وَلَا الأَرْضِ مَقْعَدَ

ایک اور قول ہے۔

مَا إِنْ بِهَا وَالأُمُورِ مِنْ تَلَفٍ　مَاحُمَّ مِنْ أَمْرِ غَيْبِه وَقَعَا

ایک اور کا قول ہے۔

أَمُرُّ عَلَى الكَتِيبَةِ لَسْتُ أَدْرِي　أَحَتْفِيَ كَانَ فِيهَا أَمْ سِوَاهَا

اسی شعر میں فسواھا فی حرف جر کی وجہ سے محل جر میں ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝ (الحجر) کو اس پر محمول کیا ہے یعنی کاف اور میم پر عطف ہے۔ عبداللہ بن یزید نے وَالْاَرْحَامَ کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر مقدر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی والارحام اھلٌ ان توصل (1)۔ اور اس میں اغراء کا بھی احتمال ہے کیونکہ عربوں میں کچھ المغریٰ کو مرفوع پڑھتے ہیں۔ الفراء نے یہ دلیل دی ہے۔

إِنَّ قَوْماً مِنْهُمْ عُمَيْرٌ وَأَشْبَا　هُ عُمَيْرٍ وَمِنْهُمُ السَّفَّاحُ

لَجَدِيرُونَ بِاللِّقَاءِ إِذَا قَا　لَ أَخُو النَّجْدَةِ السِّلَاحُ السِّلَاحُ

یہ بھی کہا گیا ہے کہ الْاَرْحَامَ، بِهٖ کے محل پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس کا محل نصب ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔

فلسنا بالجبال ولا الحديدا

وہ کہتے تھے: انشدك بالله وبالرحم۔ اظہر یہ ہے کہ اس کو نصب فعل کے اضمار کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ صلہ رحمی واجب ہے اور اس کا قطع کرنا حرام ہے۔ صحت کے ساتھ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء سے فرمایا: جب انہوں نے پوچھا تھا کہ میں اپنی ماں (جو کافرہ تھی) سے صلہ رحمی کروں؟ ہاں اپنی ماں سے صلہ رحمی کرو (2)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صلہ رحمی کا حکم دیا، حالانکہ اس کی ماں کافرہ تھی پس اس کی تاکید کی وجہ سے کافر سے صلہ رحمی کرنے میں بھی فضل داخل ہے، حتیٰ کہ یہاں تک معاملہ پہنچا کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ذوی الارحام کو میراث ملے گی اگر مرنے والے کا کوئی عصبہ اور متعین فرض والا وارث نہ ہو اور جو شخص اپنے ذی رحم کو خریدے گا حرمت رحم کی وجہ سے وہ آزاد ہو جائیں گے اور علماء احناف نے اس قول کی تائید ابوداؤد کی حدیث سے لی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ذی رحم محرم کا مالک ہوگا وہ غلام آزاد ہوگا (3)۔ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہی مروی ہے، اور صحابہ میں سے کوئی ان کا مخالف معروف نہیں ہے۔ یہی قول حسن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 3　2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 324　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العتق، جلد 2، صفحہ 194

بصری، جابر بن زید، عطا، شعبی اور زہری کا ہے اور اس کی طرف ثوری، احمد اور اسحاق گئے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہمارے علماء (مالکیہ) کے تین اقوال ہیں (۱) یہ آباء اور اجداد کے ساتھ خاص ہے (۲) اس سے بھائی مراد ہیں اور تیسرا قول امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: خریدنے والے پر اس کی اولاد، آباء اور امہات آزاد ہو جائیں گی اور اس کے بھائی اور کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار آزاد نہ ہوگا، صحیح پہلا قول ہے اس حدیث کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے ذکر کیا ہے بہتر طریق نسائی ہے انہوں نے اس کو ضمرہ عن سفیان عن عبداللہ بن دینار عن ابی عمر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ذی رحم محرم کا مالک ہوگا وہ اس پر آزاد ہو جائے گا۔ اس حدیث کا ہر راوی عادل ہے اور اس میں کسی نے جرح قدح نہیں کی ہے، کسی ایسی علت کے ساتھ جو اس کے ترک کا موجب ہو مگر نسائی نے اس کے آخر میں کہا: یہ حدیث منکر ہے۔ دوسرے نے کہا: ضمرہ اس میں منفرد ہے۔ یہ اصطلاح محدثین میں شاذ اور منکر کا معنی ہے، ضمرہ، عادل اور ثقہ ہے۔ ثقہ کا منفرد ہونا حدیث کے لیے مضر نہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ رضائی ذوی الحارم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اکثر اہل علم کا قول ہے کہ وہ حدیث کے مقتضی میں داخل نہیں۔ شریک القاضی نے ان کی آزادی کا کہا ہے۔ اہل ظاہر اور متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ باپ، بیٹے پر آزاد نہ ہوگا جب وہ اس کا مالک ہوگا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے "بچہ اپنے والد کا احسان ادا نہیں کرے گا مگر جب وہ اسے غلام پائے پھر اسے خریدے اور آزاد کردے" (1)۔ ان علماء نے کہا: جب شرا (خریدنا) صحیح ہے تو ملک بھی ثابت ہوئی اور مالک کے لیے تصرف کا حق ہے۔ یہ مقاصد شرع سے ان کی جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بقرہ:83) "اپنے والدین سے احسان کرو"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور والدین سے احسان کرنے کو وجوب میں اکٹھا فرمایا اور والد کا بیٹے کی ملکیت میں اور اس کی سلطنت کے تحت ہونا احسان میں نہیں ہے، پس اسی پر اس کا آزاد کرنا واجب ہے یا تو اس لیے کہ ملک کی وجہ سے حدیث پر عمل کرتے ہوئے (خریدے اور پھر اسے آزاد کردے) یا احسان کی وجہ سے آیت پر عمل کرتے ہوئے۔ حدیث کا معنی جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ بچہ، باپ کی آزادی کا سبب بنا، جب اس نے اسے خریدا، تو شریعت نے آزاد کرنے کی نسبت اس کی طرف کردی رہا علماء کا اختلاف تو وہ اس کے بارے میں ہے جو ملک کی وجہ سے آزاد ہوگا، پہلے قول کی وجہ وہی ہے جو ہم نے کتاب وسنت کے معنی سے بیان کردی ہے اور دوسرے قول کی وجہ قرابت قریبہ محرمہ کو حدیث میں مذکور باپ کے ساتھ لاحق کرنا ہے اور انسان کے لیے اپنے بیٹے سے زیادہ کوئی قریبی نہیں، پس باپ پر محمول ہوگا اور بھائی اس میں اس کو قریب کرتا ہے کیونکہ ابوت کی وجہ اسے قریب کرتا ہے، پس وہ کہتا ہے: انا ابن ابیہ، میں اس کے باپ کا بیٹا ہوں۔ رہا تیسرا قول، اس کے متعلق ضمرہ کی حدیث ہے۔ وہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَالْاَرْحَامَ، الرحم، ہر قسم کے رشتہ دار کو کہا جاتا ہے خواہ وہ محرم ہو یا غیر محرم ہو۔ ابو حنیفہ ہبہ سے رجوع سے منع میں ذی رحم محرم کا اعتبار کرتے ہیں۔ چچوں کے بیٹوں کے حق میں رجوع جائز ہے حالانکہ قطعیت

1۔ صحیح مسلم، کتاب العتق، جلد 1 صفحہ 495

موجود ہے اور قرابت حاصل ہے، اسی وجہ سے میراث، ولایت اور دوسرے احکام اس کی وجہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ پس محرم کا اعتبار، نص کتاب پر، بغیر کسی دلیل کے زیادتی ہے، احناف اس کو مسخر خیال کرتے ہیں اور اس میں قطعیت کی علت کی طرف اشارہ ہے اور انہوں نے چچا کے بیٹوں، خالوؤں اور خالاؤں کے بیٹوں کے حق میں قطعیت کو جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے رَقِيْبًا کا معنی حفیظاً (1) اور ابن زید سے علیما (1) معنی مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رَقِيْبًا کا معنی حفاظت کرنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعیل بمعنی فاعل ہے۔ الرقیب اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور الرقیب کا معنی حفاظت کرنے والا اور انتظار کرنے والا ہے۔ تو کہتا ہے: رقبت ارقب رقبۃ و رقبانا، جب تو انتظار کرے۔ المرقب بلند و بالا جگہ کو کہتے ہیں جس پر رقیب کھڑا ہوتا ہے۔ الرقیب سات تیروں میں سے تیسرے تیر کو کہتے ہیں جن کے لیے حصے ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ رقیب، سانپوں میں سے ایک سانپ ہے۔ پس یہ لفظ مشترک ہے واللہ اعلم۔

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

"اور دے دو یتیموں کو ان کے مال اور نہ بدلو (اپنی) ردی چیز کو (ان کی) عمدہ چیز سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے"۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ۔ یتامیٰ سے مراد یتیم لوگ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ (الاعراف) سجود کے ساتھ سحر نہیں تھا۔ اسی طرح بلوغ کے ساتھ یتیم نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہا جاتا ہے (2)، ان کی صحبت کی وجہ سے وَ اٰتُوا کا مطلب ہے اعطوا اور ایتاء کا معنی الاعطاء ہے۔ لفلان اتو یعنی فلاں کے لیے عطا ہے۔ یہ ابوزید کا قول ہے اتوت الرجل آتوہ اتاوۃ یعنی میں نے اسے یہ رشوت دی۔ یتیم وہ ہوتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو۔ سورۃ بقرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ یہ خطاب اولیاء اور اوصیا کو ہے۔ مقاتل اور کلبی کے قول میں غطفان کے ایک شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس کے پاس یتیم بھتیجے کا بہت سا مال تھا، جب یتیم بالغ ہوا تو اس نے مال کا مطالبہ کیا اس کے چچا نے اس کو منع کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ چچا نے کہا: ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں بڑے گناہ سے اور مال واپس کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو نفس کے بخل سے بچایا گیا اور اس طرح لوٹ آیا تو وہ اس کے گھر میں اترے گا" یعنی جنت میں اترے گا جب اس نوجوان نے مال پر قبضہ کر لیا تو اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اجر ثابت ہوا اور بوجھ باقی ہوا، پوچھا گیا: یا رسول اللہ یہ کیسے ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غلام کے لیے اجر ثابت ہوا اور اس کے باپ پر بوجھ باقی ہے (3)"۔ کیونکہ وہ مشرک تھا۔

1۔ جامع البیان، جلد 3-4، صفحہ 283　2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 5　3۔ جامع اسباب النزول، جلد 2، صفحہ 93، قدیمی کتب خانہ

مسئلہ نمبر 2۔ یتیموں کو مال دینا دو اعتبار سے ہو سکتا ہے، ایک یہ ہے کھانا اور لباس جاری کرنا جب تک کہ ولایت ہو کیونکہ ممکن نہیں مگر یہ اس کے لیے ہے جو کلی طور پر لینے اور خود رائے رکھنے کا مستحق نہ ہو جیسے چھوٹا اور بڑا بے وقوف۔ دوسرا یہ کہ مال حوالے کر کے عطا کرنا اور یہ ابتلا اور ارشاد کے وقت ہوتا ہے، اس وقت اسے یتیم مجازاً کہا جاتا ہے معنی ہوگا جو یتیم تھا، یہ استصحاب الاسم (☆) ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ (الاعراف) گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہا جاتا تھا اور جب ولی کو یتیم کی رشد کا یقین ہو جائے تو اس کا مال اس سے روکنا اس پر حرام ہے اور وہ گنہگار ہوگا۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب وہ پچیس سال کا ہو جائے تو ہر حال میں اس کو مال دیا جائے گا کیونکہ اسی عمر میں وہ سنجیدہ ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رُشد کے محسوس کرنے کا ذکر نہیں کیا اور اس ارشاد میں ذکر فرمایا وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ”اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال“۔ ابو بکر رازی حنفی نے ”احکام القرآن“ میں لکھا ہے کہ جب ایک جگہ رشد مقید نہیں ہے اور دوسری جگہ مقید ہے کہ ان دونوں مقامات کا استعمال واجب ہے۔ پس میں کہتا ہوں: جب پچیس سال کا ہو جائے اور وہ ابھی سفیہ (بے وقوف) ہو اور اس سے دانائی محسوس نہ ہو تو پھر بھی اس کو مال دینا واجب ہے اور اگر اس سے عمر میں کم ہو اور دانائی محسوس نہ ہو تو مال دینا واجب نہیں اس طرح دونوں آیتوں پر عمل ہو جائے گا (1)۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب یتیم دانائی کو پہنچ جائے تو وہ سنجیدہ ہونے کی صلاحیت میں ہوگا اور جب سنجیدہ ہونے کی صلاحیت میں ہوگا تو پھر یتیم کی علت اور یتیم اسم کی وجہ سے اس کو مال دینا کیسے صحیح ہوگا؟ یہ بہت بعید ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے خصوصاً ان کی اپنی اصل پر کہ مقدرات قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں بلکہ وہ نص کی جہت سے لی جاتی ہیں، اس مسئلہ میں کوئی نص نہیں ہے۔ حجر کے بارے میں علماء کے اقوال آگے ذکر ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ یعنی یتیم کے مال سے موٹی بکری کو دبلی بکری سے مت بدلو، عمدہ درہم کو کھوٹے درہم سے مت بدلو۔ لوگ زمانہ جاہلیت میں دین کے نہ ہونے کی وجہ سے یتیموں کے مال کھانے سے نہیں ڈرتے تھے وہ یتیموں کے مال سے عمدہ اور بہتر لے لیتے تھے اور ردی اموال سے اسے بدل لیتے تھے اور کہتے اسم کے بدلے اسم، راس کے بدلے راس۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس برائی سے منع کیا۔ یہ سعید بن مسیب، زہری، سدی، ضحاک کا قول ہے اور یہی آیت کا ظاہر ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے یتیموں کے مال نہ کھاؤ یہ حرام اور خبیث ہے اور طیب و پاکیزہ کو نہ چھوڑو اور وہ تمہارے اپنے مال ہیں۔ مجاہد، ابو صالح اور باذان نے کہا: یتیموں کے مال میں خبیث کھانے میں جلدی نہ کرو اور اللہ کی طرف سے رزق حلال کے انتظار کو مت چھوڑو (3)۔ ابن زید نے کہا: زمانہ جاہلیت

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 49　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 284　　3۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 285

☆ یہ ایک اصطلاح ہے جس کی وضاحت ماقبل سے ہو رہی ہے یعنی بالغ ہونے سے کیونکہ یتیم تھا اسی وجہ سے یتیم کہا گیا۔

کے لوگ عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں بناتے تھے، بڑا میراث پر قبضہ کر لیتا (1)۔ عطا نے کہا: اس کا مطلب ہے تو اس یتیم پر نفع نہ اٹھا جو تیرے پاس ہے یہ چھوٹا دھوکا ہے۔ یہ دونوں قول آیت کے ظاہر سے خارج ہیں کیونکہ تبدل الشی بالشی کا مطلب ہے کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ لینا۔ اسی سے بدل ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ۔ مجاہد نے کہا: یہ آیت انفاق میں خلط سے منع کرنے والی ہے عرب اپنے نفقہ (خرچ) کو یتیموں کے نفقہ کے ساتھ ملا دیتے تھے تو انہیں اس سے منع کیا گیا پھر وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ:220) یعنی (اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) سے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ ابن فورک نے الحسن سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے اس آیت کی تاویل یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانے کی نہی سے کی اور خود بخود اس سے اجتناب کرنے لگے پس سورہ بقرہ کی آیت وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ میں ان سے تخفیف کی گئی (2)۔ متاخرین کی ایک جماعت نے کہا الی بمعنی مع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران:52) قتبی نے یہ دلیل پیش کی ہے:

يُسَدُّون أبوابَ القِبابِ بِضُمَّرٍ إلى عُنُنٍ مُسْتَوْثِقَاتِ الأَوَاصِرِ

اس شعر میں الی بمعنی مع ہے۔

لیکن یہ قول درست نہیں، محققین نے فرمایا الی اپنے معنی میں ہے اور اضافت کو متضمن ہے یعنی ان کے اموال کو نہ ملاؤ اور کھانے میں اپنے اموال کے ساتھ جمع نہ کرو (3)۔ پس انہیں منع کیا گیا کہ وہ یتیموں کے اموال کو اپنے اموال کی طرح خیال کریں اور پھر ان پر کھانے یا نفع اٹھانے کے اعتبار سے مسلط ہو جائیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۔ اِنَّهٗ میں ہ ضمیر سے مراد کھانا ہے حُوْبًا كَبِيْرًا۔ بڑا گناہ۔ حضرت ابن عباس اور حسن وغیرہما سے مروی ہے (4): کہا جاتا ہے: حاب الرجل یحوب حوباً جب کوئی گناہ کرے اس کی اصل اونٹ کو جھڑکنا ہے پھر گناہ کو حوب کہا گیا، کیونکہ اسے اس کے ساتھ جھڑکا جاتا ہے۔ دعا میں کہا جاتا ہے: اللھم اغفر حوبتی یعنی اے اللہ میرا گناہ معاف فرما۔ الحوبۃ کا معنی حاجت بھی ہے دعا میں ہے الیک ارفع حوبتی۔ یعنی میں تیری بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرتا ہوں۔ الحوب کا معنی وحشت بھی ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ابو ایوب کے بارے میں ہے: ''ام ایوب کی طلاق وحشت ہے (5)''۔ اس لفظ میں تین لغات ہیں۔ حوباً۔ بضم حاء۔ یہ عام قرأت ہے اور اہل حجاز کی لغت ہے حسن نے حوباً بفتحہ حا پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: یہ تمیم کی لغت ہے۔ مقاتل نے کہا: یہ حبش کی لغت ہے۔ الحوب مصدر ہے اسی طرح العیابۃ بھی مصدر ہے الحوب اسم ہے ابی بن کعب نے حاباً پڑھا ہے مصدر کی بنا پر جسے القال مصدر ہے اسم ہونا بھی جائز ہے جیسے الزاد ہے۔ الحوأب (واؤ کے بعد ہمزہ) کھلے مکان کو کہتے ہیں۔ الحوأب پانی کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 287
4۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 25، صفحہ 328-136
5۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 466

بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: الحق اللہ بہ الحوبۃ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسکنت اور حاجت لاحق کر دی۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: بات بحیبۃ سوء اس نے مسکنت میں رات گزاری۔ یا کی اصل واؤ ہے تحوب فلان یعنی گناہ کو اپنے نفس سے دور کیا اور عبادت کی۔ التحوب کا معنی پریشان ہونا بھی ہے۔ سخت چیخنا بھی ہے جیسے زجر و توبیخ ہوتی ہے لان یتحوب من کذا۔ فلاں نے تکلیف محسوس کی۔ طفیل نے کہا:

فذُوقوا کما ذُقْنا غَداۃَ مُحجّر مِن الغَیظِ فی أکبادِنا والتحوُّبِ

پس تم بھی مزا چکھو جس طرح ہم نے تکلیف اور غصہ کی وجہ سے اپنے جگروں میں فجر کی صبح مزا چکھا تھا۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۟

''اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِنْ خِفْتُمْ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَانْكِحُوْا ہے یعنی اگر تمہیں ان کے مہور اور ان میں خرچ کرنے میں عدل نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو ان سے نکاح کرو جو تمہیں (ان کے علاوہ) پسند ہیں۔ ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ مسلم کے ہیں۔ حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ کے تحت روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: اے میرے بھانجے! یہ اس یتیم بچی کے بارے ہے جو کسی ولی کی پرورش میں ہوتی تھی اور وہ اس کے مال میں شریک ہوتی تھی پس اس بچی کا مال اور جمال اس ولی کو اچھا لگتا تو وہ اس سے خود نکاح کرنا چاہتا مگر اس کے مہر میں انصاف اور جتنا کوئی دوسرا اسے مہر دیتا اتنا وہ دینے کا ارادہ نہ کرتا۔ پس انہیں ان عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا مگر یہ کہ ان سے انصاف کریں اور رواج کے مطابق انہیں مہر دیں۔ اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان عورتوں کے علاوہ جو انہیں پسند ہیں ان سے نکاح کریں۔ حدیث مکمل ذکر کی (1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہم نے کہا: وصی کو یتیم کے مال سے خود خریدنا جائز ہے جب کہ اس میں اس کا زیادہ فائدہ نہ ہو اور موکل کے لیے اس میں نظر کرنا جائز ہے جو وکیل اپنے لیے خریدے یا اپنے لیے بیچے اور سلطان کو نظر کی اجازت ہے جو وصی ایسا کرے، رہا باپ اس کے لیے نظر کرنا جائز نہیں جب تک کہ محابات ظاہر نہ ہو، اس وقت سلطان اس کے سامنے آئے۔ اس کے متعلق قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ضحاک اور حسن وغیرہما نے کہا: یہ آیت جو کچھ زمانہ جاہلیت

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی حدیث الهجرة ویقال له الرحل بالحاء، جلد 2، صفحہ 420

میں تھا اور جو ابتداء اسلام میں تھا اس کے لیے ناسخ ہے۔ ایک شخص کے لیے جائز ہوتا تھا کہ آزاد عورتوں میں سے جتنی عورتوں کے لیے چاہتا نکاح کرتا۔ اس آیت نے چار عورتوں پر محصور کر دیا (1)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن جبیر وغیرہما نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتامیٰ میں انصاف نہیں کر سکو گے، اسی طرح انہیں خوف ہو عورتوں کے بارے میں، کیونکہ وہ یتیموں کے بارے میں ڈرتے تھے اور عورتوں کے بارے میں نہیں ڈرتے تھے۔ خفتم اضداد میں سے ہے۔ کیونکہ جس چیز سے ڈرا جاتا ہے کبھی اس کا وقوع معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس کا وقوع مظنون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس خوف کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے (2)۔ ابو عبیدہ نے کہا: خِفْتُمْ بمعنی ایقنتم ہے (3)۔ اور دوسرے علماء نے فرمایا: خِفْتُمْ بمعنی ظننتم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس معنی کو محققین نے اختیار کیا ہے۔ یہ ظن کے باب سے ہے، نہ کہ یقین کے باب سے۔ تقدیر یہ ہے کہ جس کو یتیمہ کے لیے انصاف میں کوتاہی کا غالب گمان ہو تو وہ اس سے اعراض کرے اور تُقْسِطُوْا کا معنی تعدلوا ہے کہا جاتا ہے: اقسط الرجل، جب وہ عدل کرے۔ قسط جب کوئی دوسرے پر ظلم اور زیادتی کرے (4)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝ (الجن) اس آیت میں قاسطون سے مراد ظلم کرنے والے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: المقسطون فی الدین علی منابر من نور یوم القیامۃ (5)۔ یعنی دین میں عدل کرنے والے قیامت کے روز نور کے منبروں پر ہوں گے۔ ابن وثاب اور نخعی نے تقسطوا تاء کے فتحہ کے ساتھ قسط سے مشتق کر کے پڑھا ہے لا کی زیادتی کی تقدیر پر۔ گویا فرمایا: اگر تمہیں ظلم کرنے کا خوف ہو (6)۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اگر یہ سوال کیا جائے کہ آدمیوں کے لیے ما کیسے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ تو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ اس کے پانچ جواب ہیں (۱) من اور ما ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۝ (الشمس) قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اسے بنایا یعنی و من بناھا۔ مذکورہ آیت میں مَا، مَنْ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ (النور: 45) اس آیت میں من، مَا کی جگہ استعمال ہوا ہے پس یہاں مَا ذوالعقول کے لیے ہے اور وہ عورتیں ہیں کیونکہ اس کے بعد مِّنَ النِّسَآءِ مبہم کو بیان کرنے والا ہے۔ ابن ابی عبلہ نے ذوالعقول کے ذکر کی بنا پر من طاب پڑھا ہے (7)۔ (۲) بصریوں نے کہا: مَا نعوت کے لیے واقع ہوتا ہے جس طرح غیر ذوالعقول کے لیے واقع ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ماعندك؟ کہا جاتا ہے: ظریف کریم۔ معنی یہ ہے کہ عورتوں میں سے جو حلال ہیں ان سے نکاح کرو اور جس کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ طیب نہیں ہے قرآن میں ہے وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الشعراء) موسیٰ علیہ السلام نے اسے اس کے سوال کے مطابق جواب دیا۔ (۳) بعض علماء نے حکایت کیا ہے کہ اس آیت میں ما ظرفیہ ہے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 292 2۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 290 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6
4۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 7 5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عمر، جلد 2، صفحہ 160
6۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 6 7۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 7

یعنی جب تک تم نکاح کو اچھا سمجھتے ہو۔ اس میں ضعف ہے(1)۔ (۴) فراء نے کہا: مَا یہاں مصدریہ ہے، نحاس نے کہا: یہ بہت بعید ہے فانکحوا الطیبۃ صحیح نہیں ہے۔ جوہری نے کہا: طاب بالشی یطیب طیبۃ وتطیابا۔ علقمہ نے کہا۔

كَأَنَّ تَطْيَابَهَا فِي الْأَنْفِ مَشْمُومُ

پانچواں جواب یہ ہے کہ ما سے مراد یہاں عقد ہے یعنی حلال نکاح کرو۔ ابن ابی عبلہ کی قرأت ان تین اقوال کا رد کرتی ہے۔ ابوعمرو بن العلاء نے حکایت کیا ہے کہ اہل مکہ جب کڑک کی آواز سنتے تو کہتے سبحان ما سبح لہ الرعد پاک ہے وہ ذات جس کے لیے کڑک نے پاکی بیان کی۔ اس میں ما بمعنی من ہے اس کی مثل ان کا قول ہے سبحان ما سخرکن لنا یعنی من سخرکن لنا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی۔ اس کے لیے مفہوم نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس کو یتامیٰ کے بارے ناانصافی کا خوف نہ ہو تو اس کے لیے ایک، دو، تین یا چار سے نکاح کرنا جائز ہے، جس طرح خوف والے کے لیے جائز ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی جس کو اس کا خوف تھا اور اس کا حکم اس سے اعم ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام ابوحنیفہ نے اس آیت سے یتیمہ کے نکاح کا بلوغت سے پہلے جائز ہونے کا تعلق جوڑا ہے۔ فرمایا: بلوغ سے پہلے یتیمہ ہوتی ہے، بلوغت کے بعد مطلق عورت ہوتی ہے یتیمہ نہیں ہوتی اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بالغہ کا ارادہ کیا ہوتا تو اس کے مہر مثل سے کم کرنے کی نہی نہ کی جاتی کیونکہ اسے یہ اختیار ہوتا ہے، پس یہ تو اجماعاً جائز ہے۔ امام مالک اور جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا نکاح جائز نہیں حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے اور اس سے مشورہ لیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ اور نساء کا اسم اس کا اطلاق بڑی عورتوں پر ہوتا ہے جس طرح رجال کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے اور الرجل کا اسم چھوٹے بچے کو شامل نہیں ہوتا اسی طرح النساء کا اطلاق بچی کو شامل نہیں۔ المرأۃ کا لفظ چھوٹی بچی کے لیے نہیں بولا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فِیْ یَتٰمَى النِّسَآءِ۔ پس وہاں بھی وہی مراد ہے جو یہاں یَتٰمَى النِّسَآءِ سے مراد ہے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: آیت میں بڑی یتیمہ داخل ہے پس اس کی اجازت کے بغیر اس سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور چھوٹی بچی سے نکاح کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے لیے اجازت نہیں ہے جب وہ بالغ ہو گی تو اس کا نکاح جائز ہو گا لیکن اس کی اجازت سے نکاح ہو گا جیسا کہ دارقطنی نے محمد بن اسحاق کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ محمد بن اسحاق نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: میرے خالو قدام بن مظعون نے میرا نکاح اپنے بھائی عثمان بن مظعون کی بیٹی سے کر دیا۔ مغیرہ بن شعبہ اس کی ماں کے پاس آیا اور اس کے مال میں رغبت کی اور اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا، معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا، قدامہ نے کہا: یا رسول اللہ! وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے اور میں اس کے باپ کا وصی ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی میں نے اس کا نکاح ایسے شخص سے کر دیا ہے جس کی فضیلت اور قرابت کو میں جانتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: وہ یتیمہ ہے اور یتیمہ اپنے معاملہ کی زیادہ حق دار ہے، وہ مجھ سے لی گئی اور اس کا نکاح مغیرہ بن شعبہ سے کر دیا(2)۔ دارقطنی نے کہا: محمد بن اسحاق نے نافع سے نہیں سنا ہے اس سے عمر بن حسین

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 7 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 230، حدیث نمبر 36

نے اور انہوں نے نافع سے سنا ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی ذئب نے عمر بن حسین سے انہوں نے نافع سے انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، انہوں نے اپنے خالو عثمان بن مظعون کی بیٹی سے نکاح کیا فرمایا: اس کی والدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی اور عرض کی: میری بیٹی اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر کو اسے جدا کرنے کا حکم دیا تو اس نے اسے جدا کر دیا اور فرمایا: ''یتیم بچیوں سے نکاح نہ کرو حتی کہ اس سے مشورہ کرلو جب وہ خاموش رہیں تو یہ اس کا اذن ہو گا'' (1)۔ حضرت عبداللہ کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اس سے نکاح کر لیا۔ یہ امام ابوحنیفہ کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ عورت بالغ ہو جائے تو ولی کی محتاج نہیں اپنی اصل کی بنا پر کہ صحت نکاح میں ولی کی شرط نہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے اور ان کے اس قول کا کوئی معنی نہیں کہ یہ حدیث غیر بالغہ پر محمول ہے کیونکہ ''مگر اس کی اجازت سے'' کے الفاظ اس محمل کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ پھر یتیم کے ذکر کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت کی حضرت عائشہ کی تفسیر سے وہ مسئلہ سمجھ آتا ہے جو امام مالک نے مہر مثل کے بارے میں فرمایا اور مہر کے فساد اور اس کی مقدار میں غبن واقع ہونے کی صورت میں مہر مثل کی طرف لوٹایا جائے گا کیونکہ حضرت عائشہ نے فرمایا: مہر جو کم از کم رائج ہے۔ پس لوگوں کے ہر طبقہ میں ان کے احوال کی حیثیت سے مہر مثل معروف ہونا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں کے لیے نکاح میں ان کے لیے وہ معروف ہیں اور وہ ات جانتے ہیں یعنی وہ مہر اور کفو ہونا اسے معلوم ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے فقیر بھتیجے سے کر دیا تو اس کی ماں نے اس پر اعتراض کیا۔ تو اس نے کہا: میں اس کے لیے اس کے متعلق کلام کرنے والے کی گنجائش دیکھتا ہوں۔ پس اس کے لیے اس کلام میں جواز رکھا گیا حتی کہ اس نے ظاہر کیا ایسی چیز کو جس نے ماں کے اعتراض کو ساقط کر دیا اور اس میں یہ لفظ بھی مروی ہے کہ میں اس کے لیے کلام کرنے والے کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور غیر یتیمہ کے لیے جائز ہے کہ وہ مہر مثل سے کم پر نکاح کرلے کیونکہ یہ آیت یتامیٰ کے بارے میں ہے۔ یہ اس آیت کا مفہوم ہے اور غیر یتیمہ اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب یتیمہ بالغ ہو جائے اور ولی اس کے مہر میں انصاف کا تقاضا پورا کرے تو اس کے لیے اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ کی تفسیر پر وہ خود نکاح کرنے والا اور جس کا نکاح کیا گیا دونوں طرف سے ہوگا۔ یہی امام ابو حنیفہ، اوزاعی ثوری اور ابوثور کا قول ہے۔ تابعین میں سے حضرت حسن اور ربیعہ کا قول ہے۔ یہی امام لیث کا قول ہے۔ امام زفر اور امام شافعی نے فرمایا: اس کے لیے اس یتیمہ سے نکاح کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ سلطان اجازت دے یا ولی اجد اس سے اس کا نکاح کر دے یا اس کی مثل قرابت کا جو اس کی مثل ہے وہ نکاح کر دے اور خود نکاح کرنے والا ہونا، اور اپنے ساتھ نکاح کرنا یہ جائز نہیں اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ ولایت، عقد کی شروط میں سے ایک شرط ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نکاح نہیں ہے مگر ولی کے ذریعے اور دو عادل گواہوں کے ذریعے'' (2)۔ نکاح کرنے والے اور نکاح کرانے والے اور گواہوں کی تعداد واجب ہے، جب ان میں سے دو ایک ہو جائیں تو ان میں سے ایک ساقط ہوگا، اس مسئلہ میں ایک

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 229، حدیث نمبر 35 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 225، حدیث نمبر 21

تیسرا قول بھی ہے وہ یہ ہے عورت اپنا معاملہ کسی شخص کے سپرد کردے وہ اس کا نکاح اپنے آپ سے کردے۔ یہ مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ ابن منذر نے یہ ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اس کا معنی ہے جو تمہارے لیے حلال ہیں۔ حضرت حسن، حضرت ابن جبیر وغیرہما سے مروی ہے (1)۔ ان کے ذکر پر اکتفا کیا جس کے ساتھ نکاح جائز ہے، کیونکہ عورتوں میں سے محرمات کثیر ہیں۔ ابن اسحاق، جحدری اور حمزہ نے طاب کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں طیب یعنی یا کے ساتھ تھا یہ امالہ کی دلیل ہے۔ مِّنَ النِّسَآءِ دلیل ہے کہ نساء نہیں کہا جائے گا مگر اسے جو بالغ ہو النساء کا واحد نسوۃ ہے اور لفظا نسوۃ کا واحد نہیں ہے لیکن امراۃ کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یہ ما سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یہ نکرہ ہیں اور غیر منصرف ہیں کیونکہ ان میں عدل اور صفت کے سبب پائے جاتے ہیں، ابو علی نے اسی طرح کہا ہے۔ طبری نے کہا: یہ معرفہ ہیں کیونکہ ان پر الف، لام داخل نہیں ہوتا یہ تعریف میں عُمَرُ کے قائم مقام ہیں۔ یہ کوفی کا قول ہے (2)۔ زجاج نے اس پر قول کو خطا کہا ہے بعض علماء نے فرمایا: یہ غیر منصرف ہیں، کیونکہ یہ اپنے لفظ اور معنی سے معدول ہیں، پس احاد، واحد واحد سے معدول ہے اور مثنی، اثنین، اثنین سے معدول ہے۔ ثلاث، ثلاثة ثلاثة سے معدول ہے۔ رباع، اربعة اربعة سے معدول ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں دو لغتیں ہیں فعال، مفعل، کہا جاتا ہے: احاد، موحد، ثناء، مثنٰی و ثلاث، مثلث، رباع، مربع اسی طرح معشر، عشار تک ہے۔ ابو اسحاق ثعلبی نے ایک تیسری لغت بھی بیان کی ہے احد وثنی، ثلث و ربع جیسے عمر و زفر، اسی طرح نخعی نے اس آیت میں پڑھا ہے۔ مہدوی نے نخعی اور ابن وثاب سے ثلاث و ربع بغیر الف کے ربع میں حکایت کیا ہے۔ یہ رباع سے تخفیف کی خاطر مقصود ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا

أقبل سَيْلٌ جاء من عنداللہ یَحْرِدُ حرد الجنةِ المُغِلَّة

ثعلبی نے کہا: اس وزن پر اربع سے زیادہ نہیں کہا جاتا مگر ایک شعر الکمیت سے مروی ہے۔

فلم یَسْتَرِ یثُوك حتی رمیـ ـت فوق الرجالِ خِصالاً عُشَارا

یعنی دس نیزے مارے، ابن الدہان نے کہا: بعض نے مسموع پر توقف کیا ہے یہ احاد سے رباع تک ہیں مذکورہ بیت کا شاذ ہونے کی وجہ سے کوئی اعتبار نہیں۔ ابو عمرو بن حاجب نے کہا: کہا جاتا ہے احاد، موحد، ثُناء، مثنی، ثلاث، مثلث، رباع، مربع، کیا اس کے علاوہ تسعہ (نو) تک اسی طرح کہا جائے گا یا نہیں اس میں اختلاف ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس پر نص قائم فرمائی ہے۔

اور اس کے معنی سے معدول ہونا یہ ہے کہ یہ اس جگہ میں استعمال نہیں ہوتا جس میں غیر معدولہ اعداد استعمال ہوتے ہیں تو کہتا ہے: جاء نی اثنان وثلاثة اور مثنی وثلاث کہنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس سے پہلے جمع ہو مثلاً جاءنی القوم احاد و ثناء و

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 293 2۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 294

ثلاث و رباع (بغیر تکرار کے)۔ یہ یہاں اور آیت میں حال کی جگہ میں ہیں اور صفت بھی ہوتے ہیں ان اعداد کی صفت ہونے کی مثال اس ارشاد میں واضح ہوتی ہے اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (فاطر: 1) یہ الاجنحۃ کی صفت ہیں یہ نکرہ ہیں ساعدہ بن جؤیۃ نے کہا:

ولكنما اهلى بوادٍ أنيسه　　ذئابٌ تَبَغَّى الناس مَثْنَى و مَوْحَدُ

اس میں مثنی اور موحد، ذئاب کی صفت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

فراء نے یہ شعر کہا ہے:

قتلنا به من بَين مَثْنَى و مَوْحَدِ　　بأربعة منكم وآخر خَامِسِ

اسی طرح اس شعر میں صفت میں یعنی قتلنا بہ ناساً یہ معرفہ اور نکرہ دونوں حالتوں میں غیر منصرف ہوتے ہیں، کسائی اور فراء نے عدد میں اس کو منصرف بنایا ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے، اخفش نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نام رکھا جائے تو معرفہ اور نکرہ دونوں صورتوں میں منصرف ہوتے ہیں کیونکہ ان سے عدل زائل ہو گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔ نو عورتوں کی اباحت پر دلالت نہیں کرتے جیسا کہ اس شخص نے کہا ہے جو کتاب و سنت کے سمجھنے سے بہت دور ہے، اور اس نے امت کے سلف صالحین کے اقوال سے اعراض کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ واؤ جمع کے لیے ہے اور اپنے اس قول کو اس سے تائید دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو عورتوں سے نکاح کیا تھا اور اپنی عصمت میں ان کو جمع کیا تھا، جو لوگ اس جہالت کا شکار ہوئے اور یہ بات کہی وہ رافضی لوگ اور بعض اہل ظاہر ہیں انہوں نے **مَثْنٰى** کو اثنین کی طرح بنایا ہے اسی طرح ثلاث اور رباع کے بارے میں کہا ہے۔ بعض اہل ظاہر اس سے بھی قبیح نظریہ رکھتے ہیں انہوں نے کہا: اٹھارہ عورتوں کے درمیان تک جمع کرنا مباح ہے اور دلیل یہ مروی ہے کہ ان صیغوں میں عدل تکرار کا فائدہ دیتا ہے اور واؤ جمع کے لیے ہے۔ پس انہوں نے مثنی، مثنی کو اثنین، اثنین کے معنی میں کیا ہے، اسی طرح ثلاث اور رباع کے بارے میں کہا ہے۔ یہ حقیقت میں لغت عرب اور سنت سے جہالت ہے اور اجماع امت کی مخالفت ہے، کیونکہ کسی صحابی اور تابعی کے بارے میں نہیں سنا گیا کہ اس نے چار عورتوں سے زیادہ عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھی ہوں۔ امام مالک نے اپنے موطا، نسائی اور دارقطنی نے اپنی اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیلان بن امیہ الثقفی کو کہا جبکہ اس نے اسلام قبول کیا تو اس کے عقد میں دس عورتیں تھیں ''ان میں سے چار کو اختیار کر اور باقی سے جدا ہو جا'' (1)۔

ابوداؤد کی کتاب میں حارث بن قیس سے مروی ہے فرمایا: میں نے اسلام قبول کیا تو میرے پاس آٹھ عورتیں تھیں میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے چار کو اختیار کر'' (2)۔ مقاتل نے کہا: قیس بن حارث کے پاس آٹھ آزاد عورتیں تھیں، جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چار عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا اور چار کو اپنے پاس رکھنے کا حکم دیا۔ مقاتل نے قیس بن حارث سے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ حارث بن قیس اسدی تھا جیسا

1۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 3، صفحہ 270، حدیث نمبر 96
2۔ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 304

کہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح محمد بن حسن نے سیر کبیر میں روایت کیا ہے کہ یہ حارث بن قیس تھا اور یہی فقہاء کے نزدیک معروف ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مباح کیا گیا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں اس کا بیان آئے گا۔ رہا ان کا قول کہ واؤ جمع کے لیے ہے یہ کہا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے عربوں کو واضح لغت کے ساتھ خطاب فرمایا اور عرب یہ اجازت نہیں دیتے کہ تو تسعہ نہ کہے اور کہے اثنین و ثلاثة واربعة۔ اسی طرح عرب اس کو قبیح سمجھتے ہیں جو کہتا ہے اعط فلانا اربعة ستة ثمانیه اور ثمانیة عشہ نہیں کہتا۔ اس آیت میں واؤ بدل ہے یعنی دو کا بدل تین سے نکاح کرلو اور تین کا بدل چار سے نکاح کرلو۔ اسی وجہ سے (واؤ) کے ساتھ عطف فرمایا (او) کے ساتھ عطف نہیں فرمایا، اگر او کے ساتھ ہوتا تو جائز ہوتا کہ دو عورتوں والے کے لیے تین عورتیں جائز نہ ہوں اور تین والے کے لیے چار عورتیں جائز نہ ہوں۔ ان کا قول کہ مثنی اثنین کا تقاضا کرتا ہے اور ثلاث، ثلاثة اور رباع اربعة کا تقاضا کرتی ہے یہ ایسا فیصلہ ہے جس پر اہل لغت ان کی موافقت نہیں کرتے اور یہ ان کی طرف سے جہالت ہے۔ اسی طرح دوسرے لوگوں کی جہالت ہے کیونکہ مثنی، اثنین، اثنین کا اور ثلاث، ثلاثة، ثلاثة کا رباع اربعة، اربعة کا تقاضا کرتا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اثنین، اثنین، ثلاثا ثلاثا، اربعا اربعا عدد کے لیے حصر ہیں جب کہ مثنی و ثلاث و رباع اس کے خلاف ہیں اور عربوں کے نزدیک معدول عدد میں معنی کی ایسی زیادتی ہوتی ہے جو اصل میں نہیں ہوتی۔ یہ اس طرح ہے کہ جب کہا: جاءت الخیل مثنی تو اس کا مطلب دو دو ہو کر گھوڑے آئے، یعنی ملے ہوئے آئے۔ جوہری نے کہا: اسی طرح عدد کا معدول ہے اور دوسرے علماء نے کہا: جب تو نے کہا: جاءنی قوم مثنی او ثلاث او احاد او عشار تو تیری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تیرے پاس ایک ایک یا دو دو یا تین تین یا دس دس ہو کر آئے۔ یہ معنی اصل میں نہیں ہے کیونکہ جب تو کہتا ہے: جاءنی قوم ثلاثة ثلاثة او قوم عشرة عشرة۔ تو تو نے قوم کی تعداد کو تیرہ کی تعداد میں منحصر کر دیا اور جب تو نے کہا: جاءنی رباع وثناء تو تو نے ان کی تعداد کو محصور نہیں کیا تیری مراد یہ ہوتی ہے کہ تیرے پاس چار چار یا دو دو آئے۔ خواہ ان کی تعداد زیادہ ہو یا کم ہو اور ہر صیغہ کو کم از کم پر اپنے گمان کے مطابق محصور کرنا ایک غیر پسندیدہ فیصلہ ہے۔ رہا علماء کا اختلاف اس شخص کے بارے میں جو پانچویں عورت سے نکاح کرتا ہے جبکہ اس کے پاس چار عورتیں پہلے موجود ہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ امام مالک اور شافعی نے فرمایا: اگر تو وہ اس کی حرمت جانتا ہے تو اس پر حد ہوگی یہی ابوثور کا قول ہے۔ زہری نے کہا: اگر وہ جانتا ہے تو اسے رجم کیا جائے گا اگر وہ جاہل ہے تو دونوں حدوں میں سے ادنیٰ حد یعنی کوڑے اس پر ہوں گے اور اس عورت کو مہر ملے گا اور ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ کبھی جمع نہ ہوں گے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر کوئی حد نہیں ہوگی یہ نعمان کا قول ہے۔ یعقوب اور محمد نے کہا: ذومحرم میں حد لگائی جائے گی اور اس کے علاوہ کسی سے نکاح کرنے کی صورت میں حد نہیں ہوگی۔ یہ اس کی مثل ہے جو مجوسی عورت سے نکاح کرتا ہے یا ایک عقد میں پانچ عورتوں سے نکاح کرتا ہے یا معتدہ سے نکاح کرتا ہے یا بغیر گواہوں کے نکاح کرتا ہے یا ایسی لونڈی سے نکاح کرتا ہے جس کے آقا کی اجازت نہیں ہے۔ ابوثور نے کہا: جب وہ جانتا ہو کہ یہ حلال نہیں ہے تو تمام صورتوں میں اس پر حد ہوگی مگر بغیر گواہوں کے

نکاح کرنے کی صورت میں حد نہ ہوگی۔ اس میں تیسرا قول بھی ہے۔ نخعی نے کہا: وہ شخص جو چوتھی عورت کی عدت گزارنے سے پہلے پانچویں عورت سے جان بوجھ کر نکاح کرتا ہے اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اسے جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہمارے علماء کا پانچویں عورت کے بارے میں فتویٰ ہے جیسا کہ ابن منذر نے یہ ذکر کیا ہے پھر جو اس سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرے گا اس کے بارے کتنا سخت قول ہوگا۔

مسئلہ نمبر10۔ زبیر بن بکار نے ذکر کیا ہے کہ ابراہیم حزامی نے مجھے بتایا انہوں نے محمد بن معن الغفاری سے روایت کیا فرمایا: ایک عورت حضرت عمر بن خطاب بڑی کے پاس آئی اور عرض کی: اے امیر المومنین! میرا خاوند دن کو روزہ رکھتا ہے رات کو قیام کرتا ہے اور اس میں اس کی شکایت کرنا بھی ناپسند کرتی ہوں، وہ اللہ کی اطاعت میں رہتا ہے حضرت عمر نے اسے کہا: تیرا خاوند بہت اچھا خاوند ہے وہ بار بار اپنی بات دہراتی رہی اور حضرت عمر اسے یہی جواب دیتے رہے۔ حضرت کعب اسدی نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! یہ عورت اپنے خاوند کی شکایت کر رہی ہے کہ وہ اس سے ہم بستر نہیں ہوتا حضرت عمر نے کہا: جیسا کہ تم نے اس کی بات سمجھی ہے پس فیصلہ بھی تم ہی کرو۔ حضرت کعب نے فرمایا: اس کے خاوند کو میرے پاس لایا جائے اسے لایا گیا تو حضرت کعب نے اسے کہا: تیری بیوی تیری شکایت کرتی ہے، خاوند نے کہا: کھانے کے بارے میں یا پینے کے بارے میں؟ حضرت کعب نے کہا: نہیں۔ عورت نے کہا اشعار کا ترجمہ: اے قاضی! اس کی دانش بڑی پختہ ہے میرے دوست کو اس کی مسجد نے میرے بستر سے غافل کر دیا ہے، اس کی عبادت نے میرے پہلو میں سونے سے عدم دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اے کعب! فیصلہ کر اور تردد کا شکار نہ ہو۔ یہ نہ دن کو سوتا ہے اور نہ رات کو سوتا ہے عورتوں کے معاملات میں اس کی تعریف نہیں کرتی۔

جواباً اس کے خاوند نے کہا: اس کے بستر اور اس کے حجلہ عروسی سے مجھے دلچسپی نہیں ہے کہ میں ایسا شخص ہوں کہ جو سورۃ النحل، سورۂ بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام اور اعراف میں نازل ہوا ہے اسی نے مجھے ہر چیز سے غافل کر دیا ہے اللہ کی کتاب میں بہت بڑا خوف دلایا گیا ہے۔

حضرت کعب نے فرمایا: اے شخص! تجھ پر اپنی بیوی کا حق ہے، ہر عقل مند کے لیے چار دنوں میں اس کا حصہ ہے اسے اپنا حق ادا کر اور علتیں بیان کرنا چھوڑ دے۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے عورتوں میں سے دو دو، تین تین اور چار چار حلال کی ہیں، تیرے لیے تین دن اور تین راتیں ہیں تو ان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں تیرے کس امر پر تعجب کروں ان کے معاملے کو سمجھنے پر یا تیرے ان کے درمیان فیصلہ پر، تم جاؤ میں نے تجھے بصرہ کی قضا کا عہدہ سونپا ہے۔ ابو ہدبہ ابراہیم بن ہدبہ نے کہا: ہمیں حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جو اپنے خاوند کی زیادتی کی شکایت کر رہی تھی اس نے کہا: میرے لیے وہ نہیں ہے جو عورتوں کے لیے ہوتا ہے، میرا خاوند ہمیشہ روزہ رکھتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لیے ایک دن ہے اور اس کے لیے ایک دن ہے، ایک دن عبادت کے لیے ہے اور ایک دن عورت کے لیے ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: اس کا مطلب ہے اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم میلان، محبت، جماع (1)، حسن معاشرت، چار، تین اور دو بیویوں کے درمیان تقسیم میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک عورت سے نکاح کرو۔ باری اور حسن معاشرت میں عدل کے ترک تک پہنچانے والی زیادتی (☆) سے منع کیا گیا ہے ایسی صورت میں ایک عورت سے نکاح کے وجوب کی دلیل ہے واللہ اعلم۔ واحدۃ کو مرفوع بھی پڑھا گیا ہے فواحدۃ فیھا کفایۃٌ او کافیۃ یعنی ایسی صورت میں ایک کافی ہے یا کفایت کرتی ہے کسائی نے کہا: فواحدۃ تقنع یعنی ایک پر قناعت کرے۔ فعل کے اضمار کے ساتھ واحدۃ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے یعنی فانکحوا واحدۃ یعنی پھر ایک سے نکاح کرو۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اس سے مراد لونڈیاں ہیں اس کا عطف واحدۃ پر ہے یعنی اگر ایک میں بھی عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر لونڈیاں رکھو۔ اس میں دلیل ہے کہ وطی اور باری میں لونڈی کا حق نہیں ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم باری مقرر کرنے میں عدل نہ کرو تو ایک عورت سے نکاح کرو یا لونڈیاں رکھو۔ لونڈیوں کو ایک عورت کے قائم مقام بنایا پس وطی اور قسم میں لونڈیوں کا حق ہونے کی نفی ہو گئی، مگر یہ کہ دائیں ہاتھ کی ملک عدل میں حسن معاشرت اور غلام کے ساتھ نرمی کے وجوب کے ساتھ قائم ہے اللہ تعالیٰ نے ملک کو الیمین کی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ یہ مدح کی صفت ہے اور یمین محاسن کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ محاسن پر قادر ہوتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ دایاں ہاتھ ہی منفقہ (خرچ کرنے والا) ہے جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: حتی لا تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ (2) (یعنی جو دایاں ہاتھ خرچ کرے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو) یہ معاہدہ اور بیعت کرنے والا ہے اسی وجہ سے قسم کو بھی یمین کہا جاتا ہے۔ یہ بزرگی کے جھنڈوں کو پانے والا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

اذا ما رَايةٌ رُفعت لمجد تلقاھا عَرَابَةُ باليمين

جب بزرگی کے لیے جھنڈا بلند کیا گیا تو عرابۃ نے اسے دائیں ہاتھ سے پکڑا۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا یعنی یہ زیادہ قریب ہے کہ تم حق سے انحراف نہ کرو اور تم ظلم نہ کرو۔ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہما سے یہی مروی ہے (3)۔ کہا جاتا ہے: عال الرجال یعول، جب کوئی ظلم کرے اور جھکاؤ کرے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: عال السھم عن الھدف یعنی تیر ہدف سے ادھر ادھر ہو گیا۔ ابن عمر نے کہا: وہ کیل اور وزن میں ظلم کرنے والا ہے۔ شاعر نے کہا:

قالوا اَتّبَعنا رسولَ اللہ واطّرحوا قولَ الرسولِ وعالُوا فی الموازین

انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور انہوں نے رسول مکرم کے قول کو پس پشت ڈال دیا اور وزن کرنے میں ظلم کیا۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 297
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد، جلد 2، صفحہ 62
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 299
☆ ... سے نکاح کرنے کی اجازت۔

ابو طالب نے کہا:

بِمیزانِ صدقٍ لا یُغِلّ شعیرۃً　　له شاھدٌ من نفسه غیرُ عائلِ

سچائی کا ترازو ہے ایک جو کی بھی خیانت نہیں کرتا اس کا نفس ہی گواہ ہے وہ ظلم کرنے والا نہیں ہے یعنی حق سے انحراف کرنے والا نہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ثلاثۃ أنفسٍ وثلاثُ ذَوْدٍ　　لقد عال الزمانُ علی عِیالِی

تین افراد اور تین اونٹ، زمانے نے میرے عیال پر ظلم کیا۔

عال الرجل یعیل کا معنی ہے وہ محتاج ہو گیا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً (توبہ:28) (اگر تمہیں فقر و غربت کا اندیشہ ہو) اسی سے شاعر کا قول ہے:

وما یَدرِی الفقیرُ متی غِناہُ　　وما یَدرِی الغنیّ متی یعیلُ

فقیر نہیں جانتا کہ اس کی غنا کب ہے اور غنی نہیں جانتا کہ وہ کب فقیر ہو جائے گا۔

العیلۃ والعالۃ کا معنی الفاقۃ (بھوک) ہے عالنی الشئ یعولنی۔ جب کوئی کسی پر غالب آ جائے تو یہ بولا جاتا ہے۔ عال الامر، جب معاملہ سخت اور شدید ہو جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الا تعولوا یعنی تمہاری اولاد زیادہ نہ ہو۔ ثعلبی نے کہا: یہ اور کسی نے معنی بیان نہیں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: عال یعیل، جب کسی کے عیال زیادہ ہوں۔ ابن عربی نے کہا: عال کے صرف سات معانی ہیں، آٹھواں معنی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے: (۱) عال جھکنا (۲) انحراف کرنا (۳) زیادہ ہونا (۴) ظلم کرنا (۵) بوجھل ہونا۔ یہ ابن درید نے حکایت کیا ہے۔ خنساء نے کہا:

یکفی العشیرۃ ما اعالھا

اس کا خاندان کفایت کرتا ہے جو اس پر بوجھل ہوتا ہے (۶) عیال کی مشقت اٹھانا۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وابدأ بمن تعول (1)، صدقہ اس سے شروع کرو جن کی تم کفالت کرتے ہو (۷) غالب ہونا، اسی سے ہے عیل صبرہ اس کا صبر مغلوب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: اعال الرجل اس کے عیال زیادہ ہیں اور رہا عال بمعنی کثر عیالہ یہ صحیح نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: رہا ثعلبی کا قول کہ (یہ کسی نے معنی بیان نہیں کیا) دار قطنی نے اپنی سنن میں یہ زید بن اسلم سے روایت کیا ہے یہ حضرت جابر بن زید کا بھی قول ہے۔ یہ دونوں مسلمانوں کے علماء اور ائمہ میں سے ہیں۔ یہ امام شافعی سے پہلے یہ معنی بیان کر چکے ہیں۔ رہا وہ جو ابن عربی نے حصر کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کا قول کیا ہے، ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عال الامر کا معنی سخت ہونا اور معاملہ کا ناہموار ہونا ہے۔ یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ہروی نے اپنی غریب میں ذکر کیا ہے ابو بکر نے کہا: عال الرجل فی الارض یعیل فیھا۔ جب کوئی زمین میں سفر کرے۔ احمر نے کہا: کہا جاتا ہے: عالنی الشی یعیلنی

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806

عیدٌ معیدٌ جب کوئی چیز کسی کو عاجز کر دے۔ رہا عال کا معنی کثر عیالہ۔ یہ کسائی ابو عمر الدوری اور ابن اعرابی نے ذکر کیا ہے۔ کسائی ابوالحسن علی بن حمزہ نے کہا: عرب کہتے ہیں: عال یعول، اعال یعیل یعنی اس کے عیال زیادہ ہو گئے۔ ابو حاتم نے کہا: امام شافعی لغت عرب کو ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ شاید یہ بھی ایک لغت ہو۔ ثعلبی المفسر ہمارے استاد ابوالقاسم بن حبیب نے کہا: ابو عمر الدوری سے میں نے اس کے متعلق پوچھا وہ لغت میں یقیناً امام تھے انہوں نے فرمایا: یہ حمیر کی لغت ہے اور انہوں نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

وانّ الموتَ یأخذ کل حیّ		بلاشك وان أمشٰی وعالا

بلاشک موت ہر زندہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اگرچہ اس کے اہل وعیال زیادہ بھی ہوں۔

ابو عمرو بن علاء نے کہا: عرب کی وجوہ اتنی زیادہ ہوتیں کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ میں کسی غلطی کرنے والے سے کوئی غلطی نہ لے لوں۔ طلحہ بن مصرف نے الا تعیلوا پڑھا ہے۔ یہ امام شافعی کی حجت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: زجاج وغیرہ نے عال کی تاویل عیال سے کرنے میں اس طرح تنقید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی کثرت مباح کی ہے اور اس میں عیال کا زیادہ ہونا ہے پھر ''عیال زیادہ نہ ہو جائیں'' کے زیادہ قریب کیسے ہوگا۔ یہ تنقید صحیح نہیں ہے کیونکہ لونڈیاں ایسا مال ہیں جس میں خرید وفروخت کے ساتھ تصرف کیا جاتا ہے۔ عیال جس میں تنقید ہے وہ آزاد عورتیں ہیں جن کے حقوق واجب ہیں (1)۔ ابن الاعرابی نے حکایت کی ہے کہ عرب کہتے ہیں: عال الرجل جب کسی کے عیال زیادہ ہو جائیں (2)۔

مسئلہ نمبر 14۔ اس آیت سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو غلام کے لیے بھی چار شادیاں کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ یعنی عورتوں میں سے جو تمہارے لیے حلال ہیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں غلام کی آزاد سے تخصیص نہیں فرمائی۔ یہ داؤد اور طبری کا قول ہے۔ یہی امام مالک سے مشہور قول ہے اور ان کے مؤطا میں موجود کلام کا ماحصل بھی یہی ہے۔ اسی طرح امام مالک سے ابن القاسم اور اشہب نے روایت کیا ہے۔ ابن المواز نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ غلام صرف دو عورتوں سے نکاح کرے۔ یہ لیث کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری، لیث بن سعد نے کہا: غلام دو عورتوں سے زیادہ عورتوں سے نکاح نہ کرے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ غلام دو عورتوں سے زیادہ سے نکاح نہ کرے۔ میں صحابہ میں سے ان کی مخالفت کرنے والا نہیں جانتا یہی امام شعبی، عطا، ابن سیرین، الحکم، ابراہیم اور حماد کا قول ہے اور اس قول کی حجت اس کی طلاق اور حد پر قیاس صحیح ہے وہ تمام علماء جو کہتے ہیں اس کی حد، آزاد کی حد سے نصف ہے، غلام کی طلاق دو طلاقیں ہیں، اس کا ایلا، دو ماہ ہیں اور اس قسم کے دوسرا احکام، پس یہ بعید نہیں ہے کہ کہا جائے کہ اس کے قول ''چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے'' میں تناقض ہے۔ واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر ابن عطیہ، جلد 2، صفحہ 8، دار الکتب العلمیہ بیروت		2۔ ایضاً

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

''اور دیا کرو (اپنی) عورتوں کو ان کے مہر خوشی خوشی پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوش دلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے''۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ۔ الصدقات جمع ہے واحد صدقة ہے۔ اخفش نے کہا: بنو تمیم کہتے ہیں صدقة اور جمع صدقات اگر تو چاہے تو دال کو فتحہ دے دے اور چاہے تو ساکن کر دے۔ مازنی نے کہا: کہا جاتا ہے صداق المرأة (صاد کے کسرہ کے ساتھ) اور صاد کے فتحہ کے ساتھ نہیں بولا جاتا (1)۔ یعقوب اور احمد بن یحییٰ نے نحاس سے فتحہ کے ساتھ حکایت کی ہے۔ اس آیت میں خطاب خاوندوں کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ، حضرت ابن زید اور ابن جریج کا ہے الله تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ اپنی بیویوں کو مہر خوشی خوشی دو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں خطاب اولیاء کو ہے۔ یہ ابو صالح کا قول ہے (2)۔ ولی، عورت کا مہر لیتا تھا اور اسے کچھ نہیں دیتا تھا پس اولیاء کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا اور انہیں ان کے مہر سپرد کرنے کا حکم دیا گیا، کلبی کی روایت میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اس طرح کرتے تھے کہ عورت کا ولی، جب اس کی شادی کر دیتا اگر وہ عورت اس کے خاندان میں قریب ہی بیاہی گئی ہوتی تو اسے مہر میں سے کچھ بھی نہ دیتا اور اگر وہ دور کہیں بیاہی جاتی تو اس کا ولی اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے اس کے خاوند کے پاس بھیجتا اور اسے اس اونٹ کے سوا کچھ نہ دیتا، تو الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (عورتوں کو خوشی خوشی ان کے مہر دیا کرو)

معتمر بن سلیمان نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرمی نے کہا: اس آیت میں مراد وہ لوگ ہیں جو ایک عورت کے بدلے میں دوسری عورت سے نکاح کرتے (وٹہ سٹہ کا نکاح) تو انہیں مہر مقرر کرنے کا حکم دیا گیا (3)۔ پہلا قول اظہر ہے، کیونکہ ایک میں یہ تمام ضمائر خاوندوں کے لیے ہیں اور وہی مراد ہیں، کیونکہ فرمایا: وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً۔ یہ ضمائر کے مرجع کے ایک ہونے کا موجب ہے اس میں پہلی ضمائر سے جو مراد ہیں دوسری سے بھی وہی مراد ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت عورت کے مہر کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور یہ اس پر اجماع ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر عراقی بعض علماء سے مروی ہے کہ لونڈی اور غلام کا آقا جب ان کا آپس میں نکاح کر دے تو اس میں مہر واجب نہیں لیکن یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً تو اس میں عام حکم فرمایا اور فرمایا: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (تو نکاح کر لو ان سے ان کے سرپرستوں کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 8 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 300 3۔ ایضاً، جلد 3-4، صفحہ 301

اجازت سے اور دوان کو مہر ان کے دستور کے موافق) علماء کا اجماع ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے اور کم از کم مہر سے متعلق علماء کا اختلاف ہے جس کا بیان وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىہُنَّ قِنۡطَارًا کے تحت آئے گا۔ اور جمہور علماء نے صَدُقَاتِهِنَّ (صاد کے فتحہ اور دال کے ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ قتادہ نے صُدْقَاتِهِنَّ صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے(2)۔ نخعی اور ابن وثاب نے دونوں کے ضمہ اور مفرد صیغہ پڑھا ہے یعنی صُدُقَتِهِنَّ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نِحۡلَةً نون کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی عطا کرنا ہے۔ نحلت فلاناً شیئاً میں نے اسے چیز عطا کی۔ مہر عورت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: نِحۡلَةً کا مطلب ہے خاوند بغیر جھگڑے کے خوش دلی سے دے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: نِحۡلَةً کا مطلب ہے واجب فریضہ ہے(3)۔ ابن جریج اور ابن زید نے کہا: متعین فریضہ ہے(4)۔ ابوعبید نے کہا: نحلۃ نہیں ہوتا مگر متعین معلوم۔ زجاج نے کہا: نحلہ کا مطلب دین کے طور پر۔ النحلہ کا مطلب دیانۃ اور ملت سے کہا جاتا ہے(5): هذا نحلته یعنی یہ اس کا دین ہے۔ یہ مفہوم اچھا ہے جب کہ خطاب ان اولیاء کو ہو جو زمانہ جاہلیت میں مہر وصول کرتے تھے حتیٰ کہ کسی عورت نے اپنے خاوند کے بارے کہا:

لا یاخذ الحلوان من بناتنا

''وہ ہماری بیٹیوں کا مہر نہیں لیتا''۔

وہ عورت کہتی ہے: وہ ایسا نہیں کرتا جیسا کہ دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مہر کی رقم لے لی اور عورتوں کو دینے کا حکم دیا۔ نحلۃ منصوب ہے کیونکہ یہ فعل کے اضمار کے ساتھ الازواج سے حال ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے انحلوهن نحلة۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حال کی جگہ میں مصدر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا یہ خطاب بھی خاوندوں کے لیے ہے اور عموم کی وجہ سے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عورت اپنا مہر خاوند کو ہبہ کر سکتی ہے خواہ وہ باکرہ (کنواری) ہو یا ثیبہ (شوہر دیدہ) ہو۔ یہی جمہور فقہاء کا قول ہے۔ امام مالک نے باکرہ کے مہر بخشنے کو منع کیا ہے اور یہ انہوں نے ولی کے لیے مقرر کیا ہے جب کہ وہ ملکیت اس عورت کی ہوگا۔ فراء نے کہا: یہ اولیاء سے خطاب ہے۔ کیونکہ وہ مہر لیتے تھے اور عورت کو اس میں سے کچھ نہیں دیتے تھے، ان کے لیے مباح قرار نہ دیا مگر یہ کہ عورت اسے بخش دے۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ پہلے اولیاء کا ذکر نہیں ہوا ہے اور منه کی ضمیر کا مرجع صداق (مہر) ہے۔ اسی طرح عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے(6): اس آیت کے نزول کا سبب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس سے اجتناب کیا کہ جو انہوں نے اپنی بیویوں کو دیا ہے وہ انہیں واپس مل جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ... الخ۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کا اتفاق ہے کہ عورت اپنے نفس کے معاملہ کی خود مالک ہے جب وہ اپنا مہر اپنے خاوند کو ہبہ کر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 8　2۔ ایضاً　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 300
4۔ ایضاً　5۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 9　6۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 301

دے گی تو اس کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا اس کو اس میں رجوع کا حق نہ ہوگا مگر شریح کا خیال ہے کہ اس میں اس کے لیے رجوع کا حق ہے اور انہوں نے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا سے حجت پکڑی ہے جب وہ خاوند سے مطالبہ کرنے والی ہوگی تو اس کا دل خوش نہ ہوگا۔ ابن عربی نے کہا: یہ باطل ہے، کیونکہ وہ خوش تھی جب اس نے کھایا تھا پس اسے کلام کا حق نہیں، کیونکہ مراد کھانا نہیں یہ حلال کرنے اور حلال ہونے سے کنایہ ہے۔ اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اگر عورت نکاح کے وقت شرط لگائے کہ وہ اس پر کسی عورت سے نکاح نہیں کرے گا اور اس وجہ سے وہ اپنے مہر میں سے کچھ ساقط کر دے۔ پھر خاوند اس پر کسی دوسری عورت سے نکاح کرے گا تو ابن القاسم کی روایت میں اس عورت کے لیے اس خاوند پر کچھ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے خاوند پر ایسی شرط لگائی تھی جس کا لگانا جائز نہ تھا جیسا کہ اہل بریرہ نے شرط لگائی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے آزاد کر دے گی اور ولا اس کے بیچنے والوں کے لیے ہوگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد کو صحیح قرار دیا تھا اور شرط کو باطل قرار دیا تھا اسی طرح یہاں اس سے بعض مہر کا ساقط کرنا صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔ ابن عبدالحکم نے کہا: اگر تو اس کا مہر، مہر مثل کی مقدار یا اس سے زیادہ باقی رہتا ہے تو عورت اس پر رجوع نہیں کرے گی اور اگر خاوند سے اس نے اتنا مہر ساقط کر دیا کہ مہر مثل سے بھی کم رہ گیا ہے پھر اس خاوند نے اس پر دوسری عورت سے نکاح کر لیا تو وہ مہر مثل کی تکمیل کے لیے رجوع کرے گی، کیونکہ اس نے اپنے اوپر خود شرط قبول کی تھی اور اس کا عوض لیا تھا جو عورت کے لیے واجب تھا پس اس سے وہ لیا جائے گا اور خاوند پر اس کا پورا کرنا واجب ہوگا، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''مومنین کے معاملات اس کی شروط کے مطابق ہوں (1) گے''۔ (☆)

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ آزاد کرنا مہر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ مال نہیں ہے، کیونکہ عورت کا آزادی کو ہبہ کرنا اور خاوند کے لیے اس کا کھانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام زفر، امام محمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے امام احمد بن حنبل، اسحاق اور یعقوب نے کہا: حضرت صفیہ کی حدیث جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے، اس میں آزادی کو ہی مہر بنایا گیا ہے۔ آزاد کرنے کے علاوہ حضرت صفیہ کا کوئی مہر نہیں تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد کیا تھا اور اس کی آزادی کو ہی اس کا مہر بنایا تھا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا کیا تھا اور حضرت انس حضرت صفیہ کی حدیث کے راوی ہیں۔ پہلے گروہ کے علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت صفیہ کی حدیث میں کوئی حجت نہیں۔ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح میں یہ خصوصیت تھی کہ آپ بغیر مہر کے بھی نکاح کر لیں آپ نے حضرت زینب سے نکاح کا ارادہ کیا تو وہ حضرت زید پر حرام ہو گئی تھیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بغیر ولی اور بغیر مہر کے داخل ہوئے تھے۔ پس اس جیسی حدیث سے استدلال مناسب نہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَفْسًا بعض علماء نے فرمایا: یہ بیان کی بنا پر منصوب ہے۔ سیبویہ اور کوفیوں نے اس اسم کا مقدم ہونا جائز قرار نہیں دیا جو بیان کی حیثیت سے منصوب ہو اور مازنی، ابو العباد المبرد نے اس کو جائز قرار دیا ہے جب کہ اس کا عامل فعل ہو اور دلیل یہ مصرعہ دیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303

☆ بشرطیکہ وہ کسی نص یا اصل شرعی کے منافی نہ ہوں۔

وما كان نفسًا بالعراق تطيب

(یعنی فراق پر ازروئے نفس کے خوش نہ تھا) قرآن حکیم میں ہے خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ (القمر: 7) اس آیت میں بطور بیان خُشعًا مقدم ہے۔ اس بنا پر شحماً تفقأت اور وجھاً حسنت جائز ہے۔ سیبویہ کے اصحاب نے کہا: نَفۡسًا فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے اغنی نفسا۔ تمیز کے طور پر منصوب نہیں ہے جب اس طرح ہو تو اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: وما کان نفسی اس میں تمام علماء نحو کا اتفاق ہے کہ تمیز کو مقدم کرنا جائز نہیں جب کہ اس کا عامل غیر متصرف ہو جیسے عشرین درھماً۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَكُلُوۡهُ اس سے مقصود کھانے کی صورت نہیں بلکہ اس سے مراد مباح کرنا ہے خواہ کسی طریقہ پر ہو۔ بعد والی آیت میں بھی یہی مراد ہے۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اس میں نفس کھانا مراد نہیں ہے مگر چونکہ کھانا مال سے متمتع ہونے کی ایک مکمل قسم ہے اس لیے تصرفات کو (کھانے) سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ (جمعہ: 9) اس آیت میں بیع کی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے مثلاً نکاح وغیرہ، لیکن بیع کا ذکر کیا گیا، کیونکہ ذکر الٰہی سے غافل کرنے والی چیزوں میں سے اہم ترین ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هَنِيۡٓــًٔا مَّرِيۡٓــــًٔا، کلوہ میں جو منصوب ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے بعض علماء نے فرمایا: یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی اکلا ھنیئا بطیب الانفس۔ عرب کہتے ہیں: ھنأہ الطعام والشراب، یھنؤہ وما کان ھیئناً ولقد ھنؤ۔ اور مصدر الھنء۔ ہر وہ چیز جو مشقت اور تکلیف سے حاصل نہ ہو وہ ھنئ ہے۔ ھنئ یہ ھنؤ سے اسم فاعل ہے جیسے ظریف، ظرف سے اسم فاعل ہے ھنئ یہ فعل کے وزن پر ہے جیسے زمن، ھنأنی الطعام و مرأنی اکٹھے استعمال ہوتے ہیں اور جب ھنأنی استعمال نہ ہو تو امرأنی الطعام الف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یعنی کھانا ہضم ہو گیا۔ ابوعلی نے کہا: یہ اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے أرجعن مازورات غیر مأجورات(1)۔ موزورات سے واؤ کو ماجورات کے لفظ کی اتباع میں الف سے بدل دیا۔ ابوالعباس نے ابن اعرابی سے روایت کیا ہے کہا جاتا ہے: ھنئ وھنأنی و مرأنی امرأنی اور مرئنی نہیں کہا جاتا۔ یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ قشیری نے حکایت کیا ہے کہ ھنئنی و مرئنی (را کے کسرہ کے ساتھ) یھنأنی یمرأنی کہا جاتا ہے اور یہ قلیل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ھنیئا جس میں گناہ نہ ہو اور مریئا جس میں کوئی بیماری نہ ہو۔ کثیر نے کہا:

هَنِيئًا مَرِيئًا غيرَداء مُخامِرٍ لِعزّة من أعراضِنا ما استَحَلّت

ایک شخص علقمہ کے پاس آیا جب کہ وہ کوئی چیز کھا رہے تھے جو اس کی بیوی نے اپنے مہر میں سے اسے ہبہ کی تھی تو اس نے اسے کہا: کل من الھنئ المرئ۔ بعض علماء نے کہا: الھنئ جو پاک ہو اور آسانی سے گلے سے اترنے والا ہو کسی چیز نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1 صفحہ 114

اسے خراب نہ کیا ہو اور المری جس کا انجام اچھا ہو، مکمل ہضم ہونے والا ہو، نہ نقصان دے اور نہ اذیت دے۔ فرمایا: جس کے مطالبہ سے دنیا میں تم خوف نہ کھاتے ہو اور آخرت میں جو بوجھ نہ ہو۔ اس پر حضرت ابن عباس کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب عورت خوشی سے اپنے خاوند کو عطیہ دے گی جب کہ وہ مجبور نہ ہوگی، سلطان اس کی وجہ سے تمہارے خلاف فیصلہ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے متعلق مواخذہ نہ کرے (1)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف ہو تو اپنی بیوی سے اس کے مہر میں سے ایک درہم مانگنا چاہیے پھر اس کے ساتھ شہد خرید دے پھر اسے بارش کے پانی کے ساتھ ملا کر پیے، پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے الھنی، المری اور مبارک پانی کو جمع کر دے گا۔ واللہ اعلم

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

”اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے) لیے سہارا اور کھلاؤ انہیں اس مال سے اور پہناؤ انہیں اور کہو ان سے بھلائی کی بات“۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کو مال دینے، عورتوں کو مہر دینے کو بیان کر دیا تو وضاحت فرمائی کہ بے وقوف اور غیر بالغ کو مال دینا جائز نہیں۔ یہ آیت یتیموں کے لیے وصی، ولی اور کفیل کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ مسلمان، آزاد، معتبر، عادل شخص کو وصی بنانا جائز ہے اور آزاد عورت کو وصی بنانے میں اختلاف ہے۔ عوام اہل العلم نے کہا: آزاد عورت کو وصی بنانا جائز ہے۔ امام احمد نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت حفصہ کو وصی بنایا تھا۔ عطا بن ابی رباح سے مروی ہے کہ انہوں نے اس شخص کو فرمایا جس نے اپنی عورت کو وصی بنایا تھا۔ عورت وصی نہیں ہو سکتی اگر عورت وصی بنائی گئی تو وہ اس کی قوم کے مرد کی طرف وصیت پھیر دی جائے گی غلام کو وصی بنانے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، ابوثور، امام محمد اور یعقوب نے اس سے منع فرمایا ہے۔ امام مالک، اوزاعی، ابن عبد الحکم نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ نخعی کا قول ہے، جب اپنے غلام کو وصی بنائے اس کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے السُّفَهَآءَ۔ سورۂ بقرہ میں السفہ کا لغوی معنی بیان ہو چکا ہے ان سفہاء سے کون مراد ہیں اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سالم افطس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: اس سے مراد وہ یتیم بچے ہیں جن کو تم مال نہیں دیتے۔ نحاس نے کہا: یہ بہتر قول ہے جو اس آیت کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسماعیل بن ابی خالد نے ابو مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ چھوٹی اولاد ہے تم ان کو مال نہ دو تاکہ وہ خراب نہ کر دیں اور تم بغیر کسی چیز کے باقی نہ رہ جاؤ (2)۔ سفیان نے حمید اعرج سے انہوں نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: اس سے مراد عورتیں ہیں (3)، نحاس وغیرہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 471 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 306 3۔ ایضاً

نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے عرب عورتوں کے بارے میں سفائنۃ یا سفیہات کہتے ہیں، کیونکہ فعیلہ کی جمع اکثر اسی طرح آتی ہے۔ کہا جاتا ہے، تم اپنا مال نہ مضاربت پر دو اور نہ ایسے وکیل کو دو جو تجارت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو عقل نہ رکھتا ہو وہ ہمارے بازار میں تجارت نہ کرے پس اس کے متعلق فرمایا وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ یعنی جو احکام سے جاہل ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کفار کو مال نہ دو اسی وجہ سے علماء نے مکروہ قرار دیا ہے کہ مسلمان کسی ذمی کو خرید و فروخت کا وکیل بنائے یا اسے مضاربت پر مال دے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: السُّفَهَآءَ سے مراد یہاں ہر وہ شخص ہے (1) جو حجر کا مستحق ہے۔ یہ جامع قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: سفیہ پر حجر، تو سفیہ کے کئی احوال ہوتے ہیں اس پر اس کے عمر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے، جنون وغیرہ کی وجہ سے عقل نہ ہونے کی حالت میں حجر کیا جاتا ہے، اپنے مال میں اچھی سوچ نہ رکھنے کی حالت میں حجر کیا جاتا ہے۔ رہا وہ شخص جس پر غشی طاری ہوتی ہے امام مالک نے اس پر حجر نہ کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے، کیونکہ غشی جلد ختم ہو جاتی ہے، حجر کبھی انسان کے اپنے حق کے لیے ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کے حق کے لیے ہوتا ہے۔ جسے اپنی ذات کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے وہ ہے جس کا ذکر ہم نے کر دیا ہے اور جنہیں دوسروں کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے وہ غلام بہت زیادہ مقروض اور مریض جو دو ثلث میں وصیت کرتا ہے۔ مفلس خاوند والی عورت، جنہیں اپنے ساتھی کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے باکرہ کو اپنے نفس کے حق کی وجہ سے حجر کیا جاتا ہے، رہا چھوٹا بچہ اور مجنون ان پر حجر کے بارے کوئی اختلاف نہیں ہے، رہا بڑا آدمی جو اپنے مال میں اچھی نظر نہیں رکھتا اور اس سے مال کو بلا وجہ تلف کرنے سے امن نہیں ہوتا، تو وہ بچے کے مشابہ ہوتا ہے اس میں اختلاف ہے جو آگے آئے گا، اس میں فرق نہیں کہ وہ اپنے مال کو گناہوں میں تلف کرتا ہو یا قرب اور مباحات میں تلف کرتا ہو۔ ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے اس میں جو مال کو قرب میں خرچ کرتا ہو بعض نے اس پر حجر کیا ہے اور بعض نے اس پر حجر نہیں کیا۔ غلام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور مقروض کے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا وہ قرض خواہوں کے لیے لے لیا جائے گا، کیونکہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ حضرت عمر نے اسیفع جہینہ سے ایسا کیا تھا۔ امام مالک نے موطا میں یہ ذکر کیا ہے: وہی باکرہ جب تک وہ پردے میں ہے اس پر حجر ہوگا، کیونکہ وہ اپنے بارے صحیح نظر نہیں رکھتی حتیٰ کہ جب نکاح کرے اور لوگ اس پر داخل ہوں اور وہ باہر نکلے اور اس کا چہرہ ظاہر ہوگا اور منافع اور نقصان کو پہچان لے تو اس پر حجر ختم ہو جائے گا اور رہی خاوند والی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی عورت کے لیے جائز نہیں جس کا خاوند اس کی عصمت کا مالک ہو کہ وہ اپنے مال میں فیصلہ کرے مگر تہائی میں اسے اجازت ہے (2)''۔

میں کہتا ہوں: رہا احکام سے جاہل شخص اگرچہ اس پر حجر تو نہیں کیا جاتا لیکن مال میں عدم تدبیر کی وجہ سے اسے مال دیا نہیں جائے گا، کیونکہ اسے فاسد بیوع اور صحیح بیوع کا علم نہیں ہے اور حل و حرمت سے ناواقف ہے، ذمی بھی بیوع کی جہالت میں اس کی مثل ہے، اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ وہ سودی معاملات کرے گا۔ واللہ اعلم۔ اس بنا پر مخاطبین کی طرف مال کی اضافت کی وجہ سے اختلاف ہے۔ یہ اضافت سفہاء کے لیے ہے۔ مال کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی، کیونکہ وہ ان کے

1۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 10 2۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ عمرو، جلد 2، صفحہ 221

قبضہ میں ہے اور وہ اس میں نگران ہیں پس وسعت کی بنا پر ان کی طرف نسبت کی گئی جیسے ارشاد ہے فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (النور: 61) اور فرمایا فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (بقرہ: 53) اور بعض علماء نے فرمایا: ان کی طرف اموال کی نسبت اس لیے کی، کیونکہ وہ ان کے اموال کی جنس سے ہے کیونکہ اموال مخلوق کے درمیان مشترک ہیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف منتقل ہوتے ہیں، ایک ملکیت سے دوسری ملکیت میں جاتے ہیں یعنی یہ مال ان کے لیے ہیں جب وہ ان کے محتاج ہوتے ہیں جس طرح تمہارے وہ مال ہیں جو تمہاری عزت کو بچاتے ہیں اور تمہاری حفاظت کرتے ہیں اور تمہاری اقدار کو بڑھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تمہارے معاملات زندگی کا قیام ہے۔ دوسرا قول حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور حضرت قتادہ کا ہے، مخاطبین کے مال حقیقۃً مراد ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تو اپنا وہ مال اپنی بیوی اور بیٹے کو نہ دے جو تیری معیشت کا سبب ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو فقیر ہو جائے اور تو ان کا منہ تکتا رہے اور ان کے ہاتھوں میں جو ہے اس کو تکتا رہے بلکہ تو خود ان پر خرچ کرنے والا ہو۔ اس مفہوم کی بنا پر السُّفَهَآءَ سے مراد عورتیں اور بچے ہوں گے، چھوٹی اولاد اور اس کی بیوی۔ مجاہد اور ابو مالک کا قول بھی سفہاء کے بارے میں یہی تھا (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت سفیہ پر حجر کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ اور فرمایا فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا (بقرہ: 282) سفیہ پر ولایت کو اسی طرح ثابت فرمایا جس طرح ضعیف پر ولایت کو ثابت فرمایا اور ضعیف کا معنی صغیر (چھوٹے) کی طرف راجع ہے اور سفیہ کا معنی بڑے بالغ کی طرف راجع ہے کیونکہ السفہ مذمت کا اسم ہے اور انسان کی اس پر مذمت نہیں کی جاتی جو اس نے کیا نہ ہو اور قلم غیر بالغ سے اٹھالیا گیا ہے پس مذمت اور حرج اس سے منفی ہو گئے۔ یہ خطابی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ سفیہ پر حجر سے پہلے کے افعال کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ مالک اور ابن القاسم کے علاوہ ان کے تمام اصحاب نے کہا کہ سفیہ کا فعل اور اس کا امر تمام جائز ہے حتی کہ امام اس کے ہاتھ کو روک لے۔ یہی امام شافعی اور امام ابو یوسف کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: اس کے افعال جائز نہیں ہیں اگرچہ امام اس کو نہ بھی روکے۔ اصبغ نے کہا: اگر اس کی سفاہت ظاہر ہو تو اس کے افعال مردود ہیں اور اگر سفاہت ظاہر نہیں ہے تو اس کے افعال رد نہیں کیے جائیں گے حتی کہ امام اس پر حجر کر دے۔ سحنون نے امام مالک کے قول کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ اگر سفیہ کے افعال حجر کیے جانے سے پہلے مردود ہوں تو سلطان کو کسی پر حجر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن القاسم کی حجت بخاری میں حضرت جابر کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے غلام آزاد کیا جب کہ اس کے پاس اس غلام کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آزاد غلام کا آزاد کرنا رد کر دیا (3) جب کہ اس سے پہلے اس پر حجر نہیں کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 5۔ بالغ شخص پر حجر کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور جمہور علماء نے فرمایا: اس پر حجر کیا جائے گا (اگر وہ بے وقوف ہوگا) امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اس شخص پر حجر نہیں کیا جائے گا جو بالغ ہو دراں حالیکہ وہ عاقل ہو مگر جب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 9　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 310　3۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، جلد 1، صفحہ 325

وہ اپنے مال کو خراب کرنے والا ہو (تو اس پر حجر کیا جائے گا) جب وہ ایسا ہو گا تو مال اس کے سپرد نہیں کیا جائے گا حتی کہ وہ پچیس سال کی عمر کو پہنچ جائے، جب اس عمر کو پہنچ جائے گا تو ہر حال میں مال اس کے سپرد کیا جائے گا خواہ وہ مفسد مال ہو یا نہ ہو، کیونکہ بارہ سال کی عمر میں اس سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے چھ ماہ کا بچہ پیدا ہو گا تو وہ پچیس سال کی عمر میں وہ باپ دادا بن جائے گا اور میں اس شخص پر حجر کرنے سے حیا کرتا ہوں جو دادا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مال کو اس سے روکنے کی مدت میں جب وہ مفسد ہونے کی حالت میں بالغ ہو تو اس کا تصرف علی الاطلاق نافذ ہوتا ہے۔ مال صرف احتیاطاً اسے نہیں دیا جاتا۔ یہ نظر اور اثر کے اعتبار سے سب ضعیف ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ہمیں محمد بن حسن صواف نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں حامد بن شعیب نے خبر دی انہوں نے کہا ہمیں شریح بن یونس نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں یعقوب بن ابراہیم (ابو یوسف القاضی) نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ہشام بن عروہ نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت زبیر کے پاس آئے اور کہا: میں نے اتنے اتنے کی بیع کے ساتھ خرید کی ہے اور حضرت علی چاہتے ہیں کہ وہ امیر المومنین کے پاس جائیں گے اور ان سے مجھ پر حجر کرنے کا سوال کریں گے حضرت زبیر نے کہا: میں بیع میں تمہارا شریک ہوں پس حضرت علی، حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا: ابن جعفر نے اتنے پیسوں میں خرید کیا ہے اس پر حجر کریں۔ حضرت زبیر نے کہا: میں اس بیع میں اس کا شریک ہوں۔ حضرت عثمان نے کہا: میں اس شخص پر ایسی بیع میں کیسے حجر کروں جس میں زبیر اس کا شریک ہے۔ یعقوب نے کہا: میں حجر پر عمل کرتا ہوں اور میرا یہی خیال ہے اور میں محجور کی بیع وشرا کو باطل کروں گا اور جب وہ حجر سے پہلے بیع وشرا کرے گا تو میں اس کو جائز قرار دوں گا، یعقوب بن ابراہیم (ابو یوسف) نے کہا: ابوحنیفہ حجر نہیں کرتے اور نہ حجر پر عمل کرتے ہیں اور حضرت عثمان کا قول کہ "میں اس پر کیسے حجر کروں" بڑے آدمی پر بھی حجر کرنے کی دلیل ہے، عبداللہ بن جعفر کو اس کی والدہ نے حبشہ کی زمین میں جنم دیا تھا یہ پہلا بچہ تھا جو اسلام میں پیدا ہوا تھا وہ فتح خیبر کے سال اپنے باپ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنی تھی اور یاد کی تھی اور خیبر سنہ 5 ہجری کو فتح ہوا تھا، اس کا قول امام ابوحنیفہ کے قول کو رد کرتا ہے۔ ان کی حجت آگے آئے گی ان شاء اللہ۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا** یعنی تمہاری معاش اور تمہارے دین کی اصلاح کے لیے بنایا ہے۔ الَّتِیْ میں تین لغات ہیں التی و اللت تا کے کسرہ کے ساتھ اللت تا کے سکون کے ساتھ، اس کے تثنیہ میں بھی تین لغت ہیں۔ اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتانّ، نون کی شد کے ساتھ اور اس کی جمع کی لغات اسی سورت میں اپنے موقع پر آجائیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ القیام و القوام، معنی جو تجھے قائم کرے۔ کہا جاتا ہے: فلان قیام اھلہ و قوام بیتہ یعنی وہ شخص جو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے۔ جب قاف کو قوام میں کسرہ دیا گیا تو واؤ کو یا سے بدل دیا گیا۔ اہل مدینہ کی قرأت قیما بغیر الف کے ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا: قیما اور قواما کا معنی قیاما ہے۔ کسائی اور فراء کے نزدیک اس کی نصب مصدر کی بنا پر ہے یعنی تم اپنے وہ مال بے وقوفوں کو نہ دو جن کے ساتھ تمہارے امور درست ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ تمہارا قیام ہے۔ اخفش نے کہا: اس کا معنی ہے جو تمہارے امور کو قائم

کرنے والے ہیں، انہوں نے اس کو جمع خیال کیا ہے۔ بصریوں نے کہا: قیماً، قیمۃ کی جمع ہے جیسے دیمۃ اور دِیَمٌ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن اموال کو اشیاء کے لیے قیمت بنایا ہے۔ ابو علی نے اس قول کو غلط کہا ہے اس نے کہا: یہ مصدر ہے جیسے قیام اور قوام مصدر میں اس کی اصل قوم ہے لیکن یا کی طرف لوٹانے میں شاذ ہے جیسے جواد کی جمع میں جیاد کا قول شاذ ہے۔ قوما و قواما و قیاما اس کا معنی ہے اصلاح حال میں دوام اور ثبات۔ حسن اور نخعی نے اللاتی پڑھا ہے انہوں نے التی کی جمع بنایا ہے اور عام قرأت جماعت کے لفظ پر التی ہے۔ فراء نے کہا: اکثر کلام عرب میں النساء اللواتی اور الاموال التی استعمال ہوتا ہے اسی طرح اموال کے علاوہ میں بھی التی استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان مالوں میں ان کے لیے رکھو یا ان کے لیے ان مالوں میں حصہ مقرر کرو اور یہ اس شخص کا قول ہے جو انسان پر بیوی اور چھوٹے بچوں کا خرچ اور لباس لازم کرتے ہیں (1)۔ یہ بچے کے خرچ کا باپ پر واجب ہونے اور بیوی کے خرچ کا خاوند پر لازم ہونے کی دلیل ہے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جو غنی کو چھوڑے اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور صدقہ کا آغاز اس سے کرو جس کی تم کفالت کرتے ہو۔ عورت کہے گی: یا تم مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو۔ غلام کہے گا: مجھے کھلاؤ یا مجھے کام پر لگاؤ۔ بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ تم مجھے کس کے آسرا پر چھوڑ رہے ہو۔ صحابہ نے کہا: اے ابو ہریرہ! تو نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: نہیں یہ ابو ہریرہ کے ذہن سے ہے (2)۔ مہلب نے کہا: اہل و عیال پر خرچ کرنا بالاجماع واجب ہے۔ یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابن المنذر نے کہا: بالغ بچے کے خرچ میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس مال نہ ہو اور اس کا کسب بھی نہ ہو۔ ایک گروہ کا خیال ہے والد کو اپنی مذکر اولاد پر خرچ کرنا لازم ہے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائیں اور مؤنث اولاد پر خرچ کرنا لازم ہے حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے اور ان کے ساتھ حقوق زوجیت ادا ہو جائیں۔ اگر خاوند نے حقوق زوجیت ادا کرنے کے بعد اسے طلاق دے دی یا خاوند مر گیا تو اس عورت کا خرچہ اس کے باپ پر نہ ہوگا، اگر حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دے دی تو اس کا خرچ باپ پر ہوگا۔

مسئلہ نمبر 9۔ پوتے کا نفقہ دادا پر نہیں ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پوتے پر دادا خرچ کرے گا حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے اور عورتوں کو حیض آ جائے۔ پھر دادا پر نفقہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ پوتے پوتیاں اپاہج ہوں، برابر ہے کہ وہ مذکر ہوں یا مؤنث ہوں جب کہ ان کے پاس مال بھی نہ ہو، برابر ہے اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو اگرچہ کتنے ہی نیچے ہوں جبکہ ان کا باپ نہ ہو اور وہ ان پر خرچ کرنے پر قادر بھی ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اور ایک گروہ نے تمام بچوں اور بالغوں، مردوں اور عورتوں کا نفقہ واجب کیا ہے جب کہ ان کے پاس ایسے اموال نہ ہوں جن کے ساتھ وہ والد کے نفقہ سے مستغنی ہو جائیں دلیل کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہندہ کو یہ فرمانا پیش کیا ہے: خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف (3) تو ابو سفیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 10
2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 808

کے مال سے اتنا لے لیا کر جو معروف طریقہ پر تجھے اور تیری اولاد کو کافی ہو اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے بیٹا کہے گا: مجھے کھلاؤ مجھے کس کے سپرد کر رہے ہو۔ یہ دلیل ہے کہ وہ یہ کہے گا جسے کسب اور پیشہ کی طاقت نہ ہو گی۔ اور جو بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے گا وہ یہ نہیں کہے گا کیونکہ وہ خود کمانے اور محنت کرنے کی عمر کو پہنچ چکا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ حتی کہ جب نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ نکاح کی عمر کو پہنچنے کو اس میں حد بنایا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے عورت کہے گی یا مجھے کھانا کھلا یا مجھے طلاق دے۔ یہ اس کے قول کا رد کرتا ہے جو کہتا ہے: تنگی کی وجہ سے تفریق نہیں کرتا ہے اور عورت پر صبر کو لازم کرتا ہے اور نفقہ خاوند کے ذمہ حاکم کے حکم سے کرتا ہے۔ یہ عطا اور زہری کا قول ہے اور کوفیوں کا نظریہ بھی یہی ہے وہ بطور دلیل یہ آیت پیش کرتے ہیں وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (بقرہ:280) (اگر وہ تنگ دست ہو تو خوشحالی تک مہلت دو) وہ کہتے ہیں: خوشحال ہونے تک مہلت دینا واجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (نور:32) وہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے پس فقر کو فرقت کا سبب بنانا جائز نہیں ہے۔ فقر کے ہوتے ہوئے نکاح کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس آیت میں ان کی کوئی حجت نہیں ہے اس کا بیان اپنی جگہ پر آئے گا اور حدیث اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: خطاب یتیم کے ولی کو ہے تاکہ وہ اس کے مال سے اس پر خرچ کرے جو مال ولی کی نگرانی میں ہے جیسا کہ پہلے مال کی اضافت میں اختلاف گزر چکا ہے۔ وصی اس یتیم کے مال اور حال کے مطابق اس پر خرچ کرے اگر وہ چھوٹا ہو اور اس کا مال کثیر ہو تو اس کے لیے دایہ کا بندوبست کرے اور اس کی پرورش کرنے والیوں کا اہتمام کرے اور اس پر خرچ میں وسعت کرے۔ اگر یتیم بڑا ہو تو اس کے لیے نرم لباس اور لذیذ کھانے اور خدام کا انتظام کرے۔ اگر اس کا مال کم ہو تو اس کے مطابق خرچ کرے۔ اگر مال بالکل تھوڑا ہو تو حاجت کی مقدار موٹا لباس اور سادہ کھانا مہیا کرے اگر یتیم فقیر ہو اس کا مال نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ بیت المال سے اس کا بندوبست کرے۔ امام اگر ایسا نہ کرے تو مسلمانوں پر یہ واجب ہے۔ جو اس کا زیادہ قریبی ہو گا اس پر واجب ہو گا پھر جو زیادہ قریبی ہو گا اس پر واجب ہو گا۔ ماں اس کی زیادہ قریبی ہے تو اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا واجب ہے اور نہ تو بچے پر رجوع کرے گی اور نہ کسی اور پر رجوع کرے گی یہ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ:233) کے تحت گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یعنی ان سے نرم لہجہ میں بات کرنا اور خوبصورت وعدہ کرنا۔ قول معروف کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان کے لیے دعا کرو اللہ تعالیٰ تم میں برکت دے، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے اور تمہارے لیے نیک بندوبست فرمائے (1) اور میں تمہاری دیکھ بھال کروں گا یہ احتیاط ایسی ہے جس کا نفع تیری طرف لوٹے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ان سے اچھا وعدہ کرو یعنی تم جب پختگی کی عمر کو پہنچ جاؤ گے تو ہم تمہارے مال تمہیں واپس کر دیں گے (2)۔ باپ بیٹے سے کہے: میرا مال تجھے ہی ملے گا ان شاء اللہ، تو ہی اس کا مالک ہو گا جب تو دانائی کا مالک ہو گا اور جب تو تصرف کرنے کو پہچان لے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 10، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ ایضاً

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

''اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال اور نہ کھاؤ انہیں فضول خرچی سے اور جلدی جلدی اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اور جو سرپرست غنی ہو تو اسے چاہیے کہ (یتیموں کے مال سے) پرہیز کرے اور جو سرپرست فقیر ہو تو وہ کھالے مناسب مقدار سے پھر جب لوٹاؤ تم ان کی طرف ان کے مال تو گواہ بنالو ان پر اور کافی ہے اللہ حساب لینے والا''۔

اس آیت میں سترہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى، الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے یہ آیت یتیموں کو مال دینے کی کیفیت کے بیان میں تمام لوگوں کے لیے خطاب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثابت بن رفاعہ اور اس کے چچا کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ اس طرح ہے کہ رفاعہ فوت ہوا اور اس نے اپنا چھوٹا بچہ چھوڑا تو ثابت کا چچا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میرے بھائی کا بیٹا یتیم ہے وہ میری پرورش میں ہے اس کے مال سے میرے لیے کیا حلال ہے اور میں اسے کب مال دے دوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مسئلہ نمبر 2۔ اختیار کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وصی، یتیم کے اخلاق میں غور و فکر کرے، اس کی اغراض کو سنے اور اس کی نجابت کا علم حاصل کرے اور اس کے مصالح میں اس کی کوشش اور مال کی حفاظت اور مال میں سستی کی معرفت حاصل کرے، جب اس میں خیر دیکھے تو ہمارے علماء وغیرہم نے فرمایا: اس کو اس کے مال میں سے کچھ دے دینے میں کوئی حرج نہیں، اس کے لیے اس میں تصرف مباح ہے اگر تو وہ اس مال میں اضافہ کرے اور اس میں بہتر انداز میں تصرف کرے تو اختیار پایا گیا اور وصی پر اس کا سارا مال دینا واجب ہو گیا اور اگر اس مال میں بہتر انداز میں تصرف نہ کرے تو وصی پر واجب ہے کہ اس کا مال اپنے پاس روکے رکھے۔ علماء میں کوئی ایسا نہیں جو کہے کہ جب بچے کی آزمائش کی جائے اور وصی اسے دانا پائے تو اس سے ولایت اٹھ جاتی ہے اور اس کا مال اسے دینا واجب ہو جاتا ہے اور اس میں تصرف کی کھلی چھٹی ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (حتیٰ کہ جب نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں) فقہاء کی ایک جماعت نے کہا: چھوٹا بچہ دو چیزوں سے خالی نہیں ہوتا یا وہ لڑکا ہوگا یا لڑکی ہوگی اگر وہ لڑکا ہوگا تو ایک مہینہ گھر کے اخراجات میں اسے اہتمام کرتے ہوئے دیکھا جائے گا یا وصی اسے تھوڑی سی چیز دے گا جس میں وہ تصرف کرے گا تاکہ اس کی تدبیر اور تصرف کو پہچان لے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ وصی اس کی نگرانی کرے گا تاکہ مال کو ضائع نہ کر دے۔ اگر وہ اسے ضائع کرے گا تو وصی پر اس

کی ضمان نہ ہوگی اگر وہ اسے مال کی حفاظت میں پوری کوشش کرنے والا دیکھے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دے اور اس پر گواہ بنالے۔ اگر وہ یتیم بچی ہوگی تو اس کو وہ چیزیں دی جائیں گی جن کا تعلق تدبیر ونظر کے اعتبار سے گھر کو بنانے سنوارنے سے ہوتا ہے مثلاً اون کاتنے والیوں کو اون دینے اور پھر کپڑا واپس لینے، اس کی اجرت دینے اور عمدہ روٹی لینے اور عمدہ بنائی لینے وغیرہ کا کام دیکھے گا، اگر وصی اسے دانا دیکھے گا تو اس کا مال اس کے حوالے کر دے گا اور اس پر گواہ بنالے گا ورنہ وہ حجر کے تحت رہیں گی حتیٰ کہ وہ ان کی دانائی محسوس کی جائے۔ حسن اور مجاہد وغیرہ نے کہا: اور ان کو ان کی عقول، ادیان اور مال بڑھانے میں آزماؤ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ یعنی جب بالغ ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ (نور: 59) یعنی جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں اور نکاح کی حالت کو پہنچ جائیں اور بلوغت پانچ چیزوں کے ساتھ ہوتی ہے تین چیزوں میں مرد اور عورتیں مشترک ہیں اور دو چیزیں عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور وہ دو چیزیں حیض اور حمل ہیں۔ حیض اور حمل کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ بلوغ ہے ان کے ہوتے ہوئے احکام وفرائض واجب ہوتے ہیں اور دوسری تین چیزوں میں عطا کا اختلاف ہے۔ رہا زیر ناف بالوں کا آنا اور عمر تو امام اوزاعی، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: پندرہ سال بلوغت کی عمر ہے جس کو احتلام نہ ہو۔ یہی قول ابن وہب، اصبغ، عبدالملک بن الماجشون، عمر بن عبدالعزیز اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا ہے، ابن عربی نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ ان علماء کے نزدیک جو اس عمر کو پہنچ جائے اس پر حدود وفرائض واجب ہیں۔ اصبغ بن الفرج نے فرمایا: ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بلوغت کی حد جس کی وجہ سے فرائض اور حدود لازم ہوتے ہیں وہ پندرہ سال عمر ہے اس مسئلہ میں جو میرے پاس معلومات ہیں ان میں سے یہ قول مجھے زیادہ پسند ہے اور میرے نزدیک یہی عمدہ ہے، کیونکہ وہ عمر جس میں جہاد میں حصہ دیا جاتا ہے اور جو قتال (جنگ) میں شریک ہوسکتا ہے وہ یہی عمر ہے اور اس مسئلہ میں حضرت ابن عمر کی حدیث سے حجت پکڑی گئی ہے جب انہوں نے جنگ خندق میں اپنے آپ کو پیش کیا جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی تو انہیں شرکت کی اجازت دی گئی جب کہ جنگ احد میں انہیں اجازت نہیں ملی تھی، کیونکہ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (1)۔ ابوعمر بن عبدالبر نے کہا: یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کی تاریخ پیدائش معلوم ہو اور رہا وہ جس کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو اور عمر کے سال کا علم نہ ہو یا وہ اس کا انکاری ہو تو اس صورت میں اس روایت کے مطابق عمل کیا جائے گا جو نافع نے اسلم سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر نے الاجناد کے امراء کو لکھا کہ جزیہ نہ لگاؤ مگر اس پر جس کے زیر ناف بال اگ آئے ہوں۔ حضرت عثمان نے چوری کرنے والے لڑکے کے بارے فرمایا: دیکھو اگر زیر ناف بال اگ آئے ہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ عطیہ القرظی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے ہر اس شخص کو حضرت سعد بن معاذ کے فیصلہ کے مطابق قتل کر دیا جس کے زیر ناف بال اگ آئے تھے اور جن کے بال نہیں اُگے تھے ان کو زندہ رکھا میں ان میں سے تھا جن کے بال ابھی نہیں اُگے تھے پس مجھے آپ نے چھوڑ دیا۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا: جس کو احتلام نہیں ہوا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 317

اس پر بلوغت کا حکم نہیں لگایا جائے گا حتیٰ کہ وہ اس عمر کو پہنچ جائے کہ جس میں کسی کو احتلام ہوتا ہے اور یہ سترہ سال کی عمر ہے اس وقت اس پر حد ہوگی جب وہ کوئی ایسا فعل شنیع کرے گا جس پر حد واجب ہوتی ہے۔ کبھی امام مالک نے فرمایا: بلوغت کی حد یہ ہے کہ اس کی آواز بھاری ہو جائے اور اس کی مینی پھول جائے۔ امام ابوحنیفہ سے دوسری روایت انیس سال کی ہے۔ اور یہ زیادہ مشہور قول ہے اور یحییٰ کے متعلق فرمایا: اس کی بلوغت کی عمر سترہ سال ہے اور اس پر نظر عکم ہے۔ اللولئی نے امام ابوحنیفہ سے اٹھارہ سال بھی روایت کیے ہیں۔ داؤد نے کہا: جب تک احتلام نہیں ہوتا عمر کے ساتھ بلوغت شمار نہ ہوگی اگرچہ چالیس سال بھی عمر ہو جائے، رہا زیر ناف بالوں کا پیدا ہونا، بعض علماء نے کہا: اس سے بلوغت پر استدلال کیا جائے گا۔ ابن القاسم اور سالم سے یہ مروی ہے۔ امام مالک کا بھی ایک قول یہ ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ احمد، اسحق اور ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بلوغت کی علامت ہے لیکن اس کے ساتھ کفار پر حکم لگایا جائے گا پس جس کے زیر ناف بال پیدا ہو چکے ہوں گے اسے قتل کیا جائے گا اور جس کے زیر ناف بال نہ ہوں گے اسے بچوں میں شمار کیا جائے گا۔ یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے انہوں نے یہ استدلال عطیہ القرظی کی حدیث سے کیا ہے اور باریک بالوں اور روؤں کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ حکم بالوں پر مرتب ہوگا۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میرے نزدیک حضرت عمر بن خطاب کی حدیث پر عمل ہے۔ اگر زیر ناف بالوں پر استرا استعمال کرتا ہے تو میں اس پر حد لگاؤں گا۔ اصبغ نے کہا: مجھے ابن القاسم نے کہا میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ حد صرف بالوں کے اگنے اور بلوغت دونوں کے جمع ہونے کی صورت میں لگائی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: زیر ناف بالوں کی وجہ سے حکم ثابت نہ ہوگا نہ تو وہ بلوغ ہے اور نہ بلوغ پر دلالت ہے۔ زہری اور عطا نے کہا: جس کو احتلام نہ ہو اس پر حد نہیں ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور مالک کا ایک رجحان بھی ایک قول کے مطابق اسی طرح ہے، امام مالک کے بعض اصحاب کا یہی قول ہے اس کا ظاہر یہ ہے کہ بالوں کے اگنے اور عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب حضرت ابن عمر کی حدیث عمر میں دلیل نہیں ہے تو پھر ہر وہ عدد جو سالوں کے متعلق علماء ذکر کرتے ہیں وہ صرف دعویٰ میں ہے۔ وہ عمر جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا وہ اس عمر سے بہتر ہے جس کا اعتبار نہیں کیا اور شرع میں اس پر دلیل بھی قائم نہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ میں زیر ناف بال اگنے کا اعتبار کیا ہے۔ میں اس کا عذر تسلیم نہیں کرتا جس نے ان دو امروں کو ترک کر دیا جن کا اعتبار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس نے اس کی تاویل کی ہے اور اس مدت کا اعتبار کرتا ہے جس کا لفظاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتبار نہیں کیا ہے اور نہ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شریعت میں نظر بنائی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہاں تو اس کا یہ قول ہے اور سورۂ انفال میں اس کا دوسرا قول ہے، کیونکہ وہاں اس نے حضرت ابن عمر کی حدیث کو نہیں چھوڑا اور اسی طرح کی تاویل کی ہے جو ہمارے علماء نے کی ہے، کیونکہ اس کا موجب ان کے درمیان فرق ہے جو جنگ کی طاقت رکھتا ہے اور جس کے لیے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا جاتا ہے اور وہ پندرہ سال کی عمر کا شخص ہے اور جو جنگ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس کے لیے حصہ مقرر نہیں کیا جاتا اور وہ بچوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ مفہوم ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حدیث سے سمجھا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ یعنی جب تم ان سے دانائی دیکھو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا (القصص: 29) (موسیٰ علیہ السلام نے طور کی جانب سے آگ دیکھی) ازہری نے کہا: عرب کہتے ہیں اذهب فاستانس هل ترى احداً (جاؤ دیکھو کیا کوئی شخص دیکھتے ہو)

نابغہ نے کہا: علی مستأنس وحد۔

اس سے وہ وحشی بیل مراد لیتا ہے جو دیکھتا ہے کہ کیا اسے کوئی شکاری نظر آتا ہے تا کہ وہ اس سے محتاط ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا انست واحسست ووجدت تمام کا ایک معنی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا یعنی تم ان سے دانائی جان لو۔ اس میں اصل ابصرتم ہے یعنی اس کا معنی دیکھنا ہے۔ عام قراءت رشداً را کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ ہے۔ سلمی، عیسیٰ، ثقفی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے رشداً راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رشداً، رشد کا مصدر ہے اور رشداً، رشد کا مصدر ہے اسی طرح ارشاد ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے رُشْدًا کی تاویل میں اختلاف کیا ہے حضرت حسن اور حضرت قتادہ وغیرہما نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عقل اور دین میں اصلاح (1)، حضرت ابن عباس، سدی اور ثوری نے کہا: عقل اور مال کی حفاظت میں (2) اصلاح ہے سعید بن جبیر اور شعبی نے کہا: ایک شخص اپنی داڑھی پکڑتا ہے اور وہ دانائی کو نہیں پہنچا ہوتا (3)۔ پس یتیم کو اس کا مال نہیں دیا جائے گا اگرچہ وہ بوڑھا بھی ہو جائے حتیٰ کہ اس سے دانائی معلوم ہو جائے۔ ضحاک نے اسی طرح کہا ہے: یتیم کو مال نہیں دیا جائے گا اگرچہ وہ سو سال کو پہنچ جائے حتیٰ کہ اس سے مال کی اصلاح معلوم ہو جائے۔ مجاہد نے کہا: یعنی خاص عقل میں اصلاح مراد ہے (4)۔ اکثر علماء نے کہا: رشد، بلوغت کے بعد ہوتی ہے۔ اگر بلوغت کے بعد بھی دانا نہ ہو، اگرچہ بوڑھا بھی ہو جائے تو اس سے حجر کا حکم زائل نہ ہوگا۔ یہ امام مالک وغیرہ کا مذہب ہے۔ ابو حنیفہ نے فرمایا: آزاد بالغ پر حجر نہیں کیا جائے گا جب وہ مردوں کی حد کو پہنچ جائے اگرچہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ فاسق ہو اور سب سے زیادہ فضول خرچی کرنے والا ہو جب کہ وہ عقل مند ہو۔ امام زفر بن ہذیل کا یہی قول ہے اور یہی نخعی کا مذہب ہے اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت قتادہ نے حضرت انس سے روایت کی ہے کہ حبان بن منقذ (چیزیں) خریدتے تھے اور ان کی سوچ اور رائے میں کمزوری تھی، عرض کی گئی یارسول اللہ! حبان پر حجر کر دیں، یہ چیزیں خریدتا ہے اور اس کی سمجھ میں ضعف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا: تو بیع نہ کیا کر اس نے کہا: حضور! میں بیع کیے بغیر رہ نہیں سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: جب تو بیع کیا کر تو کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہوگا اور تیرے لیے تین دن کا خیار ہوگا۔ احناف اور ان کے ہم نوا علماء فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر حجر کرنے کو کہا گیا، کیونکہ اس کے تصرفات میں نقصان ہوتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حجر نہیں کیا تھا پس ثابت ہوا کہ حجر کرنا جائز نہیں ہے۔ اس حدیث میں احناف کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ اس شخص کے ساتھ خاص تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 314
2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 11
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 314
4۔ ایضاً

بقرہ میں بیان کیا ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے حکم مختلف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر وہ شخص مال اور دین کو خراب کرنے والا ہو یا مال کو خراب کرنے والا ہو دین کو ضائع کرنے والا نہ ہو تو اس پر حجر کیا جائے گا اور اگر اپنے دین کو ضائع کرنے والا اور اپنے مال کی اصلاح کرنے والا ہو تو اس کے متعلق دو قول ہیں ایک یہ کہ اس پر حجر کیا جائے گا یہ ابو العباس بن شریح کا اختیار ہے اور دوسرا یہ کہ اس پر حجر نہ ہوگا یہ ابو اسحاق مروزی کا مختار قول ہے۔ امام شافعی کا بھی اظہر قول یہی ہے۔ ثعلبی نے کہا: جو ہم نے سفیہ (بے وقوف) پر حجر کے متعلق ذکر کیا ہے یہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور عبد اللہ بن جعفر کا قول ہے اور تابعین میں سے شریح کا قول ہے اور فقہاء میں سے امام مالک، اہل مدینہ، اوزاعی، اہل شام، امام ابو یوسف، امام محمد، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور کا قول ہے۔ ثعلبی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اس مسئلہ میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو تو جان لے کہ مال کا دینا دو شرائط پر ہے دانائی کا محسوس کرنا اور بالغ ہونا۔ اگر ایک شرط پائی جائے اور دوسری نہ پائی جائے تو مال یتیم کے حوالے کرنا جائز نہیں اسی طرح آیت کی نص ہے اور ابن القاسم، اشہب اور ابن وہب کی مالک سے اس آیت کے متعلق یہی روایت ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام زفر اور نخعی کے علاوہ فقہاء کا یہی قول ہے انہوں نے پچیس سال کی عمر کو پہنچنے کے ساتھ دانائی محسوس کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: اس عمر میں چونکہ وہ دادا ہو جاتا ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کے قول کے ضعف پر دلیل ہے اور اس کے ضعف پر دلیل ہے جس کے ساتھ ابو بکر رازی نے احکام القرآن میں ان دو آیتوں کے استعمال سے حجت پکڑی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہے اور اہل اصول کا اتفاق ہے کہ مطلق کو مقید کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اس کا دادا ہونا کیا فائدہ دے گا جب وہ غیر سنجیدہ ہو۔ مگر ہمارے علماء نے لڑکی میں بلوغت کے ساتھ خاوند کا اس سے دخول کرنا شرط قرار دیا ہے اس وقت رشد میں ابتلا واقع ہوگا جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی اس کا خیال نہیں رکھتے اور وہ مذکر اور مونث میں مذکورہ اقوال کے مطابق اختیار کا اعتبار کرتے ہیں۔ ہمارے علماء نے مذکر اور مونث میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: عورت، مرد کے مخالف ہوتی ہے، کیونکہ وہ پردے میں ہوتی ہے بکارت کی وجہ سے وہ نہیں باہر نکلتی ہے اور نہ امور کا اسے تجربہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس میں نکاح کے وجود پر دانائی کو موقوف کیا گیا ہے۔ نکاح کے ساتھ تمام مقاصد سمجھتی ہے۔ جبکہ مرد اس کے خلاف ہوتا ہے وہ اپنے تصرف اور نشاۃ کے آغاز سے بلوغت تک لوگوں سے ملاقات کے ساتھ اس کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی عقل بلوغت کے ساتھ مکمل ہوتی ہے، پس اس کے لیے غرض حاصل ہو جاتی ہے اور جو امام شافعی نے کہا وہ زیادہ درست ہے، کیونکہ حشفہ کے داخل کرنے کے ساتھ نفس وطی اس کی رشد و دانائی میں اضافہ نہیں کرتی جب کہ وہ تمام امور اور مقاصد کو جاننے والی ہو اور مال کو فضول خرچ کرنے والی نہ ہو پھر ہمارے علماء نے یہ زائد فرمایا ہے کہ خاوند کے دخول کے بعد اتنی مدت کا گزرنا بھی ضروری ہے جس میں احوال کی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے اس زمانہ کی تحدید میں کئی اقوال ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے پانچ، چھ اور سات سال باپ والی لڑکی کے بارے میں ہیں اور وہ یتیمہ جس کا باپ اور وصی نہ ہو اس کے لیے دخول کے بعد ایک سال مقرر کیا ہے اور جس پر والی مقرر کیا ہے اس پر ہمیشہ حجر ہوگا حتیٰ کہ اس کی دانائی ثابت ہو جائے۔ ان تمام اقوال

میں کوئی دلیل نہیں ہے باپ والی لڑکی میں سالوں کی حد بیان کرنا مشکل ہے اور یتیمہ میں ایک سال کی تحدید اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اور جس پر والی مقرر کیا گیا ہے اس پر ہمیشہ حجر ہوگا حتی کہ اس کی دانائی واضح ہو جائے، اس کو وصی حجر سے نکالتا ہے یا حکم اس سے نکالتا ہے۔ یہ قرآن کا ظاہر ہے اور اس تمام سے مقصود اس ارشاد کے تحت داخل ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا پس رشد و دانائی کا اعتبار تو متعین ہو گیا لیکن راشد کے حال کے مختلف ہونے کے سبب اس کا محسوس کرنا مختلف ہے، پس اس کو پہچان لے اور اس پر اپنی ترکیب کر اور وہ فیصلہ کرنے سے اجتناب کر جس پر دلیل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء کا اختلاف ہے اس لڑکی کے بارے میں جو باپ والی ہو اور اس مدت میں کوئی کام کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: حجر کی بقا کی وجہ سے وہ رد پر محمول ہوگا اور جو کام اس مدت کے بعد کرے گی وہ جواز پر محمول ہوگا۔ بعض نے فرمایا: جو کام وہ اس مدت میں کرے گی وہ رد پر محمول ہوگا مگر جب کہ اس میں درستگی ظاہر ہو تو جواز پر محمول ہوگا اور جو کام اس مدت کے بعد کرے گی وہ جواز پر محمول ہوگا مگر یہ کہ اس میں سفاہت واضح ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ جس پر حجر کیا گیا ہے اس کو مال دینے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا سلطان کی ضرورت ہوگی یا نہیں۔ ایک جماعت نے کہا: یہ معاملہ سلطان وقت کی طرف لے جانا ضروری ہے اور اس کے نزدیک اس کی دانائی ثابت ہوگی تو اس کا مال اس کو دیا جائے گا۔ ایک گروہ نے کہا: یہ وصی کے اجتہاد پر موقوف ہے سلطان کی طرف معاملہ لے جانے کی ضرورت نہیں (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہمارے زمانہ کے وصی میں درست یہ ہے کہ وہ سلطان کی طرف مسئلہ لے جائے اور اس کے پاس رشد کے ثبوت سے مستغنی نہ ہو کیونکہ اس میں حفاظت ہے اس سے کہ اوصیاء متفق ہو جائیں کہ بچہ دانا ہو گیا ہے اور وہ محجور علیہ (جس کو تصرف سے روکا گیا ہے) کو بری کردے جس کو اس وقت میں تحصیل کی قلت اور نادانی کی وجہ سے تصرف سے روکا گیا تھا (2)۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب دانائی کے پائے جانے کے ساتھ مال اس کے حوالے کیا جائے گا پھر اگر وہ قلت تدبیر اور فضول خرچی کے ظہور کے ساتھ بے وقوفی کی طرف لوٹ آئے تو ہمارے نزدیک اس کی طرف حجر پھر لوٹ آئے گا اور امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: حجر دوبارہ نہیں لوٹے گا، کیونکہ وہ بالغ عاقل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قصاص اور حدود میں اس کا اقرار جائز ہے اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ (البقرہ: 282) (پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فرق نہیں فرمایا کہ محجور سفیہ ہو یا اطلاق کے بعد اس پر سفاہت طاری ہو۔

مسئلہ نمبر 10۔ وصی کے لیے یتیم کے مال میں وہ سب کچھ کرنا جائز ہے جو باپ کے لیے کرنا جائز ہوتا ہے مثلاً تجارت کرنا، بضاعت پر دینا، بیع و شراء کرنا وغیرہ اور اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کے تمام اموال کی زکوٰۃ ادا کرے خواہ سونا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 11، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً

چاندی ہو، کھیتی ہو یا جانور ہوں اور فطرانہ بھی ادا کرے اور اس کی طرف سے جنایات کی دیت اور اگر وہ چیزیں ضائع کر دے اس کی قیمت ادا کرے، والدین کا نفقہ اور تمام لازمی حقوق ادا کرے۔ یتیم کا نکاح کرنا، اس کی طرف سے مہر ادا کرنا، اس کے لیے لونڈی خریدنا، جسے وہ لونڈی بنائے، اس کے مفاد میں تمام مصالح کا اہتمام کرنا، جب وصی بعض قرض خواہوں کو قرضہ ادا کر دے اور مال میں کچھ بچ جائے جو اس کا مزید قرضہ ادا کر دے تو وصی کا یہ فعل جائز ہے اور اگر باقی مال تلف ہو جائے تو وصی پر باقی قرض خواہوں کے لیے کچھ نہ ہوگا اور نہ ان پر جنہوں نے قرضہ وصول کر لیا۔ اگر قرض خواہوں نے تمام مال لے لیا پھر دوسرے قرض خواہ آ گئے، اگر تو وصی کو باقی قرض کا علم تھا یا میت باقی قرض کے ساتھ معروف تھا تو وصی ان عرفاء کے لیے اتنے پیسوں کا ضامن ہوگا جو ان کا حصہ بنتا ہے اور وصی ان لوگوں سے پیسے واپس لے گا جنہوں نے مکمل اپنا قرضہ وصول کر لیا تھا اور اگر وصی کو اس کا علم نہ ہو اور نہ میت قرضہ کے ساتھ معروف ہو تو وصی پر کچھ نہ ہوگا اور جب وصی نے میت کا قرضہ بغیر گواہی کے دے دیا تو وہی ضامن ہوگا۔ اگر اس نے گواہی قائم کی اور طویل زمانہ گزر گیا حتی کہ گواہ فوت ہو گئے تو اس پر کچھ نہیں ہوگا۔ سورۂ بقرہ میں وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ:220) کے تحت وصی کے خرچ کرنے کے متعلق احکام گزر چکے ہیں جو کافی وشافی ہیں۔ الحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو بغیر اسراف کے کھایا جائے وہ جائز ہے۔ پس اس کے لیے دلیل خطاب ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے مال نہ کھاؤ، کیونکہ یہ اسراف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اوصیاء کو یتیموں کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے وہ اتنا کھا سکتے ہیں جو ان کے لیے کھانا ضروری اور مباح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اسراف کا لغوی معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ السرف کا مطلب خرچ کرنے میں خطا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

أَعْطَوْا هُنَيْدَة يَحْدُوها ثمانيةٌ   ما في عطائهم مَنٌّ ولا سَرَفُ

یعنی وہ عطا کی جگہ میں خطا نہیں کرتے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وقال قائلهُم والخيلُ تخبِطُهم   أسْرَفْتُمْ فأجبنا أنّنا سَرِفُ

نضر بن شمیل نے کہا: السرف کا معنی فضول خرچی کرنا ہے اور السرف کا معنی غفلت ہے، اسراف کا مزید معنی کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گا۔

وَّ بِدَارًا اس کا معنی ان کا جلدی بڑا ہونا ہے۔ وہ حالت بلوغ کو ہے۔ البدار، المبادرۃ یہ قتال اور مقاتلہ کی طرح ہے۔ اس کا اسرافاً پر عطف ہے اور اَنْ یَّكْبَرُوْا، بدار کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی جو تیری پرورش میں ہے اس کے مال کو غنیمت نہ سمجھ، کہ تو اسے کھائے اور کہے کہ میں اس کے بڑے ہونے کے لیے جلدی کر رہا ہوں، تاکہ دانا نہ ہو جائے اور اپنا مال لے نہ لے۔ یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: جو یتیموں کے مال

سے ان کے سرپرستوں کے لیے حلال ہے۔ غنی کو حکم دیا کہ وہ یتیم کے مال کے استعمال سے رک جائے اور فقیر وصی کے لیے مباح قرار دیا کہ وہ معروف طریقہ سے اس کے مال سے کھا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے: عف الرجل عن الشیٔ، واستعف جب کوئی کسی چیز سے رک جائے۔ الاستعفاف عن الشیٔ کا مطلب ہے چیز کو ترک کر دینا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (نور:33) (اور چاہیے کہ پاک دامن بنے رہیں وہ لوگ جو نہیں کر پاتے شادی کرنے کی قدرت) العفة کا معنی ہے جو چیز حلال نہیں ہے اس سے رک جانا اور جس کا کرنا واجب نہیں اس سے رک جانا۔ ابو داؤد نے حسین المعلم عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ کی سند سے روایت فرمایا ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میں فقیر ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میرے پاس ایک یتیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے یتیم کے مال سے کھا جب کہ تو اسراف کرنے والا نہ ہو، فضول خرچی کرنے والا نہ ہو اور مال کو جمع کرنے والا نہ ہو۔(1)

مسئلہ نمبر 13۔ علماء کا اختلاف ہے کہ مخاطب کون ہے اور اس آیت سے مراد کیا ہے؟ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کے تحت مروی ہے فرمایا: یہ یتیم کے اس ولی کے بارے نازل ہوئی جو اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے جب وہ محتاج ہو تو اس کے لیے یتیم کے مال سے کھانا جائز ہے۔ ایک روایت میں ہے: اس کے مال کی مقدار معروف طریقہ سے کھانا جائز ہے۔

بعض نے فرمایا: اس سے مراد یتیم ہے اگر وہ غنی ہو تو ولی پر وسعت کا مظاہرہ کرے اور اس کے مال سے اجتناب کرے اگر وہ فقیر ہو تو ولی پر اپنے مال کی مقدار اس پر خرچ کرے۔ یہ ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا قول ہے۔ پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح ہے کیونکہ یتیم اپنے مال میں اپنی صغرسنی اور سفاہت کی وجہ سے تصرف کرنے کے ساتھ مخاطب نہیں ہوتا واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 14۔ معروف طریقہ سے کھانے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ ایک قوم نے کہا: وہ یتیم کے مال سے قرض لے جب اسے ضرورت ہو پھر جب خوشحال ہو تو ادا کر دے۔ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن عباس، حضرت عبیدہ، حضرت ابن جبیر، شعبی، ابو العالیہ اور اوزاعی کا قول ہے اور اپنی حاجت سے زیادہ یتیم کے مال سے قرض نہ لے۔ حضرت عمر نے فرمایا: خبردار میں نے بیت المال سے اپنا معاملہ اس طرح کیا ہے جس طرح ولی کا معاملہ یتیم کے مال سے ہوتا ہے۔ اگر میں غنی ہوں گا تو میں اس مال سے پرہیز کروں گا اگر فقیر ہوں گا تو معروف طریقہ سے کھاؤں گا پھر جب خوشحال ہوں گا تو وہ مال واپس کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے عاصم سے انہوں نے ابو العالیہ سے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کے متعلق روایت کیا ہے کہ وہ قرض لے کر کھائے۔ پھر بطور دلیل یہ آیت پڑھی فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ۔

دوسرا قول: ابراہیم، عطا، حسن بصری، نخعی اور قتادہ سے مروی ہے کہ فقیر وصی نے جو معروف طریقہ سے کھایا اس کی اس پر قضا نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ یہی فقہاء کا نظریہ ہے۔ حسن نے فرمایا: یہ اللہ کی طرف سے وصی کے لیے کھانا ہے وہ اتنا کھائے جو اس کی بھوک کو مٹا دے اور اتنا کپڑا پہنے جو اس کی شرمگاہ کو ڈھانپ دے، روئی کے اعلیٰ کپڑے اور لباس نہ پہنے۔

1۔ ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فیما لولی الیتیم ان ینال من مال الیتیم، حدیث نمبر 2488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس قول کی صحت پر دلیل اجماع امت ہے کہ امام جو مسلمانوں کا نگران ہوتا ہے جو وہ بیت المال سے کھاتا ہے وہ اس پر بطور قرض واجب نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مال میں اس کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ پس حضرت عمر کے قول میں پہلے قول والوں کے لیے حجت نہیں ہے کہ ''جب میں خوشحال ہوں گا تو ادا کر دوں گا'' اگرچہ صحیح بھی ہو۔ حضرت ابن عباس، ابو العالیہ اور شعبی سے مروی ہے کہ معروف طریقہ سے کھانا سے مراد مویشیوں کے دودھ سے نفع حاصل کرنے، غلاموں سے خدمت لینے اور سواریوں پر سوار ہونے کی طرح ہے جبکہ اصل مال کو نقصان نہ ہو جس طرح خارش زدہ اونٹ کو تارکول لگاتا ہے، گمشدہ چیز کا اعلان کرتا ہے، حوض کی لپائی کرتا ہے اور کھجوریں توڑتا ہے۔ رہے اموال کے اعیان اور اصول تو ان کا لینا وصی کے لیے جائز نہیں۔ یہ تمام فقہاء کے قول سے نکالا گیا ہے۔ وہ اپنے عمل کی اجرت کی مقدار لے لے۔ ایک طائفہ نے یہ کہا ہے اور یہی معروف ہے، اس پر قضا نہیں ہے، لیکن اس سے زائد لینا حرام ہے۔ حسن بن صالح بن حی، (اس کو ابن حبان کہا جاتا ہے) نے باپ اور حاکم کے وصی کے درمیان فرق کیا ہے، باپ کے وصی کے لیے معروف طریقہ سے کھانا جائز ہے اور رہا حاکم کا وصی تو اس کے لیے مال لینا کسی صورت میں جائز نہیں۔ یہ تیسرا قول ہے اور چوتھا قول مجاہد سے مروی ہے۔ فرمایا: نہ وہ قرض لے اور نہ کسی اور اعتبار سے لے۔ مجاہد کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے)

اور یہ تجارت نہیں ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: اس آیت میں رخصت اس ارشاد سے منسوخ ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا (بے شک جو لوگ کھاتے ہیں یتیموں کا مال ظلماً) بشر بن الولید نے امام ابو یوسف سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری رضامندی سے)

پانچواں قول یہ ہے کہ حضر اور سفر کے درمیان فرق ہے پس جب مقیم ہو تو ممنوع ہے اور جب اس کی وجہ سے سفر کرنے کا محتاج ہو تو جتنی ضرورت ہے اتنا لے لے اور کوئی چیز جمع نہ کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے۔

چھٹا قول: ابو قلابہ نے کہا: غلہ میں سے جو چنے اس میں سے معروف طریقہ سے کھائے۔ رہا سونا، چاندی تو اس سے قرض لینا اور کسی اور اعتبار سے لینا جائز نہیں ہے۔ ساتواں قول عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَ مَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ جب محتاج اور مجبور ہو تو معروف طریقہ سے کھائے۔ شعبی نے کہا: جب ایسی کیفیت میں کہ وہ خون اور خنزیر کے گوشت کے قائم مقام ہو تو اس سے لے سکتا ہے اور اگر وہ اپنا مال پائے تو پھر اسے پورا کر دے۔ نحاس نے کہا: اس کا کوئی معنی نہیں، کیونکہ جب انسان ایسی اضطراری کیفیت میں ہو تو اس کے لیے یتیم اور کسی دوسرے کے مال سے لینا، خواہ وہ قریبی ہو یا دور ہو جائز ہے۔ حضرت ابن عباس اور نخعی نے یہ فرمایا ہے کہ اپنے مال سے وصی معروف طریقہ سے کھائے تاکہ

یتیم کے مال کی ضرورت ہی نہ رہے اور غنی اپنی غنا کی وجہ سے پرہیز کرے اور فقیر اپنے نفس پر کنجوسی کرے تا کہ یتیم کے مال کی ضرورت نہ رہے۔ نحاس نے کہا: اس آیت کی تفسیر میں جو مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے، کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں بغیر کسی قطعی حجت کے ان میں کسی چیز کا استعمال جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں: اس قول کو الکیا طبری نے احکام القرآن میں پسند فرمایا ہے اور فرمایا: بعض سلف نے اس آیت کے حکم میں یہ وہم کیا ہے کہ وصی کے لیے بچے کے مال سے اتنی مقدار میں کھانا جائز ہے جو اسراف کی حد کو نہ پہنچے اور یہ جو اللہ تعالیٰ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے) کا حکم فرمایا ہے اس کے خلاف ہے۔ یہ یتیم کے مال میں ثابت نہیں ہوتا اور وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ کا ارشاد اپنے مال کے کھانے کی طرف راجع ہے نہ کہ یتیم کے مال کے کھانے کی طرف راجع ہے۔ پس اس کا معنی ہے یتیم کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ نہ کھاؤ بلکہ اپنے اموال کے کھانے پر اکتفا کرو اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ (نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے) پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ظاہر ہو گیا کہ تھوڑی خوراک پر اکتفا کرے تا کہ وہ یتیم کا مال کھانے کا محتاج ہی نہ ہو۔ یہ آیت کا مکمل معنی ہے۔ ہم بہت سی ایسی محکم آیات پڑھتے ہیں جن میں غیر کا مال اس کی رضا کے بغیر کھانے سے منع فرمایا ہے خصوصاً یتیم کے حق میں۔ یہ آیت کئی معانی کا احتمال رکھتی ہے۔ پس محکم آیات کے موجب پر اس کو محمول کرنا متعین ہے۔ اگر سلف کے مذہب کی تائید کرنے والا کہے کہ قضاۃ، مسلمانوں کے لیے کام کرنے کی وجہ سے تنخواہیں لیتے ہیں تو پھر وصی جو یتیم کے لیے کام کرتا ہے وہ اپنے عمل کی مقدار اجرت کیوں نہ لے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سلف میں سے کسی نے وصی کے لیے بچے کے مال سے لینا جائز قرار نہیں دیا جبکہ وصی غنی ہو جبکہ قاضی کا حکم اس سے مختلف ہے پس دونوں مسئلوں میں فرق ہے وہ مال جو فقہاء، قضاۃ اور وہ خلفاء لیتے ہیں جو اسلام کے امور چلاتے ہیں ان کے لیے تیرا مال متعین نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ مال مختلف اوصاف کے مالک مختلف لوگوں کے لیے مقرر فرمایا ہے اور قضاۃ بھی ان اصناف میں سے ہیں اور وصی اپنے عمل کی وجہ سے شخص معین کے مال سے اس کی رضا کے بغیر لیتا ہے، اس کا عمل مجہول ہے اور اس کی اجرت بھی مجہول ہے اور یہ استحقاق سے بعید ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے شیخ امام ابو العباس فرماتے تھے کہ اگر یتیم کا مال اتنا زیادہ ہو کہ اس کی بہت زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی کہ ولی اپنی حاجات اور مہمات سے بھی غافل ہو جائے تو اس میں ولی اپنے عمل کی اجرت مقرر کر لے اور اگر یتیم کا مال تھوڑا ہو وصی کو اپنی حاجات سے غافل نہ کرتا ہو تو وصی اس کے مال سے کچھ نہ کھائے مگر اس کے لیے تھوڑا دودھ پینا، تھوڑا سا کھانا اور گھی کھانا مستحب ہے یہ اس کے مال کو نقصان پہنچانے والا اور زیادہ لینے والا نہ ہو بلکہ اتنا مال لے جتنا کہ عادۃً کھانا یا لینا جائز و معاف ہوتا ہے۔ ہمارے شیخ نے فرمایا: جو میں نے اجرت کا ذکر کیا ہے اور تھوڑی سی کھجور اور دودھ لینے کا ذکر کیا ہے یہ تمام معروف میں آجاتا ہے آیت کو اس پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: بچے کے مال سے اجتناب کرنا افضل ہے انشاء اللہ تعالیٰ اور قاضی مال تقسیم کرنے والا جو لیتا ہے اور اسے رسم کا نام دیتا ہے اور اس کے حواری جو لوٹ مار عوام سے کرتے ہیں میں اس کے حلال ہونے اور جواز کی کوئی صورت نہیں جانتا یہ لینے والے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم میں داخل ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ)

مسئلہ نمبر 15۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ اللہ تعالیٰ نے مال کی حفاظت کرنے اور لغزش کرنے پر تنبیہ کرنے کے لیے گواہ بنانے کا حکم دیا ہے اور بعض علماء کے نزدیک گواہ بنانا مستحب ہے۔ بے شک قول وصی کا معتبر ہے کیونکہ وہ امین ہے اور ایک جماعت کے نزدیک گواہ بنانا فرض ہے یہی آیت کا ظاہر ہے۔ وہ امین نہیں ہے کہ اس کا قول قبول ہو جیسا کہ وکیل ہے جب وہ کہے کہ جو اسے دیا گیا ہے وہ اس نے واپس کر دیا ہے یا مودع کو واپس کر دیا ہے۔ وہ باپ کے لیے امین ہے جب باپ نے اسے امین بنایا تھا تو غیر پر اس کا قول قبول کرنا نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وکیل اگر دعویٰ کرے کہ اس نے زید کو وہ دے دیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا تو اس کا قول بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح وصی کا حکم ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور ابن جبیر کا خیال ہے کہ یہ گواہی اس پر ہو گی جو وصی حالت یسر میں وہ مال واپس کرے گا جو اس نے حالت فقر میں یتیم کے مال سے قرض لے لیا تھا۔ عبیدہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کی ادائیگی کے وجوب پر دلیل ہے جو یتیم کے مال سے کھائے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم قرضہ لو یا تم کھاؤ تو واپسی کے وقت گواہ بنالو۔ صحیح یہ ہے کہ لفظ اس صورت کو اور اس کے علاوہ صورت کو عام ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جب تم اس یتیم پر خرچ کرو تو گواہ بنالو حتی کہ اگر اختلاف واقع ہو تو دلیل قائم کر سکے تمام مال جو امانت کے اعتبار سے گواہیوں کے ذریعہ قبضہ کیا جائے تو وہ اس سے بری نہ ہو گا مگر دیتے وقت گواہی قائم کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاَشْهِدُوْا۔ جب کسی نے بغیر گواہی کے مال پر قبضہ کیا ہو تو اسے واپس کرتے وقت بغیر گواہی کے بھی واپس کر سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ جس طرح وصی اور کفیل پر یتیم کے مال کی حفاظت اور اس کے لیے اس میں زیادتی کرنا لازم ہوتی ہے اسی طرح وصی پر بچے کے بدن کی حفاظت کرنا بھی لازم ہوتا ہے مال کی حفاظت تو اس کو محفوظ کرنے کے ساتھ کرتا ہے اور بدن کی حفاظت اس کو ادب سکھانے کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری پرورش میں یتیم ہے کیا میں اس کے مال سے کھا سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جبکہ مال کو جمع کرنے والا نہ ہو اور اپنے مال کو یتیم کے مال کے ذریعے بچانے والا نہ ہو (1)۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اس کو سزا دے سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتنی سزا دے سکتا ہے جتنی تو اپنے بچے کو دیتا ہے ابن عربی نے کہا: اگرچہ یہ سنداً ثابت نہیں پھر بھی کسی کو اس حدیث سے مفر نہیں۔

مسئلہ نمبر 17۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے اور

1۔ سنن ابی داود، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی مال الیتیم ... الخ حدیث نمبر 2488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان کی جزا دینے والا ہے اس میں ہر حق سے انکار کرنے والے کے لیے وعید ہے۔ اس میں باء زائدہ ہے اور اور اسم جلالت محل رفع میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ہیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس ترکہ سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے''۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے امر کا ذکر کیا تو ساتھ ہی مواریث کا ذکر فرمایا۔ اور یہ آیت اوس بن ثابت انصاری کے بارے میں نازل ہوئی وہ فوت ہوا اور ایک بیوی چھوڑی جس کو ام کجہ کہا جاتا ہے اور اس عورت سے تین بیٹیاں چھوڑیں دو آدمی کھڑے ہوئے، وہ دونوں میت کے چچا کے بیٹے تھے اور اس کے وصی تھے ان کو سوید اور عرفجہ کہا جاتا ہے ان دونوں نے مال لے لیا اور اس کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو کچھ نہ دیا اور وہ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو وارث نہیں بناتے تھے اور نہ چھوٹے کو وارث بناتے تھے اگرچہ وہ مذکر بھی ہوتا وہ کہتے: میراث صرف اسے ملے گی جو گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر جنگ کرے گا اور نیزہ زنی کر سکتا ہوگا اور تلوار چلا سکتا ہوگا اور غنیمت جمع کر سکتا ہوگا۔ ام کجہ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلایا، تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اس کا بیٹا گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا، نہ تو وہ بوجھ اٹھا سکتا ہے اور نہ دشمن کو زخمی کر سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں واپس جاؤ حتیٰ کہ میں دیکھ لوں جو اللہ تعالیٰ میرے لیے ان کے بارے میں کوئی نیا حکم فرما دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی (1) اور ان کی جہالت کی وجہ سے جو تصرف اور قول تھا اسے باطل کر دیا، کیونکہ چھوٹے ورثا تو بڑوں کی نسبت مال کے زیادہ حق دار ہونے چاہیے تھے کیونکہ وہ تو نہ خود تصرف کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مصالح میں غور و فکر کر سکتے ہیں زمانہ جاہلیت کے لوگوں نے الٹ حکم جاری کیا ہوا تھا اور حکمت کو باطل کر دیا تھا اور اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے گمراہ ہو چکے تھے اور اپنی آراء اور تصرفات میں غلطی کی تھی (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے فرمایا اس آیت میں تین فوائد ہیں (۱) میراث کی علت کو بیان فرمایا، وہ قرابت ہے (۲) قرابت کا عموم جیسے بھی ہو قریبی ہو یا بعیدی ہو (۳) مقررہ حصہ کا اجمال۔ یہ حصہ آیت میراث میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں حکم کے لیے تمہید ہے اور اس فاسد رائے کا ابطال ہے حتیٰ کہ شافی بیان واقع ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ابوطلحہ نے جب اپنا مال (بیرحاء) صدقہ کیا اور اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو اپنے قریبی رشتہ دار فقراء میں دے دے، تو حضرت ابوطلحہ نے وہ باغ حضرت حسان

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 137 2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 328

اور حضرت ابی کو دے دیا۔ حضرت انس نے فرمایا: یہ دونوں حضرات ابوطلحہ کے مجھ سے زیادہ قریبی تھے۔ ابوداؤد نے کہا: مجھے محمد بن عبداللہ انصاری سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا ابوطلحہ انصاری کا سلسلہ نسب یہ تھا زید بن سہل بن الاسود بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار۔ اور حضرت حسان کا سلسلہ نسب یہ تھا حسان بن ثابت بن المنذر بن حرام۔ دونوں تیسرے دادا میں جمع ہوتے ہیں اور وہ حرام ہے اور ابی بن کعب کا سلسلہ نسب یہ تھا ابی بن کعب بن قیس بن عبید بن زید بن معاویہ بن عمرو بن مالک بن النجار۔

انصاری نے کہا: ابوطلحہ اور ابی بن کعب کے درمیان چھ آباء تھے۔ فرمایا: عمرو بن مالک، حسان اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو جمع کرتا ہے ابوعمر نے کہا: اس میں ایسی چیز ہے جو قرابت کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس دوری میں بھی ہوتی ہے اور جو اس سے کم ہو وہ تو زیادہ اس لائق ہے کہ اسم القرابۃ اسے لاحق ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کے لیے میراث میں حصہ ثابت کیا ہے اور یہ نہیں بیان فرمایا کہ وہ کتنا ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوید اور عرفجہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اس کے مال سے کچھ بھی جدا نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کے لیے بھی حصہ مقرر فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ وہ حصہ کتنا ہے حتی کہ میں دیکھ لوں جو اللہ تعالیٰ نازل فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَاۗءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَھَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّھُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَھُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَھُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَھُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ پھر ان دونوں کو پیغام بھیجا کہ ام کجہ کو اس کے ترکہ سے آٹھواں حصہ دو اور بیٹیوں کو دو ثلث۔ اور باقی مال تمہارا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء نے اس آیت سے فرائض پر متروک مال کی تقسیم پر استدلال کیا ہے جب کہ اس میں اس کی حالت کی تبدیلی کرنا بھی ہو جیسے حمام، کمرہ، زیتون کا کھلوان اور وہ گھر جس میں حصہ داروں کے اقرار کے ساتھ منافع باطل ہوتے ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: متروکہ مال تقسیم کیا جائے گا اگرچہ کسی کے حصہ میں اتنا مال آئے جس سے نفع حاصل نہ کیا جا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 397

سکتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا یہ ابن کنانہ کا قول ہے اور یہی امام شافعی نے کہا ہے اور امام ابوحنیفہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: چھوٹا سا گھر دو آدمیوں میں مشترک ہو ایک تقسیم طلب کرے اور دوسرا انکار کرے تو اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ ابن ابی لیلیٰ نے کہا: اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہو جو اپنے حصہ سے نفع نہ اٹھا سکتا ہو تو تقسیم نہیں کی جائے گی ہر وہ تقسیم جس میں کسی ایک پر نقصان وارد ہو تو مال تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ دونوں قول میں اصح قول ہے۔ ابن القاسم نے یہ مالک سے روایت کیا ہے جو ابن عربی نے ذکر کیا ہے ابن القاسم نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تقسیم نہیں ہوتی مثلاً گھر، منازل، حمامات اور اس کی تقسیم میں ضرر ہو اور جب تقسیم کیا جائے تو اس سے نفع حاصل نہ ہو تو اسے بیچا جائے اور اس میں شفعہ نہ ہوگا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شفعہ اس چیز میں ہے جس کو تقسیم نہ کیا گیا ہو جب حدود واقع ہوں تو شفعہ نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ اس چیز میں ثابت فرمایا جس میں حدود واقع کرنا ممکن ہو اور شفعہ کو غیر منقسم چیز میں معلق فرمایا ان چیزوں میں سے جن میں حدود کا واقع کرنا ممکن ہو۔ یہ حدیث کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو دار قطنی نے ابن جریج کی حدیث سے نقل کی ہے فرمایا: مجھے صدیق بن موسیٰ نے خبر دی انہوں نے محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ورثاء پر تقسیم نہ ہوگا مگر وہ مال جو تقسیم کا احتمال رکھتا ہو''۔ ابوعبید نے کہا: یہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص مر جائے اور کوئی ایسی چیز چھوڑ جائے کہ اگر اسے ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے تو اس میں تمام ورثاء یا بعض ورثاء کو نقصان ہوتا ہو۔ فرمایا: اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا جیسے جوہرہ، حمام، چادر اور اس کی مثل چیزیں (دار قطنی کی حدیث کے متن میں التعضیة لفظ استعمال ہوا ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی شرح میں لکھا ہے) التعضیة کا معنی ہے جدا جدا کرنا۔ کہا جاتا ہے: عضیت الشیٔ جب کسی چیز کو جدا جدا کیا جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝ (الحجر) (جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا غَيْرَ مُضَاۗرٍّ تو اللہ تعالیٰ نے نقصان دینے کی نفی فرمائی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار۔ (نہ ابتداءً کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ بدلے میں نقصان پہنچائے)

نیز آیت کریمہ میں تقسیم کے متعلق کوئی ذکر نہیں یہ صرف چھوٹے اور بڑے کے لیے حصہ کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اور یہ زمانہ جاہلیت کے رواج کا رد کرتی ہے۔ فرمایا: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ، وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ (یعنی مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے) یہ بالکل ظاہر ہے اور اس حصہ کی مقدار دوسری دلیل سے ماخوذ ہے۔ وارث کہے کہ میرے لیے حصہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، پس تم مجھے اس مال سے حصہ دو۔ اسے اس کا شریک کہے: خاص طور پر تجھے دینا تو ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ میرے اور تیرے درمیان ضرر اور نقصان کا باعث ہوگا، کیونکہ اس طرح مال خراب ہو جائے گا، اس کی ہیئت بدل جائے گی اور اس کی قیمت کم ہو جائے گی پس ترجیح واقع ہوگی۔ اور اظہر یہ ہے کہ اس صورت میں تقسیم نہیں کرنی چاہیے جس میں منفعت باطل ہو جائے اور مال کم ہو جائے جیسا کہ ہم نے دلیل ذکر کی ہے۔ واللہ الموفق

فراء نے کہا: نَصِيبًا مَّفْرُوضًا یہ تیرے اس قول کی طرح ہے قسماً واجباً وحقا لازماً۔ یہ اسم مصدر کے معنی میں ہے اسی وجہ سے منصوب ہے۔ زجاج نے کہا: حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی ان کے لیے حصے فرضی حالت میں ہیں۔ اخفش نے کہا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حصہ مقرر فرمایا ہے۔ مفروض کا مطلب ہے واجب مقدر۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

"اور جب حاضر ہوں (ورثہ کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم بچے اور مسکین تو دو انہیں بھی اس سے اور کہو ان سے اچھی بات"۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو میراث میں کسی چیز کا مستحق نہیں ہے اور ورثہ کی تقسیم کے وقت حاضر ہوا اور وہ قریبی رشتہ داروں سے ہو یا یتامیٰ اور فقراء سے ہو جو وارث نہیں ہیں تو ان کو احترام دو اور انہیں محروم نہ کرو اگر مال زیادہ ہو اور اگر مال زمین ہو یا اتنا تھوڑا ہو کہ تھوڑی سی بخشش کو بھی قبول نہ کرتا ہو تو ان سے معذرت کرنی چاہیے۔ اگر تھوڑا مال دے دیا جائے تو اس میں بہت بڑا اجر ہے۔ ایک درہم، ایک لاکھ سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔ اس قول کے مطابق یہ آیت محکم ہے یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ تابعین کی ایک جماعت نے اس کی پیروی کی ہے مثلاً عروہ بن زبیر وغیرہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بھی اس کا حکم دیا ہے اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا ہے يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے)

سعید بن مسیب نے فرمایا: آیت میراث اور وصیت نے اس آیت کو منسوخ کیا ہے۔ جن علماء نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے وہ ابو مالک، عکرمہ اور ضحاک ہیں اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ آیت ورثاء کے حصص کے استحقاق کو بیان کرتی ہے اور مشارکت کا استحباب اس کے لیے ہے جو حاضر ہوا ہے اور اس کا حصہ نہ ہو۔ ابن جبیر نے کہا: لوگوں نے اس آیت کو ضائع کر دیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: لیکن لوگوں نے بخل کیا ہے(1)۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ الخ کے تحت مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے فرمایا: لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے اللہ کی قسم یہ منسوخ نہیں ہے لیکن لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں سستی کی ہے۔ والی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو وارث ہوتا ہے یہ وہ ہوتا ہے جو عطا کرتا ہے اور دوسرا والی وہ ہوتا ہے جو وارث نہیں ہوتا وہ وہ ہے جو اچھی بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں تجھے عطا کرنے کا مالک نہیں ہوں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ میراث تقسیم کرتے وقت رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا مظاہرہ کریں۔ یتامیٰ اور مساکین سے صلہ رحمی کریں (اگر) وصیت میں سے ہو۔ اور اگر وصیت نہ ہو تو میراث میں سے ان کو کچھ دو۔ نحاس نے کہا: یہ بہتر ہے جو کچھ اس آیت کے بارے میں کہا گیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 12

ہے یہ بطور استحباب اور خیر کے فعل کی ترغیب اور اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کے لیے ہے۔ ایک گروہ نے کہا: یہ تھوڑا سا دینا فرض کی حیثیت سے واجب ہے ورثاء اصناف کو عطا کریں جب کہ اس پر ان کے نفوس خوش ہوں جیسے چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزیں، پرانے کپڑے اور جو ہلکی پھلکی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس قول کو ابن عطیہ اور قشیری نے روایت کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ بطور استحباب ہے، کیونکہ اگر یہ فرض ہوتا تو ترکہ میں استحقاق ہوتا اور میراث میں اشتراک ہوتا۔ ایک جہت کے لیے معلوم ہے اور دوسری کے لیے مجہول ہے اور یہ حکمت کے منافی ہے اور یہ جھگڑے اور قطع تعلقی کا سبب ہے۔ ایک فرقہ کا خیال ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو وصیت کے مطابق مال تقسیم کرتے ہیں۔ ورثاء مخاطب نہیں ہیں۔ حضرت ابن عباس، سعید بن مسیب اور ابن زید سے مروی ہے کہ جب مریض وصایا کے ذریعے مال تقسیم کرے اور وہ لوگ حاضر ہوں جو وارث نہیں ہیں تو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ انہیں محروم نہ کرے۔ یہ حکم اس وقت نازل ہوا تھا جب وصیت واجب تھی اور آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی۔ صحیح پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب وارث اتنا چھوٹا ہو کہ اپنے مال میں تصرف نہ کر سکتا ہو تو ایک گروہ نے فرمایا: چھوٹے وارث کا ولی مجور کے مال سے اتنی مقدار موجود لوگوں کو دے جو مناسب سمجھے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: وہ انہیں نہ عطا کرے بلکہ انہیں کہے کہ اس مال میں سے میرے لیے کچھ نہیں ہے یہ یتیم کا مال ہے جب یہ بالغ ہو گا تو میں اسے تمہارا حق بتا دوں گا۔ یہ معروف قول ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب میت نے اس کے لیے کسی چیز کی وصیت نہ کی ہو اگر اس نے اسے وصی بنایا ہو تو وصیت کے مطابق تصرف کرے۔ عبیدہ اور محمد بن سیرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں رزق سے مراد یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائیں اور ان دونوں حضرات نے ایسا کیا تھا ترکہ میں سے ایک بکری ذبح کی تھی۔ عبیدہ نے کہا: یہ آیت اگر نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے تھا۔ قتادہ نے یحییٰ بن یعمر سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیات محکم ہیں لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے ایک یہ آیت، آیت استیذان، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (نور: 58) اور یہ آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (حجرات: 13)

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِّنْهُ ضمیر قسمت کے معنی کی طرف راجع ہے کیونکہ یہ مال اور میراث کے معنی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ (یوسف: 76) اس آیت میں ھا ضمیر ذکر کی گئی ہے اور اس سے مراد سقایۃ ہے کیونکہ الصواع مذکر ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینہ وبین اللہ حجاب (1)۔ دعوۃ کی طرف مذکر ضمیر لوٹائی دعا کے معنی کی بنا پر۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سوید بن طارق جعفی کو کہا تھا، جب اس نے شراب کے متعلق پوچھا تھا۔ انہ لیس بدواء ولکنہ داء۔ شراب کے معنی کی بنا پر مذکر ضمیر لوٹائی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے: قاسمہ المال وتقاسماہ واقتسماہ اور اسم القسمۃ مونث ہے۔ اور القسم قسمت الشئ فانقسم کا مصدر ہے اسم ظرف مقسم ہے جیسے مجلس، تقسمھم الدھر فتقسموا یعنی زمانہ نے انہیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم، حدیث نمبر 2268، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جدا جدا کیا تو وہ جدا جدا ہو گئے۔ التقسیم سے مراد التفریق ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا سعید بن جبیر نے کہا: انہیں کہا جائے کہ لے لو تمہارے لیے برکت ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں دینے کے ساتھ کہو کہ میں پسند کرتا تھا کہ اگر اس سے زیادہ ہوتا (تو میں تجھے زیادہ دیتا) بعض علماء نے فرمایا: ان کو دینے کے ساتھ عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہاں اگر انہیں کچھ نہ دے تو کم از کم اچھی کلام کرے اور ایک قسم کا عذر پیش کرے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝

''اور چاہیے کہ ڈریں جو (یتیموں کے سرپرست ہیں اور سوچیں) کہ اگر چھوڑ جاتے وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے تو وہ کتنے فکر مند ہوتے ان کے متعلق پس چاہیے کہ وہ ڈریں اللہ سے اور کہیں ایسی بات جو بالکل درست ہو''۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْيَخْشَ، لیخش سے الف حذف کیا گیا ہے لام امر کی وجہ سے، جزم ہونے کی وجہ سے اور سیبویہ کے نزدیک لام امر کا اضمار حروف جر پر قیاس کرتے ہوئے جائز نہیں مگر ضرورت شعری کے لیے جائز ہے اور کوفیوں نے جزم کے ساتھ لام کے حذف کو جائز قرار دیا ہے اور تمام نے یہ شعر پڑھا ہے:

محمدُ تَفْدِ نفسَك كلُّ نفس إذا ما خِفْتَ مِنْ شیٔ تَبَالا

اے پیارے محمد! ہر نفس کو تیری ذات پر فدا ہونا چاہیے جب آپ کسی چیز سے اندیشہ محسوس کریں۔

اس شعر میں تفد سے مراد لتفد لیا ہے۔ اور یخش کا مفعول، دلالت کلام کی وجہ سے محذوف ہے اور خافوا، لو کا جواب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لو ترکوا لخافوا، لو کے جواب میں لام کا حذف جائز ہے اور اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ اوصیاء کے لیے وعظ ہے یعنی تم یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد کے ساتھ تمہارے بعد کیا جائے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اور ایک طائفہ نے کہا: اس سے مراد تمام لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یتیموں اور لوگوں کی اولاد کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا ہے۔ اس وجہ سے شیبانی نے حکایت کیا ہے کہ ہم قسطنطنیہ پر مسلمہ بن عبدالملک کے لشکر میں تھے ہم ایک دن اہل علم کی ایک جماعت میں بیٹھے تھے ان میں ابن الدیلمی بھی تھے آخری زمانہ کی ہولناکیوں کا ذکر ہوا میں نے ابن الدیلمی سے کہا: اے ابو بشر! میری خواہش ہے کہ میری اولاد نہ ہو، اس نے مجھے کہا: یہ تیرے ذمہ نہیں ہے جس شخص سے جس روح کے پیدا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما رکھا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی خواہ وہ پسند کرے یا ناپسند کرے۔ لیکن اگر تو ان پر امن کا خواہش مند ہے تو دوسروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ایک

روایت میں ہے انہوں نے فرمایا: کیا میں تیری ایسے امر پر دلالت نہ کروں کہ تو اگر اس سے دو چار ہو گا تو اللہ تعالیٰ تجھے اس سے نجات عطا فرمائے گا اور اگر تو اپنے بعد اولاد چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے ان کی حفاظت فرمائے گا؟ میں نے کہا: ضرور بتائیے، تو انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا...... الخ (1)۔

میں کہتا ہوں: یہی معنی محمد بن کعب القرظی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: ''جو اچھا صدقہ کرے گا وہ پل صراط سے گزر جائے گا اور جو کسی بیوہ کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے باقی ماندہ لوگوں کے لیے بہتر خلیفہ بنا دے گا'' (2)۔ تیسرا قول وہ ہے جو اکثر مفسرین کا ہے یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس پر موت آتی ہے تو وہ اپنی وصیت کے وقت پاس موجود آدمی کو کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تجھے اولاد عطا فرمائے گا تو اپنے لیے اس کا خیال رکھنا، اپنے مال کی اللہ کے راستہ میں وصیت کر اور صدقہ کر اور غلام آزاد کر حتی کہ وہ اپنے عام مال پر پہنچ جاتا ہے یا اس کو وصیت کے ساتھ گھیر لیتا ہے پھر وہ اپنے ورثاء کو نقصان پہنچاتا ہے پس انہیں اس سے منع کیا گیا گویا یہ آیت انہیں کہہ رہی ہے کہ جس طرح تم اپنے ورثاء اور اپنی اولاد کے بارے میں اپنے بعد خوف کرتے ہو اسی طرح اپنے غیر کے ورثاء پر خوف کرو اسے مال میں فضول خرچی پر نہ ابھارو۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ، سدی، ابن جبیر، ضحاک اور مجاہد کا قول ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب آدمی وصیت کے وقت حاضر ہو تو اسے یہ کہنا مناسب نہیں کہ وہ مرنے والے کو کہے کہ تو اپنے مال کی وصیت کر اللہ تعالیٰ تیری اولاد کا رازق ہے لیکن وہ یہ کہے کہ تو اپنے نفس کے لیے نیک اعمال آگے بھیج اور اپنی اولاد کے لیے (کچھ) چھوڑ۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ سے یہی مراد ہے۔ مقسم اور حضرمی نے کہا: یہ آیت اس کے برعکس میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والے کے قریب موجود شخص اسے کہے کہ اپنے ورثاء کے لیے مال محفوظ کر لے اور اپنے بچوں کے لیے باقی رکھ کوئی دوسرا تیرے مال کا تیری اولاد سے زیادہ حق دار نہیں ہے اور وہ اسے وصیت سے منع کرے پس اس سے قریبی رشتہ داروں اور ہر شخص کو نقصان ہو گا جس کے لیے وصیت کرنے کا حق ہے انہیں کہا گیا کہ جس طرح تم اپنی اولاد کے متعلق خوف کھاتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ان سے اچھا سلوک ہو۔ پس اسی طرح مساکین، یتامیٰ کی جہت سے بھی اچھی بات کرو اور ان کو نقصان پہنچانے میں اللہ سے ڈرو۔ یہ دونوں قول آیت میراث کے نزول سے پہلے وصیت کے وجوب کے وقت پر مبنی ہیں یہ سعید بن جبیر اور ابن مسیب سے مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ دونوں قول تمام لوگوں میں عام نہیں ہیں بلکہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک صنف کے لیے ایک قول بہتر ہے اور دوسری صنف کے لیے دوسرا قول بہتر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی جب ایسے ورثاء چھوڑ جائے جو خود کفیل ہوں، غنی ہوں تو پھر اسے وصیت کی طرف بلانا چاہیے اور اپنے لیے آگے بھیجنے پر ابھارنا چاہیے اور جب ایسے ورثاء چھوڑے جو ضعیف اور کمزور ہوں اور مفلس ہوں تو ان کے لیے مال چھوڑنے اور احتیاط کرنے کی طرف بلانا بہتر ہے، کیونکہ اس ارادہ میں بھی اس کا اجر مساکین کو مال دینے کی اجر کی طرح ہے اور رعایت کا دارومدار ضعف اور کمزوری ہے پس اس کے ساتھ میلان واجب ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 452 2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 220

میں کہتا ہوں: یہ تفصیل صحیح ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کو فرمایا تھا: ''تو اپنے ورثاء کو غنی چھوڑے تو یہ انہیں غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں'' (2)۔ اگر انسان کی اولاد نہ ہو یا وہ غنی اور خود کفیل ہو اور اس کا مال اس کے باپ کی طرف سے ہو اور اس پر اسے امن ہے تو اس وقت انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو آخرت کے ذخیرہ کے لیے آگے بھیجے تاکہ اس کے بعد اس کی اولاد اس کے بعد برے کاموں میں خرچ نہ کرے اور پھر وہ اس پر بوجھ ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا، السدید کا معنی ہے عدل پر مبنی اور درست قول۔ یعنی مریض کو حکم دو کہ وہ اپنے مال سے واجبی حقوق ادا کرے پھر اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے اتنی مقدار وصیت کرے جس کی وجہ سے چھوٹے ورثاء کو نقصان نہ پہنچے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے میت کو عدل پر مبنی قول کہو، وہ یہ ہے کہ اسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرے اور اسے اس کے پڑھنے کا حکم نہ کرے۔ بلکہ آہستہ آہستہ خود پڑھے تاکہ وہ سن لے اور اسے تلقین کرے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے قریب المرگ لوگوں کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو اور آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ انہیں کلمہ پڑھنے کا حکم دو، کیونکہ اگر اس کا اسے حکم دیا گیا تو ہوسکتا ہے وہ غصہ میں آجائے اور اس کا انکار کر دے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یتیم ہے یعنی اسے نہ جھڑکو اور نہ اسے حقیر سمجھو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

''بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی آگ میں''۔

اس آیت میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا روایت ہے کہ یہ آیت غطفان کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس کو مرثد بن زید کہا جاتا تھا اور وہ اپنے بھتیجے کے مال کا والی تھا جو یتیم تھا اور چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کا مال کھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ مقاتل بن حیان نے کہا ہے۔ اسی وجہ سے جمہور علماء نے کہا: اس سے مراد اوصیاء ہیں جو یتیم کے مال سے وہ کھاتے ہیں جو ان کے لیے مباح نہیں ہے۔ ابن زید نے کہا: یہ ان کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو عورتوں اور بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے۔ ہر اعتبار سے مال لینے کو کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ مقصود کھانا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر اشیاء کو تلف کیا جاتا ہے۔ ذکر میں پیٹ کو خاص کیا ہے ان کے نقص کو بیان کرنے کے لیے اور مکارم اخلاق کی ضد کے ساتھ اس پر طعن و تشنیع کی ہے۔ مال اور انجام کے اعتبار سے کھائی گئی چیز کو آگ کہا گیا ہے (2) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا (یوسف: 36) اس آیت میں خمر سے مراد عنب (انگور) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: نارًا سے مراد حرامًا ہے کیونکہ حرام آگ کا سبب بنتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے حرام کو آگ کا نام دے دیا۔ حضرت

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1524
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 14

ابوسعید خدری سے مروی ہے فرمایا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معراج کی رات کے متعلق بتایا کہ میں نے ایک قوم دیکھی جن کے ہونٹ، اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے ان پر ایک ایسا فرشتہ متعین تھا جو ان کے ہونٹوں سے پکڑتا تھا پھر ان کے مونہوں میں آگ کی چٹا نیں ڈالتا تھا جو ان کے نیچے سے نکل جاتی تھیں، میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں (1)۔ کتاب وسنت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یتیم کا مال کھانا کبائر میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ ان سات چیزوں میں یتیم کا مال کھانے کا بھی ذکر فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ابن عامر اور عاصم نے حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں یاء کے ضمہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اصلاه الله حر النار اصلاء سے مشتق کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (مدثر) ابوحیوہ نے فعل کی کثرت کی وجہ سے تصلية سے مشتق کر کے یا کے ضمہ، صاد کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ (الحاقہ) (پھر اسے دوزخ میں جھونک دو)

اسی سے مشتق عربوں کا قول ہے صليته مرة بعد مرة و تصليت۔ آگ کے ساتھ گرمی چاہی۔ شاعر نے کہا:

وقد تَصَلَّيتُ حَرَّ حربهم كما تَصَلَّى المَقْرُورُ من قَرَسِ

باقی قراء نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اسے صلی النار، یصلاها، صلی وصلاءً سے مشتق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (اللیل) الصلاء کا معنی آگ کے قرب کی وجہ سے گرم ہونا ہے یا آگ لگنے سے گرم ہونا ہے۔ اسی سے حارث بن عباد کا قول ہے:

لم أكنْ من جُناتها عَلِمَ اللهُ وإنِّي لِحَرِّها اليومَ صَالِ

السعیر کا معنی بھڑ کنے والا انگارہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت، وعید کی آیات میں سے ہے۔ اس آیت میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے جو گناہوں کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بعض گنہگاروں پر نافذ ہوگا، پس وہ آگ میں داخل ہوں گے پھر جل جائیں گے اور مر جائیں گے۔ دوزخیوں کا حکم اس سے مختلف ہے وہ نہ مریں گے اور نہ زندہ ہوں گے (بلکہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے) گویا یہ کتاب وسنت کا جامع قول ہے تا کہ دونوں کے متعلق خبر مخبر کے خلاف واقع نہ ہو اور بعض سے اس کی مشیت سے عذاب ساقط ہونے والا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) یہی جواب ہوگا جو بھی اس مفہوم و معنی میں سے تم پر وارد ہوگا۔ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رہے دوزخی تو وہ اس طرح رہیں گے وہ نہ تو دوزخ میں مریں گے اور نہ زندہ رہیں گے لیکن کچھ لوگوں کو آگ ان کے گناہوں کے سبب لاحق ہوگی یا فرمایا: ان کی خطاؤں کے سب لاحق ہوگی پھر انہیں اللہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 454

تعالیٰ موت دے گا حتیٰ کہ وہ جب کوئلہ بن جائیں گے تو اذن شفاعت ہوگا پھر انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر وہ جنت کی نہروں پر پھیلا دیئے جائیں گے پھر ارشاد ہوگا اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگ آئیں گے جیسے دانہ سیلاب کی مٹی میں اگتا ہے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیہات میں بکریاں چراتے تھے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

''حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے۔ پھر اگر ہوں صرف لڑکیاں دو سے زائد تو ان کے لیے دو تہائی ہے جو میت نے چھوڑا اور اگر ہو ایک ہی لڑکی تو اس کے لیے نصف ہے اور میت کے ماں، باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس سے جو میت نے چھوڑا بشرطیکہ میت کی اولاد ہو اور اگر نہ ہو اس کی اولاد اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا تیسرا حصہ ہے (باقی سب باپ کا) اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے (اور یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو میت نے کی اور قرض ادا کرنے کے بعد۔ تمہارے

باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کون ان میں سے زیادہ قریب ہے تمہیں نفع پہنچانے میں؟ یہ حصے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جاننے والا ہے، بڑا دانا ہے۔ اور تمہارے لیے نصف ہے جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں بشرطیکہ نہ ہو ان کی اولاد اور اگر ہو ان کی اولاد تو تمہارے لیے چوتھائی ہے اس سے جو وہ چھوڑ جائیں (یہ تقسیم) اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہے جو وہ کر جائیں اور قرض ادا کرنے کے بعد اور تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے اس سے جو تم چھوڑو بشرطیکہ نہ ہو تمہاری اولاد اور اگر ہو تمہاری اولاد تو ان کا آٹھواں حصہ ہے اس سے جو تم پیچھے چھوڑ جاؤ (یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو تم نے کی ہو اور (تمہارا) قرض ادا کرنے کے بعد اور اگر ہو وہ شخص جس کی میراث تقسیم کی جانے والی ہے کلالہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ہر ایک کے لیے ان میں سے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب شریک ہیں تہائی میں (یہ تقسیم) وصیت پوری کرنے کے بعد ہے جو کی گئی ہے اور قرض ادا کرنے کے بعد بشرطیکہ اس سے نقصان نہ پہنچایا گیا ہو (یہ نظام وراثت) حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے، والا بڑا بردبار ہے۔ یہ حدیں اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا اسے اللہ تعالیٰ باغوں میں، بہتی ہوں گی جن کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تجاوز کرے گا اللہ کی (مقررہ) حدوں سے داخل کرے گا اسے اللہ آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا''۔

ان آیات میں پینتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ اس لیے پہلے لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ اور وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ میں جو اجمال تھا اس میں اس کا بیان ہے۔ پس یہ سوال کے وقت سے بیان کے تاخیر کے جواز کی دلیل ہے اور یہ آیت دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور احکام کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے امہات الآیات میں سے ایک ہے، کیونکہ فرائض عظیم القدر ہیں حتی کہ علم کا یہ تیسرا حصہ ہے (1) اور علم الفرائض کا نصف علم ہونا بھی مروی ہے۔ یہ پہلا علم ہے جو لوگوں سے چھین لیا جائے گا اور بھلا دیا جائے گا۔ دارقطنی نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرائض سیکھو اور یہ لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ یہ نصف علم ہے اور یہ پہلی چیز ہے جو بھلائی جائے گی اور یہ پہلی چیز ہے جو میری امت سے اٹھائی جائے گی (2)۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سیکھو اور یہ لوگوں کو سکھاؤ اور فرائض سیکھو اور لوگوں کو یہ سکھاؤ، علم حاصل کرو اور لوگوں کو علم سکھاؤ میں ایک ایسا شخص

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 328

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب الحث علی تعلیم الفرائض، حدیث نمبر 2709، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوں جس کی روح قبض کی جائے گی اور علم اٹھا لیا جائے گا اور فتن ظاہر ہوں گے حتیٰ کہ دو آدمی فریضہ (میراث کا مسئلہ) میں جھگڑیں گے تو کوئی ایسا شخص نہیں پائیں گے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لو کہ فرائض صحابہ کا عظیم علم تھا اور ان کی عظیم مباحث میں سے تھا لیکن لوگوں نے اس علم و ضائع کر دیا ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے فرمایا، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: جس نے فرائض، طلاق اور حج کا علم حاصل نہیں کیا وہ اہل دیہات پر فضیلت کیسے پائے گا۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: میں ربیعہ کو یہ کہتے ہوئے سنتا تھا کہ جس نے فرائض کا علم سیکھا قرآن نے جو فرائض کا بیان کیا ہے اس کے سیکھے بغیر تو وہ انہیں جلدی بھول جائے گا۔ امام مالک نے کہا: انہوں نے سچ کہا۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابوداؤد اور دارقطنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم صرف تین ہیں ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ فضیلت ہے (۱) محکم آیات (۲) سنت قائمہ (۳) فریضۃ عادلۃ (1)۔

خطابی ابوسلیمان نے کہا: محکم آیات سے مراد کتاب اللہ ہے۔ ان آیات میں احکام بیان ہوئے ہیں مگر قرآن کی جو آیات منسوخ ہیں ان پر عمل نہیں کیا جاتا اور صرف ناسخ پر عمل کیا جاتا ہے اور سنت قائمہ سے مراد سنت ثابتہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی سنن ثابتۃ میں سے مروی ہے اور فریضہ عادلۃ دو احتمال رکھتا ہے (۱) تقسیم میں عادل کا ہونا پس کتاب وسنت میں مذکورہ حصص میں عدل کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کتاب وسنت اور جو ان کے ہم معنی ہے ان سے مستنبط مسائل۔ پس یہ فریضۃ کتاب وسنت سے ماخوذ مسائل کے برابر ہوگا، کیونکہ وہ کتاب وسنت سے ماخوذ معنی میں نص ہوگا۔ عکرمہ سے مروی ہے فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا وہ ان سے ایک ایسی عورت کے متعلق مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے جس نے خاوند اور والدین چھوڑے تو حضرت زید بن ثابت نے کہا: خاوند کے لیے نصف ہوگا اور ماں کے لیے ماںقی کا تہائی ہوگا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: تم یہ مسئلہ کتاب اللہ میں پاتے ہو یا اپنی رائے سے بیان کر رہے ہو۔ حضرت زید نے کہا: میں اپنی رائے سے کہتا ہوں، میں ماں کو باپ پر فضیلت نہیں دیتا۔ ابوسلیمان نے کہا: یہ فریضۃ کے تعدیل کے باب سے ہے جب کہ اس فریضہ کے متعلق نص نہ ہو یہ انہوں نے منصوص علیہ کا اعتبار کیا ہے اور وہ یہ ارشاد ہے وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ وارث ہوں تو ماں کے لیے تہائی حصہ ہے جب ماں کا حصہ تہائی پایا گیا اور باقی مال وہ دو تہائی ہے وہ باپ کے لیے ہے، خاوند کو حصہ دینے کے بعد باقی مال سے بچے ہوئے نصف مال کو کل مال پر قیاس کیا جبکہ والدین کے ساتھ بیٹا یا ذوسھم (حصہ لینے والا) نہ ہو تو والدین کے درمیان وہ مال تین حصوں میں تقسیم ہوگا ایک حصہ ماں کے لیے اور دو حصے باپ کے لیے اور وہی باقی ہے، یہ تقسیم میں زیادہ عدل ہے بنسبت اس کے کہ باقی نصف میں سے تمام مال کا تہائی ماں کو دیا جائے اور ماںقی باپ کو دیا جائے جو چھٹا حصہ بنتا ہے۔ پس اس طرح ماں کو باپ پر فضیلت ہوگی، حالانکہ وہ مفضولہ ہے اصل میراث میں اور ماں کے لیے باپ کے حصہ سے زیادہ ملے گا، حالانکہ اصل میراث میں باپ مقدم اور مفضل ہے۔ اس میں زیادہ عدل ہے بنسبت اس کے جو

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب ما جاء فی تعلیم الفرائض، حدیث نمبر 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس کا نظریہ ہے کہ ماں کو کل مال سے تہائی ملے گا اور باپ کا حصہ چھٹے حصہ کی طرف لوٹا کر کم کرتے ہیں پس حضرت ابن عباس کا قول چھوڑ دیا گیا اور عام فقہاء نے حضرت زید کے قول کو اپنایا۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس نے خاوند اور والدین کے بارے میں کہا: خاوند کے لیے نصف ہے اور ماں کے لیے تمام مال کا ثلث 1/3 ہے اور باقی باپ کے لیے ہے۔ قاضی شریح، محمد بن سیرین، داؤد بن علی اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے۔

ان علماء میں سے ابوالحسن، محمد بن عبداللہ، فرضی مصری المعروف بابن اللبان نے دونوں مسئلوں میں یہی کہا ہے اور کہا انہوں نے کہ مسئلہ المشترکہ میں حضرت علی کا قول یہی ہے اور ایک مقام پر کہا: حضرت علی سے یہی مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت علی، حضرت زید، حضرت عبداللہ، تمام صحابہ اور عام علماء سے مشہور اور معروف وہی قول ہے جو امام مالک نے لکھا ہے اور حضرت ابن عباس پر ان کی حجت یہ ہے کہ ابوین جب ورثہ میں شریک ہوں ان کے ساتھ اور کوئی شریک نہ ہو تو ماں کے لیے ایک تہائی اور دو تہائی باپ کے لیے ہوگا اور اسی طرح جب اس نصف میں والدین شریک ہوں جو خاوند سے زائد ہوتا ہے، تو دونوں اس میں اسی طرح حصہ پائیں گے (یعنی) ماں کے لیے تہائی اور باپ کے لیے دو تہائی ہوگا۔ نظر و قیاس میں یہی صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت مواریث کے نزول کے سبب میں روایات مختلف ہیں، پس ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دار قطنی نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی نے کہا: یا رسول اللہ! سعد فوت ہو گیا ہے اور اس نے دو بیٹیاں اور ایک بھائی چھوڑا ہے، اس کے بھائی نے سعد کا سارا ترکہ قبضہ میں کر لیا ہے، عورتوں سے ان کے مال کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجلس میں جواب نہ دیا، پھر وہ عورت آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! سعد کی بیٹیاں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے بھائی کو میرے پاس بلاؤ، وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی دو اور اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ دو اور باقی مال تیرے لیے ہے(1)۔ ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آیت مواریث نازل ہوئی۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔ حضرت جابر نے بھی روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر بنی سلمہ میں پیدل چل کر میری عیادت کے لیے تشریف لائے، انہوں نے مجھے بے ہوش پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور وضو کیا پھر اس پانی سے مجھ پر چھڑکا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنے مال میں کیا کروں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی **یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ**۔ ان دونوں احادیث کو صحیحین میں بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اس میں ہے میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! میں اپنے مال کو اپنے بچوں میں تقسیم کروں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی **یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ** (الآیۃ) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(2) اور بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا نزول اس وجہ سے ہوا کہ مال سارا بیٹے کے لیے ہوتا اور والدین کے لیے وصیت تھی، پس ان آیات سے اس حکم کو منسوخ کیا گیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب فرائض الصلب، حدیث نمبر 2710، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض من رسول اللہ، باب میراث البنین مع البنات، حدیث نمبر 2022، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقاتل اور کلبی نے کہا: یہ آیت ام کجہ کے متعلق نازل ہوئی اس کا واقعہ ذکر ہو چکا ہے۔ سدی نے کہا: یہ حضرت حسان بن ثابت کے بھائی عبدالرحمن بن ثابت کی بیٹیوں کے سبب نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ میراث صرف ان لوگوں کو دیتے جو جنگوں میں شریک ہوتے اور جو دشمن سے قتال کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی جس نے ہر چھوٹے بڑے کا حصہ بیان کیا۔ یہ بھی بعید نہیں کہ یہ تمام کا جواب ہو اس وجہ سے اس کا نزول مؤخر ہوا۔ واللہ اعلم۔ الکیا الطبری نے کہا: بعض آثار میں وارد ہے کہ جو کچھ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ وہ چھوٹے بچے کو میراث سے محروم کرتے تھے تو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہی ہوتا رہا یہاں تک کہ اس آیت نے حکم منسوخ کر دیا۔ اور ہمارے نزدیک اس پر شریعت کا مشتمل ہونا ثابت نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے، کیونکہ یہ آیت سعد بن ربیع کے ورثہ کے متعلق نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ثابت بن قیس بن شماس کے ورثہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اہل النقل کے نزدیک پہلا قول اصح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا سے میراث واپس لی۔ اگر ہماری شریعت میں اس سے پہلے یہ حکم ثابت ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میراث واپس نہ لیتے کبھی بھی ہماری شریعت میں یہ ثابت نہیں ہوا کہ بچے کو میراث نہیں دی جائے گی حتیٰ کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کرے اور اپنے حریم کا دفاع کرے۔ میں کہتا ہوں: قاضی ابو بکر بن عربی نے اسی طرح کہا ہے۔ اس آیت کا نزول ایک بدیع نکتہ پر دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ مال بڑے لے لیتے تھے، اسلام کے ابتدائی دور میں شریعت خاموش نہ تھی اور نہ اس کو ثابت کرنے والی تھی، کیونکہ اگر یہ شریعت ہوتا اور ثابت ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چچے کی دو بچیوں پر مال واپس کرنے کا حکم نہ لگاتے، کیونکہ جب احکام جاری ہو چکے ہوں پھر بعد میں نسخ آئے تو وہ مستقبل میں موثر ہوتا ہے۔ سابقہ فیصلوں کو ختم نہیں کرتا یہ ایک زمانہ جاہلیت کا ظلم تھا۔ شریعت اسلامیہ نے اسے اٹھا دیا یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ۔ شوافع نے کہا ہے کہ یہ ارشاد صلبی اولاد میں حقیقت ہے اور رہا پوتا وہ اس میں بطریق مجاز داخل ہے۔ جب کوئی قسم اٹھائے کہ اس کی اولاد نہیں ہے اور اس کا پوتا ہو تو وہ حانث نہ ہو گا۔ جب فلاں کی اولاد کے لیے وصیت کرے تو اس میں پوتے داخل نہ ہوں گے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: اگر اس کی صلبی اولاد نہ ہوگی تو پوتا داخل ہوگا اور یہ معلوم ہے کہ الفاظ تبدیل نہیں ہوتے اس سے جو علماء کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن المنذر نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ فرمایا تو آیت کے ظاہر سے یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ میراث تمام اولاد کے لیے ہے خواہ مومن ہو یا کافر ہو، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اولاد کا ارادہ کیا ہے اور بعض کا نہیں۔ پس مسلم کافر کا وارث نہ ہوگا اور کافر، مسلمان کا وارث نہ ہوگا یہی حدیث کا ظاہر ہے۔

میں کہتا ہوں: جب اللہ تعالیٰ نے فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ فرمایا تو ان میں وہ قیدی بھی داخل ہے جو کفار کے قبضہ میں ہے پس وہ بھی وارث ہوگا جب تک اس کی زندگی اسلام پر معلوم ہو۔ یہی اکثر اہل علم کا قول ہے مگر نخعی نے کہا: قیدی وارث نہ ہوگا اور جب اس کی زندگی کا علم نہ ہو تو اس کا حکم مفقود کا حکم ہوگا اور آیت کے عموم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث داخل نہ ہوگی کیونکہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں، صدقہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۂ مریم میں آئے گا۔ اسی طرح اپنے باپ یا دادے، اپنے بھائی یا اپنے چچا کا قاتل بھی اسی عموم میں داخل نہ ہوگا کیونکہ سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ اپنے مقتول کے مال اور اس کی دیت سے وارث نہ ہوگا۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اگر وہ اسے خطاً قتل کر دے تو اس کی دیت سے اسے میراث نہیں ملے گی اور اس کے مال سے امام مالک کے قول کے مطابق وارث ہوگا اور امام شافعی، امام احمد، سفیان اور اصحاب الرائے کے قول میں نہ مال سے وارث ہوگا اور نہ دیت سے وارث ہوگا، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے۔ یہی قول اسحاق اور ابوثور کا ہے۔ اور یہی قول سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، زہری، اوزاعی، ابن المنذر کا ہے، کیونکہ میراث ایسی چیز ہے جس کا وارث اللہ نے اسے اپنی کتاب میں بنایا ہے اس سے سنت اور اجماع کے ساتھ استثنا نہیں کی گئی۔ ہر مختلف فیہ مسئلہ ظاہر آیات کی طرف لوٹایا جائے گا جن میں میراث کا بیان ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اسلام کے ابتدائی دور میں میراث کا حق کئی اسباب سے ہوتا تھا۔ ان میں سے حلف، ہجرۃ اور معاقدۃ ہے۔ پھر یہ تمام اسباب منسوخ ہو گئے جیسا کہ اسی سورت میں وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کے تحت تفصیل آئے گی ان شاء اللہ۔

علماء کا اجماع ہے کہ اولاد کے ساتھ ایسے افراد وارث ہوں جن کے لیے حصہ متعین ہے تو پہلے اسے حصہ مفروضہ کے مطابق حصہ دیا جائے گا پھر جو مال بچے گا وہ مرد کے لیے دو عورتوں کے حصہ کے برابر حصہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فرائض ان کے اہل کے حوالے کرو (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے یعنی وہ فرائض جو کتاب اللہ میں واقع ہیں اور یہ فرائض چھ ہیں۔ 1/2- 1/4- 1/8- 2/3- 1/3- 1/6- 1/2 پانچ کا حصہ مقرر ہے صلبی بیٹی، پوتی، سگی بہن، باپ کی طرف سے بہن اور خاوند۔ یہ حصص اس صورت میں ہیں جب یہ علیحدہ ہوں کوئی انہیں اپنے حصہ سے محجوب کرنے والا نہ ہو۔ حاجب کے ہوتے ہوئے خاوند کا حصہ 1/4 ہوگا اور ایک بیوی اور زیادہ بیویوں کے لیے 1/4 ہو کا جب کہ حاجب نہ ہو اور 1/8 حصہ ہوگا ایک بیوی اور زیادہ بیویوں کے لیے جب کہ حاجب ہوگا اور 2/3 حصہ چار افراد کا ہے صلبی بیٹیوں میں سے دو یا زیادہ ہوں اور پوتیاں، سگی بہن یا باپ کی طرف سے بہنیں جب دو یا دو سے زیادہ ہوں یہ حصص اسی صورت میں ہیں جب ان کو محجوب کرنے والا نہ ہو اور 1/3 حصہ دو افراد کا ہے ماں کا حصہ ہے جب میت کا بیٹا اور پوتا نہ ہو اور دو یا دو سے زیادہ اس کے بھائی اور بہنیں نہ ہوں اور یہ حصہ ماں کی طرف سے دو یا دو سے زیادہ اولاد کا ہو۔ اور یہ کل مال کا تیسرا حصہ لیں گے اور باقی کا ثلث 1/3 یہ ماں کے لیے ہے۔ اس مسئلہ میں جب کہ میت کے وارث خاوند یا بیوی اور والدین ہوں تو اس صورت میں ماں کو باقی کا ثلث 1/3 ملے گا۔ اس کا بیان پیچھے گزر چکا ہے اور بھائیوں کے ہوتے ہوئے دادا کے مسائل میں جب ان کے ساتھ ذوسہم ہو اور باقی کا تیسرا حصہ اس کے لیے ہو۔

اور 1/6 حصہ سات افراد کے لیے ہے۔ ابوان، دادا جب اس کے ساتھ میت کا بیٹا اور پوتا ہو ایک دادی اور بہت سی

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2657

دادیاں جب وہ جمع ہوں اور صلبی بیٹی کے ساتھ پوتی، سگی بہن کے ساتھ باپ کی طرف سے بہنیں، ماں کی اولاد میں سے ایک خواہ مذکر ہو یا مونث ہو۔ یہ تمام فرائض کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں مگر ایک دادی اور بہت سی دادیوں کا حصہ سنت سے ماخوذ ہے ان فرائض کے لیے میراث کو ثابت کرنے والے اسباب تین ہیں۔ ثابت نسب، منعقد نکاح اور آزاد کرنے کی ولاء۔ کبھی یہ تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک شخص عورت کا خاوند بھی ہوتا ہے، اس کا آزاد کرنے والا بھی ہوتا ہے اور اس کے چچا کا بیٹا بھی ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص میں دو چیزیں جمع ہوتی ہیں مثلاً عورت کا خاوند اور اس کا آزاد کرنے والا ہوتا ہے یا اس کا خاوند اور اس کے چچا کا بیٹا ہوتا ہے پس وہ دو وجہوں سے وارث ہوتا ہے اس کے لیے تمام مال ہوتا ہے جب کہ وہ ایک ہوتا ہے نصف مال زوجیت کی وجہ سے اور نصف ولاء یا نسب کی وجہ سے مل جاتا ہے۔ مثلاً ایک عورت ایک شخص کی بیٹی بھی ہوتی ہے اور اس کو آزاد کرنے والی بھی ہوتی ہے تو اس عورت کو تمام مل جاتا ہے جب کہ یہ ایک وارث ہو، نصف مال نسب کی وجہ سے اور نصف ولاء کی وجہ سے مل جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ میراث نہیں ہوگی مگر قرضہ اور وصیت ادا کرنے کے بعد۔ جب کوئی شخص فوت ہوگا تو پہلے اس کے متعین حقوق نکالے جائیں گے پھر اس کے کفن، دفن کا انتظام کیا جائے گا پھر اس کے مراتب کے مطابق قرضے ادا کیے جائیں گے پھر تہائی حصہ سے اس کی وصیتیں پوری کی جائیں گی اور وہ چیزیں جو وصیت کے معنی میں ہوں گی، باقی مال ورثاء کے درمیان تقسیم ہو گا اور جملہ ورثاء سترہ ہیں۔ دس مرد ہیں، بیٹا، پوتا، چچا، چچا کا بیٹا، خاوند اور آزاد کرنے والا۔ اور عورتوں میں سے سات ہیں بیٹی، پوتی اگرچہ نیچے کی ہو، ماں، دادی اگرچہ بہت اوپر کی ہو، بہن، بیوی، آزاد کرنے والی عورت، بعض فضلاء نے انہیں نظم کیا ہے:

والوارثون إن اردت جمعهم — مع الإناث الوارثات معهم
عشرةٌ من جملة الذكرانِ — وسبعُ أشخاصٍ من النسوانِ
وهُمْ وقد حصرتهم فى النظم — الأبنُ، أبنُ الأبن وأبنُ العمّ
والأبُ منهم وهوفى الترتيب — والجدُّ من قَبْل الأخِ القريب
وأبنُ الأخِ الأدنَى أجَلْ والعمُّ — والزوجُ والسيِّد تم الأمُّ
وأبنةُ الأبن بعدها والبنتُ — وزوجةٌ وجدّة وأختُ
والمرأةُ المولاةُ أعنِى المعتقه — خُذْها إليك عِدّةً محققةً

مسئلہ نمبر 8۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيٓ أَوْلَادِكُمْ تو اس میں ساری اولاد شامل ہے خواہ وہ موجود ہو یا ماں کے پیٹ میں ہو قریبی ہو یا بعید ہو، مذکر ہو یا مونث ہو سوائے کافر کے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: یہ حکم قریبی اولاد میں حقیقت ہے، دور والوں میں مجاز ہے اور بعض نے کہا: تمام اولاد میں حقیقت ہے، کیونکہ یہ پیدا ہونے سے ہے۔ مگر وہ میت کے قرب کی مقدار کے اعتبار سے وارث ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يٰبَنِيٓ اٰدَمَ (الاعراف: 35) (اے آدم کے بیٹو!) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انا سید ولد آدم۔ میں آدم کی اولاد کا سردار ہوں اور فرمایا: اے بنی اسرائیل! تیر

اندازی کرو کیونکہ تمہارا باپ (اسماعیل علیہ السلام) تیر انداز تھا، لیکن اس اطلاق میں عرف کا استعمال، اس حقیقت پر قریبی افراد پر غالب ہے۔ اگر صلبی اولاد میں مذکر موجود ہو تو پوتے کو کچھ نہیں ملے گا اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔ اگر صلبی اولاد میں سے مذکر نہ ہو اور اولاد کی اولاد میں مذکر ہو (یعنی پوتا موجود ہو) تو پہلے صلبی بیٹیوں کو حصہ دیا جائے گا اور وہ 2/3 حصہ تک پہنچے گا، پھر باقی 1/3 پوتوں کو ملے گا اگر وہ میت سے تعلق میں برابر ہوں یا مذکر لڑکیوں سے اسفل ہو تو یہ اس طرح تقسیم کریں گے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہوگا۔ یہ امام مالک، امام شافعی اور اصحاب رائے کا قول ہے اور یہی عام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اہل علم کا قول ہے۔ مگر حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر مذکر پوتا ہو اور اس کے مقابلے میں مؤنث اولاد ہو تو مؤنث پر ہی ترکہ رد ہوگا۔ اگر اس مؤنث سے وہ اسفل ہو تو پھر اس مؤنث اولاد پر رد نہ ہوگا اس میں انہوں نے اس قول کا خیال رکھا ہے فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ۔ لڑکیوں کے لیے 2/3 حصہ سے زیادہ نہیں بنایا اگرچہ زیادہ بھی ہوں۔ میں کہتا ہوں: ابن عربی نے یہ تفصیل حضرت ابن مسعود سے اسی طرح ذکر کی ہے، ابن المنذر اور الباجی نے بھی ان سے یہی ذکر کیا ہے۔ جو صلبی بیٹیوں سے بچے وہ پوتوں کے لیے ہے، پوتیوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ ان دونوں حضرات نے تفصیل نہیں کی۔ ابن المنذر نے ابوثور سے یہ حکایت کیا ہے۔ اسی طرح ابو عمر نے حکایت کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت ابن مسعود نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب بیٹیاں 2/3 حصہ مکمل کرلیں گی تو باقی پوتوں کے لیے ہوگا ان کی بہنوں کے لیے نہیں ہوگا اور نہ ان سے اوپر والی پوتیوں کے لیے ہوا اور نہ نیچے والیوں کے لیے ہوگا۔ ابوثور اور داؤد بن علی کا یہی مذہب ہے۔ اس کی مثل علقمہ سے مروی ہے اور اس مذہب والوں کی حجت حضرت ابن عباس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال کو فرائض والوں میں کتاب اللہ کے مطابق تقسیم کرو اور جو فرائض سے بچ جائے تو قریبی مذکر رشتہ دار کے لیے ہے (1)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے اور جمہور کی حجت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہے۔ نظر اور قیاس کی حجت سے یہ ہے کہ جو تمام مال میں اپنے درجہ والوں کو عصبہ بناتا ہے تو واجب ہے کہ وہ فاضل مال میں بھی اسے عصبہ بنائے، جس طرح صلبی اولاد ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ پوتا اپنی بہن کو میراث میں شریک کرے جس طرح صلبی بیٹا بہن کو میراث میں شریک کرتا ہے، ابوثور اور داؤد کی طرف سے حجت پکڑنے والے نے حجت پکڑی ہے کہ پوتی 2/3 حصہ کے بعد فاضل مال میں علیحدہ وارث نہیں بنتی اس کا بھائی اسے عصبہ نہیں بناتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کے ساتھ اس کا بھائی ہو تو وہ اس کی وجہ سے قوی ہو جاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ عصبہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی اولاد میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی کے لیے نصف مقرر فرمایا اور دو سے زیادہ کے لیے 2/3 مقرر فرمایا اور دو کے لیے کتاب اللہ میں کوئی حصہ منصوص نہیں فرمایا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث الولد من ابیہ وامہ، حدیث نمبر 6235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

علماء نے اس دلیل پر کلام فرمائی ہے جو دو کے لیے 2/3 حصہ کا موجب ہے وہ دلیل کیا ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ اجماع ہے۔ یہ مردود ہے کیونکہ حضرت ابن عباس سے صحیح قول مروی ہے کہ دو بیٹیوں کو نصف 1/2 ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ یہ شرط اور جزا ہے۔ فرمایا: پس دو بیٹیوں کو دو تہائی 2/3 نہیں دیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: دو بہنوں پر قیاس کے ساتھ دو بیٹیوں کو 2/3 حصہ دیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کے آخر میں فرمایا: وَلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ اور پھر فرمایا: فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ۔ پس دو بیٹیاں 2/3 کے اشتراک میں دو بہنوں کے ساتھ ملحق ہوں گی اور بہنیں جب دو سے زیادہ ہوں گی تو 2/3 میں اشتراک میں بیٹیوں کے ساتھ ملحق ہوں گی۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ اخوات کے بارے میں حکم منصوص ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے اور اس کے ساتھ یہ تسلیم شدہ حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت میں ایسی چیز موجود ہے جو دلالت کرتی ہے کہ دو بیٹیوں کے لیے 2/3 ہے وہ یہ ہے کہ جب بیٹی ایک ہو تو اپنے بھائی کے ساتھ 1/3 حصہ لیتی ہے تو معلوم ہوا کہ دو بیٹیوں کے لیے 2/3 ہوگا۔ اس دلیل سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے اور یہ قول قاضی اسماعیل، ابو العباس المبرد کا ہے۔ نحاس نے کہا: اہل نظر کے نزدیک یہ حجت غلط ہے، کیونکہ اختلاف ایک لڑکی میں نہیں دو لڑکیوں میں ہے۔ پس ان کا مخالف کہتا ہے جب وہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑے تو بیٹیوں کے لیے نصف ہوتا ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ یہ ان کا فرض ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَوْقَ کا لفظ زائد ہے یعنی ان کن نساء اثنتین یعنی عورتیں دو ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (الانفال:12) مراد اعناق ہے۔ اس قول کو نحاس اور ابن عطیہ نے رد کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غلط ہے، کیونکہ ظروف اور تمام اسماء کا کلام عرب میں بغیر معنی کے زائد ہونا جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ۔ یہ فصیح کلام ہے فوق زائد نہیں ہے بلکہ یہ معنی کے لیے محکم ہے کیونکہ عنق (گردن) کو مارنا ثابت ہوتا ہے جب وہ جوڑ کی ہڈی سے اوپر ہو نہ کہ دماغ میں مارنا مراد ہے، جیسا کہ درید بن الصمۃ نے کہا: میں دماغ سے نیچے سے اور ہڈی سے اوپر کی جگہ مارتا ہوں پس میں جوانوں کی گردنوں کو مارتا ہوں۔ اور قوی ترین حجت بیٹیوں کے لیے 2/3 حصہ ہونے میں سبب نزول میں مروی صحیح حدیث ہے۔ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت الثلث، الربع، عشر تک عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے اور بنی تمیم اور ربیعہ کی لغت الثلث لام کے سکون کے ساتھ ہے اسی طرح عشر تک عین کلمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے: ثلثت القوم اثلثھم وثلثت الدراھم اثلثھا جب تو انہیں تین مکمل کر دے۔ واثلثت ھی۔ لیکن وہ مائۃ اور الف میں کہتے ہیں اَمْاَيْتُهَا و آلَفْتُهَا و اَمْاَتْ، آلَفَتْ۔

مسئلہ نمبر 10۔ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ نافع اور اہل مدینہ نے واحدۃ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس کا معنی ہے وقعت وحدثت واحدۃ۔ اور یہ کان تامہ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إذا كان الشتاء فَادْفِئُونِي فإن الشيخ يُهرِمه الشتاءُ

جب موسم سرما ہو تو مجھے گرم کرو کیونکہ بوڑھے آدمی کو سردیوں کا موسم مزید بوڑھا کر دیتا ہے۔

اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ واحدۃً پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ قرأت بہتر ہے یعنی وان کانت المتروكة او

المولودۃ (واحدۃً) اگر میت کے پیچھے ایک بچی ہو۔ جیسے ارشاد ہے فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً۔ جب صلبی بیٹیوں کے ساتھ، پوتیاں بھی ہوں اور صلبی بیٹیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ پوتیوں کو میراث سے محروم کر دیں گی کیونکہ پوتیوں کے لیے 2/3 حصہ کے علاوہ میں بطور فرض میراث نہیں ملتی۔ اگر صلبی بیٹی ایک ہو ایک پوتی ہو یا بہت سی پوتیاں ہوں تو وہ صلبی بیٹی کے ساتھ مل کر 2/3 حصہ مکمل کریں گی، کیونکہ دو بیٹیاں یا زائد اسی فرض 2/3 کی وارث ہوتی ہیں اور پوتیاں، بیٹیوں کے قائم مقام ہوتی ہیں جب بیٹیاں نہ ہوں اور اسی طرح پوتے حجب اور میراث میں بیٹیوں کے قائم مقام ہوتے ہیں جب ان عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ ہو جو سدس 1/6 کی مستحق ہے تو یہ سدس 1/6 پوتی کے لیے ہوگا اور متوفی کی سگی بہن کی نسبت یہ 1/6 حصہ کی زیادہ مستحق ہے۔

جمہور فقہاء صحابہ اور تابعین کا یہی نظریہ ہے مگر ابو موسیٰ، سلیمان بن ابی ربیعہ سے مروی ہے کہ بیٹی کے لیے نصف ہے اور نصف ثانی بہن کے لیے ہے اور ایسی صورت میں پوتی کا کوئی حق نہیں ہے (1)۔ ابو موسیٰ سے صحیح یہ مروی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ سے رجوع کر لیا تھا۔ یہ بخاری نے روایت کیا ہے۔ آدم نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو قیس نے بتایا کہ میں نے ہزیل بن شرحبیل کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابو موسیٰ سے بیٹی، پوتی اور بہن کے درمیان میراث کی تقسیم کے بارے پوچھا گیا تو ابو موسیٰ نے کہا: بیٹی کے لیے 1/2 حصہ ہے، بہن کے لیے 1/2 ہے۔ اور حضرت ابن مسعود کے پاس جاؤ وہ بھی میری متابعت کریں گے۔ حضرت ابن مسعود سے پوچھا گیا اور انہیں ابو موسیٰ کے قول کے متعلق خبر دی گئی تو حضرت ابن مسعود نے کہا: پھر میں تو گمراہ ہو گیا اور میں ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں (اگر میں ایسا فیصلہ کروں) میں تو اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کروں گا بیٹی کے لیے نصف ہوگا اور پوتی کے لیے 1/6 ہوگا دو ثلث مکمل کریں گے اور باقی بہن کے لیے ہوگا۔ ہم پھر ابو موسیٰ کے پاس آئے انہیں حضرت ابن مسعود کے قول کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا: جب تک یہ عالم اجل تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ نہ پوچھا کرو۔ اگر پوتی یا پوتیوں کے ساتھ ان کے درجہ میں یا ان سے نیچے لڑکا ہو تو وہ انہیں عصبہ بنا دے گا۔ اور دوسرا نصف ان کے درمیان ہوگا۔ مذکر کے لیے دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہوگا جتنی مقدار کو بھی پہنچ جائے، جب کہ حضرت ابن مسعود کا قول اس کے خلاف ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ جب صلبی بیٹیاں یا صلبی بیٹی اور پوتیاں دو ثلث (2/3) مکمل کر لیں اور اسی طرح وہ سگی بہن اور بہنوں اور باپ کی طرف سے بھائیوں کے متعلق فرماتے ہیں: سگی بہن کے لیے نصف ہے اور باقی بھائیوں اور بہنوں کے لیے ہے جب تک کہ انہیں تقسیم کی وجہ سے 1/6 سے زیادہ نہ پہنچے اگر اس 1/6 سے زیادہ پہنچے تو انہیں 2/3 حصہ مکمل کرتے ہوئے 1/6 حصہ دیا جائے گا اور اس سے زائد انہیں نہیں دیا جائے گا۔ یہی ابو ثور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب کوئی شخص مر جائے اور اپنی حاملہ بیوی چھوڑ جائے تو مال کی تقسیم میں توقف کیا جائے گا حتیٰ کہ بچی یا بچہ پیدا ہو جائے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے اور اس کی بیوی حاملہ ہو تو ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ وارث ہوگا اور اس کی میراث جاری ہوگی جب وہ زندہ پیدا ہوگا اور آواز نکالے گا اور عام علماء کا قول ہے کہ جب مردہ پیدا ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض، باب فرائض الصلب، حدیث نمبر 2711، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا تو وارث نہ ہوگا۔ اگر زندہ پیدا ہو اور آواز نہ نکالے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس کے لیے میراث نہ ہوگی اگرچہ وہ حرکت بھی کرے یا چھینک مارے جب تک کہ آواز نہ نکالے اور ایک طائفہ نے کہا: جب حرکت کرنے، آواز نکالنے یا دودھ پینے یا سانس لینے کے ساتھ بچے کی زندگی معلوم ہو جائے گی تو اس کے احکام، زندہ کے احکام ہوں گے۔ یہ امام شافعی، سفیان، ثوری اور اوزاعی کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ امام شافعی نے جو کہا ہے وہ نظر کا احتمال رکھتا ہے مگر خبر اس سے مانع ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے "جو بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اسے چوک دیتا ہے وہ شیطان کی چوک کی وجہ سے روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی والدہ کے۔ یہ خبر ہے اور خبر پر نسخ واقع نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 12۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ یہ حکم خنثیٰ (ہیجڑا) کو بھی شامل ہے جس کی دونوں آگے والی شرمگاہیں ہوتی ہیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اسے پیشاب کرنے کے اعتبار سے وارث بنایا جائے گا اگر وہ مرد والی شرمگاہ سے پیشاب کرتا ہے تو وہ مرد کی میراث کا وارث ہوگا، اگر وہ عورت والی شرمگاہ سے پیشاب کرتا ہے تو عورت کی میراث کا وارث ہوگا۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک سے میں نے اس کے متعلق کوئی چیز یاد نہیں کی، بلکہ ابن القاسم نے ذکر کیا ہے کہ وہ امام مالک سے اس کے متعلق پوچھنے سے ڈر گئے۔ اگر وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرتا ہو تو جس جگہ سے پہلے پیشاب کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا یہ سعید بن مسیب، امام احمد اور اسحاق کا قول ہوگا یہ اصحاب الرائے سے حکایت کیا گیا ہے۔ قتادہ نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے خنثیٰ کے متعلق فرمایا: اس کی میراث کا اعتبار اس کے پیشاب کرنے کی جگہ کے اعتبار سے ہوگا اگر وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرتا ہوگا تو نصف مذکر اور نصف مونث ہوگا۔ یعقوب اور محمد نے کہا: جس شرمگاہ سے زیادہ پیشاب کرتا ہوگا اس کے اعتبار سے وارث ہوگا۔ اوزاعی سے یہی حکایت ہے۔ نعمان نے کہا: جب وہ دونوں سے اکٹھا پیشاب کرے تو وہ خنثیٰ مشکل ہے۔ میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ کس طرف سے زیادہ پیشاب کرتا ہے۔ نعمان سے یہ بھی روایت ہے کہ جب ایسا ہوگا تو توقف کیا جائے گا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب خنثیٰ مشکل ہوگا تو دونوں حصوں میں سے کم حصہ دیا جائے گا۔ یحییٰ بن آدم نے کہا: جب وہ مرد کی حیثیت سے پیشاب کرتا ہوگا اور اسے عورت کی طرح حیض بھی آتا ہوگا تو وہ پیشاب کرنے کے اعتبار سے وارث ہوگا کیونکہ اثر میں ہے "پیشاب کرنے کی جگہ کے اعتبار سے وارث ہوگا" اور امام شافعی کے قول میں ہے جب اس کے دونوں طرفوں سے پیشاب اکٹھا نکلتا ہوگا اور ایک سے دوسری کی نسبت پہلے نہیں نکلتا ہوگا تو وہ خنثیٰ مشکل ہوگا اسے مونث کی میراث کی طرح میراث دی جائے گی اور اس کے اور دوسرے ورثاء کے درمیان مال موقوف ہوگا حتیٰ کہ اس کا امر واضح ہو جائے یا ورثاء صلح کرلیں۔ یہی ابو ثور کا قول ہے۔ شعبی نے کہا: مذکر کی نصف میراث اور مونث کی نصف میراث دی جائے گی۔ اوزاعی کا یہی مذہب ہے اور یہ مالک کا مذہب ہے۔ ابن شاس نے جواھر ثمینۃ میں، امام مالک عالم مدینہ کے مذہب پر کہا ہے کہ خنثیٰ کی جب دونوں شرمگاہیں ہوں گی یعنی مرد کی شرمگاہ اور عورت کی شرمگاہ جن کے ذریعے پیشاب کیا جاتا ہے تو جس کے ذریعے پیشاب کرتا ہوگا اس کا حکم اس کے مطابق ہوگا اگر دونوں سے پیشاب کرتا ہوگا تو اعتبار کثرت کا ہوگا یعنی جس شرمگاہ سے زیادہ پیشاب کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اگر برابر پیشاب کرتا ہوگا تو

جس شرمگاہ سے پہلے کرتا ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اگر دونوں سے اکٹھا کرتا ہوگا تو پھر داڑھی اگنے یا پستانوں کے بڑا ہونے اور عورتوں کے پستانوں کے مشابہ ہونے کا اعتبار ہوگا، جب دونوں امر برابر ہوں تو پھر بلوغت کے وقت کی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اگر حیض آتا ہوگا تو عورت کے حکم میں ہوگا اگر احتلام پایا جاتا ہوگا تو اس کا حکم ہوگا اگر دونوں پائے جاتے ہوں گے تو مشکل ہو گا۔ اسی طرح اگر پیشاب کرنے کی جگہ نہ ہو یعنی نہ وہ ہو جو مردوں کے ساتھ خاص ہے اور نہ وہ ہو جو عورتوں کے ساتھ خاص ہے بلکہ اس کی ایک جگہ ہو جس سے پیشاب کرتا ہو تو پھر بلوغت کا انتظار کیا جائے گا اگر کوئی تمیز دینے والی صورت ہوگی تو فبہا ورنہ مشکل ہوگا پھر جہاں اشکال کا حکم ہم لگائیں گے تو اسے مذکر اور مونث دونوں کے حصوں کا نصف ملے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ علماء نے خنثیٰ مشکل کی علامات ذکر کی ہیں۔ ہم سورۂ بقرہ اور اس سورت کے آغاز میں ایک علامت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جس کے ذریعے وہ ایک قسم کے ساتھ لاحق کیا جائے گا۔ یہ علامت ہے پسلیوں کے اعتبار کا (اگر پسلیاں زیادہ ہیں تو عورت ہے اگر کم ہیں تو مرد ہے)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی علامت مروی ہے اس کے ساتھ آپ نے فیصلہ فرمایا تھا۔ بعض فضلاء نے بہت سے اشعار میں خنثیٰ کا حکم نظم کیا ہے: خنثیٰ میں پستان، داڑھی اور پیشاب کی جگہ کا اعتبار ہے اگر اس کے تمام حالات برابر ہوں اور کوئی ایک صورت واضح نہ ہو اور اس کی نشانیاں مشکل ہوں تو 6/8 حصہ ملے گا یہ اس کا حصہ ہے جو اشکال کی وجہ سے مستحق ہے۔ اس میں عبرت ہے۔ واجب ہے کہ وہ دنیا میں جب تک زندہ ہے نہ خود نکاح کرے اور نہ کسی کا نکاح کرائے۔ جب عیال والا نہ ہو تو میں اسے مردوں میں شمار نہیں کرتا۔ یہ تمام جو میں نے نظم میں ذکر کیا ہے بڑے بڑے علماء کے اقوال ہیں۔ ایک قوم نے خنثیٰ پر کلام کرنے سے انکار کیا تو اس کو کوئی ملامت نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس کے ذکر میں شناعت ظاہر ہے اور بشاعت بالکل واضح ہے۔ اس کی مخفی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ گزر چکا ہے کہ اگر اس کی پسلیاں کم ہوں تو وہ میراث، نکاح، احرام، حج، نماز اور احکام میں مردوں کی طرح ہوگا۔ اگر مردوں سے ایک پسلی زیادہ ہو تو وہ عورتوں میں سے ہوگا، کیونکہ عورتوں کی ایک پسلی زیادہ ہوتی ہے۔ اس فائدہ کو غنیمت جان، کیونکہ حوا کی تخلیق کی وجہ سے آدم کی ایک پسلی کم ہوئی یہ قول حق ہے اور اس پر دلیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ابو الولید بن رشد نے کہا: خنثیٰ مشکل نہ خاوند ہوتا ہے، نہ بیوی، نہ باپ اور نہ ماں۔ بعض نے کہا کہ ایسے خنثے پائے گئے ہیں جن کے پیٹ سے بچے ہوئے اور جن کی پیٹھ سے اولاد ہوئی۔ ابن رشد نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو اپنے صلبی بیٹے سے باپ کی مکمل میراث پائے گا اور بطن سے پیدا ہونے والی اولاد سے ماں کی مکمل میراث پائے گا۔ یہ بعید ہے۔ واللہ اعلم۔

سنن دار قطنی میں ابو ہانی عمر بن بشیر سے مروی ہے فرمایا: عامر شعبی سے ایک ایسے بچے کے بارے میں پوچھا گیا جو نہ مذکر ہے، نہ مونث ہے، نہ اس کے لیے وہ شرمگاہ ہے جو مذکر کی ہوتی ہے اور نہ وہ ہے جو عورت کے لیے ہوتی ہے اس کی ناف سے پیشاب، پاخانہ کی ہیئت سے مواد نکلتا ہے۔ عامر سے اس کی میراث کے بارے پوچھا گیا تو عامر نے کہا: مذکر کے حصہ کا نصف اور مؤنث کے حصہ کا نصف اسے دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِاَبَوَيْهِ یعنی میت کے والدین۔ یہ ضمیر بغیر مرجع کے ہے اور جائز ہے،

کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حتی توارت بالحجاب اور اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝
(ان دونوں قرآنی الفاظ میں ضمیر بغیر مرجع کے ہے)۔ السُّدُسُ اس کا رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور اس کا ما قبل خبر ہے۔
اسی طرح الثلث اور السدس ہیں اسی طرح نِصۡفُ مَا تَرَكَ اور فَلَكُمُ الرُّبُعُ - وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ اور فَلَهُنَّ الثُّمُنُ اور فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ کی ترکیب ہے۔ اور الابوان الاب اور الابة کا تثنیہ ہے۔ الام کے لفظ کی وجہ سے اسے ابۃ نہیں کہا جاتا۔ اور عرب دو مختلف چیزوں کو متفق چیزوں کے قائم مقام کر دیتے ہیں اور ایک کو دوسری پر غلبہ دے دیتے ہیں اس کی خفت یا اس شہرت کی وجہ سے اور یہ اسماء صالحہ میں مسموع ہے مثلاً اب اور الام کے لیے ابوان۔ الشمس والقمر کے لیے القمران اللیل والنہار کے لیے الملوان، اسی طرح العمران، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے لیے بولا جاتا ہے۔ تذکیر کی خفت کی وجہ سے قمر کو شمس پر غلبہ دیا۔ عمر کو ابوبکر پر غلبہ دیا، کیونکہ حضرت عمر کا زمانہ طویل اور مشہور تھا اور جنہوں نے العمرین سے عمر بن خطاب اور عمر بن عبد العزیز کا ارادہ کیا ہے، اس کا قول درست نہیں، کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے بھی العمرین بولا جاتا تھا۔ یہ ابن الشجری کا قول ہے۔ اور وَلِاَبَوَيۡهِ میں اوپر والے آباء داخل نہیں ہیں جس طرح نیچے والے ابناء اَوۡلَادِكُمۡ میں داخل ہیں۔ کیونکہ لِاَبَوَيۡهِ کا لفظ تثنیہ ہے اور یہ عموم اور جمع کا احتمال نہیں رکھتا بخلاف اَوۡلَادِكُمۡ کے قول کے (کہ یہ جمع ہے) اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اوپر والی ام، دادی ہے اور اس کے لیے بالاجماع ثلث مفروض نہیں ہے۔ پس جدّ کا اس لفظ سے خارج ہونا قطعی ہے اور دادا کا شامل ہونا مختلف فیہ ہے۔ جن علماء نے کہا: وہ باپ کی طرح ہے اور اس کے ساتھ بھائی محجوب ہوتے ہیں ان میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کی زندگی کے ایام میں کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی اور ان کی وفات کے بعد اس مسئلہ میں اختلاف ہوا اور جنہوں نے کہا: وہ باپ ہے ان میں حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابوہریرہ ہیں یہ تمام علماء باپ کی عدم موجودگی میں دادا کو باپ کی طرح سمجھتے تھے اور اس کے ہوتے ہوئے بھائیوں کو محروم کرتے تھے اور بھائی دادا کے ہوتے ہوئے ان کے نزدیک کسی چیز کے وارث نہیں بنتے تھے۔ یہ عطا، طاؤس، حسن اور قتادہ کا قول ہے اور یہی نظریہ امام ابوحنیفہ، ابوثور اور اسحاق کا ہے اور ان کی حجت یہ ارشاد ہے مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ (الحج: 78) اور يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ (الاعراف: 35) یہاں ابراہیم کو باپ اور آدم کی اولاد کہہ کر پکارا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یابنی اسماعیل ارموا فان اباکم کان رامیاً اے اسماعیل کی اولاد تیر اندازی کرو، کیونکہ تمہارا باپ بھی تیر انداز تھا۔
حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زید، حضرت ابن مسعود کا خیال یہ ہے کہ بھائیوں کے ساتھ دادا کو میراث ملے گی۔ اور سگے بھائیوں کے ہوتے ہوئے یا باپ کی طرف سے بھائیوں کے ہوتے ہوئے اس کی میراث ثلث 1/3 سے کم نہ ہوگی مگر ذوی الفرائض کے ساتھ، کیونکہ ان کے ساتھ زید کے قول کے مطابق سدس سے کچھ کم ہوجاتا ہے۔ یہ امام مالک، امام اوزاعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھائیوں اور دادا کو سدس 1/8 میں شریک کرتے تھے اور ذوی الفرائض اور دوسرے ورثاء کے ساتھ سدس 1/6 سے دادا کا حصہ کم نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن ابی لیلی اور ایک جماعت کا

قول ہے۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ دادا، باپ کے ہوتے ہوئے وارث نہیں ہوتا اور بیٹا باپ کو محجوب کرتا ہے اور دادے کو باپ کے قائم مقام رکھا ہے حجب اور میراث میں جبکہ مرنے والا قریبی باپ نہ چھوڑے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ دادا، بھتیجوں کو میراث سے محروم کرے گا، مگر شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مقاسمہ میں بھتیجوں کو بھائیوں کے مقام پر رکھا ہے۔ جمہور کے قول کی حجت یہ ہے کہ یہ ایسا مذکر ہے جو اپنی بہن کو عصبہ نہیں بناتا چچا اور چچا کے بیٹے کی طرح دادا تقسیم نہیں کرتا۔ شعبی نے کہا: اسلام میں پہلا وارث دادا حضرت عمر بن خطاب تھے۔ حضرت عاصم بن عمر کا بیٹا فوت ہوا اور دو بھائی چھوڑے۔ حضرت عمر نے پوتے کا سارا مال لینے کا ارادہ کیا، پھر حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہما سے اس مسئلہ میں مشورہ کیا تو دونوں نے ایک مثال دی، حضرت عمر نے فرمایا: اگر تم دونوں کی رائے جمع نہ ہوتی تو میں اسے اپنا بیٹا اور اپنے آپ کو اس کا باپ نہ دیکھتا۔ دار قطنی نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اجازت طلب کی تو زید نے اجازت دی جب کہ حضرت زید کا سر ان کی لونڈی کے ہاتھ میں تھا وہ انہیں کنگھی کر رہی تھی حضرت زید نے اپنا سر کھینچا۔ حضرت عمر نے اسے کہا: وہ تجھے کنگھی کرتی رہے حضرت زید نے کہا: اے امیر المومنین! اگر آپ مجھے بلاتے تو میں خود تمہارے پاس آجاتا۔ حضرت عمر نے کہا: مجھے آپ سے ایک کام ہے میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ دادا کی میراث کے بارے میں غور کریں۔ حضرت زید نے کہا: وہی ہوگا جو آپ کہیں گے حضرت عمر نے کہا: یہ وحی نہیں ہے حتیٰ کہ ہم زیادتی اور کمی کر کے نص قرآنی کی مخالفت کرنے والے ہوں گے۔ یہ تو ایک تمہاری رائے ہے اگر میں اسے اپنے موافق دیکھوں گا تو میں اس کی پیروی کروں گا ورنہ تم پر کوئی حرج نہیں ہوگی۔ حضرت زید نے اپنی رائے دینے سے انکار کیا۔ حضرت عمر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے باہر نکلے اور فرمایا: میں تو اس لیے آیا تھا کہ تم میرا مسئلہ حل کرو گے۔ پھر ایک مرتبہ اسی وقت میں حضرت عمر، حضرت زید کے پاس آئے جس وقت پہلے آئے تھے، حضرت عمر ٹھہرے رہے حتیٰ کہ حضرت زید نے کہا: میں تمہارے لیے اس کے متعلق لکھتا ہوں تو حضرت زید نے انتڑیوں کے ٹکڑے پر لکھا اور اس کی مثال بیان فرمائی۔ اس کی مثال درخت کی مثل ہے جو ایک تنے پر اگتا ہے پھر اس میں ایک ٹہنی نکلتی ہے پھر اس ٹہنی میں دوسری ٹہنی نکلتی ہے تنا پہلی ٹہنی کو سیراب کرتا ہے اگر پہلی ٹہنی تو کاٹ دے تو پانی دوسری ٹہنی کی طرف لوٹے گا اگر تو دوسری ٹہنی کاٹ دے تو پانی پہلی ٹہنی کی طرف لوٹے گا۔ حضرت عمر وہ تحریر لے کر آئے اور خطبہ دیا پھر وہ تحریر ان پر پڑھی پھر فرمایا: زید بن ثابت نے دادا کے متعلق ایک قول کیا ہے میں اسے جاری کرتا ہوں۔ فرمایا: حضرت عمر پہلے دادا تھے (جو اسلام میں میراث پانے والے تھے) انہوں نے سارا مال لینے کا ارادہ کیا تھا یعنی اپنے پوتے کا سارا مال لینے اور میت کے بھائیوں کو کچھ نہ دینے کا ارادہ کیا تھا اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب نے مال کو تقسیم فرمایا۔

مسئلہ نمبر 14۔ رہی دادی تو اہل علم کا اجماع ہے کہ دادی کے لیے 1/6 حصہ ہے جب میت کی والدہ نہ ہو اور علماء کا اجماع ہے کہ ماں نانی اور دادی کو محروم کر دیتی ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ باپ، میت کی نانی کو محروم کر دیتا ہے اور دادی کی میراث میں اختلاف ہے جب اس کا بیٹا زندہ ہو۔ ایک جماعت نے کہا: دادا ہی وارث نہ ہوگی جب دادی کا بیٹا زندہ ہو۔ حضرت زید بن ثابت، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے اور امام مالک، ثوری، امام اوزاعی، ابو ثور اور

اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ ایک جماعت نے کہا: دادی اپنے بیٹے کے ساتھ وارث ہو گی۔ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے اور شریح، جابر بن زید، عبید اللہ بن حسن، شریک، احمد، اسحاق اور ابن المنذر کا بھی یہی قول ہے۔ اور فرمایا: جس طرح دادے کو باپ کے سوا کوئی محروم نہیں کرتا اسی طرح دادی کو ماں کے سوا کوئی محروم نہیں کرتا۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: دادی اپنے بیٹے کے ساتھ وہ پہلی دادی ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں 1/6 حصہ عطا فرمایا جب کہ اس کا بیٹا زندہ تھا (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ بہت سی جدات کو میراث دینے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: صرف دو دادیاں وارث ہوں گی، ماں کی ماں اور باپ کی ماں اور ان دونوں کی مائیں۔ اسی طرح ابو ثور نے امام شافعی سے روایت کیا ہے اور یہی تابعین کی جماعت کا قول ہے۔ اگر ان میں سے ایک ہو تو اس کے لیے 1/6 حصہ ہو گا اگر دو جمع ہو جائیں اور ان کی قرابت برابر ہو تو دونوں کو 1/6 حصہ ملے گا اسی طرح اگر زیادہ ہوں جب کہ وہ رشتہ میں برابر ہوں اور اس پر اجماع ہے اگر وہ قریبہ ہو جو ماں سے پہلے ہے تو اسے 1/6 حصہ ملے گا، دوسریوں کو نہیں ملے گا اگر وہ قریب ہو جو باپ سے پہلے ہے جو اس کے اور ماں سے پہلے والی کے درمیان 1/6 حصہ ہو گا اگرچہ بہت دور کی ہو اور ماں سے پہلے والی ایک جدہ وارث ہو گی اور ماں کے باپ کی ماں جو جدہ ہے وہ کسی صورت میں وارث نہ ہو گی یہ حضرت زید بن ثابت کا مذہب ہے اور اس مسئلہ میں جو ان سے مروی ہے اس میں سے یہی زیادہ محفوظ ہے۔ یہی امام مالک اور اہل مدینہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جدات مائیں ہیں جب یہ جمع ہوں تو 1/6 حصہ قریبی کو ملے گا جس طرح آبا، جمع ہوں تو میراث کا حق دار وہی ہوتا ہے جو زیادہ قریبی ہوتا ہے، اسی طرح بیٹے اور بھائی اور بھتیجے اور چچا کے بیٹے میراث میں جب جمع ہوں تو میراث کے حق دار وہ ہوں گے جو زیادہ قریبی ہوں گے۔ اسی طرح امہات کا حکم ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ اصح ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ امام اوزاعی تین جدات کو وارث بناتے تھے۔ ایک ماں سے پہلے والی اور دو باپ سے پہلے والیاں، یہی امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔ دارقطنی نے یہ مرسلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے اس کا برعکس مروی ہے وہ تین جدات کو وارث بناتے تھے۔ دو ماں کی جہت سے اور ایک باپ کی طرف سے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی حضرت زید کے قول کی طرح ہے یہ دونوں قریبی کے لیے 1/6 حصہ مقرر فرماتے تھے خواہ وہ ماں کی طرف سے ہو یا باپ کی طرف سے ہو۔ اور جو دور کا رشتہ دار ہے وہ اس میں اس کا شریک نہ ہو گا۔ یہ ثوری، امام ابو حنیفہ ان کے اصحاب اور ابو ثور کا قول ہے۔ رہے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس تو یہ چار جدات کو وارث بناتے تھے یہ حسن بصری، محمد بن سیرین اور جابر بن زید کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہر جدہ جب متوفی (مرنے والا) کی طرف منسوب ہو اس کے نسب میں دو ماؤں کے درمیان ایک باپ واقع ہو تو وہ وارث نہ ہو گی۔ یہ اہل علم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ بچے کے ہوتے ہوئے والدین میں سے ہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض من رسول اللہ، باب ما جاء فی میراث الجدۃ مع ابنہا، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک کے لیے 1/6 حصہ ہے۔ ولد کو مبہم فرمایا پس اس میں مذکر، مؤنث برابر ہوگا، کوئی شخص مرے اور ایک بیٹا اور والدین چھوڑے تو والدین میں سے ہر ایک کے لیے 1/6 حصہ ہوگا اور باقی بیٹے کے لیے ہوگا اگر وہ ایک بیٹی اور والدین چھوڑے تو بیٹی کے لیے نصف ہوگا اور والدین کے لیے 2/6 حصہ ہوگا اور باقی اقرب عصبہ کے لیے ہوگا اور وہ باپ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ما ابقت الفرائض فلاوْلی رجل ذکر یعنی فرائض سے جو بچے وہ قریبی مرد کے لیے ہوگا۔ باپ کے لیے استحقاق دو اعتبار سے ہے ایک عصبہ ہونے اور دوسرا فرض کے اعتبار سے۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا کہ والدین جب وارث ہوں تو ماں کے لیے 1/3 حصہ ہے اس کی دلیل وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ ہے یہ خبر دینا ہے کہ ماں کے لیے 1/3 حصہ ہے اور باقی دو ثلث 2/3 باپ کے لیے ہے یہ اس طرح ہے جیسے تو دو شخصوں کو کہتا ہے: یہ مال تم دونوں کے لیے ہے پھر تو ایک کو کہتا ہے: اے فلاں! تیرے لیے اس میں سے 1/3 ہے تو دوسرے کے لیے اس میں اپنی نص کے ساتھ 2/3 مقرر کر دیا کیونکہ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ میں کلام کی قوت دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں تمام حصہ داروں میں سے منفرد ہیں اپنی اولاد کی طرف سے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بناء پر 2/3 باپ کے لیے بطور فرض متعین ہوگا جبکہ وہ عصبہ نہ ہو۔ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ مذکر اولاد کے نہ ہونے کے وقت باپ کو ثلث کی زیادتی نصرت اور مشقت کے وجوب کی وجہ سے ہے اور ماں کے لیے ایک سہم (حصہ) ہوگا قرابت کی وجہ سے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حکمت درست ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو اس کی زندگی میں بھی موجود ہیں پھر وہ سدس کی طرف کیوں لوٹایا گیا اور وہ چیز جو ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں سدس 1/6 کی طرف لوٹانا بچے پر نرمی کرنے کے لیے ہے اور اس کے مال کی اچھی دیکھ بھال کے لیے ہے، کیونکہ اس کے مال سے جز کا نکالنا اس کو مال سے باندھ رکھنا ہے یا یہ حکم تعبدی ہے یہ سب سے اولیٰ قول ہے۔ واللہ الموفق

مسئلہ نمبر 17۔ اگر کہا جائے کہ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ میں واو کی زیادتی کا کیا فائدہ ہے کلام کا ظاہر یہ تھا فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زیادتی سے اس بات کی خبر دینا مقصود ہے کہ یہ امر مستقل اور ثابت ہے پس اس کے ثبوت اور استقرار کی خبر دی گئی ہے پس والدین کے انفراد کے وقت والدین کا حال بچوں کے حال کی طرح سے مذکر کے لیے عورتوں کے دو حصوں کے برابر ہے۔ باپ کے لیے اسی وجہ سے دو فرض جمع ہو جاتے ہیں ایک مفروض حصہ اور دوسرا عصبہ ہونے کے اعتبار سے، کیونکہ بچے کی طرح یہ بھی بھائیوں کو محجوب کر دیتا ہے یہ حکم میں عدل اور حکمت میں یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 18۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اہل کوفہ نے فلامة الثلث پڑھا ہے۔ یہ لغت سیبویہ نے حکایت کی ہے کسائی نے کہا: یہ ہوازن اور ہذیل میں سے اکثر لوگوں کی لغت ہے، کیونکہ لام جب مکسور ہو اور وہ حرف کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 338

متصل ہو تو کسرہ کے بعد ضمہ کو ناپسند کرتے ہیں پس انہوں نے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیا، کیونکہ کلام میں فعل نہیں تھا اور جنہوں نے ضمہ پڑھا ہے انہوں نے اصل پر پڑھا ہے، کیونکہ لام منفصل ہے کیونکہ وہ اسم پر داخل ہے۔ یہ تمام گفتگو نحاس نے کی ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ بھائی ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب کر دیتے ہیں اور یہ حجب نقصان ہے خواہ بھائی سگے ہوں یا باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ہوں اور ان کا حصہ نہ بھی ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں: سدس 1/6 حصہ بھائیوں نے ماں کو جس سے محجوب کیا وہ بھائیوں کے لیے ہے اور ان سے دوسرے علماء کی طرح کا قول بھی مروی ہے کہ وہ باپ کے لیے ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ سدس باپ کو ملے گا بھائیوں کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ باپ ہی ان کا کفیل ہے اور ان کے نکاح کا متولی ہے اور ان کے اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ دو بھائی یا زیادہ ہوں مذکر ہوں یا مؤنث ہوں، سگے ہوں یا باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ہوں ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب کریں گے مگر حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ بھائیوں میں سے دو ایک کے حکم میں ہیں ماں کو تین بھائیوں سے کم محجوب نہیں کریں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہنیں، ماں کو ثلث سے سدس کی طرف محجوب نہیں کریں گی، کیونکہ کتاب اللہ بھائیوں کے بارے میں ہے۔ عورتوں کی میراث کی قوت، مردوں کی میراث کی قوت کی مثل نہیں ہے حتیٰ کہ الحاق کا اعتبار کیا جائے۔ الکیا الطبری نے کہا: ان کے اقوال کا تقاضا یہ ہے کہ بہنیں بھائیوں کے ساتھ داخل نہیں ہیں، کیونکہ اخوۃ کا لفظ مطلق ہے یہ بہنوں کو شامل نہیں ہے جس طرح البنین کا لفظ البنات کو شامل نہیں ہے یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ماں کو ایک بھائی اور ایک بہن ثلث سے سدس کی طرف محجوب نہیں کرے گی اور یہ مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ جب آیت میں بھائیوں کے ساتھ بہنیں مراد ہیں تو انفرادی طور پر بھی مراد ہوں گی اور تمام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جمع کا کم از کم فرد تثنیہ (2) ہے کیونکہ تثنیہ کا معنی ایک چیز کو اس کی مثل کے ساتھ جمع کرنا ہے پس معنی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ جمع ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: دو اور اس سے اوپر جماعت ہیں (1)۔ سیبویہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے خلیل سے ما احسن وجوھما کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے کہا: دو جماعت ہیں۔

شاعر کا قول صحیح ہے:

وَمَهْمَهَيْنِ　قَذَفَيْنِ　مَرْتَيْن　　ظهراهما مِثْلُ ظُهورِ التُّرْسَيْنِ

خوفناک چٹیل دو میدان بہت دور ایسی زمینیں جن پر نہ پانی ہے نہ نبات ان کی بلند جگہیں ڈھالوں کی بلند جگہوں کی مثل ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لما أتتنا المرأتان بالخَبَرْ　　فقلن إن الأمر فينا قد شُهِرْ

جب دو عورتیں ہمارے پاس خبر لائیں تو انہوں نے کہا: ہمارے متعلق معاملہ شہرت پا چکا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب الاثنان جماعۃ، حدیث نمبر 961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُحيىٰ بالسلام غِنىٰ قومِ ويُبخَل بالسلام على الفقيرِ
أليس الموت بينهما سواء إذا ماتوا وصاروا فى القبورِ

غنی شخص کو سلام کیا جاتا ہے اور فقیر پر سلام کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔ کیا ان دونوں میں موت برابر نہیں ہوگی جب مریں گے اور قبور میں جائیں گے؟

جب حضرت عثمان اور حضرت ابن عباس کے درمیان کلام واقع ہوئی تو حضرت عثمان نے حضرت ابن عباس سے کہا: ان قومك حجبوها تیری قوم نے انہیں (قریش) محجوب کر دیا ہے۔ وہ اہل فصاحت و بلاغت تھے اور جن علماء نے جمع کا کم از کم فرد تین کو بنایا ہے۔ اگر چہ یہاں انہوں نے بھی نہیں کہا۔ وہ حضرت ابن مسعود، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم وغیرہم ہیں۔

مسئلہ نمبر 20۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ابن کثیر، ابوعمرو، ابن عامر اور عاصم نے یوصی (صاد کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور باقی قراء نے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح دوسرے کو بھی پڑھا گیا ہے اور دونوں جگہ يُوۡصِىۡ کے متعلق عاصم سے مختلف اقوال ہیں۔ صاد پر کسرہ ابوعبیدہ اور ابوحاتم کا اختیار ہے، کیونکہ میت کا ذکر اس سے پہلے جاری ہے۔ اخفش نے کہا: اس کی تصدیق یہ ارشاد کر رہا ہے یوصین اور توصون۔

مسئلہ نمبر 21۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرض کے ذکر پر وصیت کے ذکر کو مقدم کرنے میں کیا حکمت ہے حالانکہ دین بالاجماع مقدم ہے۔ ترمذی نے حارث عن علی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض کو وصیت سے پہلے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور تم قرض سے پہلے وصیت کو ثابت کرتے ہو(1)۔ فرمایا: عام اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے کہ وصیت سے پہلے قرض کو پورا کیا جائے گا۔ دارقطنی نے عاصم بن ضمرہ عن علی رضی اللہ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دین (قرض) وصیت سے پہلے ہے اور وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابواسحاق ہمدانی نے روایت کیا ہے اس کا جواب پانچ وجوہ سے ہے۔

(۱) ان دو فصلوں کو میراث پر مقدم کرنے کا قصد کیا ہے اور ان کی ذوات میں ترتیب کا قصد نہیں کیا اسی وجہ سے لفظ میں وصیت مقدم ہے۔

(۲) جب وصیت لزوم کے اعتبار سے قرضہ کی نسبت کم تھی تو اس کے اہتمام کے لیے اسے مقدم فرمایا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً (الکہف:49)

(۳) وصیت کے وجود اور وقوع کی کثرت کی وجہ سے اسے مقدم فرمایا۔ پس یہ ہر میت کے لیے لازم کی طرح ہوگی جب کہ اس پر شرع کی نص بھی موجود ہے اور دین (قرضہ) کے اس کے کم ہونے کی وجہ سے اسے مؤخر فرمایا، کیونکہ قرض کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے پس اس کے ذکر سے آغاز کیا جو ضروری تھا اور اس کا عطف کیا جو کبھی کبھی واقع ہوتا ہے اور او کے ساتھ عطف اس کو مزید قوت دیتا ہے اگر قرض بھی ضروری ہوتا تو عطف واؤ کے ساتھ ہوتا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا من رسول اللہ، باب ماجاء یبدأ بالدین قبل الوصیۃ، حدیث نمبر 2048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۴) وصیت کو مقدم فرمایا، کیونکہ یہ مساکین اور کمزور لوگوں کا حصہ ہے اور قرض کو مؤخر فرمایا، کیونکہ وہ قرض خواہ کا حصہ ہے وہ سلطان کی طاقت کے ذریعے طلب کر سکتا ہے اور اسے اس میں کلام کی گنجائش ہے۔

(۵) وصیت کا منشاء انسان کی اپنی ذات سے ہے اس لیے اسے مقدم فرمایا اور قرض تو ادا کیا ہی جاتا ہے خواہ اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 22۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو امام شافعی نے میراث پر حج اور زکوٰۃ کے قرض کو مقدم فرمایا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب کوئی شخص زکوٰۃ میں سستی کرے تو اس کے راس المال سے زکوٰۃ لینا واجب ہے۔ یہ بادی النظر میں ظاہر ہے، کیونکہ یہ بھی حقوق میں سے ایک حق ہے پس موت کے بعد اس سے اس کی ادائیگی لازم ہے جس طرح انسانوں کے حقوق کا حکم ہے خصوصاً زکوٰۃ کا مصرف بھی آدمی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے کہا: اگر میت نے اس کی وصیت کی ہو تو اس کے تہائی مال سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی اگر خاموش رہا تو کوئی چیز اس کے مال سے نہیں نکالی جائے گی۔ یہ علماء فرماتے ہیں: کیونکہ یہ تو ورثاء کو فقراء چھوڑنے کے مترادف ہے مگر اس نے جان بوجھ کر تمام حقوق ترک کیے ہوں حتی کہ جب وہ فوت ہو تو یہ اس کے تمام مال کو گھیر لیں تو پھر ورثاء کے لیے کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔

مسئلہ نمبر 23۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ مبتدا کی وجہ سے ان پر رفع پڑھا گیا ہے اور خبر مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ھم المقسوم علیھم وھم المعطون ان پر مال تقسیم ہو گا اور انہیں دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 24۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا بعض علماء نے فرمایا: تم نہیں جانتے کہ دعا اور صدقہ کے اعتبار سے دنیا میں کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ان الرجل لیرفع بدعاء ولدہ من بعدہ انسان کا مرتبہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کی دعا کی وجہ سے بلند کیا جاتا ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے جب انسان مرتا ہے تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا اجر اور فائدہ اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ اس حدیث میں ہے "اور نیک بیٹا جو باپ کے لیے دعا کرتا ہے" اور بعض علماء نے فرمایا: آخرت میں جو زیادہ نفع بخش ہے تم اسے نہیں جانتے۔ کبھی بیٹا افضل ہوتا ہے پس وہ اپنے باپ کی سفارش کرے گا۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے کہ بعض مفسرین نے کہا: بیٹا جب آخرت میں باپ کے درجہ سے افضل درجہ میں ہو گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے باپ کو اس کی طرف بلند کر دے گا اسی طرح باپ جب اپنے بیٹے سے بلند درجہ ہو گا تو وہ بھی سوال کرے گا تو اللہ تعالیٰ بیٹے کو باپ کے پاس پہنچا دے گا۔ اس کی مزید تفصیل سورۃ الطور میں آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: دنیا و آخرت کے اعتبار سے ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے لفظ اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 25۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَرِيْضَةً اس کو مصدر مؤکد کی بنا پر نصب ہے، کیونکہ يُوْصِيْكُمُ کا معنی ہے یفرض علیکم۔ مکی وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہے اور اس میں عامل یوصیکم ہے اور یہ ضعیف قول ہے۔ امت ماقبل سے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بتایا کہ وہ قرابت کی وجہ سے خود حکم کرنے کی مشقت سے بچائے گئے ہیں جب کہ تمہارے رشتہ دار قرابت میں جمع ہو جائیں یعنی آباء، ابناء دنیا میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور آخرت میں شفاعت

کرتے ہیں جب یہ آباء اور ابناء میں ثابت ہو گیا تو تمام اقارب میں ثابت ہو گیا اگر تقسیم اجتہاد پر موقوف ہوتی تو رشتہ داروں میں سے ہر ایک کے غنا میں نظر کرنا واجب ہوتا اور اس وقت امر ضبط سے خارج ہو جاتا، کیونکہ امر مختلف ہو جاتا پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ بندے کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو مواریث کی مقدار میں استعمال نہ کرے بلکہ شرعی مقادیر کو بیان کرے۔ پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا اللہ تعالیٰ مواریث کی تقسیم کو جاننے والا ہے۔ حَكِيْمًا اس نے مواریث کی تقسیم کو پختہ فرمایا اور اس کے اہل کو بیان فرمایا۔ زجاج نے کہا: عَلِيْمًا یعنی اشیاء کو ان کی تخلیق سے پہلے جانتا ہے۔ حَكِيْمًا ہر چیز کو مقدر کرنے میں اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ماضی اور مستقبل برابر ہیں۔ اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے حکمت وعلم کو دیکھا تو انہیں کہا گیا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اسی طرح تھا جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔

مسئلہ نمبر 26۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ یہ خطاب مردوں کو ہے اور یہاں الولد سے مراد صلبی بیٹے اور پوتے ہیں اگرچہ نیچے کے ہوں مذکر ہوں یا مؤنث ہوں ایک ہو یا زائد ہوں یہ بالا جماع ثابت ہے۔ اور علماء سے اس پر بھی اجماع ہے کہ بیٹے یا پوتے نہ ہوں تو خاوند کے لیے نصف ہے اور بیٹے یا پوتے کے ہوتے ہوئے 1/4 ہے۔ بیوی اپنے خاوند سے 1/4 کی وارث ہوگی جب کہ اس کی اولاد نہ ہو اور اولاد کے ہوتے ہوئے بیوی کو 1/8 ملے گا اور علماء کا اجماع ہے کہ ایک بیوی ہو، دو ہوں، تین ہوں، چار ہوں تمام کا حکم ایک بیوی کا ہے اگر خاوند کی اولاد نہ ہوگی تو سب کو 1/4 حصہ ملے گا اور ایک بیٹا بھی ہوگا تو 1/8 حصہ ملے گا۔ تمام 1/8 میں شریک ہوں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور تمام کے حکم میں کوئی فرق نہیں کیا، جس طرح کہ ایک بیٹی اور ایک بہن اور بہت سی بیٹیوں اور بہنوں کے درمیان فرق کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 27۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً، الکلالہ مصدر ہے۔ تکللہ النسب یعنی احاط بہ۔ اسی سے الاکلیل ہے۔ یہ چاند کی منزلوں میں ایک منزل ہے وہ چاند کو گھیر لیتی ہے۔ اسی سے الاکلیل ہے۔ اس کا مطلب تاج، پگڑی ہے جو سر کو گھیر لیتی ہے جب انسان فوت ہو اور اس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو تو اس کا ورثہ کلالہ ہے یہ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔ یحییٰ بن آدم نے شریک، زہیر اور ابوالاحوص سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے سلیمان بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے علماء کو اس پر متفق دیکھا ہے کہ کلالہ وہ ہے جو فوت ہو اور اس کی اولاد اور والد نہ ہو۔ اسی طرح کتاب العین کے مصنف ابو منصور اللغوی، ابن عرفہ، قتبی، ابو عبید، ابن الانباری نے کہا ہے: الاب، الابن دونوں انسان کی طرفیں ہیں جب وہ دونوں نہ ہوں تو اس کا نسب اس کو گھیر لیتا ہے۔

اسی سے کہا جاتا ہے: روضۃ مکللہ جب روضہ نور سے گھیرا گیا ہو۔ بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

سَكَنَهُ روضۃٌ مُكَلَّلَةٌ عم بها الأيْقُان و الذُّرَق

اس کا مسکن نورانی روضہ ہے اس کے اردگرد گھاس اور بوٹیاں ہیں۔

امرؤ القیس نے کہا:

أصاحِ ترى بَرْقا أُرِيكَ ومِيضَهُ كلمعِ اليَدينِ فى حَبِىٍّ مُكَلَّلِ

قرابت کو کلالۃ کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے میت کو تمام جوانب سے گھیر لیا ہوتا ہے وہ نہ ان سے ہوتے ہیں اور نہ وہ ان سے ہوتا ہے۔ وہ اسے گھیر لیتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ منسوب ہوتے ہیں جیسا کہ اعرابی نے کہا: مالی کثیر و یرثنی کلالہ متراخ نسبھم۔ میرا مال کثیر ہے اور میرے رشتہ دار میرے وارث ہیں۔ جن کا نسب متاخر ہے۔

فرزدق نے کہا:

وَرِثتم قناۃ المجد لاعن کلالۃٍ عن ابنی مناف عبدِ شمسٍ و ھاشِم

اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

إنّ أبا المَرْءِ أحمى له ومَوْلَى الكلالة لا يغضبُ

بعض علماء نے فرمایا: کلالہ، کلال سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے تھکانا، گویا وہ میراث کو وارث کی طرف دور سے تھکا کر لوٹاتا ہے۔ اعشی نے کہا:

فأليت لا أرثى لها من كلالة ولا من وَجَى حتى تلاقِى محمدا

ابوحاتم اور الاثرم نے ابوعبیدہ سے روایت کیا ہے فرمایا: کلالۃ وہ ہوتا ہے جس کا نہ باپ، نہ بیٹا اور نہ بھائی وارث ہو۔ ابو عمر نے کہا: ابوعبیدہ کا باپ اور بیٹے کے ساتھ کلالہ کی شرط میں بھائی کا ذکر غلط ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کلالہ کی شرط میں بھائی کو ذکر نہیں کیا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ حضرت ابوبکر سے یہ مروی تھا پھر ان دونوں حضرات نے اس سے رجوع کر لیا۔ ابن زید نے کہا: کلالہ زندہ اور میت دونوں ہوتے ہیں۔ عطاء سے مروی ہے کہ الکلالۃ سے مراد مال ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ عجیب قول ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی وجہ ہے اعراب سے ابھی یہ واضح کیا گیا ہے۔ ابن اعرابی سے مروی ہے کہ کلالہ دور کے چچا کے بیٹے ہیں۔ سدی سے مروی ہے کہ کلالہ میت ہے اور ان سے جمہور کے قول کی مثل مروی ہے۔ یہ اقوال ان کی وجوہ بھی اعراب سے واضح ہوئی ہیں بعض کوفیوں نے یورّث کلالۃ یعنی را کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن اور ایوب نے یورث را کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اصحاب المعانی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا ورث سے اور دوسرا اورث سے مشتق ہے۔ کلالہ مفعول ہے اور کان بمعنی وقع ہے اور جنہوں نے یورث را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے نزدیک بھی کلالہ سے مراد مال ہونے کا احتمال ہے۔ تقدیر ہوگی یورث ورثۃ کلالۃ۔ اس صورت میں یہ مصدر محذوف کی صفت ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ کلالہ ورثاء کا اسم ہو اور یہ کان کی خبر ہو۔ تقدیر یوں ہوگی ذا ورثۃ۔ اور کان کا تامہ ہونا بھی جائز ہے۔ یورث، رجل کی صفت ہے۔ رجل کو رفع کان کی وجہ سے ہے اور کلالۃ تفسیر یا حال کی بنا پر منصوب ہے اس بنا پر کہ کلالہ سے مراد میت ہو۔ تقدیر یوں ہوگی وان کان رجل یورث متکلل النسب الی المیت۔

مسئلہ نمبر 28۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کلالہ کا دو جگہوں پر ذکر فرمایا ہے۔ سورہ کے آخر میں اور یہاں۔ اور

دونوں جگہوں میں بھائیوں کے علاوہ کسی وارث کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور رہی یہ آیت تو علماء کا اجماع ہے کہ اس میں بھائیوں سے مراد ماں کی طرف سے بھائی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ (اگر وہ زیادہ ہوں اس سے تو وہ تہائی میں شریک ہیں) اور حضرت سعد بن ابی وقاص ولہ اخ واخت من امہ پڑھتے تھے اور اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ سگے بھائی یا باپ کی طرف سے بھائی ان کی میراث اس طرح نہیں ہے پس ان کا اجماع دلیل ہے کہ سورۃ کے آخر میں جن بھائیوں کا ذکر ہے وہ متوفی کے سگے بھائی ہیں یا باپ کی طرف سے بھائی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ اور اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ماں کی طرف سے بھائیوں کی میراث اس طرح نہیں۔ پس یہ دونوں آیتیں دلالت کرتی ہیں کہ تمام بھائی کلالۃ ہیں۔ شعبی نے کہا: اولاد اور والد کے علاوہ ورثاء کلالۃ ہیں خواہ وہ بھائی ہوں یا دوسرے عصبہ ہوں۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت زید اور حضرت ابن عباس نے بھی یہی فرمایا ہے اور پہلا قول بھی یہی ہے جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ طبری نے کہا: درست بات یہ ہے کہ کلالۃ وہ لوگ ہیں جو میت کے وارث ہوتے ہیں سوائے اولاد اور والد کے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خبر صحیح میں ہے۔ "میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کلالہ میرے وارث ہوں گے کیا میں سارے مال کی وصیت کردوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں"۔

مسئلہ نمبر 29۔ اہل لغت نے کہا: کہا جاتا ہے رجل کلالۃ و امرأۃ کلالۃ۔ اس کا نہ تثنیہ ہوتا ہے اور نہ جمع، کیونکہ یہ مصدر ہے جیسے وکالۃ، دلالۃ، سماحۃ، شجاعۃ۔ اس کی طرف ضمیر مفرد لوٹائی فرمایا: ولہ اخ، لہما کی ضمیر نہیں ذکر فرمائی۔ عربوں کی عادت پر مرد اور عورت پہلے ذکر ہو چکے ہوں تو جب وہ دو اسم ذکر کرتے ہیں پھر ان کے متعلق خبر دیتے ہیں اور وہ دونوں ایک حکم میں ہوتے ہیں تو کبھی ایک اسم کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے اور کبھی دونوں کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے۔ عرب کہتے ہیں: جس کے پاس غلام اور لونڈی ہوں تو کہتے ہیں: فلیحسن الیہ والیہما والیہم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (بقرہ: 45)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (النساء: 135)

اور اَوْلٰى بِهِمَا جائز ہے۔ یہ فراء وغیرہ سے مروی ہے۔ اور امرأۃ کے لیے مراۃ بھی کہا جاتا ہے یہ اس کی اصل ہے۔ اخ کی اصل اَخَوٌ ہے اس پر دلیل اخوان ہے۔ اخ سے واؤ کو حذف کیا گیا اور بغیر قیاس کے اس میں یہ تبدیلی کی گئی۔ فراء نے کہا: اخت کے ہمزہ کو ضمہ دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے واؤ کو حذف کیا گیا ہے اور بنت کے پہلے حرف کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے یاء حذف کی گئی ہے اور یہ حذف اور تعلیل غیر قیاسی ہے۔

مسئلہ نمبر 30۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ۔ یہ تشریک مذکر اور مؤنث کے درمیان برابری کا تقاضا کرتی ہے اگرچہ زیادہ بھی ہوں، جب وہ ماں کی وجہ سے حصہ پائیں گے تو مؤنث پر مذکر کو ترجیح نہ ہوگی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے اور فرائض میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مذکر اور مؤنث برابر ہوں مگر ماں کی طرف سے بھائیوں کی میراث میں یہ برابر ہوتے ہیں۔ جب کوئی عورت فوت ہو جائے اور اپنا خاوند، ماں اور ماں کی طرف سے بھائی

چھوڑ جائے تو خاوند کو نصف حصہ ملے گا، ماں کو 1/3 حصہ ملے گا اور 1/6 حصہ ماں کی طرف سے بھائی کو ملے گا۔ اور اگر دو بھائی اور دو بہنیں چھوڑے تو مسئلہ پھر بھی اسی طرح ہوگا خاوند کے لیے 1/2 ماں کے لیے 1/6 اور بھائیوں اور بہنوں کے لیے 1/3 حصہ ہوگا۔ اس طرح فریضہ مکمل ہوگیا۔ اسی پر عام صحابہ کا مسلک ہے۔ کیونکہ انہوں نے ماں کو بھائی اور بہن کی وجہ سے ثلث سے سدس کی طرف مجوب کر دیا ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عول کا اعتبار نہیں کیا۔ اگر ماں کے لیے 1/3 ہوں تو مسئلہ میں عول ہوگا اور وہ عول کا نظریہ نہیں رکھتے۔ عول کی وضاحت دوسرے مقام پر آئے گی یہ اس کا مقام نہیں ہے۔ اگر عورت اپنے خاوند، ماں کی طرف سے بہت سے بھائی اور سگا ایک بھائی چھوڑ کر جائے تو خاوند کے لیے 1/2 حصہ ہوگا ماں کی طرف سے بھائیوں کو 1/3 حصہ ملے گا اور باقی مال سگے بھائیوں کے لیے ہوگا۔ اسی طرح جس کے لیے مقررہ حصہ ہوگا وہ اسے دیا جائے گا اور باقی اگر بچے گا تو عصبہ کے لیے ہوگا۔ اگر عورت چھ متفرق بھائی چھوڑ جائے تو یہ مسئلہ حماریہ ہے اسے مشترکہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک قوم نے کہا: ماں کی طرف سے بھائیوں کے لیے 1/3 ہے اور خاوند کے لیے 1/2 ہے اور ماں کے لیے 1/6 ہے۔ سگے بھائی اور بہن اور باپ کی طرف سے بھائی اور بہن محروم ہو جائیں گے۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوموسیٰ، شعبی، شریک اور یحییٰ بن آدم سے یہی مروی ہے اور یہی قول امام احمد بن حنبل کا ہے اور ابن المنذر نے اس کو اختیار کیا ہے، کیونکہ خاوند، ماں اور ماں کی طرف سے بھائی اصحاب فرائض ہیں اور عصبہ کے لیے کچھ نہیں بچا ہے۔ ایک قوم نے کہا: ماں ایک ہے اور ان کا باپ گدھا تھا اور انہوں نے ان کے درمیان ثلث میں اشتراک کی ہے اسی وجہ سے اسے مشترکہ اور حماریہ مسئلہ کہتے ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود، مسروق اور شریح سے یہی مروی ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور اسحاق کا بھی قول ہے۔ یہ مسئلہ درست نہیں رہتا اگر میت مرد ہو۔ یہ علم الفرائض کے مسائل تھے جن کو یہ آیت متضمن تھی واللہ الموفق۔

زمانہ جاہلیت میں وراثت مرد ہونے اور قوت والا ہونے کی حیثیت سے جاری ہوتی تھی اور لوگ صرف مردوں کو وارث بناتے تھے عورتوں کو وارث نہیں بناتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ کے ارشاد کے ساتھ اس باطل نظریہ کو ختم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ورثاء زمانہ جاہلیت میں اسی طرح تھے اور اسلام کے آغاز میں حلیف ہونے کے اعتبار سے وارث ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ حلیف ہونے کے بعد ہجرت کی وجہ سے ورثہ ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا (الانفال: 72) اس کی تفصیل آئندہ آئے گی وہاں ذوی الارحام اور ان کی میراث کے متعلق قول آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور سورۃ النور میں ملاعنۃ کے لڑکے ولد الزنا (حرامی) اور مکاتب کی میراث کا ذکر توفیق الٰہی سے ہو گا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: وہ قیدی جس کی زندگی معلوم ہو اس کی میراث ثابت ہے، کیونکہ وہ بھی ان مسلمانوں میں داخل ہے جن پر احکام اسلام جاری ہوتے ہیں اور سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ جو دشمن کے ہاتھ میں قیدی ہے وہ وارث نہیں ہے اور مرتد کی میراث سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 31۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے غَیۡرَ مُضَآرٍّ اس کو نصب حال کی بنا پر ہے اور اس کا عامل یوصی ہے۔ ای یوصی بھا غیر مضار۔ یعنی ورثاء پر ضرر (نقصان) کو داخل کرنے والا نہ ہو یعنی اسے اپنے اوپر ایسے قرض کی وصیت کرنا مناسب نہیں جو اس پر نہیں ہے، تا کہ ورثاء کو ضرر نہ ہو اور نہ قرض کا اقرار کرے۔ الاضرار کا تعلق وصیت اور دین سے (قرض) ہے۔ رہا وصیت کی طرف اس کا مرجع تو وہ یہ ہے کہ وہ 1/3 حصہ سے زائد کی وصیت کر دے یا کسی وارث کے لیے وصیت کر دے اگر وہ 1/3 سے زائد کی وصیت کرے گا تو اسے لوٹا یا جائے گا مگر یہ کہ ورثاء اسے جائز قرار دیں، کیونکہ زیادہ وصیت سے روکنا ورثاء کے حقوق کی وجہ سے ہے نہ کہ حق اللہ کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ وارث کے لیے وصیت کرے گا تو وہ میراث کی طرف لوٹے گا۔ علماء کا اجماع ہے کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ رہا اضرار کو قرض کی طرف لوٹانا تو وہ یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں قرض کا اقرار کرے جس میں اس کے لیے اقرار جائز نہیں ہے جیسا کہ اگر وہ مرض میں وارث کے لیے یا مہربان دوست کے لیے قرض کا اقرار کرے تو یہ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے غیر مضار وصیۃ من اللہ پڑھا ہے یعنی مضار کو وصیت کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ اسم فاعل مصدر کی طرف مضاف نہیں ہوتا اور حذف پر قرأت بہتر ہے اور معنی یہ ہے غیر مضار ذی وصیۃ۔ یعنی وہ وصیت کی وجہ سے اپنے ورثاء کو ان کی میراث میں نقصان دینے والا نہ ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ حالت مرض میں غیر وارث کے لیے قرض کا اقرار جائز ہے جبکہ صحت کی حالت میں اس پر قرض نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 32۔ اگر صحت کی حالت میں قرض اس پر دلیل سے ثابت ہو اور وہ اجنبی کے لیے قرض کا اقرار کرے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ صحت کے دین سے ادائیگی کا آغاز کیا جائے گا۔ یہ نخعی اور کوفیوں کا قول ہے۔ فرماتے ہیں: حالت صحت میں قرض دینے والا جب اپنا قرض وصول کرلے گا تو مرض میں جن لوگوں کے لیے اس نے قرض کا اقرار کیا ہے پھر وہ حصہ لیں گے۔ ایک طائفہ نے کہا کہ حالت صحت میں قرض دینے والے اور حالت مرض میں جن کے لیے اس میت نے اقرار کیا ہے دونوں برابر ہوں گے جب کہ وہ اقرار غیر وارث کے لیے ہو۔ یہ امام شافعی، ابو ثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ ابو عبید نے ذکر کیا ہے کہ یہ اہل مدینہ کا قول ہے اور انہوں نے حسن سے یہ روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33۔ سورۂ بقرہ میں وصیت میں اضرار کے بارے میں وعید اور اس کی وجوہ گزر چکی ہیں۔ ابو داؤد نے شہر بن حوشب (اس پر طعن کیا گیا ہے) کی حدیث سے روایت کیا ہے شہر بن حوشب نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مرد یا عورت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عمل ساٹھ سال کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے تو وہ وصیت میں نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لیے آگ ثابت ہو جاتی ہے (1)۔ فرمایا: حضرت ابو ہریرہ نے مجھ پر یہ آیت مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ۙ غَيۡرَ مُضَآرٍّ سے لے کر ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝ تک پڑھی۔ حضرت

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی کراہیۃ الاضرار فی الوصیۃ، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عباس نے فرمایا: وصیت میں اضرار، کبیرہ گناہوں میں سے ہے یہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے مگر امام مالک اور ابن القاسم کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وصیت کرنے والے کا فعل 1/3 حصہ میں نقصان دینے والا شمار نہ ہوگا، کیونکہ تہائی میں تصرف کرنا اس کا حق ہے جیسے چاہے تصرف کرے۔ اور المذہب میں یہ قول ہے کہ نقصان کی صورت میں اسے لوٹایا جائے گا۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 34۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَصِيَّةً اس کو حال کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے، یہ مصدر ہے اس کا عامل يُوْصِيْكُمْ ہے۔ اس میں مضار کا عمل کرنا بھی صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کے ساتھ ضرر واقع ہو یا اس کے سبب واقع ہو اس پر ضرر کا وقوع مجازا ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ حسن بن ابی الحسن نے غَيْرَ مُضَآرِّ وَصِيَّةً کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے جیسے تو کہتا ہے: شجاع حرب وبضة المتجرد۔ یہ طرفہ بن العبد کے شعر میں استعمال ہوا ہے اور معنی کی صحت کی وجہ سے لفظ میں مجاز ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر فرمایا: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ یعنی اہل میراث کو جاننے والا ہے اور تم میں جاہل لوگوں کو جاننے والا ہے اور بعض متقدمین نے واللہ علیم حکیم پڑھا ہے یعنی میراث اور وصیت کی تقسیم کو پختہ کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 35۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، تلك، هذه کے معنی میں ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جن کو اس نے تمہارے لیے بیان کیا ہے تاکہ تم ان کو پہچان لو اور ان کے مطابق عمل کرو۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جو میراث کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور اس کا اقرار کرے گا اور ان کے مطابق عمل کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے: يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، تَجْرِيْ جنت کی نعت کی بنا پر منصوب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی جو میراث کی تقسیم نہیں کرتا اور ان پر عمل نہیں کرتا وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ اور اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کرتا ہے يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا۔ اگر نافرمانی سے مراد کفر ہے تو آگ میں ہمیشہ رہنا اپنے مفہوم پر صحیح ہوگا، اگر اس سے مراد گناہ کبیرہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے اوامر سے تجاوز ہو تو ہمیشہ رہنا ایک مدت تک کے لیے ہوگا۔ جیسے تو کہتا ہے: خلد الله ملكه (اللہ تعالیٰ اس کا ملک ہمیشہ رکھے) زہیر نے کہا:

ولا خالدا الا الجبال الرواسيا

(یعنی گاڑھے ہوئے پہاڑوں کے علاوہ کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں) یہ مفہوم بہت سے مقام پر گزر چکا ہے۔ نافع اور ابن عامر نے ندخله اور دونوں جگہ نون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت فرمائی ہے اور باقی علماء نے دونوں جگہ یا کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے داخل کرے گا۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝

''اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بند کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کرے

ان (کی زندگی) کو موت یا بنا دے اللہ تعالیٰ ان (کی رہائی) کے لیے کوئی راستہ"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں عورتوں سے حسن سلوک کرنے اور انہیں مہر دینے کا ذکر فرمایا تو پھر مردوں کے ساتھ ان کی میراث کا بھی ذکر فرمایا اور وہ اگر غلط کاری کریں تو ان پر سختی کرنے کا ذکر فرمایا تا کہ عورت کو یہ وہم نہ ہو کہ اس کے لیے پاکدامنی کا ترک بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰتِيْ یہ التی کی جمع ہے یہ مؤنث کے لیے مبہم اسم ہے اور یہ معرفہ ہے نکرہ بنانے کے لیے اس سے الف، لام کو دور کرنا جائز نہیں ہے اور یہ صلہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ اس میں تین لغات ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس کی جمع اللاتِ یعنی یا کے حذف اور کسرہ کے باقی رکھنے کے ساتھ بھی بنائی جاتی ہے اور اللائی ہمزہ اور یا کے اثبات کے ساتھ بھی جمع آتی ہے اور اللاء ہمزہ کے کسرہ اور یا کے حذف کے ساتھ بھی آتی ہے اللا ہمزہ کے حذف کے ساتھ بھی جمع آتی ہے اگر تو جمع کی جمع بنائے تو اللاتی کی جمع اللواتی اور اللاء کی جمع اللوائی بنائے گا۔ عربوں سے اللوات یعنی تا کے حذف اور کسرہ کے اثبات کے ساتھ بھی مروی ہے۔ یہ ابن الشجری کا قول ہے۔ جوہری نے کہا: ابوعبیدہ نے یہ شعر کہا ہے:

من اللّواتِي والتِي واللاّتِ زَعَمنَ أنْ قد كَبُرتُ لِداتِ

اللوا، تا کے اسقاط کے ساتھ ہے۔ التی کی تصغیر اللَّتَیَّا فتحہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔ راجز نے کہا:

بعد اللُّتيا واللَّتيا والتي

بعض شعراء نے التی پر حرف ندا داخل کیا ہے جب کہ حروف ندا اس اسم پر داخل نہیں ہوتے جس پر الف لام ہو سوائے ہمارے قول: یا اللہ کے۔ گویا التی کو اس اسم جلالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس حیثیت سے کہ الف، لام اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

من أجلِك يالتِي تَيَّمتِ قلبِي وأنتِ بَخِيلَةٌ بِالوِدِّ عَنِّي

کہا جاتا ہے: یہ اللَّتیا اور اللّتی یہ دونوں داهية (مصیبت) کے اسماء میں سے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ یہاں فاحشۃ سے مراد زنا ہے اور الْفَاحِشَةَ برے فعل کو کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے جیسے عاقبة اور عافية مصدر ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے با جارہ کے ساتھ بالفاحشة پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ نِّسَآئِكُمْ اسلام کے معنی میں اضافت ہے اور مومن عورتوں کی حالت کا بیان ہے جیسے ارشاد فرمایا: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (بقرہ: 282) کیونکہ کافرہ کبھی نسب کی وجہ سے مسلمانوں کی عورتوں سے ہوتی ہے اس کو یہ حکم لاحق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ یعنی مسلمانوں میں سے ان پر چار گواہ بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے زنا پر خصوصی طور پر چار گواہ مقرر فرمائے، مدعی پر تغلیظ اور بندوں کی پردہ پوشی کے لیے اور زنا پر چار

گواہوں کی تعدیل کا حکم تورات، انجیل اور قرآن میں ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً (النور: 4)

اور یہاں فرمایا: فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ۔ ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: یہود اپنے ایک مرد اور عورت کو لے آئے جنہوں نے زنا کیا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس اپنے دو عالم آدمی لے آؤ، تو وہ صوریا کے دو بیٹے لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تم تورات میں ان دونوں کا معاملہ کیسے پاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم تورات میں دیکھتے ہیں کہ جب چار آدمی گواہی دیں کہ انہوں نے اس کا آلہ تناسل، عورت کی شرمگاہ میں اس طرح دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سرچو ہوتا ہے تو ان دونوں کو رجم کیا جائے گا۔ فرمایا: تم لوگوں کو کون سی چیز ان کے رجم کرنے سے مانع تھی؟ انہوں نے کہا: ہماری سلطانی چلی گئی، پس ہم قتل کو ناپسند کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہوں کو بلایا وہ آئے اور گواہی دی کہ انہوں نے اس کا ذکر اس کی فرج میں سرمہ دانی میں سرچو کی طرح دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو رجم کرنے کا حکم دیا (1)۔ ایک قوم نے کہا: زنا میں چار گواہ ہیں تاکہ زنا کرنے والوں میں سے ہر ایک پر دو دو گواہ گواہی دیں جس طرح دوسرے حقوق میں گواہ گواہی دیتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا حق ہے جو ان میں سے ہر ایک سے لیا جائے گا۔ یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ قسم، اموال میں داخل ہوتی ہے اور اللوث، قسامت میں داخل ہے اور ان میں سے یہاں کسی ایک کا دخل نہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ گواہوں کے لیے مذکر ہونا ضروری ہے، کیونکہ ارشاد ہے مِّنْكُمْ اس میں امت کا کوئی اختلاف نہیں اور گواہ عادل ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیوع اور رجعت میں عدالت شرط قرار دی ہے۔ یہ بڑا معاملہ ہے اور یہ اس کے لیے اولیٰ ہے اور یہ دلیل کے ساتھ مقید پر مطلق کو حمل کرنے سے ہے جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔ گواہ ذمی نہ ہوں گے اگرچہ حکم، ذمیہ پر بھی لگایا ہو۔ سورۂ مائدہ میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور امام ابو حنیفہ نے اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ کے قول سے اس مسئلہ میں دلیل پکڑی ہے کہ قذف میں جب ایک گواہ خاوند ہو تو لعان نہ ہوگا اس کا بیان ان شاء اللہ، سورۂ نور میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ یہ زنا کرنے والوں کی پہلی سزا ہے اور یہ ابتداء اسلام میں تھا۔ یہ حضرت عبادہ بن صامت، حسن اور مجاہد کا قول ہے حتیٰ کہ بعد والی اذیت کے ساتھ یہ سزا منسوخ ہوگئی پھر وہ اذیت سورۂ نور کی آیت کے ساتھ اور ثیبہ میں رجم کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ ایک فرقہ نے کہا: اذیت پہلی سزا تھی پھر امساک کے ساتھ وہ منسوخ ہوگئی لیکن تلاوت مؤخر مقدم کی گئی۔ یہ ابن فورک کا قول ہے اور یہ گھروں میں امساک اور حبس ابتداء اسلام میں تھا جب کہ ایسا جرم کرنے والے کم تھے، جب زیادہ ہوگئے اور ان کی قوت کا خدشہ ہوا تو ان کے لیے قید بنائی گئی۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ قید حد تھی یا حد کی وعید دی تھی؟ دو قول ہیں (1) حد کی دھمکی دی گئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حد ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔ ابن زید نے یہ زائد کہا ہے کہ انہیں نکاح کرنے سے منع کیا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود باب فی رجم الیہودیین، حدیث نمبر 3862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا حتی کہ وہ مرجائیں یہ ان کے لیے بطور سزا ہے جب انہوں نے نکاح کو بغیر وجہ کے طلب کیا۔ یہ دلیل ہے کہ وہ حد تھی بلکہ اس سے بھی سخت تھی مگر یہ حکم ایک حد تک محدود تھا اور وہ دوسری آیت میں اذیت ہے، دونوں تاویلوں کے اختلاف پر کہ کون سی آیت پہلے ہے۔ دونوں سزائیں ایک حد تک محدود تھیں۔ اور وہ غایت حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث میں موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھ سے حاصل کرو، مجھ سے حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راستہ بنایا ہے کنوارے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ کی سزا سو کوڑے اور رجم ہے''۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (بقرہ:187) جب رات آئے گی تو اس کی غایت کی انتہا کی وجہ سے روزے کا حکم اٹھ جائے گا نہ کہ اس کے منسوخ ہونے کی وجہ سے حکم اٹھ جائے گا۔ یہ متاخرین محققین اصولین کا قول ہے۔ نسخ دو متعارض قولوں میں ہوتا ہے جن کو کسی اعتبار سے جمع کرنا ممکن نہ ہو اور قید، تعزیر، کوڑے اور رجم کو جمع کرنا ممکن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اذیت اور تعزیر، کوڑوں کے ساتھ باقی ہے، کیونکہ یہ متعارض نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں ایک شخص پر لاگو کیے جائیں گے، رہا قید کرنا، تو یہ اجماع کے ساتھ منسوخ ہے اور متقدمین کا ایسی صورت میں نسخ کا اطلاق مجازاً ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ⑯

''جو مرد و عورت ارتکاب کریں بدکاری کا تم میں سے تو خوب اذیت دو انہیں پھر اگر دونوں توبہ کرلیں اور (اپنی) اصلاح کرلیں تو چھوڑ دو انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذٰنِ یہ الذی کا تثنیہ ہے اور قیاس یہ تھا کہ اللذیان کہا جاتا جیسے رحیان، مصطفیان، شجیان۔ سیبویہ نے کہا: یا کو حذف کیا گیا ہے تاکہ اسماء متمکنہ اور اسماء مبہمات میں فرق ہو جائے۔ ابوعلی نے کہا: یا تخفیفاً حذف کیا گیا ہے، کیونکہ اللذان میں التباس کا امن ہے کیونکہ نون حذف نہیں ہوتی۔ اسماء متمکنہ میں تثنیہ کا نون اضافت کے ساتھ حذف ہوتا ہے جیسے رحیان، **مصطفیا القوم**۔ اگر یا حذف ہو تو تثنیہ کے ساتھ مفرد مشتبہ ہو جائے گا۔ ابن کثیر نے اللذان کو نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قریش کی لغت ہے اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ تشدید، زا کے الف کا بدل ہے اس کی وضاحت سورۃ القصص میں فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ کے تحت آئے گی۔ اس میں دوسری لغت ہے اللذا یعنی نون کے حذف کے ساتھ ہے۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ بصریوں نے کہا: نون کو حذف کیا گیا ہے، کیونکہ صلہ کی وجہ سے اسم طویل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ھذان اور فذانک برھان پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے صرف فذانک برھانان پڑھا ہے۔ اللذان ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ سیبویہ نے کہا: اس کا معنی ہے فیما یتلی علیکم اللذان یاتیانھا۔ ھا ضمیر سے مراد فاحشۃ ہے۔ فآذوھما میں فا داخل کیا گیا ہے، کیونکہ کلام میں امر کا معنی ہے، کیونکہ جب الذی فعل کے ساتھ ملایا گیا تو اس میں شرط کا معنی پایا گیا، کیونکہ اس پر کوئی معین حکم واقع نہیں ہوئی۔ جب

شرط اور ابہام اس میں پایا گیا تو شرط کے قائم مقام ہوا پس فا داخل ہوئی۔ ماقبل مضمر اس پر عمل نہیں کرتا جس طرح اس کا ماقبل شرط میں عمل نہیں کرتا جب ان سے پہلے فعل کا اضمار اچھا نہیں تا کہ دونوں کو نصب دے تو ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا۔ یہ سیبویہ کا اختیار ہے۔ فعل کے اضمار کی تقدیر پر نصب جائز ہے یہ مختار ہے جب کلام میں امر، نہی کا معنی ہو جیسے تیرا قول ہے الذی عندك فاکرمہما۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰذُوْهُمَا قتادہ اور سدی نے کہا: اس کا مطلب توبیخ اور عار دلانا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ بغیر عار دلائے جفا اور سب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ زبان سے تنبیہ اور جوتوں سے مارنا ہے۔ نحاس نے کہا: ایک قوم نے کہا: یہ منسوخ ہے۔ میں کہتا ہوں: ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ۔ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا یہ ابتدا میں حکم تھے پھر سورۃ النور کی آیت نے ان دونوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولیٰ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے یہ ان کو توبیخ کے ساتھ ادب سکھانا واجب ہے۔ انہیں کہا جائے گا: تو نے فجور کیا تم نے فسق کیا اور تم نے اللہ تعالیٰ کے امر کی مخالفت کی۔

مسئلہ نمبر 3۔ الّٰتِیْ اور الَّذٰنِ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: سورۃ النساء کی پہلی آیت عام ہے شادی شدہ عورتیں ہوں یا غیر شادی شدہ ہوں اور دوسری آیت مردوں کے متعلق خاص ہے۔ تثنیہ کے لفظ نے مردوں کی دونوں قسموں کو بیان کیا جو شادی شدہ ہیں اور جو غیر شادی شدہ ہیں عورتوں کی سزا قید کرنا ہے اور مردوں کی سزا اذیت ہے۔ لفظ اس قول کا مقتضی ہے اور کلام کی نص زانیوں کی تمام اقسام کو شامل ہے اور پہلی آیت میں مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اور دوسری آیت میں مِنْكُمْ کا ارشاد لفظ کی جہت سے اسی قول کی تائید کرتا ہے۔ نحاس نے اس قول کو پسند کیا ہے اور انہوں نے یہ قول حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ سدی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: المحصنات کا لفظ جو پہلی آیت میں ہے اس میں مردوں میں سے جو شادی شدہ ہیں وہ بھی ان کے ساتھ داخل ہیں، دوسری آیت میں مرد اور عورت جو کنوارے ہیں وہ داخل ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس قول کا معنی مکمل ہے مگر آیت کا لفظ اس سے پوری مناسبت نہیں رکھتا۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے اور نحاس نے اس کا انکار کیا ہے اور فرمایا: مذکر پر مؤنث کو غلبہ دینا بعید ہے، کیونکہ کوئی چیز مجاز کی طرف نہیں نکالی جاتی جب کہ حقیقت میں اس کا معنی صحیح ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: زانیہ کو روکنا ہے جبکہ زانی کو روکنا نہیں ہے۔ روکنے میں عورت خصوصی طور پر ذکر کی گئی ہے پھر اذیت میں دونوں جمع کیے گئے ہیں۔ قتادہ نے کہا: عورت کو قید کیا جائے گا اور دونوں کو اکٹھی اذیت دی جائے گی۔ یہ اس لیے ہے، کیونکہ مرد محنت و مزدوری کا محتاج ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مقتضیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس میں زانیوں کے احکام کا بیان ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے مقتضی کے مطابق عمل کیا ان سے اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے اور انہوں نے شراحہ ہمدانیہ کو سو کوڑے لگائے تھے اور اس کے بعد اسے رجم کیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے کتاب اللہ کے حکم سے اسے کوڑے لگائے ہیں اور سنت رسول کی وجہ سے اسے رجم کیا ہے۔ یہ قول حسن بصری، حسن بن صالح

بن حیی اور اسحاق کا ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا شادی شدہ زانیہ پر بغیر کوڑوں کے رجم ہوگا۔ یہ حضرت عمر سے مروی ہے اور یہ قول زہری، نخعی، مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، اصحاب رائے، امام احمد، ابوثور کا ہے۔ ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے فعل سے دلیل پکڑی ہے کہ آپ ﷺ نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا تھا اور دونوں کو کوڑے نہیں لگائے تھے اور نبی کریم ﷺ نے حضرت انیس سے کہا تھا: تم اس کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ بھی اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو اسے رجم کر دو۔ دونوں نے کوڑے مارنے کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر یہ مشروع ہوتے تو آپ ﷺ خاموش نہ رہتے۔ ان کو کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ اس لیے خاموش رہے، کیونکہ وہ کتاب اللہ سے ثابت تھے شہرت اور قرآن میں تنصیص کی وجہ سے خاموش رہنا ممتنع نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور: 2) یہ تمام زانیوں کو عام ہے واللہ اعلم۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فعل خلفاء راشدین سے ماخوذ تھا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا۔ اسے کہا گیا: تو نے منسوخ پر عمل کیا اور ناسخ کو چھوڑ دیا۔ یہ تو واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ کنوارے آدمی کو کوڑے لگانے کے ساتھ جلاوطن کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ کوڑوں کے ساتھ اسے جلاوطن بھی کیا جائے گا۔ یہ خلفاء راشدین حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن عمر کا بھی یہی قول ہے۔ عطا، طاؤس، سفیان، امام مالک، ابن ابی لیلیٰ، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور کا قول ہے اور حماد بن ابی سلیمان، امام ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن نے جلاوطنی کے ترک کا قول کیا ہے۔ جمہور کی حجت حضرت عبادہ کی حدیث ہے اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت زید بن خالد کی حدیث ہے اور العسیف (نوکر) والی حدیث ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، رہی بکریاں اور لونڈی، تو وہ تجھے واپس کی جائے گی۔ آپ ﷺ نے اس کے بیٹے کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال جلاوطن کیا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے نقل کیا ہے اور جو علماء جلاوطن کرنے کا نظریہ نہیں رکھتے وہ لونڈی میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں، اس میں کوڑوں کا ذکر ہے جلاوطنی کا ذکر نہیں ہے۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے زہری سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: حضرت عمر نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب کی حد میں خیبر کی طرف جلاوطن کیا تو وہ ہرقل سے جا ملا اور نصرانی ہو گیا۔ حضرت عمر نے کہا: اس کے بعد کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر جلاوطن کرنا اللہ تعالیٰ کی حد ہوتی تو اس کے بعد حضرت عمر اسے ترک نہ کرتے۔ پھر کتاب میں جو نص ہے وہ کوڑے ہیں اور نص پر زیادتی نسخ ہے۔ پس اس سے ایک قطعی حکم کا خبر واحد کے ساتھ نسخ لازم آتا ہے۔ جمہور علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث لونڈیوں کے متعلق ہے، نہ کہ آزاد لوگوں کے متعلق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے لونڈی کو زنا کی وجہ سے مارا اور اسے جلاوطن بھی کیا۔ اور رہی حضرت عمر کی حدیث اور ان کا قول کہ میں اس کے بعد کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا، یہ شراب کے بارے میں ہے۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ نافع نے حضرت ابن عمر سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

مارا اور جلاوطن کیا۔ حضرت ابوبکر نے مارا اور جلاوطن کیا، حضرت عمر نے مارا اور جلاوطن کیا(1)۔ یہ ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کی ہے اور نسائی نے اپنی سنن میں ابوکریب محمد بن علا ہمدانی عن عبداللہ بن ادریس عن عبیداللہ بن عمر عن نافع کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ دارقطنی نے کہا: عبداللہ بن ادریس اس حدیث کو روایت کرنے میں منفرد ہیں، ابوکریب کے علاوہ کسی ثقہ راوی نے اسے مسند روایت نہیں کیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ جلاوطنی مروی ہے، پس اس کے ہوتے ہوئے کلام کی گنجائش نہیں اور جس نے سنت کی مخالفت کی، سنت ہی اس سے مخاصمت کرے گی۔ و باللہ التوفیق۔

رہا ان کا یہ قول کہ نص پر زیادتی نسخ ہے۔ یہ مسلم نہیں ہے، بلکہ اصل کے ساتھ دوسرے حکم کی زیادتی ہے۔ پھر وہ خبر واحد صحیح کے ساتھ پانی پر نبیذ کے وضو کرنے کی زیادتی کرتا ہے اور قربیٰ میں فقر کی شرط لگاتا ہے، اس کے علاوہ بہت سی چیزیں ہیں جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں خبر واحد کے ساتھ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جلاوطنی کے قائل علماء کا مذکر آزاد کو جلاوطن کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ غلام اور لونڈی کو بلا وطن کرنے میں اختلاف ہے۔ جو علماء غلام اور لونڈی کو جلاوطن کرنے کی رائے رکھتے ہیں ان میں حضرت ابن عمر بھی ہے۔ حضرت ابن عمر نے اپنی لونڈی کو زنا کی وجہ سے کوڑے لگائے اور فدک کی طرف جلاوطن کیا۔ امام شافعی، ابوثور، ثوری، طبری اور داؤد کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول غلام کی جلاوطنی کے بارے میں مختلف ہے۔ کبھی تو انہوں نے کہا: میں غلام کو جلاوطن کرنے میں اللہ سے استخارہ کروں گا، اور کبھی فرمایا: نصف سال جلاوطن کروں گا، کبھی فرمایا: ایک سال دوسرے شہر کی طرف بھیج دوں گا۔ یہی طبری کا قول ہے۔ لونڈی کی جلاوطنی کے بارے میں بھی دو قول ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: مرد کو جلاوطن کیا جائے گا عورت اور غلام کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا اور جس کو جس شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے اس میں اسے قید کر دیا جائے گا۔ مصر سے حجاز، شغب، اسوان اور اس جیسے شہروں کی طرف جلاوطن کیا جائے گا مدینہ سے خیبر اور فدک کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسی طرح کیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے بصرہ کی طرف جلاوطن کیا تھا۔ امام شافعی نے فرمایا: اس کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے۔ ابن عربی نے کہا: جلاوطنی کی اصل یہ ہے کہ بنی اسماعیل نے اجماع کیا تھا کہ جو حرم میں کوئی گناہ کرے گا اسے حرم سے جلاوطن کر دیا جائے گا پس یہ سنت ہوگی وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سنت بن گئی کہ جب کوئی جرم کرے گا اسے اس کے شہر سے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ جاری رہا حتی کہ اسلام آ گیا۔ پس اسلام نے زنا میں اس کو خصوصی طور پر برقرار رکھا۔ اور جو علماء غلام پر جلاوطنی کا نظریہ نہیں رکھتے وہ لونڈی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے حجت پکڑتے ہیں۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ غلام کو جلاوطن کرنا اس کے مالک کو سزا دینا ہے، کیونکہ جلاوطنی کی مدت میں اس کے منافع سے اسے روکنا ہے۔ یہ شرع کا تصرف مناسب نہیں پس غیر مجرم کو سزا نہیں دی جاتی۔ اسی وجہ سے جمعہ، حج اور جہاد اس سے سرور کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا، کیونکہ وہ حق اللہ ہے۔ اسی طرح جلاوطنی ہے۔ 1

عورت جب جلاوطن کی جائے گی تو اکثر اس کا فاحشہ سبب ہوتا ہے اور یہ جلاوطنی اس کی شرمگاہ کے کھولنے اور اس کی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود عن رسول اللہ، باب ما جاء فی النفی، حدیث نمبر 1358، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حالت کو ضائع کرنے کا سبب ہے، کیونکہ اصل اس کو گھر سے نکلنے سے منع کرنا ہے اور اس کی نماز بھی گھر میں افضل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کو خروج کے لباس سے علیحدہ کرو وہ گھر کو لازم پکڑیں۔ پس اس سے تغریب کی حدیث کے عموم کی تخصیص حاصل ہوگی۔ اس مصلحت کی وجہ سے جس کی شہادت اعتبار کے ساتھ دی گئی ہے۔ اصولیین اور اہل نظر کے نزدیک اس میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے شاذ قول کیا ہے کہ کوڑوں اور رجم کو شیخ پر جمع کیا جائے گا، جوان کو کوڑے لگائے جائیں گے انہوں نے حضرت زید بن ثابت کی حدیث میں لفظ الشیخ سے دلیل پکڑی ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمها البتة۔ اس حدیث کو نسائی نے نقل کیا ہے۔ اس طائفہ کا یہ قول فاسد ہے، کیونکہ دوسری حدیث میں الثیب کا ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ تَابَا یعنی اگر وہ زنا سے توبہ کریں وَ اَصْلَحَا یعنی اس کے بعد عمل کی اصطلاح کریں۔ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا یعنی ان کی اذیت اور تعبیر چھوڑ دو۔ یہ حدود کے نزول سے پہلے کا حکم تھا۔

جب حدود نازل ہوئیں تو اس آیت کو منسوخ کر دیا۔ اعراض سے مراد ہجرت نہیں ہے، لیکن ہجرت برائی کو چھڑانے والی ہے، اعراض کرانے والی ہے اس میں سابقہ معصیت کے سبب ان کے لیے حقارت ہے اور دوسری آیت میں جہالت کے مطابق احتقار ہے۔ واللہ تواب یعنی اپنے بندوں کے گناہوں سے رجوع کرنے والا ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓىِٕكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ وَ لَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

''توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے ان کی توبہ ہے جو کر بیٹھتے ہیں گناہ بے سمجھی سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے پس یہی لوگ ہیں (نظر رحمت سے) توجہ فرماتا ہے اللہ ان پر اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا۔ اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لیے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آجائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب اور نہ ان لوگوں کی توبہ جو مرتے ہیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں انہیں کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے عذاب دردناک''۔

اس آیت میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ہر اس شخص کو شامل ہے جس نے کوئی گناہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن سے جہالت کی بنا پر گناہ ہوا اور توبہ ہر اس شخص کے

لیے ہے جس نے دوسری جگہ میں گناہ کیا۔ اور امت کا اتفاق ہے کہ مومنین پر توبہ کرنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ (نور: 31) رجوع کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو!۔

اور ایک گناہ سے توبہ کرنا صحیح ہے جب کہ کسی دوسرے گناہ پر قائم بھی ہو جو اس پہلے گناہ کی نوع سے نہ ہو۔ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں: وہ توبہ کرنے والا شمار نہ ہو گا جو کسی بھی گناہ پر قائم ہو، دو معصیتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ (پہلا) مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے اگر چاہے تو اس کی توبہ قبول فرمالے چاہے تو قبول نہ فرمائے۔ عقل کے طریق سے بھی اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا واجب نہیں، جیسا کہ مخالف کا قول ہے، کیونکہ واجب کی شرط میں سے ہے کہ وہ موجب علیہ سے اعلیٰ مرتبہ ہو، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مخلوق کا خالق اور مالک ہے اور ان کو مکلف بنانے والا ہے۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس پر کوئی چیز واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود خبر دی ہے۔ اور وہ اپنے وعدہ میں سچا ہے۔ کہ وہ اپنے گناہگار بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ فرمایا وہ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ: 25) وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (توبہ: 104) (کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) (اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی چیزوں کے متعلق خبر دی ہے کہ اس نے وہ چیزیں اپنے اوپر واجب کی ہیں، یہ ان چیزوں کے وجوب کا مقتضی ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ عقلاً اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ رہی نقلی دلیل تو اس کا ظاہر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرنا ہے۔ ابوالمعالی وغیرہ نے کہا: یہ ظواہر ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں۔ توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعی واجب نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ابوالمعالی وغیرہ کی اس معنی میں مخالفت کی گئی ہے۔ جب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خالص توبہ کی جس میں توبہ کی مکمل شرائط موجود تھیں تو ابوالمعالی نے کہا: اس کی توبہ کی قبولیت کا ظن غالب ہوتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق خبر دی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میرا والد اسی قول کی طرف میلان رکھتا تھا اور اس کو راجح قرار دیتا تھا اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اس کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ اس توبہ کرنے والے کے بارے میں یہ معنی ختم کردے جو اس کے اس ارشاد میں ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (شوریٰ: 25) اور ارشاد ہے وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ (طٰہٰ: 82)

جب یہ ثابت ہو گیا تو تو جان لے کہ عَلَى اللّٰهِ کے کلمات میں حذف ہے یہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے، اس کا مطلب ہے علی فضل اللہ و رحمتہ بعبادہ۔ یہ اس طرح ہے جیسے حضرت معاذ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اتدری ما حق العباد علی اللہ؟۔ کیا تجھے معلوم ہے اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق کیا ہے؟ حضرت معاذ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان یدخلھم الجنة کہ انہیں جنت میں داخل کرے۔ ان تمام آیات اور احادیث کا مطلب یہ ہے کہ

اس کے فضل اور اس کی رحمت پر سچا وعدہ ہے اور اس کا قول سچا ہے اس کی دلیل یہ ارشاد ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام:12) (واجب کرلیا ہے اس نے اپنے آپ پر رحمت فرمانا)

یعنی اس نے رحمت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں علی بمعنی عند ہے اور تقدیر عبارت عند اللہ ہے یعنی یہ اس کا وعدہ ہے اور اس کے وعدہ میں خلاف نہیں ہے وہ توبہ قبول فرماتا ہے جب وہ ایسی شرائط کے ساتھ ہو جو اسے درست کرنے والی ہیں۔ توبہ کی شرائط چار ہیں۔ دل سے شرمندہ ہونا، فی الحال معصیت کو ترک کرنا، دوبارہ وہ برائی نہ کرنے کا عزم کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ سے حیا کی وجہ سے ہو نہ کسی دوسرے کی وجہ سے ہو۔ جب ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ ہوگی تو توبہ صحیح نہ ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی شرائط میں سے یہ بھی ہے گناہ کا اعتراف کرنا، کثرت سے استغفار کرنا۔ سورۂ آل عمران میں توبہ کے بہت سے معانی اور اس کے احکام گزر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق توبہ حد کو ساقط نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا: چور مرد، چور عورت اور تہمت لگانے والا جب یہ توبہ کریں جب کہ ان کے خلاف گواہی قائم ہو چکی ہو تو ان پر حدود قائم کی جائیں گی۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں علی بمعنی من ہے یعنی انما التوبة من اللہ للذین ...... الخ یہ ابو بکر بن عبدوس کا قول ہے واللہ اعلم۔ توبۃ النصوح کے بارے میں کلام اور وہ اشیاء جن کی وجہ سے توبہ کی جاتی ہے ان پر گفتگو ان شاء اللہ سورۃ التحریم میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ اس آیت میں اور سورۂ انعام میں اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ میں سوء کا لفظ کفر اور گناہوں کو شامل ہے۔ جس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ جاہل تھا حتیٰ کہ وہ اپنے اس گناہ سے علیحدہ ہو جائے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اجماع ہے کہ ہر معصیت جہالت کی وجہ سے ہوتی ہے خواہ وہ عمداً ہو یا بے سمجھی کی وجہ سے ہو۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ ضحاک اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ یہاں جہالت سے مراد عمد (جان بوجھ کر) ہے۔ عکرمہ نے کہا: دنیا کے تمام امور جہالت ہیں ان کی مراد وہ دنیا کے اعمال ہیں جو اللہ کی اطاعت سے خارج ہیں۔ یہ قول اس ارشاد کے ساتھ جاری ہے اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (محمد:36) (دنیوی زندگی کھیل اور تماشا ہے) زجاج نے کہا: بِجَهَالَةٍ کا مطلب ہے وہ فانی لذت کو باقی لذت پر ترجیح دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: بِجَهَالَةٍ کا مطلب ہے وہ عقوبت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ یہ ابن فورک نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ان کا یہ قول ضعیف قرار دیا گیا ہے اور رد کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے مرض اور موت سے پہلے (توبہ کرتے ہیں) ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: ہر وہ کام جو موت سے پہلے ہے وہ قریب ہے۔ ابو مجلز، ضحاک، عکرمہ اور ابن زید وغیرہ نے کہا: ملائکہ اور نزع کو دیکھنے سے پہلے اور انسان کے مغلوب ہونے سے پہلے وہ توبہ کرتے ہیں۔ محمود الوراق نے کتنا عمدہ کہا تھا:

قدِّم لِنفسِكَ توبةً مرجوّةً قبلَ المماتِ وقبلَ حبسِ الألسُنِ

بادِرْبها غَلقَ النفوسِ فإنّها ذُخرٌ وغُنمٌ لِلمُنيبِ المُحسنِ

موت سے پہلے اور زبان پر قفل لگنے سے پہلے اپنے لیے توبہ آگے بھیج جس کی امید کی جاسکتی ہو اور توبہ کرنے میں جلدی کر دفرصت کے ضیاع سے پہلے، کیونکہ محسن، منیب شخص کے لیے ذخیرہ اور غنیمت ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: انسان سے اس وقت بھی توبہ صحیح ہے، کیونکہ امید باقی ہے اس سے شرمندگی، فعل کے ترک پر عزم صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی روح اس کے حلقوم تک نہیں پہنچ جاتی'' (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حدیث کا یہ معنی ہروی نے بیان کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے بغیر اصرار کے قریب زمانہ میں گناہ سے توبہ کرتے ہیں۔ صحت میں جلدی توبہ کرنے والا افضل ہے اور زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے عمل صالح کی امید ہے اور بعد سے مراد موت ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وأين مكانُ البُعدِ إلّا مكانيا

صالح مری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسے گناہ کی وجہ سے عار دلائی جس سے وہ توبہ کر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس گناہ میں مبتلا کرے گا۔ حسن نے کہا: ابلیس جب زمین پر اترا تو اس نے کہا: مجھے تیری عزت کی قسم میں ابن آدم سے جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ روح اس کے جسم میں باقی ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ابن آدم کو توبہ سے محروم نہیں کروں گا جب تک کہ اس کی روح گلے تک نہیں پہنچ جائے گی۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تائبین کے حکم میں داخل ہونے سے نفی کی ہے جن پر موت کا وقت قریب آجائے اور وہ مایوسی کے عالم میں پہنچ جائیں جیسا کہ فرعون تھا جب وہ پانی میں غرق ہونے لگا تو اس نے ایمان لانے کا اظہار کیا تو اس اظہار ایمان نے اسے کچھ فائدہ نہ دیا، کیونکہ اس وقت میں توبہ نفع نہیں دیتی، کیونکہ وہ تکلیف کے زوال کی حالت ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زید اور جمہور مفسرین کا قول ہے۔ رہے کفار تو وہ اپنے کفر پر مرتے ہیں، پس آخرت میں ان کے لیے توبہ نہیں ہے۔ اس کی طرف اس ارشاد میں اشارہ ہے أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا اس عذاب میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اگر اس ارشاد سے اشارہ تمام لوگوں کی طرف ہو تو نافرمانوں کی جہت سے وہ عذاب دائمی نہ ہوگا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ گناہ کفر سے کم ہوں یعنی توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو کفر سے کم درجہ کے گناہ کرتے ہیں پھر موت کے وقت توبہ کرتے ہیں اور نہ ان کے لیے توبہ ہے جو کافر ہو کر مرتے ہیں پھر قیامت کے دن توبہ کریں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں سیئات سے مراد کفر ہے تو معنی یہ ہوگا جو حالت کفر میں مرتے ہیں۔ ابو العالیہ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ باب فی فضل التوبۃ والاستغفار، حدیث نمبر 3460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: پہلی آیت مومنین کے بارے میں نازل ہوئی اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ ..... الخ اور دوسری آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی وَ لَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ یعنی ان لوگوں کے لیے توبہ کی قبولیت نہیں ہے جو اپنے فعل پر اصرار کرتے ہیں حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ یعنی جب نزع کی حالت میں ہو جاتا ہے اور حضرت عزرائیل کو دیکھ لیتا ہے۔ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـئٰنَ اس کے لیے توبہ نہیں ہے پھر کفار کی توبہ کا ذکر کیا فرمایا: وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰۤـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا یعنی کفار کے لیے دردناک دائمی عذاب ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًـا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ﴿۱۹﴾

''اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لیے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی اور نہ روکے رکھو انہیں تاکہ لے جاؤ کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے انہیں بجز اس صورت کے کہ ارتکاب کریں کھلی بدکاری کا اور زندگی بسر کرو اپنی بیویوں کے ساتھ عمدگی سے پھر اگر تم ناپسند کرو انہیں (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لیے) خیر کثیر''۔

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا اس کا تعلق پہلے مذکور بیویوں کے ذکر سے ہے۔ اس سے مقصود ان سے ظلم اور تکلیف کو دور کرنا ہے اور خطاب اولیاء کو ہے ان، یحلّ کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یعنی تمہارے لیے عورتوں کا وارث بننا صحیح نہیں ہے۔ کرھا مصدر ہے حال واقع ہو رہا ہے۔ اس آیت کے نزول کے سبب میں روایات اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کے ورثاء اس کی بیوی کے زیادہ حق دار ہوتے اگر کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا، اگر وہ چاہتے تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دیتے، اگر چاہتے تو اس کا نکاح نہ کرتے وہ اس عورت کے اس کے گھر والوں کی نسبت زیادہ حق دار ہوتے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابوداؤد نے بھی اس کی ہم معنی روایت نقل کی ہے۔ زہری اور ابومجلز نے کہا: عربوں کی عادت سے تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس شخص کا دوسری بیوی سے جو بیٹا ہوتا وہ یا مرنے والے کا عصبہ اس شخص کی بیوی پر اپنا کپڑا ڈالتا تو وہ اس عورت کا اس کی اپنی ذات اور اس کے اولیاء سے زیادہ حق دار بن جاتا، اگر وہ چاہتا تو بغیر مہر کے اس سے نکاح کر لیتا اور وہی مہر جو میت نے اس عورت کو دیا ہوتا (اس پر اکتفا کرتا) اگر وہ چاہتا تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دیتا اور اس کا مہر خود لے لیتا اور اس عورت کو کچھ نہ دیتا، اگر وہ چاہتا تو اس کو روک لیتا حتی کہ وہ فدیہ دے وہ مال جو اس کو میت کی طرف سے ملا ہے یا وہ عورت مر جائے اور وہ اس کا وارث ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 140

پس معنی یہ ہوگا کہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم ان عورتوں کے وارث ہو ان کے خاوندوں کی طرف سے پھر تم ان کے خاوند بن جاؤ۔ بعض علماء نے فرمایا: وارث اگر جلدی کرتا اور اس عورت پر کپڑا ڈال دیتا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہوتا اگر عورت جلدی کرتی اور اپنے میکے چلی جاتی، تو وہ عورت اپنے نفس کی خود حق دار ہوتی، یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک شخص کے عقد میں بوڑھی عورت ہوتی جب کہ اس کا نفس جوان عورت کی خواہش کرتا، تو وہ بوڑھی عورت کے فراق کو اس کے مال کی وجہ سے ناپسند کرتا پس وہ اسے روکے رکھتا اور اس کے قریب بھی نہ جاتا حتیٰ کہ وہ اسے اپنا مال فدیہ دے یا وہ مر جائے اور اس کے مال کا وہ وارث بن جائے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ خاوند کو حکم دیا گیا کہ وہ اگر بیوی کی صحبت کو پسند نہیں کرتا تو اسے طلاق دے دے اور اس کو ناپسند کرتے ہوئے روکے نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا اس آیت سے مقصود زمانہ جاہلیت کی رسم کا قلع قمع کرنا ہے۔ یعنی عورتوں کو مال کی طرح نہ بنایا جائے تاکہ مال کی طرح ان میں بھی میراث جاری ہو۔ کُرْهًا (کاف کے ضمہ کے ساتھ) حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے اور فتحہ کے ساتھ باقی قراء کی قرأت ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قتبی نے کہا: الکرہ کاف کے فتحہ کے ساتھ اکراہ کے معنی میں ہے اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مشقت کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لتفعل ذالك طوعا او کرها یعنی تجھے یہ کرنا چاہیے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے۔ یہ خطاب اولیاء کے لیے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب عورتوں کے خاوندوں کے لیے ہے جب وہ انہیں روکے رکھیں اور ان سے برتاؤ بھی اچھا نہ کریں اور یہ ان کی میراث کے لالچ کی خاطر ہو یا وہ اپنے بعض مہر فدیہ دے دیں۔ یہ قول اصح ہے اور ابن عطیہ نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے کہا: اس کی دلیل یہ ارشاد ہے اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ جب وہ برائی کا ارتکاب کرے تو والی کے لیے اس کو روکنا جائز نہیں تاکہ اس کا مال لے جائے اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ خاوند کے لیے ہے۔ اس کا بیان بعد والے مسئلہ میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ، عضل کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور وہ ہے روکنا اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ، الفاحشة کے معنی میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد زنا ہے۔ جب کنواری زنا کرے تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال جلاوطن کی جائے گی اور اپنے خاوند کو وہ رقم لوٹا دے گی جو بطور مہر لے چکی ہوگی۔ ابو قلابہ نے کہا: جب کسی مرد کی بیوی زنا کرے تو کوئی حرج نہیں کہ خاوند اسے تکلیف پہنچائے اور اس پر سختی کرے تاکہ وہ اس سے لیا ہوا مال واپس کر دے۔ سدی نے کہا: جب عورتیں ایسے فعل کا ارتکاب کریں تو ان کے مہر واپس لے لو۔ ابن سیرین اور ابو قلابہ نے کہا: خاوند کے لیے بیوی سے فدیہ لینا جائز نہیں مگر یہ کہ اس کے پیٹ پر کسی غیر مرد کو پائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ضحاک اور قتادہ نے کہا: فاحشة مبینہ سے مراد اس آیت میں بغض اور نافرمانی ہے۔ ان علماء نے فرمایا: جب عورت نافرمان ہو تو مرد کے لیے اس کا مال لینا جائز اور حلال ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں اس آیت میں فاحشة کے متعلق خاوند کے لیے کوئی نص نہیں پاتا۔ ایک قوم نے کہا: اس سے مراد بدزبانی کرنا اور قول اور فعل سے برا سلوک کرنا ہے۔ یہ نشوز کا معنی ہے۔

بعض اہل علم بطور خلع نافرمان عورت سے مال لینا جائز قرار دیتے ہیں مگر وہ یہ خیال رکھے کہ جو اس نے دیا ہے اس سے تجاوز نہ کرے، اس قول پر عمل کرے لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ۔ امام مالک اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا: خاوند کے لیے جائز ہے کہ نافرمان بیوی سے سب کچھ لے لے جس کی وہ مالک ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: زنا خاوند پر نافرمانی اور اذیت سے زیادہ برداشت کرنا مشکل ہے یہ تمام فاحشۃ کے حکم میں ہے مال کا لینا یہ حلال کر دیتا ہے۔ ابوعمر نے کہا: ابن سیرین اور ابوقلابہ نے کہا: میرے نزدیک یہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ فاحشۃ کبھی بدزبانی اور اذیت سے ہوتی ہے، اسی وجہ سے بدزبان کو فاحش اور متفحش کہتے ہیں اس بنا پر اگر وہ اس بیوی کی فاحشۃ پر مطلع ہو تو اس کے لیے لعان کرنا ہوگا اور اگر چاہے تو اسے طلاق دے دے۔ اور رہا اسے تکلیف دینا حتیٰ کہ وہ اسے اپنے مال کا فدیہ دے تو یہ خاوند کے لیے جائز نہیں۔ میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جس نے کہا ہو کہ اسے تکلیف دینا اور اس کے ساتھ برا سلوک کرنا خاوند کے لیے جائز ہے حتیٰ کہ وہ اس سے خلع کر لے جب وہ اسے زنا کرتے ہوئے پائے، سوائے ابوقلابہ کے۔ واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (بقرہ:229) یعنی حسن معاشرت اور خاوند کے حق کا قیام اور بیوی کے حق کے قیام میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (بقرہ:229) پس کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کو کچھ فدیہ دے کر جان چھڑائے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝ پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوش دلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔

یہ آیات اس باب میں اصل ہیں۔ عطا خراسانی نے کہا: جب کسی مرد کی بیوی برائی کا ارتکاب کرے تو وہ اس سے وہ مال لے لے جو اس نے اسے دیا تھا اور اسے باہر نکال دے۔ پھر یہ حکم حدود کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ چوتھا قول اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ مگر یہ کہ وہ بدکاری کریں تو وہ گھروں میں روکی جائیں گی۔ یہ نسخ سے پہلے تھا۔ یہ عطا کے قول کے معنی میں ہے اور یہ ضعیف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب ہم اس قول کو اختیار کریں کہ عضل میں خطاب اولیاء کو ہے تو اس کا فقہ یہ ہے کہ جب ولی میں یہ صحیح ثابت ہو کہ وہ عضل کرنے والا ہے تو قاضی عورت اور مرد کے بارے میں غور کرے گا مگر باپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ایسا کرے تو اس کے لیے یہ حکم نہیں۔ اگر اس عضل میں اصلاح ہو تو پھر اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ اور یہ ایک اور بہت سے نکاح کا پیغام دینے کے اعتبار سے ہے، روکنا صحیح ہو تو اس میں امام مالک کے مذہب میں دو قول ہیں۔ وہ تمام اولیاء کی طرح ہے۔ قاضی اس کی بیٹیوں میں سے جس کا نکاح چاہے گا کر دے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ بھی جائز ہے کہ تَعْضُلُوْهُنَّ نہی کی بنا پر مجزوم ہو اور واؤ عاطفہ ہو جملہ کلام پہلے جملہ سے جدا ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ تَرِثُوْا پر عطف کی بنا پر منصوب ہو اور واؤ مشترکہ ہو، فعل کا فعل پر عطف ہو۔ حضرت ابن مسعود نے ولا ان تعضلوھن پڑھا ہے۔ یہ قرأت نصب کے احتمال کو قوت دیتی ہے۔ اور روکنا ان احکام میں سے ہے جو نص کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُبَيِّنَةٍ یا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ نافع اور ابو عمرو کی قرأت ہے۔ باقی قراء نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے با کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ابان الشئ سے مشتق ہوگا۔ کہا جاتا ہے: ابان الامر بنفسه، ابنته وبين وبينت۔ یہ تمام قرأت فصیح لغات ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ یعنی ان سے اچھا سلوک کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے ہر ایک کے لیے حسن معاشرت ضروری ہے خواہ وہ خاوند ہو یا ولی ہو لیکن اغلب طور پر اس امر سے مراد خاوند ہوتے ہیں۔ یہ اس ارشاد کی مثل ہے فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ (بقرہ: 229) یہ ان کو پورا مہر اور خرچ دینا ہے۔ اس کی غلطی کے بغیر اس کے سامنے منہ نہ بسورے۔ اچھے انداز میں اس سے گفتگو کرے، نہ بد خلقی سے، نہ سخت کلام کرے اور نہ اپنا میلان دوسری بیوی کی طرف ظاہر کرنے والا ہو۔ العشرۃ کا معنی مخالطت اور ممازجت ہے اسی سے طرفہ کا قول ہے:

فلئن شَطَّتْ نَوَاهَا مرّةً　لعلَى عهدِ حَبِيبٍ مُعْتَشِرْ

شاعر نے حبیب کو جمع کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے خلیط اور غریق استعمال ہوتے ہیں۔ عاشرہ معاشرۃ، تعاشر القوم واعتشروا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے جب ان سے عقد نکاح کریں بہتر انداز میں آپس میں تعلق باقی رہے۔ اس سے انسان کا نفس پرسکون ہوتا ہے اور زندگی خوشگوار رہتی ہے۔ یہ خاوند پر واجب ہے قضا اس پر لازم نہ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: مرد عورت کے لیے اسی طرح اپنے آپ کو مزین رکھے جس طرح عورت مرد کے لیے اپنے آپ کو مزین رکھتی ہے۔ یحییٰ بن عبدالرحمٰن الحنظلی نے کہا: میں محمد بن حنفیہ کے پاس آیا، وہ میرے پاس آئے تو انہوں نے ایک سرخ چادر اوڑھی ہوئی تھی اور ان کی داڑھی سے خوشبو کے قطرے گر رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ محمد بن حنفیہ نے کہا: یہ چادر مجھ پر میری بیوی نے ڈالی ہے اور اس نے مجھے خوشبو لگائی ہے وہ ہم سے ایسی ہی خواہش کرتی ہیں جیسی ہم ان سے رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اپنی بیوی کی خاطر اپنے آپ کو مزین کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح میں پسند کرتا ہوں کہ بیوی میرے لیے مزین ہو۔

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس میں داخل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: آیت کے مفہوم کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد رہنمائی کرتا ہے: فاستمتع بها وفيها عوج(1) یعنی تو اس سے بدسلوکی نہ کر جب کہ اس میں ٹیڑھا پن موجود بھی ہو، عورت سے مخالفت شروع ہوتی ہے اور اس کے ذریعے ناچاقی واقع ہوتی ہے اور یہ خلع کا سبب ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ہمارے علماء نے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ کے قول سے استدلال کیا ہے کہ عورت کے لیے ایک خادمہ کافی نہ ہو تو خاوند پر اس کی کفالت کی مقدار خدمت کرنا ضروری ہے جیسے بادشاہ اور خلیفہ کی بیٹی اگر کسی کی بیوی ہو تو انہیں ایک خادمہ کفایت نہیں کرتی۔ یہ معاشرۃ بالمعروف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے فرمایا: خاوند پر ایک خادمہ لازم ہے یہ اس کی ذات کی خدمت کے لیے کافی ہے، دنیا میں ایک عورت کے لیے ایک خادمہ کافی ہوتی ہے یہ اس جنگجو کی طرح ہے جس

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المداراۃ مع النساء، حدیث نمبر 4786، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے بہت سے گھوڑے ہوں تو اسے ایک گھوڑے کا حصہ ملتا ہے، کیونکہ قتال ایک گھوڑے پر ہی ممکن ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ غلط ہے، کیونکہ بادشاہوں کی بیٹیوں کی بہت سی خادمائیں ہوتی ہیں انہیں ایک خادمہ کفایت نہیں کرتی، کیونکہ وہ کپڑے دھونے، آرام وغیرہ کے خیال کرنے اور دوسرے کاموں کے لیے ایک خادمہ کافی نہیں ہوتی ہے۔ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ بدصورت یا بد خلق ہونے کی وجہ سے اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو جب کہ وہ فاحشہ اور نافرمان نہیں ہے۔ یہ سارے احتمال ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس عورت سے نیک صالح اولاد عطا فرمادے ان کو رفع عسیٰ کی وجہ سے ہے ان اور فعل مصدر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مفہوم صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی مومن، مومنہ کو جدا نہ کرے اگر اس سے ایک خلق کو ناپسند کرے گا تو اس کی دوسری عادت سے خوش ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ عورت سے کلی طور پر بغض نہ رکھے جو اسے اس کے فراق پر برانگیختہ کردے۔ یعنی اس کے لیے یہ مناسب نہیں بلکہ اس کی برائی کو اس کی اچھائی کی وجہ سے معاف کردے اور اس کی ناپسندیدہ بات کو اس کی پسندیدہ باتوں کی وجہ سے برداشت کرے۔ مکحول نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتا ہے پس اسے خیر دی جاتی ہے پس وہ اپنے رب پر شکوہ کرتا ہے پھر تھوڑے عرصہ بعد وہ دیکھتا ہے کہ اسے خیر دی گئی ہوتی ہے۔ ابن عربی نے ذکر کیا فرمایا: مجھے ابو القاسم بن حبیب نے خبر دی، انہوں نے ابو القاسم السیوری سے روایت کیا انہوں نے ابو بکر بن عبد الرحمن سے روایت کیا فرمایا: الشیخ ابو محمد بن ابی زید علم اور دین میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بڑی بدسلوکی کرتی تھی، اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتی تھی اور اپنی زبان کے ساتھ اسے اذیت دیتی تھی۔ شیخ صاحب کو بیوی کے معاملہ میں کہا گیا اور اس پر اتنا صبر کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں ایک ایسا شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بدن کی صحت، اپنی معرفت اور غلاموں کی نعمتیں کی ہیں شاید میرے گناہوں کی سزا اس کی صورت میں دی گئی ہو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس کو جدا کروں تو مجھ پر اس سے سخت سزا اور عقوبت نازل ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں طلاق کی کراہت کی دلیل ہے اگرچہ مباح ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مباح چیزوں میں سے کسی چیز کو ناپسند نہیں فرماتا سوائے طلاق اور کھانے کے۔ اللہ تعالیٰ معدہ کو ناپسند فرماتا ہے جب وہ بھر جاتا ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱

''اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو ایک بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے؟ اور کیوں کر (واپس) لیتے

ہو تم مال کو حالانکہ مل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ''۔

ان آیات میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ گزشتہ آیات میں اس جدائی کا حکم گزر چکا جس کا سبب عورت ہے اس صورت میں خاوند کے لیے اپنا مہر واپس لینا جائز تھا اب اس جدائی کا ذکر ہو رہا ہے جس کا سبب خاوند ہے۔ یہاں فرمایا کہ جب مرد، عورت کو بغیر بدخلقی اور سوء معاشرت کے اسے طلاق دینے کا ارادہ کرے تو اس سے مال طلب نہ کرے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جب میاں، بیوی آپس میں جدائی کا ارادہ کرتے ہوں اور دونوں کی طرف سے نافرمانی اور سوء معاشرت کا مظاہرہ ہو، تو امام مالک نے فرمایا: خاوند کے لیے اس سے مال لینا جائز ہے جب جدائی کا سبب عورت بھی ہو، مرد کے سبب ہونے کا اعتبار نہ ہوگا۔ ایک جماعت علماء کا قول ہے کہ اس کے لیے مال لینا جائز نہیں مگر یہ کہ عورت ہی خود نافرمانی کرتی ہو اور جدائی چاہتی ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا** اس آیت میں مہر زیادہ رکھنے کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مثال نہیں دیتا مگر مباح چیز کے ساتھ۔ حضرت عمر نے خطاب فرمایا اور کہا: خبردار! عورتوں کے مہر میں غلو نہ کرو اگر مہر کی زیادتی دنیا میں باعث عزت ہوتی یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعث تقویٰ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سب سے زیادہ اس کے مستحق ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی کسی بیوی اور کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں رکھا (1)۔ ایک عورت کھڑی ہوئی اور کہا: اے عمر اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرماتا ہے اور تو ہمیں محروم کرتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: **وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا**۔ حضرت عمر نے فرمایا: اس عورت نے ٹھیک کہا، عمر نے غلطی کی۔ ایک روایت میں ہے حضرت عمر نے سر جھکا دیا پھر فرمایا: اے عمر! تجھ سے تمام لوگ زیادہ فقیہ ہیں۔ ایک روایت ہے: عورت نے ٹھیک کہا، مرد نے غلطی کی اور انکار کو ترک فرما دیا۔ اس حدیث کو ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں ابوالعجفاء سلمی سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عمر نے خطبہ دیا آگے بارہ اوقیہ تک روایت ذکر کی۔ عورت کے کھڑے ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ابوالعجفاء سے روایت کیا ہے اور بارہ اوقیہ کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ مرد کو عورت کا مہر بوجھل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے دل میں اس عورت کے لیے عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے: قد کلفتُ اِلیکَ علق القربة او عرق القربه۔ مجھے تیری طرف سے مشکیزہ کے پانی کی تکلیف دی گئی ہے۔ میں پیدائشی عربی تھا میں علق القربة او عرق القربة کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ جوہری نے کہا: علق القربة، عرق القربة میں ایک لغت ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: علق القربة سے مراد مشکیزہ کی وہ رسی ہے جس کے ساتھ مشکیزہ کو لٹکایا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے: کلفت اِلیک حتی عصام القربة۔ مجھے تیری مشقت میں ڈالا گیا ہے حتیٰ کہ مشکیزہ کی رسی بھی میرے ذمہ ہے اور اس کا پانی بھی میری ذمہ داری ہے۔ کہتا ہے: جشِمت اِلیکِ حتی سافرت واحتجت الی عرق القِربة۔ اس جملہ میں عرق القربة سے مراد مشکیزہ کا پانی ہے اور یہی لفظ پانی کے بہاؤ کے لیے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الصداق، حدیث نمبر 1801، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 340

بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لوگ پانی سفر میں ساتھ لے جاتے تھے اور اسے اونٹ پر لٹکا دیتے تھے اور اسے بانٹتے تھے تو سواری پر وہ شاق ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ العرق اور العلق دونوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اصمعی نے کہا: عرق القربۃ ایسا کلمہ ہے جس کا معنی شدت ہے اور فرمایا: میں نہیں جانتا کہ اس کی اصل کیا ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے ابن ابی طرفہ سے سنا، میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں سے یہ زیادہ فصیح ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لقیت من فلان عرقۃ القربۃ۔ یعنی میں نے فلاں سے تکلیف پائی اور اس نے ابن الاحمر کا یہ شعر پڑھا:

لَيْسَتْ بِشَتْمَةٍ تُعَدُّ وَ عَفْوُهَا عَرَقُ السِّقَاءِ على القَعُود اللَّاغِبِ

ابو عبیدہ نے کہا: شاعر کی مراد یہ ہے کہ وہ ایک کلمہ سنتا ہے جو اسے غضب ناک کرتا ہے وہ گالی بھی نہیں ہے کہ ایسے کہنے والے کا مؤاخذہ کیا جائے، حالانکہ مجھے اس حد تک پہنچایا گیا ہے جیسا کہ عرق القربۃ۔ شاعر نے عرق السقا کہا، کیونکہ شعری وزن درست نہیں رہتا تھا پھر کہا علق القعود واللاغب۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سفروں میں لوگ پیٹھ پر مشکیزہ لٹکاتے تھے۔ یہ معلیٰ اور فراء کے حکایت کردہ معنی کے مشابہ ہے۔ اس نے کہا: لوگ جنگلوں میں سفر کرتے تھے اور پانی ساتھ لے جاتے تھے اور اسے اونٹ پر لٹکا دیتے تھے اور اسے تقسیم کرتے تھے۔ یہ سواری پر مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہوتا تھا۔ فراء نے یہ علق کی تفسیر کی ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ آیت زیادہ مہر رکھنے کے جواز کو مہیا نہیں کرتی کیونکہ قنطار کے ساتھ تمثیل یہ مبالغہ کی جہت سے ہے گویا یوں فرمایا وآتیتم ھذا القدر العظیم الذی لا یؤتیہ احد یعنی تم اتنی مقدار میں دو کہ کسی نے اتنی مقدار میں نہ دیا ہو۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے: من بنی للہ مسجدا ولو کمفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ (جس نے اللہ کی رضا کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ کونج کے گھونسلے کی طرح ہو تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے گھر بنا دے گا) اور یہ معلوم شدہ بات ہے کہ کونج کے گھونسلے کی مقدار مسجد نہیں ہوتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو حدرد کو فرمایا تھا جب کہ وہ مہر کے سلسلہ میں مدد طلب کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مہر کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ دو سو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: گویا تم سونا چاندی پتھریلی زمین یا پہاڑ سے کاٹتے ہو۔ بعض لوگوں نے مہر زیادہ رکھنے سے منع فرمایا۔ یہ لازم نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس نکاح کرنے والے پر انکار مہر زیادہ رکھنے کی وجہ سے نہ تھا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ اس حالت میں فقیر تھا اور مدد طلب کرنے اور سوال کرنے کا محتاج تھا اور یہ بالاتفاق مکروہ ہے۔ حضرت عمر نے ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کو جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، چالیس ہزار درہم مہر دیا تھا۔ ابو داؤد نے عقبۃ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا: کیا تو خوش ہے کہ میں تیرا نکاح فلاں عورت سے کر دوں؟ اس شخص نے کہا: ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے کہا: کیا تجھے پسند ہے کہ میں فلاں سے تیرا نکاح کر دوں؟ اس عورت نے کہا: ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح کر دیا۔ اس شخص نے اس عورت سے حقوق زوجیت ادا کیے اور اس کے لیے مہر مقرر نہ کیا اور نہ اسے کچھ دیا(1)۔ یہ حدیبیہ میں موجود لوگوں میں سے تھا اس کو خیبر سے حصہ ملا تھا جب وہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح باب فیمن تزوج ولم یسم صداقاً..... حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

شخص فوت ہونے لگا تو اس نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فلاں عورت سے میرا نکاح کیا تھا اور میں نے اس کا مہر مقرر نہیں کیا تھا اور نہ میں نے اسے کوئی اور چیز دی تھی، میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بطور مہر خیبر کا حصہ دیا، اس عورت نے وہ حصہ لے لیا اور اسے ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ علماء کا اجماع ہے کہ مہر کی زیادتی کی کوئی حد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا اور کم از کم مہر کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ کے تحت آئے گی۔ سورۂ آل عمران میں قِنْطَارًا کی تحدید کا قول گزر چکا ہے۔ ابن محیصن نے وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ کے الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے یہ ایک لغت ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

تسمع من تحت العجاج لها ازْمَلا

اور ایک اور کا قول ہے۔

إن لم أقاتلْ فألبسونی برْقعا

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا بکر بن عبداللہ المزنی نے کہا: خلع کرنے والی عورت سے خاوند کچھ واپس نہ لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَاْخُذُوْا اور اس کو سورۂ بقرہ کی آیت کے لیے ناسخ بنایا ہے۔ ابن زید وغیرہ نے کہا: یہ سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا (بقرہ:229) سے منسوخ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیات محکمہ ہیں نہ ان میں کوئی ناسخ ہے اور نہ کوئی منسوخ ہے، بلکہ ایک دوسرے پر مبنی ہیں۔ طبری نے کہا: یہ آیت محکمہ ہے بکر کے قول کا کوئی معنی نہیں۔ اگر عورت خود دینے کا ارادہ کرے تو نبی کریم ﷺ نے ثابت کے لیے جائز قرار دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے وہ لے لے جو اس نے اسے دیا تھا۔ بُهْتَانًا مصدر ہے حال واقع ہو رہا ہے۔ اِثْمًا اس کا عطف بُهْتَانًا پر ہے۔ مُّبِیْنًا، اِثْمًا کی نعت ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ، خلوت اختیار کرنے کے بعد مال لینے سے منع کی علت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الافضاء کا مطلب ہے مرد کا ایک لحاف میں عورت کے ساتھ ہونا خواہ اس نے حقوق زوجیت ادا کیے ہوں یا نہ کیے ہوں۔ یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ اور کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ فراء نے کہا الافضاء کا معنی مرد اور عورت کا خلوت اختیار کرنا اور جماع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور سدی وغیرہ نے کہا: اس آیت میں افضاء سے مراد جماع ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ کنایہ فرماتا ہے۔ اور لغت میں الافضاء کی اصل مخالطت ہے ملی جلی چیز کو فضا کہا جاتا ہے، شاعر نے کہا:

فقلتُ لها یا عمّتی لكِ ناقتی وتمْرٌ فَضَا فی عَیْبَتی وزَبِیب

کہا جاتا ہے: القوم فَوْضَی فَضَا یعنی لوگ ملے جلے ہیں ان کا کوئی امیر نہیں ہے۔ أفْضَی کا معنی خلوت اختیار کی ہے اگرچہ جماع نہ کیا ہو، تو کیا خلوت کی وجہ سے مہر ثابت ہو جائے گا یا نہیں؟ ہمارے علماء کے اس کے متعلق مختلف چار اقوال ہیں (۱) مہر صرف خلوت سے ثابت ہو جاتا ہے (۲) وطی سے مہر ثابت ہوتا ہے (۳) جس گھر میں عورت بھیجی گئی ہے اس میں خلوت سے

ثابت ہوتا ہے (۴) مرد اور عورت کے گھروں کے درمیان جدائی سے ثابت ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مطلقاً خلوت سے ثابت ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب کا یہی قول ہے۔ یہ فرماتے ہیں: جب خلوت صحیحہ ہو جائے تو پورا مہر اور عدت واجب ہو جاتی ہے، خواہ مرد نے عورت سے دخول کیا ہو یا دخول نہ کیا ہو۔ کیونکہ دارقطنی نے ثوبان سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے عورت کا دوپٹہ کھولا اور اس کی طرف دیکھا تو مہر واجب ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: جب دروازہ بند کیا، پردہ لٹکا دیا اور شرمگاہ کو دیکھا تو مہر واجب ہو گیا (2)۔ امام مالک نے فرمایا: جب وہ عورت کے ساتھ ایک طویل عرصہ ٹھہرا رہا مثلاً ایک سال وغیرہ۔ اور وہ دونوں متفق ہوں کہ جماع نہیں ہوا اور عورت پورا مہر طلب کرے تو اس کے لیے یہ ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اس عورت پر عدت نہ ہوگی اور اسے نصف مہر ملے گا سورۂ بقرہ میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا اس کے متعلق تین اقوال ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے ذریعے حاصل کیا ہے اور تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے ساتھ ان کی فروج کو حلال کیا ہے''۔ یہ عکرمہ اور ربیع کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ارشاد مراد ہے فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (بقرہ: 229) یہ حسن، ابن سیرین، قتادہ، ضحاک اور سدی کا قول ہے تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نکاح کا عقد ہے۔ مرد کہتا ہے: میں نے نکاح کیا اور میں نکاح کی عقد کا مالک ہوا۔ یہ مجاہد اور ابن زید کا قول ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ میثاق غلیظ سے مراد بچہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

''اور نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا مگر جو ہو چکا (اس سے پہلے سو وہ معاف ہے) بے شک یہ فعل بہت بے حیائی اور نفرت کا فعل اور بہت برا طریقہ تھا''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لیے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی) کے نزول کے بعد اپنے باپ کی بیوی سے اس کی رضا سے نکاح کر لیتے تھے حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی وَ لَا تَنْكِحُوْا الخ پس یہ تمام احوال میں حرام ہو گیا، کیونکہ نکاح کا اطلاق جماع اور نکاح کرنے پر ہوتا ہے۔ اگر باپ کسی عورت سے نکاح کرے یا اس سے وطی کرے بغیر نکاح کے بیٹے پر وہ عورت حرام ہو جائے گی۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَكَحَ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: عقد ہے یعنی جو تمہارے آباء نے نکاح فاسد کیا جو اللہ کے دین کے مخالف تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کی وجہ کو پختہ کیا اور اس کی

1۔ سنن دارقطنی، 3824
2۔ ایضاً، 3819

شرائط کو واضح کر دیا ہے۔ یہ طبری کا مختار قول ہے۔ من، تَنْكِحُوْا کے متعلق ہے اور مَا نَكَحَ مصدر ہے۔ فرمایا: اگر اس کا معنی یہ ہو کہ ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا تو پھر ما کی جگہ من کا ہونا واجب تھا۔ اس بناء پر نہی اس پر واقع ہوئی کہ وہ اپنے باپ دادا کے فاسد نکاح کی طرح نکاح نہ کریں۔ پہلا قول اصح ہے۔ اور ما بمعنی الذی اور من ہو گا اس پر دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام نے اس آیت کو اس معنی پر محمول کیا اور بیٹوں کے لیے اپنے باپ دادا کی بیویوں سے نکاح کرنے سے استدلال کیا ہے۔ عرب میں ایسے قبائل تھے جن کی عادت تھی کہ باپ مر جاتا تو بیٹا اس کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح کر لیتا۔ یہی طریقہ انصار میں بھی تھا اور قریش میں یہ طریقہ باہم رضامندی پر مباح تھا، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ عمرو بن امیہ نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیا پھر اس سے مسافر یا ابو معیط کو اس نے جنم دیا اور پہلے امیہ سے اس کے بیٹے ابو العیص وغیرہ تھے۔ بنو امیہ، مسافر اور ابو معیط کے بھائی تھے اور ان کے چچے بھی تھے۔ اسی سے ہے کہ صفوان بن امیہ بن خلف نے اپنے باپ کے بعد اپنی سوتیلی ماں فاختہ بنت اسود بن مطلب بن اسد سے نکاح کیا تھا۔ امیہ قتل ہوا تھا جب کہ وہ اس کے عقد میں تھی۔ اس میں سے یہ ہے منظور بن زبان نے ملیکہ بنت خارجہ سے نکاح کیا تھا اور یہ پہلے اس کے باپ زبان بن سیار کے عقد میں تھی۔ حصن بن ابی قیس نے اپنے باپ کی بیوی کبیشہ بنت معن سے نکاح کیا تھا۔ اسود بن خلف نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا۔ اشعث بن سوار نے کہا: ابو قیس فوت ہوا اور یہ انصار کے نیک افراد میں سے تھا، اس کے بیٹے قیس نے اپنے باپ کی بیوی کو نکاح کا پیغام بھیجا، اس عورت نے کہا: میں تجھے اپنا بیٹا شمار کرتی ہوں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتی ہوں اور آپ سے مشورہ طلب کرتی ہوں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور صورت حال عرض کی پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ عربوں میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں سے نکاح کیا تھا وہ حاجب بن زرارہ تھا، وہ مجوسی ہو گیا تھا اس نے یہ فعل شنیع کیا تھا اس کا ذکر نضر بن شمیل نے اپنی ''کتاب المثالب'' میں کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا اس سے جس طریقہ پر ان کے آباء نکاح کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ یعنی جو گزر چکا اور جو ہو چکا یعنی جو تمہارے باپ دادا اور قرابتداروں سے جو ہو چکا وہ معاف ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے یعنی جو کچھ پہلے ہو چکا تم اس سے اجتناب کرو اور اسے چھوڑ دو۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّا بمعنی بعد ہے یعنی بعد ما سلف۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (الدخان: 56) اس آیت میں اِلَّا بمعنی بعد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب لا ما سلف یعنی وہ نہیں جو ہو چکا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا۔ یعنی ولا خطا۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا معنی ہے: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا اور بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں اضمار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ یعنی نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا) اگر تم ایسا کرو گے تو تم سے مواخذہ ہو گا اور تمہیں سزا دی جائے گی مگر جو ہو چکا وہ معاف ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا اس عمل کی مذمت فرمائی اس میں مبالغہ فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ اس نے جو فعل کیا وہ انتہائی قبیح اور برا ہے۔ ابو العباس نے کہا: میں نے ابن عربی سے نکاح المقت کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا: وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح کرے جب باپ اسے طلاق دے یا باپ مرجائے۔ ایسے شخص کو الضیزن کہا جاتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: عربوں میں جب کوئی شخص اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرتا اور پھر اس عورت سے بچہ پیدا ہوتا تو اس بچے کو مقتی کہا جاتا تھا۔ المقت کی اصل البغض ہے۔ یہ مقت یمقت مقتاً فھو ممقوت و مقیت سے مشتق ہے۔ اور باپ کی بیوی سے بچہ پیدا کرنے والے کو مقیت کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو مقتاً فرمایا ہے، کیونکہ یہ مقت والا ہے۔ ایسا نکاح کرنے والے کو وہ بچہ لاحق ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے مراد نہی ہے اس بات سے کہ آدمی ایسی عورت سے وطی کرے جس سے اس کا باپ یا دادا وطی کر چکا ہو مگر جو زمانہ جاہلیت میں ان کے آباء جن عورتوں سے زنا کر چکے وہ معاف ہے، جب کہ وہ مناکحت کے اعتبار سے صحبت نہ تھی، کیونکہ تمہارے لیے ان سے نکاح جائز ہے اور تم عقد نکاح کے ذریعے وطی کر سکتے ہو جن سے تمہارے آباء نے زنا کے اعتبار سے وطی کی ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ اس صورت میں استثنا متصل ہوگی اور اس میں اصل ہوگی کہ زنا حرام نہیں کرتا جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''حرام کر دی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں رضاعت سے اور مائیں تمہاری بیویوں کی اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں اور (حرام کی گئیں) بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور (یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو مگر جو گزر چکا (سو وہ معاف ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ یعنی تم پر اپنی ماؤوں سے نکاح کرنا اور اپنی بیٹیوں سے نکاح کرنا

حرام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن سے نکاح کرنا حلال ہے اور جن سے نکاح کرنا حرام ہے جیسا کہ باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کی حرمت ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سات عورتیں نسب کی وجہ سے اور چھ عورتیں حرمت رضاعت اور حرمت مصاہرت کی وجہ سے حرام کی ہیں اور سنت متواترہ نے ساتویں عورت کو اس کے ساتھ لاحق کیا ہے وہ ہے پھوپھی، بھتیجی کو جمع کرنا۔ اس پر اجماع ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک روایت ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا: نسب کی وجہ سے سات عورتیں حرام ہیں اور حرمت مصاہرت کی وجہ سے سات عورتیں حرام ہیں پھر یہ آیت تلاوت کی۔ عمرو بن سالم مولی الانصار نے اس کی مثل کہا ہے اور فرمایا: ساتویں صورت اس ارشاد میں ہے وَّالْمُحْصَنٰتُ۔ اور وہ سات عورتیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ یہ ہیں مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور وہ عورتیں جن کی حرمت کا سبب مصاہرت اور رضاعت ہے وہ سات ہیں رضاعی مائیں، رضاعی بہنیں، عورتوں کی مائیں۔ کسی دوسرے مرد سے بیوی کی بیٹیاں، بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا اور ساتویں وہ عورت جن سے تمہارے باپ دادا نکاح کر چکے ہوں۔

امام طحاوی نے فرمایا: یہ تمام محکم اور متفق علیہ طور پر حرام ہیں ان میں سے کسی عورت سے بالا جماع نکاح کرنا جائز نہیں ہے مگر ان عورتوں کی مائیں جن کے ساتھ دخول نہیں ہوا۔ جمہور علماء سلف کا نظریہ یہ ہے کہ بیٹی سے عقد کرنے سے ماں حرام ہو جاتی ہے اور ماں، بیٹی کو حرام نہیں کرتی مگر جب ماں سے دخول ہو چکا ہو۔ تمام ائمہ فتویٰ کا یہی قول ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے کہا: ماں اور ربیبۃ (بیوی کی بیٹی جو دوسرے خاوند سے ہے) برابر ہیں ان میں سے کوئی ایک حرام نہیں ہوتی مگر دوسری سے صحبت کر لینے کے بعد۔ یہ علماء کہتے ہیں: اُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔ یہ علماء کہتے ہیں: دخول کی شرط امہات اور ربائب تمام کی طرف راجع ہے۔ خلاس نے حضرت علی بن ابی طالب سے یہ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر، حضرت زید بن ثابت سے بھی مروی ہے۔ یہی ابن زبیر اور مجاہد کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: دونوں میں دخول مراد ہے۔ جمہور کا قول اس کا مخالف ہے۔ حکم اور فتویٰ جمہور کے قول پر ہے۔ اہل عراق نے اس میں سختی کی ہے حتی کہ انہوں نے کہا: اگر عورت سے زنا سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ بوسہ دیا یا چھوا تو اس عورت کی بیٹی اس شخص پر حرام ہو جائے گی۔ مالکیوں اور شوافع کے نزدیک نکاح صحیح کے ساتھ حرام ہوگی۔ حرام، حلال کو حرام نہیں کرتا جیسا کہ آگے آئے گا اور خلاس کی حدیث جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ علماء حدیث کے نزدیک اس کی روایت صحیح نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح، جمہور کے قول کے مثل مروی ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطا سے پوچھا ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرتا ہے پھر نہ اسے دیکھتا ہے نہ اس سے مجامعت کرتا ہے حتی کہ وہ اسے طلاق دے دیتا ہے کیا اس شخص کے لیے اس عورت کی ماں حلال ہوگی؟ عطا نے کہا: نہیں۔ یہ مطلق ہے خواہ اس نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ میں نے عطا سے پوچھا کیا حضرت ابن عباس وَاُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ وَرَبَآىٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا: نہیں نہیں۔ سعید نے قتادہ سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَاُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت مبہم ہے بیٹی پر عقد کی وجہ سے ماں حلال نہیں ہوگی۔ اسی طرح

مالک نے اپنے مؤطا میں حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے زید نے کہا: نہیں الامر (ماں) مبہم ہے اس میں شرط نہیں ہے۔ شرط صرف ربائب میں ہے۔ ابن المنذر نے کہا: یہ صحیح ہے، کیونکہ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ کے ارشاد میں تمام عورتوں کی مائیں داخل ہیں۔ اس قول کی تائید اعراب کی جہت سے بھی ہوتی ہے جب دو خبریں عامل میں مختلف ہوں تو ان کی نعت ایک نہیں ہوتی اور نحویوں کے نزدیک مررت بنسائك وهربت من نساء زيد الظريفات اس بنا پر جائز نہیں کہ الظریفات، نسائك اور نساء زید کی نعت ہو۔ اسی طرح اس آیت میں اللاتی کا دونوں کی نعت ہونا جائز نہیں، کیونکہ دونوں خبریں مختلف ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے جائز ہے خلیل اور سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

إنّ بها أكْتَلَ أو رِزَامَا خُوَيْرِبَيْنِ يَنْقُفَانِ الْهَامَا

یعنی اکتل اور رزام یعنی خویربان کھوپڑی کو توڑتے ہیں۔

اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے صراحۃً مروی ہے کہ "جب کوئی شخص عورت سے نکاح کرے تو اس کے لیے اس عورت کی ماں سے نکاح کرنا حلال نہیں خواہ بیٹی سے صحبت کر چکا ہو یا صحبت نہ کی ہو اور جب ماں سے نکاح کرے اور اس نے ابھی دخول نہ کیا ہو پھر اسے طلاق دے دے تو پھر اگر چاہے تو اس کی بیٹی سے نکاح کر لے"۔ اس حدیث کو صحیحین میں نقل کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو گیا، تو تو جان لے کہ تحریم، اعیان کی صفت نہیں اور نہ اعیان تحلیل وتحریم کا مورد ہیں نہ مصدر ہیں، امر و نہی کے ساتھ تکلیف کا تعلق مکلفین کے افعال کے ساتھ ہے، لیکن اعیان جب افعال کا مورد ہیں تو امر و نہی اور حکم کو ان کی طرف منسوب کیا گیا اور مجازاً ان کے ساتھ معلق کیے گئے محل کے اعتبار سے کہ فعل یہاں پایا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُمَّهٰتُكُمْ امہات کی حرمت ہر حال کو شامل ہے کسی وجہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اسی وجہ سے اہل علم اسے المبہم کہتے ہیں یعنی اس میں نہ باب ہے، نہ اس کی تحریم کو روکنے کا کوئی راستہ ہے۔ اسی طرح بیٹیوں اور بہنوں اور محرمات کی حرمت ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ امہات، امہۃ کی جمع ہے کہا جاتا ہے۔ ام و امھۃ کا ایک معنی ہے۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ آئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ام کی اصل امھۃ ہے فعلۃ کے وزن پر جیسے قبرة و حمرة یہ دو پرندوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پہلے ہ ساقط ہو گئی پھر جمع میں واپس آ گئی شاعر نے کہا:

أُمَّهَتِي خِنْدِفُ والدَّوْسُ أَبِي

بعض علماء نے فرمایا: ام کی اصل امۃ ہے، انہوں نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

تقبلتها عن أُمّة لك طالما تَثُوبُ إليها لى النوائب أجمعا

اور اس کی جمع امات ہو گی۔ چرواہے نے کہا تھا۔

كانت نجائبُ مُنْذِرٍ و مُحَرِّقٍ أُمَّاتِهِنَّ وطَرْقُهُنَّ فَحِيلَا

پس الام کا لفظ ہر مونث کا اسم ہے جس کے لیے تجھ پر ولادت کا رشتہ ہو۔ پس اس میں قریبی والدہ اس کی والدہ اور اس کی

دادی، باپ کی والدہ اور دادی سب داخل ہیں اگرچہ بہت اوپر کی ہوں اور البنت ہر اس مؤنث کا نام ہے تیرے لیے اس پر ولادت کا رشتہ ہو۔ اگر تو چاہے تو کہہ سکتا ہے: ہر وہ مؤنث جس کا نسب تیری طرف ولادت کی وجہ سے لوٹے خواہ ایک درجہ ہو یا زیادہ درجات ہوں، پس اس میں صلبی بیٹی، اس کی بیٹیاں، بیٹوں کی بیٹیاں اگرچہ بہت نیچے کی ہوں سب داخل ہیں۔ الاخت ہر اس مؤنث کا اسم ہے تیرے دونوں اصلوں میں تیری پڑوسی ہو یا ایک اصل میں تیری پڑوسی ہو۔ بنات، جمع ہے بنت کی اس کی اصل بنیة ہے اور مستعمل ابنة اور بنت ہوتا ہے۔ فراء نے کہا: بنت کی با کو کسرہ دیا گیا ہے تا کہ یا پر دلالت کرے اور اخت میں ہمزہ پر ضمہ دیا گیا ہے تا کہ واؤ کے حذف پر دلالت کرے، کیونکہ اخت کی اصل اخوۃ ہے اور جمع اخوات ہے اور العمة ہر مونث کا اسم ہے جو تیرے باپ یا تیرے دادا کے ساتھ اس کی دونوں اصل میں شریک ہو یا ایک اصل میں شریک ہو اگر تو چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے ہر مذکر جس کا نسب تیری طرف لوٹے تو اس کی بہن تیری پھوپھی ہے کبھی پھوپھی ماں کی جہت سے ہوتی ہے یہ تیری ماں کے باپ کی بہن ہے۔ خالہ ہر اس مونث کا اسم ہے جو تیری ماں کے ساتھ دونوں اصلوں میں شریک ہو یا ایک اصل میں شریک ہو۔ اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے ہر وہ مونث جس کا نسب تیری طرف ولادت کے ساتھ لوٹے تو اس کی بہن تیری خالہ ہے کبھی خالہ باپ کی جہت سے ہوتی ہے وہ تیرے باپ کی ماں کی بہن ہے اور بنت الاخ ہر اس مونث کا اسم ہے تیرے بھائی کا اس پر ولادۃ کا رشتہ ہو بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ ہو۔ اور اسی طرح بنت الاخت (بھانجی) ہے۔ یہ سات عورتیں ہیں جن کی حرمت کا سبب نسب ہے نافع نے اور ایک روایت میں ابو بکر بن ابی اویس نے الاخ کی وجہ سے خا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جب اس میں الف، لام ہو حرکت کے نقل کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ یہ تحریم میں ان کی طرح ہیں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رضاعت کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ عبداللہ نے وامھاتکم الائی بغیرتا کے پڑھا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ الّٰٓئِيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ (الطلاق: 4) شاعر نے کہا:

من اللّاءِ لم يحجُجْنَ يَبْغِين حِسْبَةً ولكن ليقتُلنَ البَرِيَ المغفّلا

اَرْضَعْنَكُمْ جب عورت بچے کو دودھ پلا دے تو وہ اس پر حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی ماں بن جاتی ہے اور اس کی بیٹی حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی بہن ہو جاتی ہے اور اس کی بہن حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی خالہ بن جاتی ہے اس کی ماں حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی نانی بن جاتی ہے اور اس کے خاوند کی بیٹی حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی بہن بن جاتی ہے اور اس خاوند کی بہن حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی پھوپھی بن جاتی ہے اور اس خاوند کی ماں حرام ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کی دادی بن جاتی ہے اور اس عورت کے بیٹوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں حرام ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ اس کے بھائیوں اور بہنوں کی بیٹیاں بن جاتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابو نعیم عبید اللہ بن ہشام الحلبی نے کہا: امام مالک سے پوچھا گیا: کیا عورت حج کرے اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ؟ امام مالک نے فرمایا: ہاں۔ ابو نعیم نے کہا: امام مالک سے پوچھا گیا: ایک عورت نے شادی کی اس کے خاوند

نے اس کے ساتھ صحبت کی پھر ایک عورت آئی اور اس نے کہا: میں نے ان دونوں (میاں، بیوی) کو دودھ پلایا تھا۔ امام مالک نے فرمایا: انہیں جدا کر دیا جائے اور جو کچھ عورت نے مرد سے مہر لیا تھا وہ اس کا ہوگا اور جو باقی ہے وہ اس خاوند پر باقی نہ رہے گا۔ پھر امام مالک نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مثل مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کہا تھا۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! یہ بوڑھی عورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ فلاں نے اپنی بہن سے نکاح کیا ہے؟

مسئلہ نمبر 6۔ رضاع سے حرمت تب ثابت ہوتی ہے جب کہ دو سال کے دوران دودھ پلایا جائے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ ہمارے نزدیک قلیل دودھ پلانے یا زیادہ دودھ پلانے کے درمیان کوئی فرق نہیں جب معدہ تک دودھ پہنچ جائے گا اگرچہ ایک گھونٹ بھی ہوگا تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ امام شافعی نے دودھ پلانے میں دو شرائط کا اعتبار کیا ہے ایک شرط پانچ چسکیاں، کیونکہ حضرت عائشہ کی حدیث میں ہے "جو اللہ نے نازل فرمایا اس میں تھا کہ دس معلوم چسکیاں حرام کر دیتی ہیں پھر پانچ چسکیوں کے ساتھ دس والا حکم منسوخ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا جب کہ یہ قرآن سے پڑھی جاتی تھیں"۔ اس سے استدلال یہ ہے کہ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ دس چسکیاں، پانچ کے ساتھ منسوخ ہو گئیں اگر تحریم پانچ سے کم چسکیوں کے ساتھ معلق کریں تو یہ پانچ کے لیے نسخ ہوں گی اور اس میں خبر واحد اور قیاس قبول نہیں ہوتا، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ نسخ واقع نہیں ہوتا اور سہلہ کی حدیث میں ہے "تو اسے (سالم) پانچ چسکیاں دودھ پلا دے وہ ان کی وجہ سے حرام ہو جائے گا"۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دودھ پلانا دو سال میں ہو۔ اگر دو سال سے زائد عمر میں دودھ پلایا جائے گا تو حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (بقرہ:233) تمام اور کمال کے بعد کوئی چیز نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہ نے اڑھائی سال کا اعتبار کیا ہے اور امام مالک نے ایک ماہ زائد کا اعتبار کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: جب تک وہ دودھ پیتا ہے اور اس کا دودھ چھڑایا نہیں گیا تو وہ رضاع ہے اگرچہ اس پر تین سال بھی گزر چکے ہوں۔ اوزاعی نے کہا: جب ایک سال بعد دودھ چھڑا دیا گیا ہو پھر متواتر دودھ چھوٹا ہی رہے تو اس کے بعد رضاع ثابت نہ ہوگا۔ لیث بن سعد علماء کے درمیان منفرد ہیں۔ وہ کہتے ہیں: بڑے کو دودھ پلانا بھی حرمت کا موجب ہے۔ یہ حضرت عائشہ کا قول ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے بھی روایت ہے اور حضرت ابو موسیٰ سے اس سے رجوع بھی مروی ہے۔ یہ ابو حصین نے ابو عطیہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ایک شخص مدینہ طیبہ سے اپنی بیوی کے ساتھ آیا اس نے بچہ جنم دیا اور اس کے پستان پھول گئے تھے۔ پس اس کے خاوند نے اسے چوسنا شروع کر دیا اور کلی کرنا شروع کر دیا تو دودھ کا گھونٹ اس کے پیٹ میں چلا گیا اس نے حضرت ابو موسیٰ سے مسئلہ پوچھا تو حضرت ابو موسیٰ نے کہا: تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی اور تو حضرت ابن مسعود کے پاس جا اور اسے یہ مسئلہ بتا۔ اس شخص نے ایسا کیا حضرت ابن مسعود اس اعرابی کے ساتھ حضرت ابو موسیٰ کے پاس آئے اور کہا: کیا تم اس سفید، سیاہ بالوں والے کو رضیع خیال کرتے ہو! حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب دودھ گوشت اور ہڈیوں کو بڑھاتا ہے اشعری نے کہا: تم مجھ سے کوئی مسئلہ نہ پوچھا کرو جب کہ تمہارے درمیان یہ بہت بڑا عالم موجود ہے۔ پس "پس تم نہ پوچھا کرو" کے الفاظ دلیل ہیں کہ آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سالم مولیٰ ابن

حذیفہ کے واقعہ سے حجت پکڑی ہے کہ وہ اس وقت مرد تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہلہ بنت سہیل کو کہا تھا کہ تو اسے دودھ پلا دے۔ اس حدیث کو مؤطا وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔ ایک طائفہ نے شاذ قول کیا ہے اور دس چسکیاں پینے کا اعتبار کیا ہے انہوں نے عشر رضعات جو قرآن میں تھا اس کا اعتبار کیا ہے گویا انہیں ناسخ نہیں پہنچا تھا۔ داؤد نے کہا: حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی مگر تین چسکیاں پینے کے ساتھ اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے حجت پکڑی ہے ''ایک چسکی اور دو چسکیاں حرمت رضاعت کو ثابت نہیں کرتی ہیں'' اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عائشہ اور حضرت ابن زبیر سے مروی ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابوثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ یہ دلیل الخطاب سے تمسک (دلیل پکڑنا) ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ان علماء کے علاوہ ائمہ فتویٰ کا یہ نظریہ ہے کہ ایک گھونٹ بھی حرام کر دیتا ہے جب یقین ہو جائے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے انہوں نے کم از کم مقدار جس پر رضاع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اس سے حجت پکڑی ہے۔ اس کی تائید، اہل مدینہ کے عمل سے اور مصاہرت پر قیاس کے ساتھ کی گئی ہے، اس علت کے ساتھ کہ یہ لاحق ہونے والا معنی ابدی تحریم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اس میں عدد شرط نہیں ہے جس طرح مصاہرت میں عدد شرط نہیں ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دودھ تھوڑا پینا اور زیادہ پینا، پنگھوڑے میں حرام کر دیتا ہے جو روزہ دار کے روزہ کو افطار کر دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث اس کے خلاف پر آگاہ نہیں تھے۔ میں کہتا ہوں: اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: لاتحرم المصة ولا المصتان (ایک اور دو چسکیاں حرام نہیں کرتی ہیں) نص ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ کی تفسیر کرتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں تین چسکیاں پلائیں یا زیادہ مگر یہ ممکن ہے کہ اسے اس پر محمول کیا جائے جب دودھ کا بچے کے پیٹ میں پہنچنا متحقق نہ ہو، کیونکہ دس معلوم چسکیوں اور پانچ معلوم چسکیوں کا ارشاد موجود ہے پس معلوم کے ساتھ وصف ذکر فرمایا یہ پیٹ میں دودھ کے پہنچنے میں شک اور وہم سے بچنے کے لیے ہے۔ دلیل خطاب اس کو فائدہ دیتی ہے کہ چسکیاں جب غیر معلوم ہوں تو حرام نہیں کرتیں۔ واللہ اعلم۔ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ املاجۃ والا ملاجتین والی حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن زبیر کبھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، کبھی حضرت عائشہ سے روایت فرماتے ہیں، کبھی اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں اس قسم کا اضطراب حدیث کو حجت ہونے سے ساقط کر دیتا ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ صرف سات چسکیاں پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی بہن حضرت ام کلثوم کو حکم دیا کہ وہ سالم کو دس چسکیاں پلا دے۔ حضرت حفصہ سے اس کی مثل مروی ہے ان سے تین چسکیاں پلانا بھی اور پانچ چسکیاں پلانا بھی مروی ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ اسحاق سے یہ حکایت کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ جن علماء نے نر کے دودھ کی نفی کی ہے انہوں نے اس جملہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، ابوسلمہ بن عبد الرحمن کا قول ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: نر کا دودھ مرد کی طرف سے کسی چیز کو حرام نہیں کرتا۔ اور جمہور علماء فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ دلیل ہے کہ نر باپ ہے، کیونکہ دودھ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے سبب دودھ دیتا ہے یہ ضعیف ہے، کیونکہ بچہ مرد

اور عورت دونوں کے پانی سے پیدا ہوا ہوتا ہے اور دودھ عورت سے ہوتا ہے مرد سے دودھ نہیں نکلتا اور مرد کی طرف سے وطی ہوتی ہے جو مرد سے پانی کے نزول کا سبب ہے۔ جب بچہ ماں سے جدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دودھ پیدا فرماتا ہے کسی اعتبار سے مرد کی طرف مضاف نہیں ہوتا اسی وجہ سے مرد کو دودھ میں کوئی حق نہیں ہے۔ دودھ عورت کے لیے ہوتا ہے پانی پر قیاس سے اس کو لینا ممکن نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب(1) (جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ رضاع سے بھی حرام ہوتے ہیں) یہ رضاع کی وجہ سے تحریم کا تقاضا کرتا ہے اور مرد کی طرف رضاع کی نسبت کی وجہ اس طرح ظاہر نہیں ہوتی جس طرح پانی کی نسبت مرد کی طرف اور رضاع کی نسبت عورت کی طرف ظاہر ہوتی ہے ہاں اس میں اصل زہری، ہشام بن عروہ عن عائشہ کے سلسلہ سے مروی حدیث ہے کہ افلح ابی قعیس کا بھائی حضرت عائشہ کے پاس آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا، وہ حضرت عائشہ کا رضاعی چچا تھا یہ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہ نے کہا: میں اسے اجازت نہیں دیتی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے مسئلہ عرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تیرے پاس آنا چاہیے، کیونکہ وہ تمہارا چچا ہے تربت یمینک، ابوالقعیس اس عورت کا خاوند تھا جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دودھ پلایا تھا۔ یہ بھی خبر واحد ہے یہ بھی احتمال ہے کہ افلح نے حضرت ابوبکر کے ساتھ دودھ پیا ہو اسی وجہ سے آپ نے فرمایا ہو: وہ تیرے پاس داخل ہو، کیونکہ وہ تمہارا چچا ہے۔ بہر حال اس میں حتمی قول کرنا مشکل ہے اور حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن عمل اس پر ہے اور تحریم میں احتیاط بہتر ہے جبکہ یہ ارشاد بھی موجود ہے وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (اس کے علاوہ عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں) یہ مخالف کے قول کو تقویت دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ اس سے مراد سگی بہن ہے اور وہ بہن ہے جس کو تیرے باپ کے دودھ سے تیری ماں نے دودھ پلایا ہے خواہ اس کو تیرے ساتھ دودھ پلایا ہو یا وہ تجھ سے پہلے پیدا ہوئی ہو یا بعد میں اور وہ جو صرف باپ کی طرف سے تیری بہن ہے اور وہ وہ ہے جس کو تیرے باپ کی بیوی نے دودھ پلایا ہے اور صرف ماں کی طرف سے بہن یہ وہ ہے جس کو تیری ماں نے کسی دوسرے مرد کے دودھ سے دودھ پلایا ہے پھر حرمت مصاہرت کا ذکر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ تمہاری بیویوں کی مائیں۔ مصاہرت کے سبب حرام ہونے والی عورتیں چار ہیں، بیوی کی ماں، بیوی کی بیٹی، باپ کی بیوی، بیٹے کی بیوی اور بیوی کی ماں، بیٹی سے عقد صحیح سے حرام ہو جاتی ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ۔ یہ ایک مستقل کلام ہے اور مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ کا ارشاد پہلے فریق کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ یہ ربائب کی طرف راجع ہے، کیونکہ یہ قریب مذکور ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ربیبۃ خاوند کی بیوی کی بیٹی جو پہلے خاوند سے ہو اس کو ربیبۃ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنی گود میں اس کی تربیت کرتا ہے پس یہ مربوبۃ ہے۔ فعیلۃ بمعنی مفعولۃ ہے۔ فقہاء نے اتفاق کیا ہے کہ ربیبۃ اپنی ماں کے خاوند پر حرام ہوتی ہے جب وہ ماں سے صحبت کر لیتا ہے اگرچہ ربیبۃ اس کی پرورش میں نہ بھی ہو۔ بعض متقدمین اور اہل ظواہر نے شاذ

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، باب ما یحرم من الرضاع، حدیث نمبر 3248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قول کیا ہے کہ ربیبۃ اس مرد پر حرام نہیں ہوتی مگر جب کہ وہ اس شخص کی پرورش میں ہو جس نے اس کی ماں سے نکاح کیا ہے اگر وہ بچی دوسرے شہر میں ہو اور ماں کو وہ دخول کے بعد جدا کر دے تو اس شخص کے لیے اس بچی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ انہوں نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ربیبۃ کو دو شرطوں کے ساتھ حرام کیا ہے (۱) وہ ماں سے نکاح کرنے والے کی پرورش میں ہو، دوسری یہ کہ وہ ماں سے دخول کر چکا ہو۔ جب ان دو شرطوں میں سے ایک مفقود ہو تو تحریم نہیں پائی جائے گی اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی حجت پکڑی ہے کہ "اگر یہ میری گود میں پرورش نہ پاتی تب بھی میرے لیے حلال نہ تھی، کیونکہ یہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے" (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں پرورش کو شرط قرار دیا ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی اجازت روایت کی ہے۔ ابن المنذر اور طحاوی نے کہا کہ رہی حضرت علی کی حدیث تو وہ ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کا راوی ابراہیم بن عبید غیر معروف ہے اور اکثر اہل علم نے اس کو دور کیا ہے اور اس کے خلاف قول کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کو فلا تعرضن علی بناتکن ولا اخوتکن دور کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عام فرمایا ہے اور آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنی وہ بیٹیاں پیش نہ کرو جو میری گود میں ہیں بلکہ تحریم میں سب کو برابر کیا۔ امام طحاوی نے فرمایا: گود میں ہونے کی اضافت غالب طور پر ہے کہ وہ ربائب ہوتی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گود میں پرورش نہ پا رہی ہوں تو حرام ہی نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ یعنی ماں کے ساتھ دخول نہ کیا ہو تو اس کی بیٹی سے نکاح کرنے میں تجھ پر کوئی حرج نہیں ہے جب تم انہیں طلاق دے دو یا وہ مر جائیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرے پھر اسے طلاق دے دے یا وہ دخول سے پہلے مر جائے تو اس آدمی کے لیے اس عورت کی بیٹی سے نکاح کرنا حلال ہے، امہات کے ساتھ دخول میں اختلاف ہے جس سے ربائب کی تحریم واقع ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا دخول سے مراد جماع ہے۔ طاؤس اور عمرو بن دینار وغیرہما کا یہی قول ہے۔ امام مالک، ثوری، امام ابوحنیفہ، اوزاعی اور لیث کا اتفاق ہے کہ جب عورت کو شہوت کے ساتھ چھو لے تو اس پر اس عورت کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی اور وہ عورت اس کے باپ اور اس کے بیٹے پر حرام ہو جائے گی۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ دیکھنے میں اختلاف ہے امام مالک نے فرمایا: جب اس کے بالوں یا سینے کو یا دوسرے محاسن کو لذت کے لیے دیکھا تو اس پر اس کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی۔ کوفیوں نے کہا: جب اس کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھے گا تو یہ شہوت سے چھونے کے قائم مقام ہو گا۔ ثوری نے کہا: جب وہ اس کی فرج کی طرف جان بوجھ کر دیکھے گا یا اسے چھوئے گا تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔ انہوں نے شہوت کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ابی لیلیٰ نے کہا: دیکھنے سے حرام نہ ہو گی حتیٰ کہ چھو لے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے: دلیل اس پر کہ دیکھنے سے تحریم واقع ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ اس میں استمتاع کی ایک قسم ہے پس یہ نکاح کے قائم مقام ہو گا کیونکہ احکام معانی سے متعلق ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے۔ یہ کہنے کا بھی احتمال ہے کہ یہ استمتاع کے ساتھ جمع ہونے کی ایک نوع ہے، کیونکہ دیکھنا اجتماع اور ملاقات ہے اس میں محبت کرنے والوں کے درمیان استمتاع ہے۔ شعراء نے اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب امہاتکم التی ارضعنکم، حدیث نمبر 4711، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں مبالغہ کیا ہے:

أليس الليل يجمع أم عمرو وإيانا فذاك بنا تدانِ

نعم ترى الهلال كما أراه ويعلوها النهار كما علانِ

تو پھر دیکھنے، مل کر بیٹھنے، باتیں کرنے اور لذت میں یہ کیفیت کیسے نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ، الحلائل جمع ہے حلیلۃ کی۔ اس سے مراد بیوی ہے بیوی کو حلیلہ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ تحل مع الزوج حیث حل یعنی یہ خاوند کے ساتھ اترتی ہے جہاں وہ اترتا ہے یہ فعیلہ بمعنی فاعلۃ ہے۔ زجاج اور ایک اور قوم کا یہ نظریہ ہے کہ یہ لفظ الحلال سے ہے یہ حلیلۃ بمعنی محللہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نام اس کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ میاں، بیوی سے ہر ایک دوسرے کا ازار کھولتا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ علماء کا اجماع ہے باپ، دادا جن عورتوں سے نکاح کرتے ہیں وہ بیٹوں پر حرام ہو جاتی ہیں اور جس سے بیٹے نکاح کرتے ہیں وہ باپ، دادا پر حرام ہو جاتی ہیں خواہ نکاح کے ساتھ وطی ہو یا نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک نکاح فاسد کرے تو دوسرے پر اس سے عقد کرنا حرام ہوگا جس طرح عقد صحیح سے حرام ہوتا ہے، کیونکہ نکاح فاسد یا تو ایسا ہوگا کہ اس کے فساد پر اتفاق ہوگا یا اس میں اختلاف ہوگا۔ اگر اس کے فساد پر اتفاق ہو تو وہ حکم کو ثابت نہیں کرتا اور اس کا وجود نہ ہونے کی طرح ہوتا ہے اگر اس میں اختلاف ہے تو اس کے ساتھ وہ حرمت متعلق ہوتی ہے جو نکاح صحیح کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، کیونکہ احتمال ہے کہ وہ نکاح صحیح ہو پس وہ مطلق اللفظ کے تحت داخل ہوگا۔ اور فروج جب ان میں تحریم و تحلیل کا تعارض ہو تو تحریم کو غلبہ دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن المنذر نے کہا: علماء امصار کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص نکاح فاسد کے ساتھ عورت سے وطی کرے تو اس کے باپ اور بیٹے پر وہ عورت حرام ہو جاتی ہے اور ذیل کے مسئلہ پر علماء کا اجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ لونڈی کو کسی کا خریدنا اسے اس کے باپ اور بیٹے پر حرام نہیں کرتا، جب کوئی شخص لونڈی خریدے پھر اسے چھوئے یا بوسہ دے تو وہ اس کے باپ اور بیٹے پر حرام ہو جائے گی۔ میں ان علماء کو نہیں جانتا جو اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہوں۔ ابن المنذر نے کہا: جو کچھ ہم نے کہا کسی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف صحیح مروی نہیں۔ یعقوب اور محمد نے کہا: جب کوئی شخص کسی عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو وہ عورت اس کے باپ اور اس کے بیٹے پر حرام ہو جائے گی اور اس شخص پر اس عورت کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی۔ امام مالک نے فرمایا: جب لونڈی سے وطی کرے یا وطی کے لیے اس کے پاس بیٹھے اور اس کا پردہ بکارت نہ پھاڑے یا اسے بوسہ دے یا اس کے جسم کے ساتھ جسم لگائے یا اسے ہاتھ لگائے اور یہ بطور تلذذ ہو تو اس کے بیٹے کے لیے وہ حلال نہ ہوگی۔ امام شافعی نے فرمایا: چھونے سے حرام ہوگی نظر سے حرام نہ ہوگی۔ یہی قول اوزاعی کا بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ زنا سے وطی میں اختلاف ہے کہ کیا وہ حرام کرے گا یا نہیں؟ اکثر علماء کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی

عورت سے زنا کرے تو اس پر اس سے اس کی وجہ سے نکاح کرنا حرام نہ ہوگا اسی طرح اس پر اس کی بیوی حرام نہ ہوگی جب وہ بیوی کی ماں یا بیٹی سے زنا کرے گا اور اس پر حد لگائی جائے گی پھر وہ اپنی بیوی سے صحبت کرے گا اور جس نے ایک عورت سے زنا کیا پھر اس کی ماں یا بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو وہ دونوں اس وجہ سے اس پر حرام نہ ہوں گی اور ایک جماعت نے کہا کہ وہ حرام ہو جائے گی۔ یہ قول عمران بن حصین سے مروی ہے یہی قول امام شعبی، عطا، حسن، سفیان ثوری، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے کا ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ زنا ماں اور بیٹی کو حرام کر دیتا ہے اور یہ حلال وطی کے قائم مقام ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے اور امام مالک اور اہل حجاز کا صحیح قول یہ ہے کہ زنا کا کوئی حکم نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ اور جس سے زنا ہوا ہے وہ اس کی عورتوں کی ماؤں سے نہیں ہے نہ اس کی ربائب بیٹیوں میں سے ہے۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کا قول ہے، کیونکہ جب زنا کی وجہ سے مہر، عدت کا وجوب، میراث، لحوق الولد کا حکم اٹھ گیا اور حد واجب ہوئی تو اس کے لیے جائز نکاح کا حکم بھی اٹھ گیا۔ دارقطنی نے زہری عن عروہ عن عائشہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا پھر وہ اس عورت سے یا اس کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حرام۔ حلال کو حرام نہیں کرتا حرام وہ وطی کرتی ہے جو نکاح سے ہو۔

اور دوسرے قول کی حجت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جریج کے متعلق خبر دینا ہے جب جریج نے اس بچے سے پوچھا اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟ تو بچہ بول پڑا اس نے کہا: فلاں چرواہا۔ یہ دلیل ہے کہ زنا بھی حرام کرتا ہے جس طرح حلال وطی حرام کرتی ہے پس جس عورت سے زنا کیا گیا وہ اور اس کی بیٹی زانی کے باپ، دادا اور اس کے بیٹوں کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم کی روایت المدونہ میں ہے۔ اس سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ زانی کے پانی سے ہونے والی اس کی ماں سے زنا کرنے والے کے لیے حلال نہیں ہے۔ یہ مشہور ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے عورت اور اس عورت کی بیٹی کی فرج کو دیکھا۔ آپ نے حلال اور حرام کے درمیان فرق نہیں فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے عورت (ماں) اور بیٹی دونوں کا پردہ کھولا"۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی وجہ سے ہم نے کہا کہ بوسہ اور استمتاع کی تمام صورتیں حرمت کو پھیلاتی ہیں۔ عبدالملک الماجشون نے کہا: وہ حلال ہے اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا (الفرقان: 54) یعنی نکاح صحیح کے ساتھ نسب اور سسرال بنائے اس کی تفصیل سورۃ الفرقان میں آئے گی۔ ان دو مسئلوں پر حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جریج کے بارے میں حکایت کی کہ اس نے زانی کے بیٹے کو زانی کی طرف منسوب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت کی تصدیق فرمائی کہ اس نے خلاف عادت بچہ کو اس کی شہادت دینے کے لیے قوت گویائی عطا فرمائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جریج سے مدح اور اظہار کرامت کے طور پر بیان فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ کی تصدیق اور اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے کے ساتھ یہ نسبت صحیح ہے پس بنوت اور اس کے احکام ثابت ہوئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ زنا کی صورت میں بنوت، ابوت کے احکام جاری ہوں گے مثلاً توارث،

ولایات وغیرہ، جب کہ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان کے درمیان توارث نہیں ہے تو پھر یہ نسبت کیسے صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کا موجب ہے اور وہ احکام جن پر اجماع ہے ہم نے ان کی استثنا کی ہے اور دوسروں کو باقی رکھا ہے اس دلیل کی اصل پر۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 15۔ لواطت کرنے والے کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا ہے کہ لواطت کرنے والے سے نکاح حرام نہیں۔ ثوری نے کہا: جب کسی لڑکے سے کوئی ملاعبت کرے تو اس پر اس کی ماں حرام ہوگی۔ یہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے اپنی عورت کے بیٹے، عورت کے باپ یا عورت کے بھائی سے لواطت کی تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ امام اوزاعی نے کہا: جو کوئی کسی لڑکے سے لواطت کرے پھر جس سے لواطت کی گئی ہے اس کی لڑکی پیدا ہو تو لواطت کرنے والے کے لیے اس لڑکی سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کی بیٹی ہے جس کے ساتھ وہ دخول کر چکا ہے یہ امام احمد کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ یہ تخصیص ہے تا کہ اس سے ہر وہ شخص خارج ہو جائے جس کو عرب متبنیٰ بتاتے ہیں جو صلب سے نہیں ہوتا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی (مطلقہ) بیوی سے نکاح کیا تو مشرکین نے کہا: اس نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحزاب میں آئے گا۔ رضاعی بیٹے کی بیوی حرام ہے اگرچہ وہ بھی صلب سے نہیں ہوتا۔ اس پر اجماع ہے اور اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ (1) رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 17۔ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ۔ اس کا عطف حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ پر ہے اس وجہ سے اَنْ محل رفع میں ہے اور دو بہنوں کا لفظ تمام صورتوں کو شامل ہے خواہ انہیں نکاح کے ساتھ جمع کیا جائے یا ملک یمین کے ساتھ جمع کیا جائے اور امت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی وجہ سے ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنا ممنوع ہے، اور اس کی دوسری دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تعرض علی بناتکن ولا اخواتکن (2) تم مجھ پر اپنی بیٹیاں اور اپنی بہنیں پیش نہ کرو۔ اور ملک یمین میں دو بہنوں کو جمع کرنے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ ملکیت کے ذریعے وطی میں جمع کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ ملکیت میں ویسے جمع کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اسی طرح ماں اور بیٹی کو ایک سودے میں خریدنا جائز ہے، لیکن جس لونڈی سے وطی کی گئی ہو اس کی بہن سے نکاح کرنے میں اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: جب وہ اپنی لونڈی سے ملک یمین کی وجہ سے وطی کر چکا ہو تو اس کے لیے اس کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ملک یمین، بہن کے نکاح سے مانع نہیں۔ ابو عمر نے کہا: جنہوں نے عقد نکاح کو شرا (خریدنا) کی طرح بنایا انہوں نے اس کی اجازت دی اور

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، باب ما یحرم من الرضاع، حدیث نمبر 3248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب وربائبکم اللاتی فی حجورکم الخ، حدیث نمبر 4715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جنہوں نے اس کو وطی کی طرح بنایا تو انہوں نے جائز قرار نہیں دیا۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ بیوی کی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ یعنی دونوں کو عقد نکاح کے ذریعے جمع کرنا حرام ہے پس تم ٹھہر جاؤ جس پر علماء نے اجماع کیا اور جس میں اختلاف کیا ان شاء اللہ درست نظریہ تیرے لیے واضح ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 18۔ اہل ظواہر نے ایک علیحدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا: وطی میں ملک یمین کے ذریعے دو بہنوں کو جمع کرنا جائز ہے جس طرح ملکیت میں ان کو جمع کرنا جائز ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو ملک یمین سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے متعلق حضرت عثمان سے مروی ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: ایک آیت نے ان دونوں کو حرام کیا اور ایک آیت نے دونوں کو حلال کیا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق نے کہا: ہمیں معمر نے بتایا انہوں نے زہری سے روایت کیا انہوں نے قبیصہ بن ذویب سے روایت کیا کہ حضرت عثمان سے ان دو بہنوں کے متعلق پوچھا گیا جو ملک یمین میں جمع کی جائیں، تو حضرت عثمان نے فرمایا: نہ میں اس کا تجھے حکم دیتا ہوں اور نہ تجھے منع کرتا ہوں، ایک آیت نے انہیں حلال کیا اور ایک آیت نے انہیں حرام کیا۔ پس وہ سائل وہاں سے نکلا اور صحابہ کرام میں سے کسی شخص سے ملا۔ معمر نے کہا: میرا خیال ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس شخص نے کہا: تو نے عثمان سے کیا پوچھا ہے؟ اس نے جو پوچھا تھا اور جو حضرت عثمان نے بتایا تھا سب کچھ بتایا۔ اس صحابی نے کہا: لیکن میں تجھے منع کرتا ہوں، اگر مجھے تجھ پر گرفت کا اختیار ہوتا پھر تو ایسا کرتا تو میں تجھے سخت سزا دیتا (1)۔ امام طحاوی اور دار قطنی نے حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت عثمان کے قول کی مثل ذکر کیا ہے اور وہ آیت جو انہیں حلال کرتی ہے وہ یہ ہے وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ان کے علاوہ تمہارے لیے عورتیں حلال کی گئی ہیں۔ لیکن فتویٰ دینے والے ائمہ نے اس قول کو لائق التفات نہیں سمجھا، کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کی تاویل سے اس کا خلاف سمجھا ہے اور ان پر تاویل کی تحریف جائز نہیں۔ اور صحابہ کرام میں سے جن کا یہ نظریہ تھا ان میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس، حضرت عمار، حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر۔ پس یہ کتاب اللہ کو جاننے والے تھے جو ان کی مخالفت کرنے والا ہے وہ تاویل میں ہٹ دھرمی کرنے والا ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ اسحاق بن راہویہ نے وطی کے ساتھ جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ جمہور اہل علم نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ امام مالک کو بھی ان میں شمار کیا جنہوں نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ صرف ملکیت میں جمع کرنے کے جواز میں اختلاف نہیں۔ اسی طرح ماں اور بیٹی کو ملکیت میں جمع کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اسحاق کا قول ہے کہ وطی میں دونوں کو جمع کرنے والے کو رجم کیا جائے گا۔ امام مالک کے قول سے کراہیت ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا: جب وہ ایک سے وطی کرے پھر دوسری سے وطی کرے تو دونوں سے توقف کرے حتیٰ کہ ایک کو حرام کرے، پس اس پر حد لازم نہ ہوگی، ابو عمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ "میں اسے سزا دیتا"۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے زانی کی حد لگاتا، کیونکہ اس نے یہ فعل آیت یا سنت کی تاویل سے کیا ہے اور اس نے از خود حرام وطی نہیں کی پس بالاجماع وہ زانی نہیں ہے اگرچہ وہ خطا کرنے والا ہے مگر وہ

1۔ مصنف عبدالرزاق، 12728

صورت جس میں وہ ایسا دعویٰ کرتا ہے جس میں جہالت کی وجہ سے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ اور ملک یمین کی وجہ سے دو بہنوں کو جمع کرنے میں بعض سلف کا قول انہیں ایک آیت حلال کرتی ہے اور ایک آیت حرام کرتی ہے۔ معلوم محفوظ ہے، پس جو اتنے قوی شبہ کی موجودگی میں کوئی ایسا فعل کرتا ہے تو اسے زانی کی حد کیسے لگائی جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء کا اختلاف ہے جب ایک سے وطی کر چکا تھا پھر دوسری سے وطی کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عمر، حسن، بصری، اوزاعی، شافعی، امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: دوسری سے اس کا وطی کرنا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ پہلی کو اپنی ملکیت سے نکال کر اس کی فرج کو حرام کر دے مثلاً اسے بیچ دے یا آزاد کر دے یا اس کا کسی اور سے نکاح کر دے۔ ابن المنذر نے کہا: اس میں دوسرا قول قتادہ کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ایک سے وطی کر چکا ہو اور دوسری سے وطی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ پہلی کو اپنے اوپر حرام کرنے کی نیت کر لے اور اس کے قریب نہ جانے کی نیت کرے، پھر دونوں سے رکا رہے حتیٰ کہ پہلی جس کو حرام کیا تھا اس کا رحم صاف ہو جائے۔ پھر دوسری سے صحبت کرے۔ اس میں تیسرا قول بھی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کے پاس دو بہنیں ہوں تو وہ کسی کے بھی قریب نہ جائے۔ حکم اور حماد نے اسی طرح کہا ہے۔ اس کا مفہوم نخعی سے بھی مروی ہے۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی شخص کی ملکیت میں دو بہنیں ہوں، تو اس کے لیے جائز ہے جس سے چاہے وطی کرے اور دوسری سے رکنا اس کی امانت کے سپرد ہے اگر وہ دوسری سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اوپر پہلی کی فرج کو حرام کر دے اپنے کسی فعل سے جو اسے اس کی ملکیت سے نکال دے مثلاً اس کا کسی دوسرے سے نکاح کر دے یا اسے فروخت کر دے یا اسے ایک مدت تک آزاد کر دے یا اسے مکاتبہ بنا دے یا طویل خدمت کرنے کے لیے کسی کو دے دے۔ اگر ایک سے وطی کر چکا تھا پھر فوراً دوسری سے وطی کر دی جب کہ پہلی کو حرام نہیں کیا تھا تو دونوں سے رک جائے۔ اس کے لیے کسی کے قریب جانا جائز نہیں حتیٰ کہ دوسری کو حرام کر دے اور یہ اس کی امانت کے سپرد نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ اب متہم ہو چکا ہے اور پہلے وہ متہم نہ تھا جب اس نے صرف ایک سے وطی کی تھی۔ اس باب میں کوفیوں، ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ وہ اگر لونڈی سے وطی کر چکا ہے تو دوسری سے وطی نہ کرے۔ اگر پہلی کو بیچ دے یا اس کا نکاح کر دے، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے تو دوسری سے رک جائے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سے وطی کرے جب تک اس کی بہن طلاق کی یا وفات کی عدت میں ہے اور عدت کے گزرنے کے بعد نہیں، حتیٰ کہ اس عورت کی فرج کا کسی دوسرے کو مالک بنا دے جس سے وہ وطی کر چکا ہے۔ یہ مفہوم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: کیونکہ ملک جو ابتداء میں لونڈی کی وطی سے مانع تھی وہ اب بھی موجود ہے کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ اس کی طرف دوبارہ لوٹ کر آئے یا اس کی ملک میں باقی رہے۔ امام مالک کا قول عمدہ ہے کیونکہ یہ فی الحال صحیح تحریم ہے، مآل کی رعایت کو لازم نہیں اور یہ کافی ہے کہ جب وہ بیع یا آگے نکاح کرنے کے ساتھ اس کی فرج اپنے اوپر حرام کر دے گا تو وہ اس پر فی الحال حرام ہوگی اور آزاد کرنے میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ وہ اس میں کسی حالت میں تصرف نہیں کر سکتا، رہا اس لونڈی کو مکاتبہ بنانا کبھی وہ زر کتابت ادا کرنے سے عاجز آ جاتی ہے اور پھر اس کی ملک کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس لونڈی ہو جس سے وہ وطی کرتا ہو پھر وہ اس کی

بہن سے نکاح کرے تو اس کے نکاح کے بارے میں تین اقوال ہیں، تیسرا قول مدونہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں سے رک جائے جب عقد نکاح واقع ہو حتیٰ کہ ایک کو حرام قرار دے، کیونکہ اس نکاح کی وجہ سے وطی میں کراہت آ گئی ہے، کیونکہ یہ ایسی جگہ میں عقد ہے جس میں وطی جائز نہیں ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ ملک یمین نکاح سے مانع نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی سے گزر چکا ہے۔ اس باب میں ایک اور قول بھی ہے کہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا اور یہی اوزاعی کے قول کا معنی ہے۔ اشہب نے کتاب الاستبراء میں لکھا ہے کہ ایک میں نکاح کی عقد مملوکہ (لونڈی) کی فرج کو حرام کر دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ایسی طلاق دے جس سے رجوع کر سکتا ہے تو اس کے لیے اس مطلقہ عورت کی بہن سے یا اس کے علاوہ چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ مطلقہ کی عدت گزر جائے اس میں اختلاف ہے کہ جب ایسی طلاق دے جس میں رجوع کا مالک نہیں ہے تو ایک جماعت نے کہا کہ نہ اس کی بہن سے اور نہ چوتھی سے نکاح کرنا جائز ہے حتیٰ کہ مطلقہ کی عدت گزر جائے۔ یہ حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے۔ اور مجاہد، عطا بن ابی رباح، نخعی، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل اور اصحاب الرائے کا یہی مذہب ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا: اس کے لیے اس کی بہن سے اور اس کے سوا چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ عطا سے مروی ہے اور عطا سے یہ اثبت روایت ہے۔ یہ حضرت زید بن ثابت سے بھی مروی ہے۔ اور یہی سعید بن مسیب، حسن، قاسم، عروہ بن زبیر، ابن ابی لیلی، امام شافعی، ابوثور اور ابو عبید کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک کا قول میں بھی یہی خیال کرتا ہوں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 21۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اس میں احتمال ہے کہ اس کا مطلب بھی وہی ہو جو وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ میں جو اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا معنی ہے اور یہ زائد کا بھی احتمال رکھتا ہے اور وہ ہے گزشتہ فعل کا جواز۔ زمانہ جاہلیت میں جمع کرنا دو بہنوں کو جائز تھا اور یہ نکاح صحیح تھا جب اسلام آیا تو دو بہنوں میں اختیار دیا گیا جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے مگر اسلام کے موجب اور شرع کے مقتضی پر کفار کی عقود کو جاری کیے بغیر خواہ ان دونوں بہنوں کو ایک عقد سے جمع کیا ہو یا دو عقدوں سے جمع کیا ہو۔ امام ابو حنیفہ دونوں کے نکاح کو باطل قرار دیتے ہیں اگر ایک عقد میں جمع کی گئی ہوں۔ ہشام بن عبداللہ نے محمد بن حسن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے لوگ ان تمام محرمات کو جانتے تھے جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہیں سوائے دو کے، ایک باپ کی عورت سے نکاح کرنا اور دوسرا دو بہنوں کو جمع کرنا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اور فرمایا وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اور باقی تمام محرمات میں اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا ذکر نہیں فرمایا۔ واللہ اعلم۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ

الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

''اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہارے ملک میں آجائیں فرض کیا ہے اللہ نے (ان احکام کو) تم پر اور حلال کردی گئی ہیں تمہارے لیے ماسوا ان کے تاکہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعہ پاک دامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کیے ہوئے مہر کے بعد بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے''۔

اس میں چودہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَّالْمُحْصَنٰتُ اس کا عطف محرمات اور پہلے ذکر کی گئی عورتوں پر ہے۔ التحصن کا معنی بچنا ہے اس سے الحصن (قلعہ) ہے، کیونکہ اس میں حفاظت کی جاتی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (الانبیاء:80) (اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے تاکہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے) اسی سے گھوڑے کے لیے حصان (بکسر الحاء) استعمال ہوتا ہے، کیونکہ گھوڑا بھی اپنے مالک کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ الحصان (بفتح الحاء) پاک دامن عورت جو اپنے آپ کو ہلاکت سے بچاتی ہے۔ حصنت المرأۃ تحصن فھی حصان۔ جیسے جبنت فھی جبان۔ حضرت حسان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا تھا:

حَصَانٌ رَزَانٌ ما تُزَنّ بِرِيبَۃٍ وتُصبِحُ غَرْثَیٰ من لحُومِ الغَوَافِلِ

مصدر الحصانۃ (بفتح الحاء) اور الحِصن جیسے العلم ہے۔ الْمُحْصَنٰتُ سے یہاں مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرأ محصنۃ یعنی شادی شدہ عورت اور محصنۃ آزاد عورت کو بھی کہتے ہیں اسی سے ہے الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ:5) (پاک دامن، مومن عورتیں اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) اور محصنۃ سے مراد پاک دامن عورت بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (پاک دامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے) اور فرمایا: مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (پاک باز بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے) مُحصَنۃ، مُحصِنۃ و حَصان اس کا معنی پاک دامن عورت ہے یعنی فسق سے رکنے والی، آزادی آزاد عورت کو ایسے کام سے روکتی ہے جو غلام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (نور:4) یعنی جو آزاد عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں لونڈی کا عرف زنا تھا۔ کیا آپ نے ہند بنت عتبہ کا قول ملاحظہ نہیں کیا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا جب اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی: کیا آزاد عورت زنا کرتی ہے (1)۔ خاوند اپنی بیوی کو کسی غیر سے نکاح کرنے سے روکتا ہے؟ ح، ص اور نون کی بنا کا معنی روکنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اسلام میں الاحصان استعمال ہوتا ہے، کیونکہ یہ حافظ اور مانع ہے یہ قرآن میں اس معنی میں وارد نہیں ہوا اور سنت میں وارد ہوا ہے۔ اسی سے نبی کریم

1۔ المحرر الوجیز، الحدیث اخرجہ ابو یعلی

ﷺ کا ارشاد ہے الایمان قید الفتك۔ ایمان دھوکے سے قتل کرنے کی قید ہے۔ اسی سے ہذلی کا قول ہے:

فلیس کعهد الدّار یا أمّ مالكٍ　　ولكن احاطتْ بالرّقاب السلاسِلُ

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت هَلُمّ الی الحدیث فقلت لا　　یأبی علیكِ اللہ والإسلامُ

اسی سے سحیم کا قول ہے:

کفی الشیبُ والإسلامُ للمرءِ ناهِیا

''انسان کو بڑھاپا اور اسلام روکنے کے لیے کافی ہے''۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، ابو قلابہ، ابن زید، مکحول، زہری اور حضرت ابو سعید خدری نے کہا: یہاں الْمُحْصَنٰتُ سے مراد قیدی خاوندوں والی عورتیں ہیں یعنی وہ حرام ہیں مگر دار الحرب سے قیدی بن کر آنے کی وجہ سے تمہاری مملوکہ بن جائیں تو حلال ہیں اور یہ عورت اس کے لیے حلال ہو گی جس کے حصہ میں آئے گی اگرچہ اس کا خاوند بھی ہو گا۔ یہ امام شافعی کا قول ہے کہ قیدی ہونا عصمت کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ ابن وہب، ابن عبد الحکم کا قول ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ اس پر صحیح مسلم کی روایت کردہ حدیث دلالت کرتی ہے حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے حنین کے دن اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ کیا۔ پس وہ دشمن سے ملے ان سے جنگ کی اور ان پر غالب آگئے۔ ان کو قیدی عورتیں ملیں تو صحابہ کرام ان سے ہم بستری کرنے سے بچنے لگے، کیونکہ ان کے مشرک خاوند موجود تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وہ تمہارے لیے حلال ہیں جب ان کی عدت گزر جائے یہ صریح اور صحیح نص ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صحابہ کرام خاوندوں والی قیدی عورتوں سے وطی کرنے سے بچنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کا ارشاد نازل فرمایا۔ یہی قول امام مالک، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور کا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ استبراء رحم کیسے ہو گا۔ حسن نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ایک حیض کے ساتھ قیدی عورت کا استبراء کرتے تھے یہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے اوطاس کی قیدی عورتوں کے متعلق مروی ہے اور حاملہ سے وطی نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ بچہ جنم دے دے اور دوسری عورت سے وطی نہیں کی جائے گی حتیٰ کہ اسے حیض آجائے۔ اور سابق خاوند کے فراش کا کوئی اثر نہیں ہو گا حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ قیدی عورت مملوکہ ہے لیکن وہ بیوی تھی اس کا نکاح زائل ہو گیا پس وہ لونڈیوں والی عدت گزارے گی۔ جیسا کہ حسن بن صالح سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: اس پر عدت دو حیض ہیں جب اس کا دار الحرب میں خاوند تھا۔ اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا استبراء اور اس کا استبرا جس کا خاوند نہیں ہے، ایک جیسا ہے تمام کا استبرا ایک حیض ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ میاں بیوی اکٹھے قیدی ہوں یا علیحدہ علیحدہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ابن بکیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ میاں بیوی اگر اکٹھے

قیدی کیے جائیں اور مرد کو زندہ رکھا گیا ہے تو دونوں اپنے نکاح پر قائم رکھے جائیں گے اس روایت میں انہوں نے یہ دیکھا کہ اسے زندہ باقی رکھنا اس کی ملکیت باقی رکھنا ہے، کیونکہ اس کے لیے عہد ہو گیا اور اس کی بیوی بھی اس کی ملکیت سے ہے ان کے درمیان کوئی حائل نہ کیا جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ثوری کا قول ہے اور ابن القاسم کا یہی قول ہے اور انہوں نے یہ امام مالک سے روایت کیا ہے اور صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ پس ملک یمین پر اس کو پھیر دیا اور اسے موثر بنایا پس عموم اور تعلیل دونوں کے اعتبار سے حکم اس کے ساتھ معلق ہو گا مگر دلیل جس کو خاص کر دے تو اس کا حکم علیحدہ ہو گا۔ اس آیت کے بارے میں دوسرا قول بھی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بن ابی الحسن، حضرت ابی بن کعب، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن عباس کا قول ہے اور ایک روایت میں عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس آیت سے مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں یعنی وہ حرام ہیں مگر آدمی خاوند والی عورت کا استبرا کرے۔ لونڈی کا بیچنا اس کی طلاق ہے، اس کو صدقہ کرنا اس کی طلاق ہے، اس کو میراث میں دینا اس کی طلاق ہے اور خاوند کا اسے طلاق دینا اس کی طلاق ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جب لونڈی بیچی جائے اور اس کا خاوند ہو تو مشتری کو اس کے بضع کا زیادہ حق ہے اسی طرح دارالحرب سے قیدی ہو کر آنے والی عورت کا حکم ہے۔ یہ تمام اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان جدائی کا موجب ہے۔ علماء نے فرمایا: جب معاملہ اس طرح ہو گا تو لونڈی کا بیچنا لونڈی کے لیے ضرور طلاق ہو گا، کیونکہ ایک شرمگاہ ایک حال میں دو شخصوں پر بالا جماع حرام ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث بریرہ اس کو رد کرتی ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت بریرہ کو خریدا تھا اور آزاد کر دیا تھا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا اور وہ خاوند والی تھی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ حضرت بریرہ کو حضرت عائشہ کے خریدنے اور آزاد کرنے کے بعد اپنے خاوند مغیث کے پاس رہنے کا اختیار دیا گیا تھا یہ دلیل ہے کہ لونڈی کو بیچنا اس کی طلاق نہیں ہے۔ اس پر فقہا اور ائمہ حدیث کا اجماع ہے۔ لونڈی کی طلاق نہیں ہے مگر طلاق۔ بعض ائمہ نے اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے عموم سے اور قیدی عورتوں پر قیاس سے حجت پکڑی ہے اور ہم نے جو حدیث بریرہ ذکر کی ہے وہ اسے خاص کرتی ہے اور اسے رد کرتی ہے۔ وہ حضرت ابوسعید کی حدیث کی بنا پر مسبیات (قیدی عورتوں) کے ساتھ خاص ہے۔ انشاء اللہ یہی قول حق اور درست ہے۔ اور اس آیت میں تیسرا قول بھی ہے ثوری نے مجاہد سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد مسلمانوں اور مشرکوں کی بیویاں ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: مشرکوں کی بیویاں ہیں۔ اور موطا میں سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد خاوندوں والی عورتیں ہیں۔ یہ اس طرف راجع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا حرام کیا ہے ایک جماعت نے کہا اس آیت میں اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد پاک دامن عورتیں ہیں یعنی تمام عورتیں حرام ہیں جن پر احصان کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ خاوند والی ہے یا خاوند والی نہیں ہے، کیونکہ شرائع اسی بات کا تقاضا کرتی ہیں۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے نکاح کے ساتھ یا خریدنے کے ساتھ جن کے تمہارے دائیں ہاتھ

مالک ہوئے۔ یہ ابوالعالیہ، عبیدہ السلمانی، طاؤس، سعید بن جبیر، علاء کا قول ہے۔ یہ عبیدہ نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے پس انہوں نے ملک یمین کے تحت نکاح کو داخل کیا ہے ان کے نزدیک اس ارشاد اِلَّا مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کا معنی یہ ہوگا کہ تم جن کی عصمت کے نکاح کے ساتھ مالک ہوتے ہو اور جن کی گردن کے خریدنے کے ساتھ مالک ہوتے ہو، گویا وہ تمام ملک یمین ہیں اور اس کے علاوہ زنا ہے یہ حسن قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اَلْمُحْصَنٰتُ سے مراد مسلمانوں اور اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس تاویل سے آیت کا معنی زنا کی تحریم کی طرف لوٹتا ہے۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت سعید بن جبیر سے کہا: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت ابن عباس سے جب اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا؟ حضرت سعید نے کہا: حضرت ابن عباس اس کو نہ جانتے تھے۔ اور مجاہد سے سنداً روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اگر میں کوئی ایسا شخص جانتا جو اس آیت کی تفسیر کرتا تو میں اس کی طرف اونٹوں کے جگر پگھلاتا (یعنی مشقت کے ساتھ سفر کر کے جاتا) اَلْمُحْصَنٰتُ سے حَکِیْمًا تک کا قول مراد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابن عباس کی طرف کیسے یہ قول منسوب کیا اور میں نہیں جانتا کہ مجاہد اس قول تک کیسے پہنچے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ مصدر مؤکد کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے یعنی یہ عورتیں حرام کی گئی ہیں اللہ کی طرف سے تم پر یہ فرض کیا گیا ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ کا معنی كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ہے۔ زجاج اور کوفیوں نے کہا: اس کو نصب اغرا کی بنا پر ہے۔ یعنی الزموا اللہ یا علیکم کتاب اللہ (یعنی اللہ کی کتاب کو لازم پکڑو) اس میں نظر ہے جیسا کہ ابوعلی نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اغراء میں، حرف اغراء پر منصوب کو مقدم کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہا جاتا: زیداً علیك، یا زیداً دونك بلکہ علیك زیداً و دونك عمراً کہا جاتا ہے۔ علیکم سے منصوب ہونے کی بنا جو انہوں نے کہا یہ صحیح ہے، رہا فعل کے حذف کی تقدیر پر تو وہ جائز ہے اور ھذا کتاب اللہ و فرضہ کے معنی پر رفع بھی جائز ہے۔ ابوحیوہ، محمد بن سمیقع نے کتب اللہ علیکم یعنی فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور اسم جلالت کو فاعل بنایا ہے۔ معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو تحریم بیان فرمائی ہے وہ اللہ نے تم پر فرض کی ہے۔ عبیدہ السلمانی وغیرہ نے کہا: كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ یہ قرآن میں موجود ارشاد مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ کی طرف اشارہ ہے۔ اس قول میں بعد ہے اور اظہر یہ ہے کہ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یہ اس تحریم کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کے درمیان اور عرب جو کچھ کرتے تھے اس کے درمیان آڑ تھی۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ حمزہ، کسائی، عاصم اور ایک روایت میں حفص نے واُحل لکم پڑھا ہے اور حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ پر عطف کیا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ پر عطف کیا ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عورتوں کو حرام نہ کرے مگر جن کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان کے ذریعے ایسی عورتوں کو حرام کیا ہے جن کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے، پس انہیں بھی اس کے ساتھ ملایا جائے گا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) (جو تمہیں رسول (مکرم ﷺ) عطا کرے تو اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کرے تو اس سے رک جاؤ) مسلم وغیرہ نے

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع نہ کرے اور عورت اور اس کی خالہ کو جمع نہ کرے''۔ ابن شہاب نے کہا: ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے باپ کی خالہ اور اس کے باپ کی پھوپھی اس کے مقام پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع کرنے کی حرمت آیت سے پائی گئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو جمع کرنا حرام کیا ہے اور عورت اور اس کی پھوپھی، جمع بین الاختین (دو بہنوں کو جمع کرنے) کے حکم میں ہے یا خالہ والدہ کے معنی میں ہے اور پھوپھی والد کے معنی میں ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ کتاب اور سنت ایک چیز کے حکم میں ہیں یا فرمایا: جو ہم نے کتاب میں ذکر کی ہیں اور جن کا بیان محمد ﷺ کی زبان سے میں نے مکمل کیا ہے ان کے علاوہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ اور ابن شہاب کا قول کہ ہم عورت کے باپ کی خالہ اور عورت کے باپ کی پھوپھی کو اس کے قائم مقام دیکھتے ہیں۔ یہ انہوں نے اس لیے کہا ہے کہ انہوں نے خالہ اور پھوپھی کو عموم پر محمول کیا ہے اور اس کے لیے یہ تمام ہوا ہے، کیونکہ عمۃ ہر اس مؤنث کا اسم ہے جو تیرے باپ کے ساتھ دونوں اصلوں میں یا ایک اصل میں شریک ہے اور خالہ بھی اسی طرح ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور مصنف ابو داؤد وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھوپھی پر بھتیجی اور بھتیجی پر پھوپھی سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور خالہ پر اس کی بھانجی سے اور بھانجی پر اس کی خالہ سے نکاح نہیں کیا جائے گا اور چھوٹی پر بڑی سے اور بڑی پر چھوٹی سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے پھوپھی اور خالہ کو جمع کرنا اور دو پھوپھیوں اور دو خالاؤں کو جمع کرنا ناپسند فرمایا(1)۔ لا یجمع کو عین کے رفع کے ساتھ خبر کی بنا پر پڑھنا جائز ہے اور نہی اس کے ضمن میں ہوئی۔ اس حدیث پر عمل میں اجماع ہے کہ جن کا پیچھے ذکر ہوا ہے ان کا جمع کرنا نکاح میں حرام ہے۔ خوارج نے دو بہنوں کو جمع کرنا اور پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرنا اور خالہ اور بھانجی کو جمع کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ان کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ دین سے نکل گئے ہیں اور دین سے خارج ہو گئے ہیں، کیونکہ یہ ثابت سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور حدیث کے الفاظ لا یجمع بین العمتین و الخالتین۔ بعض علماء کے لیے سمجھنا مشکل ہو گیا وہ اس کے مفہوم میں متحیر ہوئے حتیٰ کہ انہوں نے اسے ایسا مفہوم پہنایا جو بہت بعید ہے یا جائز ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا: بین العمتین کا معنی مجاز پر ہے یعنی پھوپھی اور بھانجی کو جمع کرنا، ان دونوں کو عمتان کہا گیا ہے جیسے کہا جاتا ہے: سنۃ العمرین۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سنت کے لیے اور بین الخالتین کے بارے میں بھی اسی طرح کہا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ ایسا تعسف ہے جس کو سنا بھی نہیں جا سکتا۔ اس میں واقعی تعسف کے ساتھ ساتھ بغیر فائدہ کے کلام میں تکرار ہے، کیونکہ جب معنی یہ ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرنا منع ہے اور پھر اگر العمتین کا بھی یہی معنی کیا جائے تو کلام میں بغیر فائدہ کے تکرار ہوگا۔ اگر اس طرح ہوتا جس طرح اس نے کہا ہے تو وبین الخالۃ ہونا واجب ہوتا، حالانکہ حدیث اس طرح نہیں ہے، کیونکہ حدیث یہ ہے کہ پھوپھی اور خالہ کو جمع کرنے سے منع فرمایا۔ پس حدیث کے لفظ پر واجب ہے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع نہ کیا جائے جبکہ ایک دوسری کی پھوپھی ہو اور دوسری کی خالہ ہو۔ نحاس

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1878

نے کہا: یہ صحیح معنی پر نکل سکتا ہے مثلاً ایک شخص اور اس کا بیٹا ہو باپ بیٹی سے نکاح کر لے اور بیٹا اس عورت کی ماں سے نکاح کرے۔ پھر باپ کی بھی بیٹی پیدا ہو اور بیٹے کی بھی بیٹی پیدا ہو۔ پس باپ کی بیٹی، بیٹے کی بیٹی کی پھوپھی ہو گی اور بیٹے کی بیٹی باپ کی بیٹی کی خالہ ہو گی۔ اور رہا دو خالاؤں کو جمع کرنا، یہ ثابت کرتا ہے کہ دو عورتیں ہوں ان میں سے ہر ایک دوسری کی خالہ ہو۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص، دوسرے شخص کی بیٹی سے نکاح کرے اور دوسرا شخص پہلے شخص کی بیٹی سے نکاح کرے، ہر ایک کی بیٹی پیدا ہو، تو ان میں سے ہر ایک کی بیٹی دوسری کی خالہ ہو گی۔ اور رہا دو پھوپھیوں کو جمع کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی دو عورتیں نہ جمع کی جائیں جن میں سے ہر ایک دوسری کی پھوپھی ہو۔ یہ اس طرح ہے ایک شخص، دوسرے شخص کی ماں سے نکاح کرے دوسرا اس کی ماں سے نکاح کرے ہر ایک کی بیٹی پیدا ہو تو ان میں سے ہر ایک دوسری کی پھوپھی ہو گی۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حرام قرار دیا جو قرآن میں سے نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو جن دو عورتوں کو جمع کرنا حرام ہے ان کے لیے ایک عمدہ کلیہ بنایا ہے۔ معتمر بن سلیمان نے فضیل بن میسرہ سے انہوں نے ابو جریر سے انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو ایسی عورتیں جب ان میں سے ایک کو مذکر تصور کیا جائے تو دوسری سے اس کا نکاح نہ ہو سکے تو ان دونوں کا جمع کرنا باطل ہے۔ میں نے شعبی سے پوچھا یہ کن سے مروی ہے؟ شعبی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے۔ سفیان ثوری نے کہا: ہمارے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ وہ نسب سے ہو اور وہ عورت اور اس کے خاوند کی بیٹی کی طرح نہ ہو، ان کو اگر چاہے تو جمع کر سکتا ہے۔ ابو عمر نے کہا امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، اوزاعی اور محدثین وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس اصل میں ان کا اختلاف نہیں ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے کہ ایک شخص، کسی شخص کی بیٹی اور اس کی بیوی کو جمع کرے، کیونکہ اگر ان میں سے ایک کو مذکر بنایا جائے تو دوسری سے نکاح جائز نہ ہو گا اور جس پر علماء کا مدار ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس میں رعایت نسب کی ہے، مصاہرت کی نہیں ہے۔ پھر بعض اخبار میں جمع نہ کرنے کی علت پر تنبیہ کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں جمع کرنا قطع رحمی کا باعث بنتا ہے، کیونکہ غیرت کی وجہ سے سوکنوں کے درمیان دشمنی اور شر واقع ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی پر اس کی بھتیجی سے اور خالہ پر اس کی بھانجی سے نکاح کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا: جب تم ایسا کرو گے تو قطع رحمی کرو گے۔ یہ ابو محمد اصیلی نے فوائد میں اور ابن عبد البر وغیرہما نے اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ ابو داؤد کی مراسیل ہے، حسین بن طلحہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع رحمی کے خوف کی وجہ سے بہن پر بہن سے نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ بعض علماء نے اس علت کو عام کیا ہے پس انہوں نے ہر دو قریبی عورتوں کو جمع کرنے سے منع کیا ہے پہلی بیوی کی خواہ وہ چچا کی بیٹی ہو یا پھوپھی کی بیٹی ہو یا خالو کی بیٹی ہو یا خالہ کی بیٹی ہو۔ یہ اسحاق بن طلحہ، عکرمہ، قتادہ اور عطا سے مروی ہے۔ اور ایک روایت ابن ابی نجیح سے بھی یہی ہے۔ ابن جریج نے ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہی صحیح ہے۔ حضرت حسن بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے ایک رات میں محمد بن علی کی بیٹی اور عمر بن علی کی بیٹی سے نکاح کیا تھا پس انہوں نے چچا کی بیٹیوں کو جمع کیا تھا۔ یہ روایت عبد الرزاق نے ذکر کی

ہے۔ ابن عیینہ نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ عورتیں نہیں جانتی تھیں کہ کس کے پاس جائیں۔ امام مالک نے ایسی صورت کو ناپسند کیا ہے لیکن ان کے نزدیک یہ حرام نہیں۔

ابن القاسم کی سماع میں ہے امام مالک سے پوچھا گیا دو چچوں کی بیٹیوں کو جمع کیا جائے گا؟ امام مالک نے فرمایا: میں اسے حرام نہیں جانتا، پوچھا گیا کیا آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں؟ امام مالک نے فرمایا: لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ ابن القاسم نے کہا: یہ حلال ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن المنذر نے کہا: میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جس نے اس نکاح کو باطل قرار دیا ہو۔ یہ دونوں عورتیں ان عورتوں میں داخل ہیں جن سے نکاح مباح کیا گیا ہے یہ ان سے کتاب وسنت اور اجماع سے خارج نہیں ہیں۔ اسی طرح پھوپھیوں اور خالاؤں کی بیٹیوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ سدی نے **وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ** کے متعلق فرمایا: یعنی نکاح کرنا حلال ہے۔ بغیر نکاح کے فرج حلال نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تمہارے قریبی محارم عورتوں کے علاوہ عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں۔ قتادہ نے کہا: ملک یمین اس کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ** یہ لفظ نکاح کرنے اور خریدنے کو شامل ہے۔ اَنْ محل نصب میں ہے ما سے بدل ہے اور حمزہ کی قرأت پر محل رفع میں ہے۔ یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ لِاَنْ یا بِاَنْ کے معنی میں ہو پھر لام اور با کو حذف کیا گیا ہو، پھر یہ محل نصب میں ہو گیا ہو۔ **مُّحْصِنِيْنَ** حال کی بنا پر منصوب ہے، اس کا معنی ہے زنا سے بچنے والے۔ **غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ** زنا نہ کرنے والے۔ السفاح کا معنی زنا ہے یہ سفح الماء سے مشتق ہے جس کا معنی پانی کا بہنا ہے اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب آپ نے شادی کے موقع پر دف بجانے والے کی آواز سنی: ''یہ نکاح ہے زنا نہیں ہے، نہ خفیہ نکاح ہے'' (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: **مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ** دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے (ا) جو ہم نے ذکر کی ہے وہ نکاح کی عقد کے ساتھ احصان ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ بضع کے منافع اپنے اموال کے ذریعے نکاح کے طریقہ پر حاصل کرو نہ کہ زنا کے طریقہ پر۔ اس وجہ پر آیت کے لیے عموم ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے **مُّحْصِنِيْنَ** یعنی احصان عورتوں کی صفت ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ تم ان میں احصان کی شرط پر ان سے نکاح کرو۔ پہلی وجہ اولیٰ ہے، کیونکہ جب آیت کو اس کے عموم پر جاری کرنا اور اس کے مقتضی کے تعلق پر جاری کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہوتا ہے، کیونکہ دوسری وجہ کا مقتضی یہ ہے کہ جو بدکارہ ہیں ان سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِاَمْوَالِكُمْ** اللہ تعالیٰ نے فروج کو اموال کے ساتھ مباح کیا ہے اور کوئی فرق نہیں فرمایا ہے۔ پس جب بغیر مال کے واقع ہو تو اباحت واقع نہ ہوگی، کیونکہ وہ اس شرط کے بغیر پایا گیا ہے جس میں اجازت دی گئی ہے جیسے اگر شراب یا خنزیر پر یا ایسی چیز پر نکاح کرے جس کا مالک ہونا ہی صحیح نہیں ہے۔ یہ قول امام احمد کا رد کرتا ہے جو انہوں نے فرمایا کہ آزاد کرنا مہر ہوگا، کیونکہ اس میں مال کا حوالے کرنا نہیں ہے، اس میں ملک کو ساقط کرنا ہے بغیر اس کے وہ اس کے ساتھ اس بات کی مستحق ہو کہ مال اس کے حوالے کیا جائے۔ مالک اپنی طرف سے جس کا مالک ہوتا ہے وہ اس کی طرف منتقل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 36

نہیں ہوتا وہ سقوط ہے پس جب خاوند اس کے حوالے کوئی چیز نہیں کرے گا تو وہ اس پر کسی چیز کی مستحق نہیں ہوگی۔ اس نے اس کے ساتھ خود اپنی ملک کو تلف کیا ہے۔ یہ آزاد کرنا مہر نہ ہوگا۔ یہ واضح ہے نیز یہ ارشاد بھی ہے کہ وَاٰتُوا النِّسَآءَ عورتوں کو دو۔ یہ حکم ایجاب کا تقاضا کرتا ہے اور آزادی کا عطا کرنا صحیح نہیں ہے اور الله تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ۔ اور یہ چیز عتق میں محال ہے پس مہر صرف مال ہی ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَمْوَالِكُمْ پھر مہر کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے بِاَمْوَالِكُمْ کے عموم سے ہر قلیل وکثیر کو مہر ہونے کے جواز پر دلیل پکڑی ہے اور یہ صحیح ہے اور اس کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کرتا ہے: ولو خاتما من حدید (1) اگر لوہے کی انگوٹھی ہی ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”بیواؤں کا نکاح کرو، پوچھا گیا: یا رسول الله! ان کے درمیان کیا مہور ہوں؟ فرمایا: جس پر ان کے اہل راضی ہو جائیں اگرچہ کیکر کی ٹہنی ہی ہو“۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: ہم نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مہر کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر ان کے اہل صلح کرلیں۔ جابر نے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص کسی عورت کو ہاتھ بھر کھانا دے تو اس کی وجہ سے وہ حلال ہو جائے گی۔ ان دونوں حدیثوں کو دار قطنی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ہر وہ چیز جس کے لیے کسی شیٔ کی قیمت بننا جائز ہے یا اس کا اجرت ہونا جائز ہو تو وہ مہر بن سکتی ہے۔ یہ جمہور اہل علم کا قول ہے اور اہل مدینہ میں سے محدثین کی ایک جماعت وغیرہ نے قلیل اور کثیر مال سے مہر مقرر کرنا جائز قرار دیا ہے۔ یہ عبد الله بن وہب، صاحب مالک کا قول ہے۔ اور ابن المنذر وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا: اگر اسے کوڑا مہر کے طور دے تو اس کے ساتھ حلال ہو جائے گی۔ سعید بن مسیب نے اپنی بیٹی عبد الله بن وداعہ کو دو دراہم کے مہر کے عوض نکاح کر دی۔ ربیعہ نے کہا: ایک درہم کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ ابو الزناد نے کہا: جس پر ان کے اہل راضی ہو جائیں۔ مالک نے کہا: دینار کی چوتھائی یا تین دراہم سے کم مہر نہ ہوگا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس کی یہ علت بیان کی ہے یہ قطع ید کے مشابہ ہے، کیونکہ بضع بھی عضو ہے اور ہاتھ بھی عضو ہے۔ مقدر مال کے ساتھ مباح کیا جاتا ہے اور وہ دینار کی چوتھائی ہے یا تین دراہم کیلا ہیں۔ امام مالک نے ہاتھ پر قیاس کرتے ہوئے بضع کو اس مقدار کی طرف لوٹایا ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام ابو حنیفہ کا اس سے پہلے یہ قول تھا مہر کو انہوں نے قطع ید پر قیاس کیا اور ہاتھ امام ابو حنیفہ کے نزدیک نہیں کاٹا جاتا مگر ایک دینار سونا یا دس دراہم کے بدلے میں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے اس پر ان کے اصحاب کی جماعت کا قول ہے۔ اور ان کے اہل مذہب کا قول ہے ان کے شہر کے اکثر علماء کا یہی قول قطع ید کے بارے میں ہے۔ کم از کم مہر کے بارے میں نہیں ہے۔ دراوردی نے مالک سے کہا: جب انہوں نے کہا کہ چار دینار سے کم مہر نہیں ہے اے ابا عبد الله! اس مسئلہ میں تم عراقی ہو گئے ہو یعنی تم اہل عراق کے راستہ پر چلے ہو۔ امام ابو حنیفہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حضرت جابر نے روایت کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں مبشر بن عبید ہے وہ متروک ہے داؤد الاودی سے مروی ہے انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دس

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراءة عن ظهر القلب، حدیث نمبر 4642، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: غیاث بن ابراہیم نے داؤد الاودی کو تلقین کی انہوں نے شعبی سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ دس دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔ پس یہ حدیث ہوگئی۔ نخعی نے کہا: اس کی کم از کم مقدار چالیس دراہم ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: 50 دراہم ہیں ابن شبرمۃ نے کہا: پانچ دراہم ہیں۔ یہ دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پانچ دراہم سے کم مہر نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً۔ استمتاع سے مراد تلذذ ہے۔ الاجود سے مراد مہور ہیں۔ مہر کو اجر اس لیے کہا گیا ہے، کیونکہ یہ استمتاع کا اجر ہے یہ نص ہے کہ مہر کو اجر کہا جاتا ہے یہ دلیل ہے کہ یہ بضع کے مقابلہ میں ہے، کیونکہ جو منفعت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اسے اجر کہا جاتا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ نکاح میں معقود علیہ (جس پر عقد کی گئی ہے) کیا ہے، عورت کا بدن، یا بضع کی منفعت یا تمام حلال ہونا؟ یہ تین اقوال ہیں مجموع (تمام) ہے، کیونکہ عقد تمام کا تقاضا کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن اور مجاہد وغیرہما نے کہا: جو تم نے نکاح صحیح کے ذریعے عورتوں سے جماع کر کے نفع اور لطف اٹھایا ہے فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ تو انہیں ان کے مہر دو۔ جب کوئی ایک مرتبہ جماع کر لے گا تو پورا مہر واجب ہوگا اگر وہ متعین ہوگا، اگر متعین نہ ہوگا تو مہر مثل واجب ہوگا۔ اگر نکاح فاسد ہوگا تو نکاح فاسد میں امام مالک سے روایت مختلف ہے کیا وہ مہر مثل یا مہر مسمی کی مستحق ہوگی جب کہ مہر صحیح ہوگا؟ کبھی تو امام مالک نے فرمایا: مہر مسمی دینا ہوگا یہی امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جس پر وہ راضی ہوئے ہیں وہ یقینی ہے اور مہر مثل میں اجتہاد ہے پس یقین کی طرف رجوع واجب ہے، کیونکہ شک کے ساتھ اموال کا استحقاق نہیں ہوتا اور مہر مثل کا قول اس لیے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی اس کا نکاح باطل ہوگا اگر مرد نے اس سے صحبت کر لی ہے تو اسے مہر مثل ملے گا، کیونکہ اس کی فرج حلال کی گئی ہے''(1)۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت کو متعہ کے جواز پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے نکاح سے منع فرمایا اور اسے حرام قرار دیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ تم نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اہل کی اجازت سے نکاح وہ نکاح شرعی ہے جو ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں ہو اور نکاح متعہ اس طرح نہیں ہے۔ جمہور علماء نے کہا: نکاح متعہ ابتداء اسلام میں جائز تھا۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابی اور حضرت ابن جبیر نے فما استمتعم بہ منھن الی اجل مسمی فآتوھن اجورھن پڑھا ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ سعید بن مسیب نے کہا: ایۃ المیراث نے اس کو منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ متعہ میں میراث نہیں تھی۔ حضرت عائشہ اور قاسم بن محمد نے کہا: متعہ کی حرمت اور اس کا نسخ قرآن میں ہے اور وہ اس ارشاد میں ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۚ (المومنون) (اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جوان کی ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بے شک انہیں ملامت نہیں کی جائے گی) اور متعہ نہ نکاح ہے اور نہ ملک یمین ہے۔ دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ سے منع فرمایا۔ فرمایا: یہ پہلے اس شخص کے لیے تھا جو نکاح نہیں پاتا تھا جب نکاح، طلاق، عدت، میاں، بیوی کے درمیان میراث کے احکام نازل ہوئے تو متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا: رمضان کے روزہ نے ہر روزہ کو منسوخ کر دیا، زکوٰۃ نے ہر صدقہ کو منسوخ کر دیا، طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو منسوخ کر دیا اور قربانی نے ہر ذبح کو منسوخ کر دیا۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: متعہ منسوخ ہے اس کو طلاق، عدت اور میراث نے منسوخ کیا ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: متعہ اللہ کی طرف سے رحمت تھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا تھا اگر حضرت عمر نے اس سے منع نہ کیا ہوتا تو کوئی زنا نہ کرتا مگر بد بخت شخص۔

مسئلہ نمبر 10۔ علماء کا اختلاف ہے کہ متعہ کتنی مرتبہ مباح ہوا اور کتنی مرتبہ منسوخ ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ سے مروی ہے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے تھے اور ہمارے پاس عورتیں نہیں ہوتی تھیں، ہم نے کہا: کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خصی ہونے سے منع فرمایا، پھر ہمیں رخصت دی کہ ہم ایک مدت تک کے لیے کپڑے کے بدلے میں کسی عورت سے نکاح کر لیں (1)۔ ابو حاتم البستی نے اپنی صحیح میں کہا: صحابہ کرام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنا کہ کیا خصی نہ ہو جائیں؟ یہ دلیل ہے کہ متعہ سے ان کے لیے استمتاع مباح ہونے سے پہلے ممنوع تھا اگر متعہ ممنوع نہ ہوتا تو ان کے اس سوال کا کوئی معنی نہ تھا۔ پھر انہیں جہاد میں ایک مدت تک ایک کپڑے کے عوض عورت سے نکاح کرنے کی رخصت دی۔ پھر متعہ سے خیبر کے سال منع کر دیا پھر فتح مکہ کے سال متعہ کی اجازت دی گئی پھر تین سال بعد حرام کر دیا۔ پس متعہ قیامت تک حرام ہے۔ ابن عربی نے کہا: عورتوں سے متعہ شریعت کے غرائب سے ہے، کیونکہ یہ اسلام کے ابتدائی دور میں مباح کیا گیا پھر خیبر کے دن حرام کیا گیا پھر غزوۂ اوطاس میں مباح کیا گیا پھر اس کے بعد حرام کیا گیا اور تحریم پر اس کا امر قرار پا گیا سوائے مسئلہ قبلہ کے شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، کیونکہ اس پر دو مرتبہ نسخ طاری ہوا پھر اس کے بعد قرار پا گیا۔ اور دوسرے علماء جنہوں نے متعہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا انہوں نے کہا: یہ سات مرتبہ تحلیل و تحریم کا تقاضا کرتی ہیں۔ ابن ابی عمرہ سے مروی ہے کہ یہ ابتداء اسلام میں جائز تھا حضرت سلمہ بن اکوع نے روایت کیا ہے کہ یہ اوطاس کے سال حلال تھا اور حضرت علی کی روایت میں اس کی حرمت خیبر کے دن ہوئی۔ حضرت ربیع بن سمرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے دن اس کی اباحت تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام طرق صحیح مسلم میں ہیں اور مسلم کے علاوہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے غزوۂ تبوک میں اس کی نہی مروی ہے۔ اس کو اسحاق بن راشد نے زہری سے انہوں نے عبد اللہ بن محمد بن علی سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس روایت پر اسحاق بن رشد کا ابن شہاب سے روایت کرنے میں کوئی متابع نہیں ہے اور مصنف

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3650

ابی داؤد میں ربیع بن سبرہ کی حدیث سے حجۃ الوداع کے موقع پر متعہ سے نہی ثابت ہے۔ ابوداؤد کا نظریہ یہ ہے کہ جتنا اس کے متعلق روایت کیا گیا ہے اس میں یہ قول اصح ہے۔ عمرو نے حسن سے روایت کیا ہے: متعہ کبھی حلال نہیں ہوا مگر عمرۃ القضاء میں صرف تین دن حلال ہوا، نہ اس سے پہلے حلال ہوا، نہ اس کے بعد حلال ہوا۔ یہ بھی سبرہ سے روایت کیا گیا ہے یہ سات جگہیں ہیں جن میں متعہ حلال کیا گیا اور حرام کیا گیا۔ ابوجعفر طحاوی نے کہا: تمام لوگ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعہ کا اطلاق روایت کیا انہوں نے بتایا کہ یہ سفر میں تھا۔ اس کے بعد سفر میں اس کو نہی لاحق ہوئی اور اس سے منع فرمایا کسی نے یہ نہیں بتایا کہ متعہ حضر میں حلال تھا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ رہی حضرت سبرہ کی وہ حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حجۃ الوداع میں اس کی اباحت کا ذکر ہے وہ ان تمام معانی سے خارج ہے اور ہم نے اس حرف کے بارے میں خوب غور و فکر کیا تو ہمیں یہ صرف عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز کی روایت میں ملا۔ اور اسے اسماعیل بن عیاش نے عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز سے روایت کیا اور ذکر کیا کہ یہ فتح مکہ کے موقع پر تھا کہ لوگوں نے آپ کی بارگاہ میں عورتوں سے جدائی کی شکایت کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں متعہ کی رخصت دی اور حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کا عورتوں سے جدائی کی شکایت کرنا محال ہے، کیونکہ انہوں نے عورتوں کے ساتھ حج کیا تھا اور مکہ میں عورتوں سے نکاح کرنا بھی انہیں ممکن تھا اس وقت وہ اس طرح نہیں تھے جیسا کہ وہ پہلے غزوات میں تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ اس قسم کا حکم مغازی میں اور جامع مواقع پر بار بار بیان فرماتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی تحریم کا ذکر حجۃ الوداع میں اس لیے کیا، کیونکہ لوگ جمع تھے تا کہ انہیں بھی سنا دیں جنہوں نے پہلے اس کے متعلق نہیں سنا تھا آپ نے اسے مؤکد فرمایا تا کہ کسی ایسے شخص کے لیے شبہ نہ رہے جو اس کی حلت کا دعویٰ کرتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ متعہ کو کثرت سے استعمال کرتے تھے (اس لیے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحریم کا ذکر کیا)

مسئلہ نمبر 11۔ لیث بن سعد نے بکیر بن اشج سے انہوں نے عمار مولی شرید سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس سے متعہ کے متعلق پوچھا: کیا یہ زنا ہے یا نکاح ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہ زنا ہے، نہ نکاح ہے۔ میں نے کہا: پھر کیا ہے؟ فرمایا: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ میں نے کہا: کیا اس عورت پر عدت ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: ہاں ایک حیض۔ میں نے کہا: متعہ کرنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: نہیں۔ ابو عمر نے کہا: سلف و خلف علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ متعہ ایک مدت تک نکاح ہے جس میں میراث نہیں ہے اور مدت کے پورا ہونے کے وقت بغیر طلاق کے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: متعہ کے پورا ہونے کے وقت بغیر طلاق کے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: متعہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے دو گواہوں کی موجودگی میں اور عورت کے ولی کی اجازت سے مقرر مدت تک نکاح کرے اس بنا پر کہ ان دونوں کے درمیان میراث نہ ہوگی اور مرد عورت کو وہ مال دے گا جس پر ان میں اتفاق ہوا تھا۔ جب مدت گزر جائے گی تو مرد کو اس عورت پر کوئی راہ نہ ہوگی اور وہ استبراء رحم کرے گی، کیونکہ بلاشک اس میں بچہ لاحق ہوگا اور اگر وہ حاملہ نہ ہوگی تو وہ دوسرے کے لیے حلال ہوگی۔ نحاس کی کتاب میں

ہے کہ اس میں خطا ہے بچہ نکاح متعہ میں لاحق نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں: یہ نحاس کی عبارت کا مفہوم ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ متعہ یہ ہے کہ مرد عورت کو کہے: میں تجھ سے ایک دن کے لیے (یا اس کی مثل کوئی مدت متعین کرے) نکاح کرتا ہوں اس شرط پر کہ تجھ پر عدت نہ ہوگی اور نہ ہمارے درمیان میراث ہوگی اور نہ طلاق ہوگی اور نہ گواہ ہوگا جو اس پر گواہی دے گا یہ بعینہ زنا ہے اور اسلام میں یہ کبھی مباح نہیں تھا اسی وجہ سے حضرت عمر نے کہا تھا: میرے پاس متعہ کے ذریعے نکاح کرنے والا شخص نہیں لایا جائے گا مگر میں اسے پتھروں کے نیچے غائب کردوں گا (1)۔

مسئلہ نمبر 12۔ ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ جب نکاح متعہ میں مباشرت کرے گا تو کیا حد لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہ ہوگا یا حد شبہ کی وجہ سے نہ لگائی جائے گی اور بچہ اس کے ساتھ لاحق ہوگا، اس شخص کو تعزیر لگائی جائے گی اور اسے سزا دی جائے گی، جب آج بچہ بعض علماء کے قول میں نکاح متعہ میں لاحق ہوگا جبکہ تحریم متعہ کا قول بھی موجود ہے۔ تو پھر اس وقت بچہ اس مرد کے ساتھ کیسے لاحق نہ ہوگا جبکہ متعہ مباح تھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ نکاح متعہ نکاح صحیح کے حکم پر تھا اور نکاح متعہ، نکاح صحیح سے جدا ہوتا ہے مدت میں اور میراث میں۔ مہدوی نے حضرت ابن عباس سے حکایت کیا ہے کہ نکاح متعہ بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے ہوتا تھا۔ جو اس نے حکایت کیا ہے کہ نکاح متعہ بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے ہوتا تھا، اس میں ضعف ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس متعہ کے جواز کے قائل تھے۔ پھر ان کا متعہ کے جواز کے قول سے رجوع ثابت ہے۔ پس متعہ کی حرمت پر اجماع منعقد ہے جب کوئی نکاح متعہ کرے گا تو اسے مشہور مذہب میں رجم کیا جائے گا۔ اور دوسری روایت امام مالک سے یہ ہے کہ اسے رجم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نکاح متعہ حرام نہیں ہے لیکن ہمارے علماء کے لیے ایک دوسری غریب اصل ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے تمام علماء سے منفرد ہو گئے وہ یہ ہے کہ جو سنت کی وجہ سے حرام کیا جاتا ہے کیا وہ قرآن سے حرام کیے گئے کی مثل ہے یا مثل نہیں ہے؟ بعض مدنی علماء کی امام مالک سے روایت یہ ہے کہ وہ برابر نہیں ہیں۔ یہ ضعیف ہے۔ ابو بکر طرطوسی نے کہا: نکاح متعہ کی رخصت صرف حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن عباس، بعض صحابہ اور اہل بیت کی ایک جماعت نے دی۔ حضرت ابن عباس کے قول کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

أقول لِلرَّكْب إذْ طال الثَّوَاءَ بنا   يا صاحِ هل لك فى فُتْيَا ابن عباس

فى بَضَّةٍ رَخْصَة الأطراف ناعمةٍ   تكون مَثْواكَ حتى مَرجعَ الناس

علماء، فقہاء، صحابہ، تابعین اور سلف صالحین میں سے تمام کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور متعہ حرام ہے۔ ابو عمر نے کہا: اہل مکہ اور یمن سے حضرت ابن عباس کے ساتھی حضرت ابن عباس کے مذہب پر متعہ کو حلال سمجھتے تھے اور تمام لوگوں نے اس کو حرام قرار دیا۔ معمر نے کہا: زہری نے کہا ہے کہ لوگ متعہ سے زیادہ ناراض ہونے لگے حتیٰ کہ شاعر نے کہا:

قال المحدِّث لما طال مجلسه   يا صاحِ هل لك فى فُتْيَا ابن عباس

1۔ الناسخ والمنسوخ، جلد 2، صفحہ 193

جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُجُوۡرَهُنَّ یہ مال وغیرہ کو شامل ہے پس اعیان کے منافع کا مہر ہونا جائز ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، مزنی، لیث، امام احمد، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی اس سے منع کرتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ نے کہا: جب وہ اس پر نکاح کرے گا تو نکاح جائز ہوگا اور اس کے حکم میں ہوگا جس کا مہر متعین نہ کیا گیا ہو اور عورت کو مہر مثل ملے گا اگر وہ اس سے دخول کر چکا ہوگا اور اگر دخول نہ کر چکا ہو تو اسے متعہ (تین کپڑے) ملے گا۔ ابن القاسم نے محمد کی کتاب میں ناپسند کیا ہے اور اصبغ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن شاس نے کہا: نکاح واقع ہو جائے تو وہ اکثر اصحاب کے قول میں نکاح ہو جائے گا۔ یہ اصبغ کی ابن القاسم سے روایت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: نکاح ثابت ہے اور اس پر لازم ہے کہ جو اس کے لیے شرط ہے وہ اس کو تعلیم دے اگر وہ دخول سے پہلے طلاق دے گا تو اس میں امام شافعی کے دو قول ہیں ایک یہ کہ عورت کو اس سورت کی تعلیم کے اجر کا نصف ملے گا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو مہر مثل کا نصف ملے گا۔ اسحاق نے کہا: نکاح جائز ہے۔ ابوالحسن لخمی نے کہا: اور اس تمام کے جواز کا قول بہتر ہے۔ اجارہ اور حج وغیرہ اموال کی طرح ہیں جو ملکیت دیئے جاتے ہیں، بیچے جاتے ہیں اور خریدے جاتے ہیں۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے، کیونکہ مستحب ہے کہ مہر معجل ہو، اجارہ اور حج مؤجل کے معنی میں ہیں اور پہلے قول والوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِاَمۡوَالِکُمۡ سے حجت پکڑی ہے اور مال کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے ساتھ طمع متعلق ہو اور نفع حاصل کرنے کے لیے شمار کیا جائے گا اور اجارہ میں رقبہ کی منفعت اور علم کے لیے تعلیم کی منفعت یہ تمام مال نہیں ہیں۔ امام طحاوی نے فرمایا: وہ اصل جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے اس شرط پر کہ وہ اسے قرآن کی فلاں سورت ایک درہم کے بدلے سکھائے گا تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اجارات جائز نہیں ہیں مگر دو معانی میں سے ایک معنی کے لیے یا تو متعین عمل پر اسے لے گا جیسے کپڑا سینے کے لیے یا کسی اور متعین کام کے لیے یا وقت معلوم پر لے گا اور جب کسی سورت کی تعلیم پر اجرت پر لے گا تو یہ اجارہ نہ وقت معلوم پر ہوگا اور نہ عمل معلوم پر ہوگا اس نے اس کو تعلیم دینے پر اجرت پر لیا ہے جب کہ تھوڑی تعلیم اور زیادہ تعلیم تھوڑے وقت میں اور زیادہ وقت میں سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنا گھر کسی کو اس شرط پر بیچے کہ وہ اسے قرآن کی ایک سورت سکھائے گا تو مذکورہ معانی کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ جب تعلیم کے ذریعے منافع اور اعیان الاموال کی ملکیت حاصل نہیں کی جاسکتی تو نظر سے ثابت ہوا کہ تعلیم کے ذریعے بضع کی ملکیت بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ واللہ الموفق۔

اور جنہوں نے اس کی اجازت دی ہے انہوں نے حدیث الموہوبۃ میں حضرت سہل کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جا میں نے تجھے اس کا مالک بنادیا اس کے عوض جو تیرے پاس قرآن ہے''(1)۔ ایک روایت میں ہے ''تو جا میں نے تیرا اس کے ساتھ نکاح کر دیا تو اسے قرآن میں سے سکھا دے''۔ علماء فرماتے ہیں: اس حدیث میں یہ نکاح کے انعقاد اور مہر (جو تعلیم تھی) کو مؤخر کرنے کی دلیل ہے اور یہ بما معك من القرآن سے ظاہر الفاظ پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب القراءۃ عن ظهر القلب، حدیث نمبر 4642، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ کیونکہ با عوض کے لیے ہے جس طرح تو کہتا ہے: خذ هذا، بهذا یعنی اس چیز کے بدلے یہ چیز لے۔ اور دوسری روایت میں ہے: فعلمها ''تو اسے سکھا'' یہ تعلیم دینے کے حکم میں نص ہے اور کلام کا سیاق گواہی دیتا ہے کہ یہ نکاح کے لیے تھ، اس شخص کے قول کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا جو کہتا ہے کہ یہ اس شخص کے اکرام کے لیے تھا، کیونکہ اس نے قرآن یاد کیا ہوا تھا اور با بمعنی لام ہے، کیونکہ دوسری حدیث اس کے خلاف کی تصریح کرتی ہے فرمایا: فعلمها من القرآن۔ اور ابوطلحہ سے جو مروی ہے اس میں بھی حجت نہیں ہے کہ انہوں نے ام سلیم کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے کہا کہ تو اسلام قبول کر میں نکاح کرلوں گی انہوں نے اسلام قبول کیا پھر اس سے نکاح کیا، پس کوئی مہر اس کے مہر سے معزز نہ تھا۔ اس کا مہر اسلام تھ، کیونکہ یہ اس کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ ام سلیم کو ابوطلحہ کی طرف سے کچھ نہیں ملتا تھا بخلاف تعلیم اور دوسرے منافع کے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح موسیٰ علیہ السلام سے اس شرط پر کیا تھا کہ وہ اس کے مہر میں شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائے گا۔ اس کا بیان سورۃ القصص میں آئے گا اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا: اے فلاں! کیا تو نے شادی کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں میرے پاس کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے جس کے عوض میں نکاح کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے پاس قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سورۃ نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں یہ تو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ثلث القرآن (قرآن کا تہائی) ہے۔ کیا تیرے پاس آیۃ الکرسی نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قرآن کا چوتھائی ہے۔ کیا تیرے پاس اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قرآن کا چوتھائی ہے، کیا تیرے پاس اِذَا زُلْزِلَتِ (سورہ) نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! فرمایا وہ قرآن کا چوتھائی ہے۔ نکاح کر، نکاح کر (1)۔

میں کہتا ہوں: دارقطنی نے حضرت سہل کی حدیث، حضرت ابن مسعود کی حدیث سے روایت کی ہے اس میں اس چیز کی زیادہ وضاحت ہے جس سے امام مالک وغیرہ نے حجت پکڑی ہے، اس میں ہے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس عورت سے کون نکاح کرے گا؟ ایک شخص کھڑا ہوا اس نے کہا: میں یا رسول الله! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تیرے پاس مال ہے؟ عرض کیا: نہیں یا رسول الله! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نے قرآن میں سے کچھ پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں سورۂ بقرہ اور سورۂ مفصل۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تیرا اس سے نکاح کر دیا اس پر کہ تو اسے پڑھائے گا اور اسے تعلیم دے گا اور جب الله تعالیٰ تجھے عطا فرمائے گا تو تو اس کو عوض دے گا۔ پس اس شخص نے اس عورت سے اس شرط پر نکاح کرلیا۔ یہ نص ہے۔ اگرچہ صحیح ہے کہ تعلیم مہر نہیں ہوگی۔ دارقطنی نے کہا: اس حدیث کو روایت کرنے میں عتبۃ بن سکن منفرد ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ فریضۃ مصدر کی بنا پر منصوب ہے حال بن رہا ہے یعنی مفروضۃ۔

مسئلہ نمبر 14۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ یعنی مہر میں کمی بیشی کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ فریضۃ کے استقرار کے بعد باہم رضامندی سے کمی بیشی کرنا جائز ہے۔ مقصود مہر سے عورت

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی اذا زلزلت، حدیث نمبر 2820، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا بری کرنا ہے یا مرد کا پورا مہر ادا کرنا ہے اگر وہ اسے دخول سے پہلے طلاق دے دے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آیت متعہ کے بارے میں ہے وہ کہتے ہیں: یہ اشارہ ہے جس پر متعہ کی مدت میں زیادتی کرنے میں راضی ہو جاتے تھے ابتداء اسلام میں (مثلاً) ایک شخص کسی عورت سے ایک دینار کے بدلے میں ایک مہینہ کے لیے نکاح کرتا تھا جب مہینہ مکمل ہو جاتا تھا تو وہ اسے کہتا: مدت میں میرے لیے زیادتی کر میں تیرے لیے مہر میں زیادتی کروں گا پس ظاہر ہوا کہ یہ تراضی کے وقت جائز تھا۔

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت کہ نکاح کرے آزاد عورتوں سے، تو وہ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو بعض تمہارے بعض (کی جنس) سے ہے، تو نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور دو ان کو مہر دستور کے موافق (تاکہ نکاح سے) وہ پاک دامن بن جائیں نہ اعلانیہ زنا کار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہو جائیں پھر اگر وہ ارتکاب کرے بدکاری کا تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کے لیے ہے جسے خطرہ ہو بدکاری میں مبتلا ہونے کا تم سے۔ اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس آیت میں اکیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تخفیف پر آگاہ فرمایا اور وہ لونڈی سے نکاح کرنا ہے اس کے لیے جو طاقت نہیں رکھتا کہ آزاد عورت سے نکاح کرے۔ طول کے معنی میں علماء کے تین مختلف اقوال ہیں پہلا معنی یہ ہے السعة والغنی یعنی خوشحالی اور غنیٰ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، سدی، ابن زید۔ اور امام مالک کا مدونہ میں قول ہے کہا جاتا ہے: طال یطول طولاً یعنی فضل کرنے اور قدرت میں طاقت رکھتا ہے۔ فلان ذو طول یعنی وہ مال میں قدرت والا ہے۔ یہ طا کے فتحہ کے ساتھ ہے اور طا کے ضمہ کے ساتھ ہو تو وہ قصر (پست) کی ضد ہے۔ یہاں اکثر علماء کے قول میں مہر پر قدرت مراد ہے۔ یہی امام شافعی، امام احمد، ابو ثور اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد بن المعدل نے کہا: عبد الملک نے کہا ہے کہ الطول سے مراد ہر وہ نقدی یا سامان یا مالدار شخص پر قرض ہے جو نکاح پر مقرر کیا جاتا ہے اور فرمایا:

ہر وہ چیز جس کا بیچنا اور اجارہ کرنا ممکن ہے وہ طول ہے۔ اور فرمایا: ایک بیوی، دو بیویاں اور تین بیویاں طول نہیں ہیں۔ اور فرمایا: میں نے امام مالک سے سنا کہ عبدالملک نے کہا: بیوی کے ذریعے نکاح نہیں کیا جاتا اور نہ اس کے ذریعے غیر تک پہنچا جاتا ہے، کیونکہ وہ مال نہیں ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جس نے لونڈی سے نکاح کیا جب کہ وہ طاقت رکھتا ہے تو امام مالک نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ان کے درمیان تفریق کی جائے۔ پھر کہا گیا: وہ بدکاری کا خوف رکھتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اسے کوڑے سے مارا جائے گا پھر اس کے بعد تخفیف فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے: الطول سے مراد آزاد عورت ہے۔ امام مالک کا قول آزاد عورت کے بارے میں مختلف ہے کہ کیا وہ طول ہے یا نہیں؟ المدونہ میں فرمایا: آزاد عورت طول نہیں ہے جو لونڈی کے نکاح سے روکتی ہے جب وہ دوسری کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے بدکاری کا خوف ہو اور کتاب محمد میں جو ہے وہ تقاضا کرتا ہے کہ آزاد عورت طول ہے۔ لخمی نے کہا: یہی ظاہر قرآن ہے۔ یہی ابن حبیب سے مروی ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جس کے پاس آزاد عورت ہو اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں اگرچہ وہ طاقت نہ رکھتا ہو اور بدکاری کا خوف بھی ہو، کیونکہ وہ شہوت طلب کرتا ہے اور اس کے پاس عورت موجود ہے۔ یہی طبری کا قول ہے۔ اور اس قول کی تائید میں حجت قائم کی ہے امام ابویوسف نے فرمایا: الطول سے مراد پہلے آزاد عورت کا عقد میں موجود ہونا ہے۔ جب اس کے عقد میں آزاد عورت ہوگی تو وہ ذوالطول ہوگا اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ الطول سے صبر اور جبر ہے اس شخص کے لیے جو کسی لونڈی سے محبت رکھتا ہے اور اتنی محبت رکھتا ہے کہ وہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ لونڈی سے نکاح کرے جب کہ وہ اس کی محبت پر ضبط نہیں رکھتا اور اسے اس کے ساتھ بدکاری کا خوف ہے اگرچہ وہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کے لیے مال میں وسعت بھی رکھتا ہو۔ یہ قتادہ، نخعی، عطا، سفیان ثوری کا قول ہے۔ اس تاویل پر لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ کا ارشاد صبر نہ کرنے کی صفت میں ہوگا اور پہلی تاویل پر لونڈی سے نکاح کرنا دو شرطوں کے ساتھ معلق ہوگا مال میں وسعت نہ رکھنا اور بدکاری کا خوف، پس یہ حکم صحیح نہ ہوگا مگر دونوں شرطوں کے جمع ہونے کے ساتھ۔ یہ امام مالک کے مذہب کی مدونہ میں ابن نافع، ابن القاسم، ابن وہب اور ابن زیاد کی روایت سے نص ہے۔ مطرف اور ابن ماجشون نے کہا: انسان کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا حلال نہیں۔ اور یہ دونوں ثابت نہیں کرتے مگر یہ کہ دونوں شرطیں جمع ہو جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اصبغ نے بھی یہی کہا ہے اور یہ قول حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، عطا، طاؤس، زہری اور مکحول سے مروی ہے اور یہی قول امام شافعی، ابوثور، امام احمد، اسحاق کا ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ پس اگر مہر پائے اور نفقہ نہ پائے تو امام مالک نے کتاب محمد میں فرمایا: اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ اصبغ نے کہا: یہ جائز ہے، کیونکہ لونڈی کا خرچہ اس کے مالکوں پر ہے جب خاوند اس کو اپنے ساتھ نہ رکھے۔ اور اس آیت میں چوتھا قول بھی ہے۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس لونڈی پر دوسری لونڈی اور نصرانیہ عورت سے نکاح کرنے کی وسعت دی ہے اگرچہ وہ شخص خوشحال ہو امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔ اور انہوں نے بدکاری کے خوف کی شرط نہیں رکھی جب کہ پہلے اس کے نکاح میں آزاد عورت نہ ہو۔ یہ علماء فرماتے ہیں:

ہر وہ مال جس کے ساتھ لونڈی سے شادی کرنا ممکن ہے، اس کے ساتھ آزاد عورت سے شادی کرنا بھی ممکن ہے پس اس بنا پر مطلقاً لونڈی سے نکاح کے جواز میں یہ آیت اصل ہے۔

مجاہد نے کہا: اس کے مطابق سفیان بھی عمل کرتے تھے۔ میں نے ان سے لونڈی کے نکاح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے ابن ابی لیلیٰ عن المنہال عن عباد بن عبد اللہ عن علی رضی اللہ عنہ کی سند سے بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کیا جائے تو آزاد کے لیے دو دن ہوں گے اور لونڈی کے لیے ایک دن ہوگا۔ فرمایا: حضرت علی اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے، اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور ارشاد باری تعالیٰ وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ کا عموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی) علماء کا اتفاق ہے کہ آزاد آدمی چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اسے عدل نہ کرنے کا خوف بھی ہو۔ علماء نے فرمایا: اسی طرح اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے اگرچہ وہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا بھی ہو اور اسے بدکاری کا خوف بھی نہ ہو۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو وہ آزاد عورت پر قدرت کے باوجود لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے اور یہ ان کا ضعیف قول ہے۔ اور کبھی امام مالک نے فرمایا: یہ واضح حرام نہیں ہے اور میں اس کو جائز کہتا ہوں اور صحیح یہ ہے کہ آزاد مسلمان مرد کے لیے کسی غیر مسلمہ لونڈی سے نکاح کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے مسلمان لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے مگر دو شرطوں کے ساتھ جن کو نص قرآنی میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے العنت سے مراد زنا ہے۔ اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور زنا کا خدشہ بھی نہ ہو تو لونڈی سے نکاح کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے اسی طرح اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور زنا کا اندیشہ ہو (تو پھر بھی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں) اگر آزاد کتابیہ سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو پھر یہ مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کیا لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے؟ اس کے متعلق ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے، کیونکہ مسلمان لونڈی، کافرہ لونڈی سے ملحق نہیں ہے مومنہ لونڈی، مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کتابیہ سے نکاح کرے، کیونکہ لونڈی ایمان کی وجہ سے اگرچہ کافرہ آزاد پر فضیلت رکھتی ہے تو کافرہ حریت (آزادی) کی وجہ سے اس پر فضیلت رکھتی ہے۔ یہ بیوی ہے اگر اس کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ آزاد ہوگا غلام نہیں بنایا جائے گا اور لونڈی کا بچہ غلام ہوگا۔ وہ اپنے مذہب پر مسئلہ بیان کر رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کرتا ہے، جبکہ آزاد عورت کو اس کا علم نہیں ہے (کہ پہلے اس کا لونڈی سے نکاح ہے)۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ نکاح ثابت ہے۔ سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آزاد عورت کو جب علم ہو تو اسے اختیار ہے۔ پھر اسے کس چیز میں اختیار ہے؟ زہری، سعید بن مسیب، امام مالک، امام احمد اور اسحاق نے کہا: چاہے تو اپنے خاوند کے ساتھ رہے، چاہے تو اسے جدا کر دے۔ عبد الملک نے کہا: لونڈی کے نکاح کو قائم رکھنے یا اسے فسخ کرنے میں اسے اختیار ہے۔ نخعی نے کہا: جب لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کرے تو لونڈی کو جدا کر دے مگر یہ کہ لونڈی سے اس کی اولاد ہو چکی ہو تو پھر وہ لونڈی کو جدا نہ کرے۔ مسروق نے کہا: لونڈی کا نکاح فسخ کیا جائے گا، کیونکہ یہ ضرورت کے لیے مباح کیا گیا تھا جس طرح مردار ضرورت کے لیے مباح ہوتا ہے جب ضرورت اٹھ گئی تو اباحت بھی اٹھ گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کسی کے نکاح میں دو لونڈیاں ہوں جبکہ آزاد عورت کو ان میں سے ایک کا علم ہو دوسری کا علم نہ ہو تو آزاد عورت کو اختیار ہوگا کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اگر آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح کرے پھر وہ راضی ہو پھر اس پر ایک اور لونڈی سے نکاح کرے پھر وہ راضی ہو، پھر اس پر ایک اور لونڈی سے نکاح کرے، پھر وہ انکار کرے تو اس کے لیے یہ اختیار ہے۔ اسی طرح اس کو دو لونڈیوں سے نکاح کا علم نہیں تھا اور ایک کے بارے میں علم تھا (تو اسے اختیار ہے)۔ ابن القاسم نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ان مسائل میں ہم نے آزاد عورت کے لیے اختیار رکھا ہے، کیونکہ مجھ سے پہلے علماء نے یہی فرمایا ہے۔ ان علماء سے مراد سعید بن مسیب، ابن شہاب وغیرہ ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مذکورہ علماء کے اقوال نہ ہوتے تو میں اسے حلال سمجھتا، کیونکہ یہ کتاب اللہ میں حلال ہے۔ اگر مرد کو ایک آزاد عورت کفایت نہ کرے اور اسے دوسری عورت کی ضرورت ہو اور وہ اس کے مہر پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے حتیٰ کہ ظاہر قرآن کی وجہ سے چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس کا نکاح رد کیا جائے گا، ابن عربی نے کہا: دلیل میں پہلا قول اصح ہے، اسی طرح قرآن میں ہے، کیونکہ جو سبب محقق کی وجہ سے راضی ہے وہ سبب مرتب کی وجہ سے راضی ہے، اسے اختیار نہ ہوگا، کیونکہ وہ جان چکی ہے کہ مرد کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کا اختیار ہے، وہ جان چکی ہے کہ اگر وہ آزاد عورت سے نکاح پر قادر نہ ہوگا تو لونڈی سے نکاح کرے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر شرط نہیں لگائی ہے جس طرح اس نے اپنے اوپر شرط لگائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی شرط میں اس کے علم کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس باب میں یہی تحقیق کی انتہا ہے اور اس میں انصاف کا پہلو ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ اس سے مراد آزاد عورتیں ہیں اس کی دلیل آزاد اور لونڈیوں کے درمیان تقسیم ہے جو اس ارشاد میں ہے: مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ۔ ایک جماعت نے کہا: اس کا معنی پاک دامن عورتیں ہیں اور یہ ضعیف قول ہے، کیونکہ لونڈیاں بھی اس کے تحت واقع ہوتی ہیں، پس اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے اور

بدکارہ مومنات اور کتابیات کو حرام کیا ہے۔ یہ ابن میسرہ اور سدی کا قول ہے۔ علماء کا اختلاف ہے لونڈیوں سے نکاح کرنے کے جواز میں اس آزاد کے لیے جو آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہیں رکھتا اور اسے بدکاری کا خطرہ ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، ابن شہاب زہری اور حارث عکلی نے کہا کہ اس کے لیے چار لونڈیوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: دو لونڈیوں سے زیادہ سے نکاح کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ امام شافعی، ابوثور، امام احمد، اسحاق نے کہا کہ صرف ایک لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور مسروق اور ایک جماعت کا قول ہے اور انہوں نے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ اور یہ خدشہ ایک کے نکاح سے زائل ہو جاتا ہے (یعنی ایک سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے)

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی غیر کی لونڈی سے نکاح کرے اور علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اپنی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں حقوق کا تعارض ہے اور اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ یعنی لونڈیاں فتیات، جمع ہے فتاۃ کی اور عرب غلام کو فتی اور لونڈی کو فتاۃ کہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے تم میں کوئی عبدی اور امتی (میرا غلام، میری لونڈی) نہ کہے بلکہ فتای وفتاتی کہے (1)۔ الفتی اور الفتاۃ کا اطلاق جوان آزاد مرد اور عورت پر ہوتا ہے لیکن غلاموں کے لیے جوانوں اور بوڑھے دونوں صورتوں میں بولے جاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمُؤْمِنٰتِ اس لفظ کے ساتھ بیان فرمایا کہ کتابیہ لونڈی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ صفت امام مالک، امام شافعی اور ان کے متبعین کے نزدیک اور ثوری، اوزاعی، حسن بصری، زہری، مکحول اور مجاہد کے نزدیک شرط ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: جن میں اصحاب الرائے بھی ہیں، کہ کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز ہے۔ ابوعمر نے کہا: میں ان سے پہلے کسی کا قول نہیں جانتا، سوائے ابوعمرو بن شرحبیل کے قول کے اس نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیاں، ان کی آزاد عورتوں کے قائم مقام ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: الْمُؤْمِنٰتِ کا لفظ یہ فاضل وصف کی جہت سے ہے یہ ایسی شرط نہیں ہے کہ اس کے علاوہ جائز ہی نہیں۔ یہ اس قول کی طرح ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی) اگر کسی کو عدل نہ کرنے کا خوف ہو پھر وہ ایک سے زیادہ سے نکاح کرے تو بھی جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ وہ زیادہ عورتوں سے نکاح نہ کرے۔ اسی طرح یہاں بھی افضل یہ ہے کہ وہ نکاح نہ کرے مگر مومنہ عورت سے، اگر غیر مومنہ سے نکاح کرے گا تو جائز ہوگا اور انہوں نے آزاد عورتوں پر قیاس سے حجت پکڑی ہے۔ جب آزاد عورتوں میں مومنات کی صفت نے کتابیات سے نکاح کرنے سے منع نہیں کیا تو اسی طرح لونڈیوں میں مومنات کا قول، کتابی لونڈیوں سے نکاح کرنے سے مانع نہ ہوگا۔ اشہب نے المدونہ میں کہا ہے کہ مسلمان غلام کے لیے کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے اور ان کے نزدیک خاوند کو حریت اور دین دونوں میں فضیلت ہے۔ اور اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ مجوسیہ اور بت پرست لونڈی سے مسلمان کا نکاح جائز نہیں اور جب ان کا نکاح بالاجماع حرام ہے تو اسی

1۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراهية التطاول على الرقيق وقوله عبدی او امتی، حدیث نمبر 2366، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طرح ملک یمین کی وجہ سے وطی کرنا بھی قیاساً اور نظراً حرام ہے۔ طاؤس، مجاہد، عطا اور عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ملک یمین کی وجہ سے مجوسیہ لونڈی سے وطی میں کوئی حرج نہیں۔ یہ شاذ اور متروک قول ہے۔ فقہاء امصار میں سے کسی نے اس کی طرف التفات نہیں کیا۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ ایسی لونڈی سے وطی کرنا حلال نہیں حتیٰ کہ مسلمان ہو جائے۔ اس مسئلہ میں تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ امور کے بواطن کو جاننے والا ہے۔ جبکہ تم امور کے ظاہر کو جانتے ہو۔ تم تمام آدم کی اولاد ہو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ پس ضرورت کے وقت لونڈی سے نکاح کرنے کو عار نہ سمجھو اگرچہ ان کے قیدی ہونے کا زمانہ قریب ہو یا دوسری ہو یا اس جیسی کسی اور صورت میں ہو۔ اس لفظ میں تنبیہ ہے کہ بعض اوقات لونڈی کا ایمان بعض آزاد عورتوں کے ایمان سے افضل ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یہ مبتدا خبر ہیں جیسے تیرا قول ہے: زید فی الدار مطلب یہ ہے کہ تم آدم کے بیٹے ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مومن ہو۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے کہ جو تم میں سے آزاد مومنات سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو تم میں سے بعض، بعض سے نکاح کر لے۔ یہ اس کی لڑکی ہے، یہ اس کی لڑکی ہے پس اس تقدیر پر بَعْضُكُمْ، فعل فلینکح کی وجہ سے مرفوع ہوگا، اور اس کلام سے مقصود ان عربوں کے نفوس کو مطمئن کرنا ہے جو لونڈی کی اولاد کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس کو عار دلاتے تھے اور اس کو الھجین کہتے تھے۔ جب شریعت اسلامیہ نے لونڈی سے نکاح کے جواز کا حکم دیا تو انہوں نے جان لیا کہ اس تھجین کا کوئی معنی نہیں۔ لونڈی کا مرتبہ جب کم ہو گیا تو آزاد مرد کے لیے بغیر ضرورت کے اس سے نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ بچے کی غلامی کا سبب بنتی ہے اور لونڈی ہمیشہ اپنے خاوند کے لیے فارغ بھی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ یعنی ان کے ارباب ولایت کی اجازت سے نکاح کرو اسی طرح غلام بھی اپنے آقا کی اجازت سے نکاح کرے گا، کیونکہ غلام مملوک ہوتا ہے اس کا کوئی امر نہیں ہوتا اور اس کا پورا بدن مستغرق ہوتا ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ غلام جب آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گا پھر اس کا آقا اس کی اجازت دے گا تو نکاح جائز ہوگا۔ یہ امام مالک اور اصحاب الرائے کا مذہب ہے۔ اور یہی قول حسن بصری، عطا بن ابی رباح، سعید بن مسیب، شریح اور شعبی کا قول ہے اور لونڈی جب اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو وہ نکاح فسخ ہو جائے گا آقا کی اجازت سے جائز نہ ہوگا، کیونکہ لونڈی میں انوثت کا نقصان قطعی طور پر اس کے نکاح کے انعقاد سے مانع ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جب غلام بھی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گا تو اس کا نکاح بھی فسخ ہوگا۔ یہ امام شافعی، اوزاعی، داؤد بن علی کا قول ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: آقا کی اجازت جائز نہیں کرتی اگر وہ نکاح میں موجود نہ ہو، کیونکہ فاسد عقد کو اس کی اجازت صحیح نہیں کرتی۔ اگر وہ نکاح کا ارادہ کرے گا تو دوبارہ نکاح کرے گا۔ مسلمانوں کے علماء کا اجماع ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر غلام کا نکاح جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر ایسے غلام کو زانی شمار کرتے تھے اور اسے حد لگاتے تھے۔ یہی ابو

ثور کا قول ہے۔ عبدالرزاق نے عبداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر اور عن معمر عن ایوب، عن نافع عن ابن عمر کی دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر نے اپنے ایک غلام کو پکڑا جس نے ان کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تھا پھر اسے حد لگائی اور انہیں (میاں، بیوی کو) جدا کر دیا اور اس عورت کے مہر کو باطل قرار دیا۔ عبدالرزاق نے کہا: ہمیں ابن جریج نے بتایا انہوں نے موسیٰ بن عتبہ سے روایت کیا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا کہ ابن عمر، آقا کی اجازت کے بغیر غلام کے نکاح کو زنا خیال کرتے تھے اور اس کو حد لگانے کا نظریہ رکھتے تھے اور انہیں بھی سزا دیتے تھے جو ان دونوں کا نکاح کرتے تھے (1)۔ عبدالرزاق نے فرمایا ہمیں ابن جریج نے عبداللہ بن محمد بن عقیل سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت جابر بن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ زانی ہے'' (2)۔ اور حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے: یہ نکاح حرام ہے۔ اگر آقا کی اجازت سے نکاح کرے گا تو طلاق اس کے ہاتھ میں ہوگی جو فرج کو حلال کرے گا۔ ابو عمر نے کہا: اس پر حجاز اور عراق کے علماء کا مذہب ہے اور حضرت ابن عباس سے بلا اختلاف مروی ہے کہ طلاق آقا کے ہاتھ میں ہے اس پر حضرت جابر بن عبداللہ اور ایک فرقہ نے ان کی متابعت کی ہے۔ یہ علماء کے نزدیک شاذ قول ہے اس پر توجہ نہیں دی جائے گی، میرا خیال ہے حضرت ابن عباس نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (النحل:75) اللہ تعالیٰ نے عبد مملوک کی مثال بیان فرمائی جو کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا۔ اور اہل علم کا اجماع ہے کہ غلام کا نکاح، آقا کی اجازت سے جائز ہے۔ اگر اس نے نکاح فاسد کیا تو امام شافعی نے فرمایا: اگر اس نے مصاحبت نہیں کی تو عورت کے لیے کچھ نہ ہوگا اور اگر مصاحبت کر چکا ہوگا تو اس پر مہر ہوگا جب وہ آزاد ہوگا یہ صحیح مذہب ہے یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے، اس پر مہر نہ ہوگا حتیٰ کہ وہ آزاد ہو جائے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اگر اس سے مصاحبت کرے گا تو اس عورت کے لیے مہر ہوگا۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: جب غلام دو شخصوں کا ہو اور ایک مالک اسے نکاح کی اجازت دے دے اور وہ نکاح کرے تو نکاح باطل ہوگا، رہی لونڈی جب اپنے مالک سے نکاح کی اجازت طلب کرے اور وہ اسے نکاح کی اجازت دے دے تو جائز ہے اگرچہ وہ خود عقد نہ بھی کرے لیکن اس کو عقد کا ولی بنایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ نکاح میں مہر کے وجوب پر یہ جملہ دلیل ہے اور یہ مہر لونڈی کے لیے ہوگا۔ بِالْمَعْرُوْفِ اس کا معنی ہے شرع اور سنت کے مطابق۔ یہ کلام تقاضا کرتا ہے کہ لونڈیاں اپنے مہر کی اپنے مالکوں کی نسبت خود زیادہ حق دار ہیں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ کتاب الرہون میں ہے: آقا کے لیے لونڈی کا مہر لینا اور بغیر جہیز (سامان) کے اسے چھوڑ دینا جائز نہیں (3)۔ امام شافعی نے فرمایا: مہر آقا کے لیے ہے، کیونکہ وہ عوض ہے پس مہر لونڈی کے لیے نہ ہوگا۔ اس کی اصل لونڈی سے منفعت اٹھانے کی اجازت ہے۔ لونڈی کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ مہر

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی نکاح العبد بغیر اذن سیدہ، حدیث نمبر 1779، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 132۔ ایضاً، حدیث نمبر 1090، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 38

اس کے سبب واجب ہوا ہے۔ قاضی اسماعیل نے احکام میں ذکر کیا ہے کہ بعض عراقیوں نے خیال کیا ہے کہ جب مالک اپنی لونڈی کا نکاح اپنے غلام سے کردے تو مہر نہیں ہوگا۔ یہ قول کتاب وسنت کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مُحْصَنٰتٍ** یعنی پاک دامن عورتیں۔ کسائی نے اسے **محصِنات** سارے قرآن میں صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے اس ارشاد کے **وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ** اور باقی قراء نے پورے قرآن میں صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: **غیر مسافحات** اعلانیہ زنا کرنے والی نہ ہوں، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں اعلانیہ زنا کرنے والی ہوتی تھیں۔ ان کے لیے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہوتے تھے بیطار کے جھنڈے کی طرح۔

وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار) برائی پر دوست نہ بنانے والی ہوں۔ اخدان کا واحد خدن اور خدین ہے۔ وہ جو تمہیں دوست بنائے۔ رجل خدنۃ جب کوئی دوست بنائے۔ یہ ابوزید سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **مسافحہ** کا معنی اعلانیہ زنا کرنے والی ہے یعنی جو عورت کرائے پر زنا کرتی ہے۔ ذات الخدن جو پوشیدہ زنا کرتی ہے بعض علماء نے فرمایا: المسافحہ سے مراد ہر شخص سے بدکاری کرنے والی اور ذات الخدن جو کسی ایک سے زنا کرتی ہے عرب اعلانیہ زنا کو معیوب سمجھتے تھے اور پوشیدہ یار بنانے کو معیوب نہیں جانتے تھے۔ اسلام نے یہ تمام صورتیں اٹھادیں اس کے متعلق یہ ارشاد نازل ہوا۔ **وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ** (الانعام: 151) یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَآ اُحْصِنَّ**۔ عاصم، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے (1) اور باقی قراء کی قرأت ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے، ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: جب وہ اسلام قبول کریں اور جب ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے: جب ان کا نکاح کیا گیا ہو۔ جب مسلمان لونڈی زنا کرے گی تو اسے آزاد عورت کے کوڑوں سے نصف کوڑے لگائیں جائیں گے۔ اس کا مسلمان ہونا اس کا محصن ہونا ہے یہ جمہور، حضرت ابن مسعود، شعبی، زہری وغیرہم کے قول میں ہے اور کافرہ لونڈی کو حد نہیں لگائی جائے گی جب وہ زنا کرے گی۔ یہ امام شافعی کا قول ہے جو ابن المنذر نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: لونڈی کا احصان اس کا آزاد شخص سے نکاح کرنا ہے جب غیر شادی شدہ مسلمان لونڈی زنا کرے گی تو اس پر حد نہ ہوگی۔ یہ سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوالدرداء سے مروی ہے اور ابو عبید نے بھی یہی کہا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت عمر بن الخطاب کی حدیث میں ہے کہ ان سے لونڈی کی حد کے بارے پوچھا گیا تو حضرت عمر نے فرمایا: اِنَّ الْاَمَۃَ اَلْقَتْ فَرْوَۃَ راسھا من وراء الدار۔ اصمعی نے کہا: الفروۃ سر کی جلد کو کہتے ہیں۔ ابو عبید نے کہا: حضرت عمر نے فروہ سے مراد سر کی جلد نہیں لی ہے اسے کیسے گھر کے پیچھے پھینک سکتی ہے۔ لیکن یہ مثال ہے فروہ سے مراد پردہ ہے۔ یعنی اس پر کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہوتا وہ ہر جگہ جاتی ہے جہاں اس کے مالک اسے بھیجتے ہیں وہ اس سے بچنے پر قادر نہیں ہوتی۔ پس وہ اس وجہ سے برائی سے بچنے پر قادر نہیں ہوتی مثلاً اسے بکریاں چرانا ہوتی ہیں، ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گویا حضرت عمر نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اس پر اس وجہ سے حد نہیں ہے اگر وہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 47

زنا کرے۔ ایک فرقہ نے کہا ہے کہ لونڈی کا احصان اس کا نکاح کرنا ہے مگر غیر شادی شدہ مسلمان لونڈی پر حد سنت سے واجب ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! لونڈی جب زنا کرے اور شادی شدہ نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد کو واجب کیا(1)۔ اور زہری نے کہا: شادی شدہ مسلمان لونڈی کی حد قرآن نے متعین فرمائی ہے اور غیر شادی شدہ کی حد، حدیث سے متعین ہے(2) اور جن علماء نے اذا احصن کا معنی اسلام لانا کیا ہے۔ قاضی اسماعیل نے کہا: اس میں بُعد ہے، کیونکہ ایمان کا ذکر تو ان سے پہلے مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اور رہے وہ علماء جنہوں نے اُحۡصِنَّ کا معنی تزوجن کیا ہے اور کہا ہے کہ لونڈی پر حد نہیں ہے حتیٰ کہ وہ شادی کر لے۔ یہ علماء ظاہر قرآن پر گئے ہیں میرا خیال ہے انہیں یہ حدیث معلوم نہیں تھی ہمارے نزدیک معاملہ یہ ہے کہ لونڈی جب زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو تو کتاب اللہ کے ساتھ اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور جب زنا کرے جب شادی شدہ نہ ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی وجہ سے کوڑے لگائے جائیں گے، لونڈی پر رجم نہ ہوگا کیونکہ رجم کا نصف نہیں ہوتا۔ ابو عمر نے کہا: قرآن کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی پر حد نہیں ہے اگرچہ وہ مسلمان بھی ہو مگر شادی کے بعد۔ پھر سنت نے اس کے کوڑوں کو بیان کیا اگرچہ شادی شدہ نہ ہو پس یہ اس کے بیان کی زیادتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مومن کی پیٹھ محفوظ ہے اسے مباح نہیں کیا جائے گا مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا، تو پھر صحیح سنت میں اس کی کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے اسے کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ واللہ اعلم

ابن المنذر نے ابو ثور کا قول ذکر کیا ہے کہ اگر علماء کا غلام اور لونڈی کو، زنا کی صورت میں رجم کرنے میں اختلاف ہوگا تو جب وہ محصن ہوں گے تو انہیں رجم کیا جائے گا اور اگر اجماع ہوگا تو پھر اجماع اولیٰ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 15۔ علماء کا اختلاف ہے کہ غلام اور لونڈی زنا کریں گے تو ان پر حد کون لاگو کرے گا؟ ابن شہاب نے کہا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ زنا کی صورت میں انہیں ان کے مالک حد لگائیں گے مگر ان کا مقدمہ سلطان تک پہنچایا جائے گا تو پھر کسی کے لیے اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام کرنا جائز نہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا بھی یہی مقتضی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو وہ اسے حد لگائے''(3)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: اپنے غلاموں پر حد قائم کرو جو ان میں سے محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈی نے زنا کیا تو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوڑے لگانے کا حکم فرمایا، اس کا قریب ہی بچہ پیدا ہوا تھا مجھے اندیشہ ہوا کہ میں اسے کوڑے لگاؤں گا تو اسے قتل کر دوں گا، میں نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اچھا کیا(4) (کہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع العبد الزانی، حدیث نمبر 2009، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ البحر الوجیز، جلد 2، صفحہ 39

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المدبر، حدیث نمبر 2080، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 173

اسے کوڑے نہیں لگائے)'' اس حدیث کو مسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوف نقل کیا ہے، نسائی نے اسے مسند ذکر کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر (زنا کرنے کی صورت میں) حد قائم کرو جو ان میں محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں''۔ یہ نص ہے کہ سردار ہی اپنے غلاموں پر حدود قائم کریں گے ان میں سے جو محصن ہیں اور جو محصن نہیں ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: آقا اپنے غلام کو حد لگائے گا زنا، شراب پینے اور قذف لگانے میں جب کہ گواہ اس کے پاس گواہی دیں اور چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹے گا بلکہ امام اس کا ہاتھ کاٹے گا۔ یہ لیث کا قول ہے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے غلاموں پر حدود قائم کیں، ان صحابہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم ہیں۔ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ان کا مخالف نہیں۔ ابن ابی لیلی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے انصار کے بقیہ لوگوں کو پایا کہ وہ اپنی لونڈیوں میں سے اس لونڈی کو اپنی مجالس میں مارتے تھے جب وہ زنا کرتی تھی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: غلاموں اور لونڈیوں پر زنا اور تمام حدود میں سلطان حدود قائم کرے گا، آقا یہ نہیں کرے گا۔ یہی حسن بن حی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: آقا ہر حد لگائے گا اور ہاتھ کاٹے گا اور امام شافعی نے ان احادیث سے حجت پکڑی ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں، ثوری اور اوزاعی نے کہا: زنا میں آقا اسے حد لگائے گا اور یہی احادیث کا مقتضیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی سورت میں غلام کو جلاوطن کرنے کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ اگر لونڈی زنا کرے پھر آقا کے حد لگانے سے پہلے وہ آزاد کر دی گئی تو آقا کو اس کو حد لگانے کا اختیار نہ ہوگا اور سلطان اسے کوڑے لگائے گا جب زنا اس کے سامنے ثابت ہو جائے گا۔ اگر لونڈی زنا کرے پھر نکاح کرلے تو پھر بھی آقا کو اسے کوڑے مارنے کا اختیار نہ ہوگا، کیونکہ خاوند کے حق کو نقصان پہنچے گا یہ امام مالک کا مذہب ہے جب کہ خاوند بھی اس آقا کا غلام نہ ہو، اگر خاوند بھی اسی مالک کا غلام ہوگا تو پھر آقا کے لیے حد لگانا جائز ہوگا، کیونکہ ان دونوں کا حق اس کا حق ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ اگر غلام زنا کا اقرار کرے اور آقا اس کا انکار کرے تو غلام پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد واجب ہو گی اور آقا کے انکار کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ اس پر علماء کا اجماع ہے اسی طرح مدبر، ام ولد، مکاتب اور جس کا بعض حصہ آزاد ہے، ان تمام کا حکم ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ لونڈی جب زنا کرے پھر آزاد کی جائے تو اسے لونڈیوں والی حد لگائی جائے گی اور جب وہ زنا کرے جب کہ اسے اپنی آزادی کا علم نہیں تھا، پھر اسے علم ہوا تو اس پر آزاد عورت کی پوری حد لگائی جائے گی، ابن المنذر نے یہ ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ غلام اور لونڈی جب زنا کریں تو آقا کے ان کو معاف کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں: اسے معاف کرنے کا اختیار ہے۔ ان کے علاوہ علماء نے کہا: اسے حد قائم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، جیسا کہ سلطان کو حد کے ثبوت کے متعلق علم ہونے کے بعد معاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح آقا کو اپنی لونڈی کو معاف کرنے کی گنجائش نہیں جب اس پر حد واجب ہو جائے۔ یہ ابو ثور کے مذہب پر ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 19۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ یعنی کوڑوں کی سزا نصف

ہوگی لونڈیوں پر، یہاں اَلْمُحْصَنٰتِ سے مراد کنواری آزاد عورتیں ہیں، کیونکہ شادی شدہ پر رجم ہے اور رجم کا نصف نہیں ہوتا۔ کنواری کو محصنہ کہا گیا ہے اگرچہ وہ شادی شدہ نہیں ہے، کیونکہ احصان شادی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قربانی کو اس کو قربان کرنے سے پہلے کہا جاتا ہے اور اسی طرح بقرۃ (بیل) کو مثیرہ (ہل چلانے والی) کہا جاتا ہے اس کے زمین میں ہل چلانے سے پہلے۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلْمُحْصَنٰتِ سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں، کیونکہ ان پر حدیث میں ضرب اور رجم ہے اور رجم کا نصف نہیں ہوتا پس ان پر نصف کوڑوں کی سزا ہوگی۔ لونڈیوں کی حد میں کمی اس وجہ سے ہے کہ وہ آزاد عورتوں سے کمزور ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: وہ (لونڈیاں) اپنی مراد کو نہیں پہنچتی ہیں جس طرح آزاد عورتیں پہنچتی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: سزا نعمت کی مقدار کے مطابق واجب ہوتی ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی ہوئی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا) جب ازواج مطہرات کی نعمت زیادہ تھی تو اس کی سزا کو بھی سخت فرمایا: اسی طرح لونڈیوں کی نعمت جب کم تھی تو اس کی سزا کو کم کیا۔ اس آیت میں خاص لونڈیوں کی حد کا ذکر فرمایا اور غلاموں کی حد کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن غلاموں اور لونڈیوں کی سزا برابر ہے زنا میں پچاس کوڑے اور حد قذف اور شراب پینے کی حد چالیس کوڑے ہے، کیونکہ لونڈی کی حد غلامی کے نقصان کی وجہ سے کم ہوئی تو غلامی کی علت کی وجہ سے اس میں غلام بھی داخل ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: من اعتق شرکاله فی عبد (1) (جس نے غلام میں اپنا حصہ آزاد کیا) میں لونڈیاں بھی داخل ہیں، اس کو علماء قیاس فی معنی الاصل کا نام دیتے ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (النور: 4) اس آیت میں محصن مرد بھی قطعاً داخل ہیں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ، سورۃ النور میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 20۔ علماء کا اجماع ہے کہ زانیہ لونڈی کو بیچنا مالک پر لازم نہیں ہے اگر وہ اس کو اپنے لیے پسند کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور اس کا زنا واضح ہو جائے تو اسے آقا حد لگائے اور اسے ملامت نہ کرے، پھر اگر زنا کرے تو آقا اسے حد لگائے اور اسے ملامت نہ کرے، پھر اگر تیسری مرتبہ زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے تو اسے بیچ دے اگرچہ بالوں کی رسی سے (بیچ دے) (2)'' اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اہل ظاہر نے چوتھی مرتبہ زنا کرنے کی صورت میں اسے بیچنے کے وجوب کا قول کیا ہے، ان علماء میں داؤد وغیرہ ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: **فلیبعها** (اسے بیچ دے) اور فرمایا: **ثم بیعوها ولو بضفیر** (پھر اسے بیچو اگر بالوں کی رسی کے ساتھ (بیچو)۔ ابن شہاب نے فرمایا: میں نہیں جانتا تیسری یا چوتھی مرتبہ کے بعد بیچنے کا حکم دیا۔ **الضفیر** سے مراد رسی ہے۔ جب اسے فروخت کرے تو اس کے زنا کی وضاحت کرے، کیونکہ یہ عیب ہے اور اسے چھپانا حلال نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 53
ایضاً صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا أعتق عبدا بین اثنین او امة بین الشرکاء، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70

ہے۔ اگر کہا جائے کہ حدیث کا مقصود زانیہ کو دور کرنا تھا اور بائع پر اس کے زنا کو بتانا واجب تھا تو کسی کے لیے اس کا خریدنا بھی مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ہمیں اس کے دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لونڈی مال ہے اور اسے ضائع نہیں کیا جائے گا، کیونکہ مال کو ضائع کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نہ اسے ہمیشہ کے لیے روکا جائے گا، کیونکہ یہ چیز اس کے لیے زنا پر ابھارنے والی ہے اور یہ اسے زنا پر قدرت دینا ہے اور نہ اسے ہمیشہ کے لیے محبوس کیا جائے گا، کیونکہ اس میں اس کے آقا کی منفعت کو معطل کرنا ہے پس اس کا بیچنا ہی باقی رہ جاتا ہے شاید دوسرا آقا وطی کے ذریعے اسے زنا سے بچالے یا وہ اس کے بچاؤ میں مبالغہ کرے اور اس طرح وہ اسے اس برائی سے محفوظ کرلے۔ علی الجملہ مالکوں کے تبدیل ہونے کے وقت اس کے احوال تبدیل ہو جائیں گے۔

مسئلہ نمبر 21۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی لونڈی سے نکاح کرنے کی نسبت کنوارہ رہ کر صبر کرنا بہتر ہے، کیونکہ یہ بچے کو غلام بنانے تک پہنچاتا ہے۔ نفس کو روکنا اور مکارم اخلاق پر صبر کرنا گھٹیا چیز سے بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس آزاد مرد نے لونڈی سے نکاح کیا اس نے اپنا نصف غلام بنالیا۔ یعنی وہ اپنی اولاد کو غلام بنانے والا ہے پس اس سے صبر افضل ہے تاکہ اولاد کو غلام نہ بنائے۔ سعید بن جبیر نے کہا: لونڈی سے نکاح زنا نہیں مگر قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی لونڈیوں کے نکاح سے صبر کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ضحاک بن مزاحم سے مروی ہے فرمایا: میں نے انس بن مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "جو اللہ تعالیٰ سے طاہر مطہر ملنا چاہتا ہے تو وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے" (1)۔ ابو اسحاق ثعلبی نے یونس بن مرداس کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ حضرت انس کا خادم تھا اور اس نے یہ زائد کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ "آزاد عورتیں گھر کے لیے صلاح (بہتر) ہیں اور لونڈیاں گھر کے لیے ہلاکت ہیں یا فرمایا گھر کے لیے فساد ہیں"۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶

"چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ کھول کر بیان کر دے (اپنے احکام) تمہارے لیے اور چلائے تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے"۔

یعنی تمہارے لیے تمہارے دین کے معاملات اور معاملات کے مصالح بیان کر دے اور جو تمہارے لیے حلال ہے اور جو تمہارے لیے حرام ہے اسے بیان کر دے۔ یہ کسی بھی واقعہ کے حکمت سے خالی نہ ہونے پر دلیل ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 135۔ ایضاً حدیث نمبر 1851، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کی مزید وضاحت آگے آئے گی۔ اس کے بعد فرمایا: یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ۔ الله چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) یہ اَنْ کے ساتھ آیا ہے اور پہلا ارشاد لام کے ساتھ تھا۔ فراء نے کہا: عرب لام، کَیْ اور اَنْ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اَنْ کی جگہ کَیْ کے معنی پر لام کو امرت اور اردت میں ذکر کیا جاتا ہے،، عرب کہتے ہیں: اردت ان تفعل، اردت لتفعل، کیونکہ یہ دونوں مستقبل کو طلب کرتے ہیں اور ظننت لتفعل جائز نہیں ہے کیونکہ تو کہتا ہے: ظننت ان قد قمت۔ اور قرآن حکیم میں ہے وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ (الشوریٰ:15) وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿﴾ (الانعام) یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ (الصف:8) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ (التوبہ:32)

شاعر نے کہا:

أرید لأنسی ذکرها فکأنما　　تمثّلُ لی لیلی بکل سبیلِ (1)

اس شعر میں یرید أن انسی مراد ہے۔ نحاس نے کہا: زجاج نے اس قول میں غلطی کی ہے اور کہا: اگر لام بمعنی أن ہوتا تو اس پر دوسرا لام داخل ہوتا ہے جیسے تو کہتا ہے: جئت کی تکرمنی۔ پھر تو کہتا ہے: جئت لکی تکرمنی اور ہم نے یہ شعر بطور دلیل پڑھا:

أردتُ لکیما یعلم الناس أنها　　سراویل قیس والوُفودُ شُهود

اس کی تقدیر یہ ہے اردته لیبین لکم۔ نحاس نے کہا: اس پر امر اتنا بڑھا کہ بعض قراء نے کہا: لام اَن، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے الله تعالیٰ اس سے ارادہ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے لیے بیان فرمائے۔

وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی اہل حق میں سے۔

بعض علماء نے فرمایا: یَهْدِیَكُمْ کا معنی ہے وہ تمہارے لیے تم سے پہلے اہل حق اور اہل باطل لوگوں کے طرق کو بیان کرتا ہے۔ بعض اہل نظر نے کہا: اس میں دلیل ہے کہ الله تعالیٰ نے ہم پر اس آیت سے پہلے جو حرام کیا وہ ہم سے پہلے لوگوں پر بھی حرام تھا۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ معنی ہوگا وہ تمہارے لیے تم سے پہلے لوگوں کا امر بیان کرتا ہے۔

اور کبھی معنی ہوگا وہ تمہارے لیے بیان فرماتا ہے جس طرح کہ اس نے تم سے پہلے انبیاء کے لیے بیان فرمایا، پس بعینه اس کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یُرِیْدُ اللّٰهُ کا قول قصہ کی ابتدا ہے یعنی الله تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ تمہارے لیے اپنی طاعت کی کیفیت بیان کرے۔ یَهْدِیَكُمْ یعنی تمہیں پہلے لوگوں کے طرق بیان کرے۔ انہوں نے جب میرے احکام کو ترک کیا تو میں نے انہیں کیسے سزا دی اور تم جب ایسا کرو گے تو میں تمہیں سزا نہیں دوں گا بلکہ میں تم پر نظر رحمت کروں گا

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ الله اسے جانتا ہے جو توبہ کرتا ہے اور حَكِیْمٌ توبہ کی قبولیت میں اس کی حکمت کارفرما ہے۔

وَاللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْكُمْ ۫ وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا ﴿﴾ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾

’’اور الله تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کر رہے ہیں اپنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40

خواہشوں کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ یہ مبتدا خبر ہے اور اَنْ، يُرِيْدُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اسی طرح يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ میں بھی اَنْ، يُرِيْدُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ کو قبول کرنے، تمہارے گناہوں سے تجاوز کرنے اور تم سے تخفیف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تمام احکام شرع میں ہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تخفیف سے مراد لونڈی سے نکاح کرنا ہے یعنی جب ہم نے جان لیا کہ تم عورتوں پر صبر کرنے میں کمزور ہو تو ہم نے لونڈیوں سے نکاح کرنے کی تخفیف کر دی۔ یہ مجاہد، ابن زید اور طاؤس کا قول ہے۔ طاؤس نے کہا: انسان عورتوں کے معاملہ میں انتہائی کمزور ہے(1)۔ شہوات کی اتباع کرنے والوں کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد زنا کرنے والے ہیں۔ سدی نے کہا: یہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ ایک جماعت نے کہا: یہ صرف یہود ہیں، کیونکہ انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مسلمان، باپ کی طرف سے بہنوں سے نکاح کرنے میں ان کی پیروی کریں۔ ابن زید نے کہا: یہ عموم پر ہے اور یہ اصح ہے(2)۔ المیل کا معنی سیدھے راستہ سے پھر جانا ہے۔ پس جو سیدھے راستے پر ہوتا ہے وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے ساتھی بھی اس راستہ پر ہوں تا کہ اسے فساد لاحق نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا، ضَعِيْفًا کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی خواہش نے اس کو راہ حق سے ہٹایا اور اس کی شہوت اور غضب نے اسے حقیر بنایا، یہ انتہائی ضعف ہے پس وہ تخفیف کا محتاج ہوا۔ طاؤس نے کہا: یہ خاص عورتوں کے معاملہ میں ضعف کا ذکر ہے(3)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے خَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيْفًا (4) یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ضعیف پیدا فرمایا یعنی وہ عورتوں کے سلسلہ میں صبر نہیں کر سکتا۔ ابن مسیب نے کہا: مجھ پر اسی سال گزر گئے اور میری ایک آنکھ چلی گئی اور میں دوسری سے بھی کم دیکھتا ہوں اور میرا ساتھی (شرمگاہ) نابینا اور بہرہ ہے اور مجھے عورتوں کے فتنہ سے اندیشہ ہے۔ اور حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: کیا تم مجھے نہیں دیکھتے کہ میں سہارا کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور میں نہیں کھاتا مگر جو میرے لیے نرم کیا جاتا ہے اور گرم کیا جاتا ہے اور میرا ساتھی ایک عرصہ سے مر چکا ہے، پھر بھی مجھے پسند نہیں کہ میں کسی ایسی عورت سے خلوت کروں جو میرے لیے حلال نہیں، ہر روز مجھے خوف ہوتا ہے کہ کہیں میرے پاس شیطان نہ آجائے اور اسے مجھ پر حرکت دے دے۔ میرے ساتھی (شرمگاہ) کے لیے نہ سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۟ (۲۹)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 40
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 5، صفحہ 39
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے''۔

اس آیت میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ یعنی بغیر حق کے۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور سورۂ بقرہ میں اس کا معنی بیان کیا ہے اور باطل طریقہ سے مال کھانے کی ایک صورت بیع العُریان بھی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص تجھ سے کوئی سامان لے یا تجھ سے جانور کرائے پر لے اور تجھے ایک درہم یا اس سے زیادہ رقم دے اس شرط پر کہ اگر وہ اس چیز کو خریدے گا یا سواری پر سوار ہوگا تو وہ سامان کی قیمت یا جانور کے کرایہ سے ہوگا اور اگر سامان نہیں خریدے گا یا سواری کرائے پر نہیں لے گا تو جو اس نے تجھے دیا ہے وہ تیرا ہوگا، یہ جائز نہیں ہے اور حجازی علماء اور عراقی علماء کے نزدیک یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ جوئے اور دھوکے اور خطرے کی بیع سے ہے اور یہ بغیر عوض اور بغیر ہبہ کے مال کھانا ہے اور یہ بالاجماع باطل ہے۔ بیع عریان فسخ ہوگی جب اس طرح بیع واقع ہوگی خواہ وہ قبضہ سے پہلے ہو یا قبضہ کے بعد ہو۔ اگر سامان موجود ہوگا تو وہ واپس کیا جائے گا اور اگر سامان ضائع ہو چکا ہوگا تو قبضہ کے دن کی قیمت لوٹائی جائے گی۔ ابن سیرین، مجاہد، نافع بن عبدالحارث اور زید بن اسلم نے بیع العریان کو جائز قرار دیا ہے اور زید بن اسلم کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جائز قرار دیا۔ ابو عمرو نے کہا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ عبدالرزاق نے اسلمی عن زید بن اسلم کے سلسلہ سے مرسل روایت کی ہے اور اس جیسی روایت حجت نہیں ہوتی۔ اور یہ احتمال ہے کہ بیع العریان جو جائز ہے وہ اس تاویل پر ہو جو امام مالک اور ان کے ساتھ فقہاء نے کی ہے۔ وہ تاویل یہ ہے کہ پہلے تو وہ اسے رقم دے دے پھر اس پہلی رقم کو ثمن سے شمار کیا جائے جب بیع کی تکمیل کو اختیار کرے۔ امام مالک اور دوسرے علماء کے نزدیک اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ مؤطا امام مالک میں عن الثقة عندہ عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع العربان سے منع فرمایا (1)۔ ابو عمر نے کہا: علماء نے اس مقام میں الثقة عندہ میں کلام کی ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ انہوں نے ابن لہیعہ سے یہ حدیث لی یا ابن وہب عن ابن لہیعہ کے سلسلہ سے روایت کی۔ ابن لہیعہ علماء میں سے ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اس کی کتابیں جل گئی تھیں پھر جب اس کے بعد وہ اپنے حافظہ سے بیان کرتا تھا تو غلطی کرتا تھا اور جو ابن لہیعہ سے ابن مبارک اور ابن وہب نے روایت کیا ہے وہ بعض علماء کے نزدیک صحیح ہے اور بعض علماء ابن لہیعہ کی تمام احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس کے پاس وسیع علم تھا اور وہ کثرت سے احادیث رکھتا تھا مگر علماء کے نزدیک یہی حال تھا جو ہم نے پہلے بیان کیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ یہ استثنا منقطع ہے یعنی وہ تجارت جو باہمی رضامندی سے ہو۔ تجارت سے مراد خرید و فروخت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ: 275) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور تجارۃ کو رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی الا ان تقع تجارۃ۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب البیوع، صفحہ 568

اس پر سیبویہ نے یہ شعر دلیل دیا ہے:

فِدىً لبني ذُهْلِ بنِ شَيبانَ ناقتي إذا كان يومٌ ذو كواكِبَ أشهبُ

اس کان کو تامہ کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ فاعل کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے اور اسے مفعول کی احتیاج نہیں ہوتی۔ تجارۃً نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں ناقصہ ہوگا، کیونکہ بغیر خبر کے اسم کے ساتھ مکمل نہیں ہوتا پس اسم اس میں مضمر ہوگا اور اگر چاہے تو اس کو مقدر کر لے یعنی الا ان تکون الاموال تجارۃ، پس مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی سے یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ (بقرہ:280)

مسئلہ نمبر3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِجَارَةً لغت میں تجارت سے مراد معاوضہ ہے اسی سے وہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کو ان اعمال صالحہ کے عوض دیتا ہے جو اس کے فعل کا بعض ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ○ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچائے تمہیں دردناک عذاب سے)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (فاطر) (وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال)۔

ان تمام صورتوں میں بیع وشرا کا ذکر مجازاً ہے۔ بیع وشرا کو عقود کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن کے ساتھ اغراض حاصل ہوتی ہیں۔ تجارت کی دو قسمیں ہی بغیر نقل اور سفر کے حضر میں پھیرنا ہے۔ یہ تربص اور احتکار ہے۔ اور معزز لوگوں نے اس سے اعراض کیا ہے، متقین نے اس سے دلچسپی نہیں رکھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سفر کے ساتھ مال گھمانا اور دوسرے شہروں کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یہ اہل مروّت کے لائق ہے اور اس میں منفعت عام ہے، مگر اس میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور دھوکا بھی بڑا ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: مسافر اور اس کا مال ہلاکت پر ہوتا ہے مگر جو اللہ تعالیٰ بچا لے۔ یعنی خطرے پر ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: تورات میں ہے: اے آدم کے بیٹے! سفر کر میں تیرے لیے رزق پیدا کروں گا۔ طبری نے کہا: یہ آیت متصوفین کے قول کے فساد پر بڑی دلیل ہے۔

مسئلہ نمبر4۔ ہر معاوضہ تجارت ہے خواہ وہ عوض کسی اعتبار سے ہو، مگر بِالْبَاطِلِ کا ارشاد اس سے ہر اس عوض کو خارج کر دیتا ہے جو شرعاً جائز نہیں مثلاً سود، یا جہالت یا فاسد عوض کو مقدر کرنا جیسے شراب، خنزیر وغیرہ۔ اور اس سے ہر وہ عقد بھی خارج ہو جاتا ہے جو جائز تو ہوتا ہے، لیکن اس میں عوض نہیں ہوتا جیسے قرض، صدقہ، ہبہ لیکن ثواب اس سے ملتا ہے اور تبرعات کی عقود دوسرے دلائل کے ساتھ جائز ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر آئیں گے یہ دونوں طرفیں متفق علیہما ہیں اور اس سے وہ دعوت بھی خارج ہو گئی جس کی طرف تمہارا بھائی تمہیں بلاتا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ

بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کے تحت روایت کیا ہے کہ ایک شخص اس آیت کے نزول کے بعد کسی کے پاس کھانا کھانے سے اجتناب کرتا تھا، تو اس آیت کو سورۂ نور کی آیت سے منسوخ کر دیا، فرمایا: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور: 61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں میں الخ)

ایک امیر آدمی اپنے کھانے کی طرف اپنے اہل میں سے کسی شخص کو بلاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ میں اس سے کھانے میں حرج دیکھتا ہوں اور وہ کہتا: مجھ سے اس کا مسکین زیادہ حق دار ہے پس اس ارشاد میں اس چیز کا کھانا حلال فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اور اہل کتاب کا کھانا حلال فرمایا(1)۔

مسئلہ نمبر5۔ اگر تو بازار سے کوئی چیز خریدے پھر اس چیز کا مالک تجھے خریدنے سے پہلے کہے: تو اس کو چکھ لے تیرے لیے حلال ہے۔ پس تو اس سے نہ کھا، کیونکہ اس کا کھانے کی اجازت دینا خریدنے کی وجہ سے ہے۔ بعض اوقات تمہارے درمیان سودا واقع نہیں ہوتا پس اس کا کھانا مشتبہ ہوگا، لیکن اگر وہ تیرے لیے اس چیز کی صفت بیان کرے پھر تو اس سے خریدے اور تو اسے اس صفت پر نہ پائے تو تجھے اختیار ہے۔

مسئلہ نمبر6۔ جمہور علماء تجارت میں غبن کے جواز کے قائل ہیں مثلاً کوئی شخص ایک یاقوت ایک درہم میں بیچے، حالانکہ وہ سو درہم کے مساوی ہو تو یہ تیرے لیے جائز ہے، کیونکہ مالک جس کی ملکیت صحیح ہے اس کے لیے اپنے بہت سے مال کو تھوڑے مال کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے جب کہ اس کی قدر معروف ہو، جس طرح ہبہ جائز ہے اگر ہبہ کیا جائے۔ اور اس میں اختلاف ہے جب اس کی قدر معروف نہ ہو۔ ایک قوم نے کہا: اگر اس کی قدر معروف ہو یا نہ ہو یہ بیع جائز ہے جب کہ بیچنے والا دانا، آزاد اور بالغ ہو۔ اور ایک جماعت نے کہا: جب غبن تہائی سے تجاوز کر جائے(2) تو مردود ہے اس سے قریب قریب اور تجارت میں متعارف غبن مباح ہے لیکن بہت زیادہ غبن جائز نہیں ہے۔ یہ ابن وہب کا قول ہے جو امام مالک کے اصحاب میں سے ہیں، پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ زانیہ لونڈی کی حدیث میں ہے ''اس کو بیچ دو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدل ہو(3)'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے کہا تھا: ''اس کو نہ خرید اگرچہ وہ تجھے ایک درہم میں ہی بیچ دے'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کو چھوڑ دو اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے رزق دیتا ہے(4)'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی شہری دیہاتی کے لیے بیع نہ کرے(5)''۔ ان ارشادات میں قلت و کثرت، تہائی وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

1۔ سنن ابو داؤد، کتاب الاطعمہ، جلد 2، صفحہ 171
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 258
4۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 4
5۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ۔ یعنی تم جو باہم رضامندی سے کرو۔ یہاں تراض بمعنی رضاً ہے لیکن باب مفاعلہ اس لیے ذکر کیا۔ کیونکہ تجارت دو شخصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ علماء کا تراضی کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: بیع کا تمام اور جزم بیع کی عقد کے بعد ابدان کے جدا ہونے کے ساتھ ہے یا ایک دوسرے کو کہے: تو اختیار کر لے۔ دوسرا کہے: میں نے اختیار کر لیا۔ اس صورت میں عقد کے بعد سودا پختہ ہو جائے گا اگرچہ ابدان کے ساتھ جدا بھی نہ ہوں (1) یہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور امام شافعی، ثوری، اوزاعی، لیث، ابن عیینہ، اسحاق وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام اوزاعی نے کہا: بائع اور مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں مگر تین بیوع میں اختیار نہیں سلطان کا مال غنیمت کی بیع کرنا، میراث میں شرکت کی بیع کرنا اور تجارت میں شرکت کرنا جب ان تین بیوع کا سودا ہو گا تو بیع واجب ہو جائے گی اور دونوں کو اختیار نہیں ہو گا اور فرمایا: جدائی کی حد یہ ہے کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک دوسرے سے چھپ جائے یہ اہل شام کا قول ہے۔ اور لیث نے کہا: جدائی یہ ہے کہ ایک کھڑا ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے: دونوں کو اختیار ہے جب تک جسموں کے ساتھ جدا جدا نہ ہو جائیں خواہ انہوں نے کہا ہو کہ اختیار کر لو یا نہ کہا ہو، حتیٰ کہ ابدان کے ساتھ اپنی اپنی جگہ سے جدا ہو جائیں۔ یہ بھی امام شافعی کا قول ہے اور اس باب میں یہی صحیح ہے، کیونکہ اس کے متعلق احادیث وارد ہیں، یہ حضرت ابن عمر، حضرت ابو برزہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے کہا: بیع کا تمام یہ ہے کہ زبان سے بیع کرنا۔ اس سے بیع پختہ ہو جائے گی اور اختیار اٹھ جائے گا۔ امام محمد بن حسن نے کہا: البیعان بالخیار مالم یتفرقا (2) کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بائع جب کہے: میں نے تجھے (یہ چیز) بیچی تو اس کے لیے رجوع کا حق ہے جب تک کہ مشتری نے یہ نہ کہا ہو کہ میں نے قبول کیا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ امام مالک نے اس پر نص قائم فرمائی۔ یہ ابن خویز منداد نے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو رجوع کا حق نہیں۔ یہ قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پہلے قول کے قائلین نے حضرت سمرہ بن جندب، حضرت ابو برزہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، حضرت ابو ہریرہ، حضرت حکیم بن حزم وغیرہم کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے روایت کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیع کرنے والوں کو خیار ہے جب تک جدا نہ ہو جائیں یا ایک دوسرے کو کہے: اختیار کر لے (3)۔ یہ دوسری روایت الا بیع الخیار اور الا ان یکون بیعھما عن خیار کا معنی ہے یعنی بیع کے مکمل ہونے کے بعد ایک دوسرے کو کہے: بیع کا نفاذ یا بیع کا فسخ اختیار کر لے، اگر وہ بیع کو قائم رکھنا اختیار کرے تو بیع مکمل ہو جائے گی اگرچہ ایک دوسرے سے جدا بھی نہ ہوں حضرت ابن عمر جو حدیث کے راوی ہیں وہ جب کسی سے بیع کرتے اور اس بیع کو نافذ کرنا پسند کرتے تو تھوڑا سا چل پڑتے پھر لوٹ آتے۔ ''الاصول'' میں ہے: جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل کو زیادہ جانتا ہے خصوصاً صحابہ کرام، کیونکہ وہ بات کو زیادہ جاننے والے تھے اور حالات سے زیادہ واقف تھے۔ ابو داؤد، دار قطنی نے ابو الوضی سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک لشکر میں سفر پر تھے تو ایک شخص آیا جس کے ساتھ ایک گھوڑا تھا ہم میں سے ایک شخص نے اسے کہا: کیا تو یہ گھوڑا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 41 2۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 279 3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 213

اس غلام کے عوض بیچے گا؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے گھوڑا غلام کے عوض بیچ دیا پھر اس نے ہمارے ساتھ رات گزاری، جب صبح ہوئی تو وہ اپنے گھوڑے کی طرف گیا، تو خریدنے والے نے اسے کہا: اب تجھے گھوڑے سے کیا غرض؟ کیا تو نے مجھے یہ فروخت نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے اس بیع کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر خریدنے والے نے کہا: تجھے اس سے کیا غرض؟ تو مجھے یہ بیچ چکا ہے، ان دونوں کو لوگوں نے کہا: یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو برزہ موجود ہیں تم دونوں ان کے پاس جاؤ، حضرت ابو برزہ نے ان دونوں سے کہا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی ہو؟ ان دونوں نے کہا: ہاں، ابو برزہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں بیع کرنے والوں کو اختیار ہے جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں۔ اور میں نہیں دیکھتا کہ تم جدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں صحابی ہیں اور حدیث کے مخرج کو انہوں نے جان لیا اور اس کے مقتضا پر عمل کیا بلکہ یہ صحابہ کا عمل تھا سالم نے کہا: حضرت ابن عمر نے کہا: ہم جب بیع کرتے تھے تو ہم میں سے ہر ایک کو خیار ہوتا تھا جب تک کہ بیع کرنے والے دونوں جدا نہ ہو جاتے تھے۔ حضرت عبد اللہ نے فرمایا: میں نے اور حضرت عثمان نے بیع کی میں نے انہیں وادی کی زمین دی اور ان کی خیبر کی زمین لی۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: جب میں نے سودا کر دیا تو میں الٹے پاؤں چلنے لگا اس خوف سے کہ کہیں حضرت عثمان میرے جدا ہونے سے پہلے مجھے سودا لوٹا نہ دیں۔ یہ روایت دار قطنی نے نقل کی ہے، پھر فرمایا: اہل لغت نے فَرَقت اور فَرّقت میں فرق کیا ہے؟ فرقت کو کلام کے اعتبار سے اور فرّقت ابدان کے اعتبار سے جدائی کو لیا ہے۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: مجھے ابن اعرابی نے مفضل سے روایت کر کے بتایا کہ فرقت دو کلاموں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے اور فرّقت دو شخصوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے یعنی میں نے دو کلاموں کے درمیان فرق کیا تو دونوں جدا ہو گئیں اور فرقت کا مطلب ہے: دو آدمیوں کے درمیان جدائی کی تو دونوں جدا ہو گئے۔ افتراق کلام کے لیے استعمال کیا اور التفرق ابدان کے لیے استعمال کیا۔ مالکی علماء نے آیۃ الدین سے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) سے حجت پکڑی ہے۔ یہ دونوں شخص عقد کر چکے ہیں اور اس حدیث میں الوفاء بالعقود کا ابطال ہے۔ انہوں نے فرمایا: کبھی التفرق قول کی تفریق میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے عقد نکاح اور اس طلاق کا وقوع جس کو اللہ تعالیٰ نے فراق کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا (آل عمران: 105) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفترق امتی (میری امت جدا ہو جائے گی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم، ابدانہیں فرمایا۔ دار قطنی وغیرہ نے عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے شعیب کو یہ کہتے ہوئے سنا، وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: ''جو شخص کسی دوسرے سے کوئی چیز خریدے تو ان میں سے ہر ایک کو اختیار ہو گا حتیٰ کہ اپنی جگہ سے جدا ہو جائیں مگر یہ کہ خیار کا سودا ہو پس ان میں سے کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے جدا ہو جائے اس خوف سے کہ اس کا ساتھی سودا واپس نہ کر دے (1)''۔ ان علماء نے فرمایا: یہ چیز دلیل ہے کہ افتراق سے پہلے ان کے درمیان بیع مکمل ہو چکی ہے، کیونکہ سودا واپس کرنا صحیح نہیں ہوتا مگر اسی صورت میں جب بیع مکمل ہو چکی ہو۔ فرماتے ہیں: المتبایعان بالخیار (2) کا معنی ہے کہ دونوں خیار

1۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 50 2۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 213

میں برابر ہیں جب تک کہ انہوں نے عقد نہیں کیا جب دونوں نے عقد کر لیا تو اس میں خیار باطل ہو گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو انہوں نے افتراق بالکلام سے اس کی علت بیان کی ہے اس سے مراد ابدان ہیں جس طرح ہم نے سورۂ آل عمران میں بیان کیا ہے اگرچہ بعض جگہ میں افتراق بالکلام صحیح ہوتا ہے، لیکن اس جگہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ ہمیں اس کلام کے متعلق خبر دیں جس کے ساتھ اجتماع واقع ہوا اور اس کے ساتھ بیع مکمل ہو گئی کیا یہ وہ کلام ہے جس سے افتراق یا اس کے علاوہ کا ارادہ کیا گیا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ اس کے علاوہ ہے تو وہ پھر گئے اور ایسی بات لائے جو غیر معقول ہے، کیونکہ وہاں اس کلام کے علاوہ کوئی کلام تھی ہی نہیں۔ اگر وہ کہیں کہ یہ بعینہ وہ کلام ہے تو انہیں کہا جائے گا: یہ کیسے جائز ہے کہ وہ کلام جس کے ساتھ وہ جمع ہوئے اور جس کے ساتھ ان کی بیع مکمل ہو، اسی کلام کے ساتھ جدا ہوئے؟ یہ عین محال ہے اور فاسد قول ہے۔ رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہ کسی کے لیے اپنے ساتھی سے جدا ہونا حلال نہیں اس خوف سے کہ کہیں وہ سودا واپس نہ کر دے (1)۔ اس کا معنی استحباب پر محمول ہے، اگر یہ قول صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: من اقال مسلما اقالہ اللہ عثرتہ (2) (جو کسی مسلمان کو سودا واپس کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی لغزش معاف کر دے گا) اور مسلمانوں کے اجماع سے حجت پکڑی ہے کہ ظاہر حدیث کے خلاف پر ایسا کرنے والے کے لیے یہ حلال ہے اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے جدا ہو جائے تاکہ اس کی بیع کو نافذ کر دے اور وہ واپس نہ کر سکے مگر یہ کہ جب وہ چاہے اور اس وجہ سے انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے جس نے لایحل روایت کیا ہے اس کی روایت رد ہے اگر اس خبر کی وجہ استحباب نہ ہو ورنہ بالاجماع یہ باطل ہے۔ اور رہی یہ تاویل کہ المتبایعان سے مراد المتساویان ہے یہ لفظ کے ظاہر سے عدول ہے، اس کا معنی ہے ان دونوں کے عقد کے بعد انہیں اختیار ہے جب تک کہ وہ دونوں اپنی مجلس میں ہیں مگر ایسی بیع جس میں ایک اپنے ساتھی سے کہے کہ تو اختیار کر لے، پس وہ اختیار کر لے۔ ایسی صورت میں دونوں کا اختیار ختم ہو جائے گا اگرچہ وہ جدا نہ بھی ہوں۔ اگر خیار فرض کیا جائے تو معنی ہو گا: مگر بیع الخیار، پھر خیار جسموں کے ساتھ جدا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گا، اس باب کی تتمیم اختلافی کتب میں موجود ہے اور عمرو بن شعیب کے قول میں سمعت ابی یقول حدیث کی صحت کے لیے دلیل ہے۔ دار قطنی نے کہا: ہمیں ابو بکر نیساپوری نے کہا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن علی الوراق نے بیان کیا کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے کہا شعیب نے اپنے باپ سے کوئی چیز سنی ہے انہوں نے کہا: وہ کہتے تھے: مجھے میرے باپ نے بتایا میں نے پوچھا اس کے باپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے سنا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: ہاں میرا خیال ہے اس نے اس سے سنا ہے۔ دار قطنی نے کہا: میں نے ابو بکر نیساپوری کو یہ کہتے ہوئے سنا وہ عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص ہے عمرو بن شعیب کا اپنے باپ شعیب سے سماع صحیح ہے اور شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے سماع صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سچا امانت دار

1۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 150
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 134

مسلمان تاجر قیامت کے روز انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا'' (1)۔ اور تاجر کے لیے اپنے سامان کی ترویج اور تزمین کے لیے قسم اٹھانا مکروہ ہے یا سامان پیش کرتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا مکروہ ہے مثلاً وہ اس طرح کہے: صلی اللہ علی محمد! یہ کتنا عمدہ سامان ہے، اور تاجر کے لیے مستحب ہے کہ فرائض کی ادائیگی سے تجارت اسے مشغول نہ رکھے جب نماز کا وقت آجائے تو اسے تجارت کو چھوڑ دینا مناسب ہے تاکہ وہ اس آیت کے مصداق لوگوں میں سے ہو جائے۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37) (ایسے مرد جنہیں تجارت اور بیع ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرتی) مزید بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ یہ آیت اور مذکورہ احادیث صوفیاء میں سے ان لوگوں کا رد کرتی ہیں جو تجارت اور صنعت کے ذریعے خوراک حاصل کرنے کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باطل ذرائع سے مال کھانے کو حرام کیا ہے اور تجارت کے ذریعے مال کو حلال کیا ہے اور یہ بالکل واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ اس میں ایک مسئلہ ہے حضرت حسن نے کثرت پر دلالت کی بنا پر تُقَتِّلُوا پڑھا ہے۔ اس پر اہل تاویل کا اجماع ہے کہ اس آیت سے مراد بعض کے بعض کو قتل کرنے سے نہی ہے۔ پھر لفظ اپنے آپ کے قتل کو بھی شامل ہے یعنی دنیا پر حرص اور طلب مال کے لالچ میں اس کو قتل نہ کرے (2)، یعنی اپنے آپ کو ایسے دھوکوں میں نہ ڈالے جو اسے تلف تک پہنچانے والے ہوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ تنگی اور غضب میں اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ ان تمام صورتوں کو نہی شامل ہے۔ حضرت عمرو بن العاص نے اس آیت سے حجت پکڑی تھی جب انہوں نے غزوۂ ذات السلاسل میں اپنے نفس پر خوف کی وجہ سے جنبی ہونے کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل نہیں کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے احتجاج کو قائم رکھا تھا اور ان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے اور مزید کچھ نہ کہا تھا۔ اس حدیث کو ابوداؤد وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

''اور جو شخص کرے گا یوں سرکشی اور ظلم سے تو ڈال دیں گے ہم اسے آگ میں اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے''۔

ذٰلِكَ کا اشارہ قتل کی طرف ہے، کیونکہ وہ قریب مذکور ہے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا اشارہ باطل ذریعے سے مال کھانے اور قتل نفس کی طرف ہے، کیونکہ ان دونوں کے متعلق نہی متواتر آئی ہے پھر نہی کے مطابق وعید وارد ہوئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سورت کے آغاز سے جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان تمام کی طرف یہ اشارہ ہے۔ طبری نے کہا: ذٰلِكَ کا اشارہ ان چیزوں کو شامل ہے جو آخری وعید کے بعد منع کی گئی ہیں اور وہ یہ ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔

کیونکہ سورت کے آغاز میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان کے ساتھ وعید متصل ہے مگر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ

1۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 7 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 42

لَكُمْ کے قول کے بعد وعید نہیں ہے مگر یہ آیت کریمہ: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا۔

العدوان، حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں (1) اور الظلم کسی چیز کو اس کی مناسب جگہ پر نہ رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وعید کو عدوان اور ظلم کے ذکر کے ساتھ مقید فرمایا تا کہ اس سے سہو اور غلطی کا فعل نکل جائے۔ عدوان اور ظلم دونوں کا ذکر فرمایا، حالانکہ ان کے معانی قریب قریب ہیں، ان کی وجہ ان کے الفاظ کا اختلاف ہے اور کلام میں یہ حسن ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

والفی قولھا کذبا ومینا

اس جملہ میں کذبا اور مینا کا ذکر کیا، حالانکہ دونوں کا معنی جھوٹ ہے۔

اور الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے عطف عمدہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: بُعْدًا وسُحْقًا اس سے یعقوب علیہ السلام کا قول ہے اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ (یوسف: 86) لفظ کے اختلاف کی وجہ سے یہ عمدہ ہے۔

نُصْلِيْهِ۔ اس کا معنی ہے ہم اسے آگ کی گرمی مس کریں گے (2)۔ ہم ان آیات اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث کو جمع کرنے کا مفہوم نافرمانوں اور گناہ کبیرہ کرنے والوں میں بیان کیا ہے جن کے لیے وعید نافذ ہو گی پس اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اعمش اور نخعی نے نصلیہ کو نون کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ صلی نار اً سے منقول ہے یعنی میں نے اس کو گرم کیا۔ اور حدیث میں ہے: شاة مصلية۔ بھونی ہوئی بکری۔ اور جنہوں نے نون کو ضمہ دیا ان کے نزدیک ہمزہ سے منقول ہے، مثلاً طعمت اور اطعمت۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝

"اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (نامہ اعمال) سے تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں"۔

اس آیت کے ضمن میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں بڑے بڑے گناہوں سے منع فرمایا چھوٹے گناہوں سے اجتناب پر تخفیف کا وعدہ فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ گناہ چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی ہوتے ہیں۔ یہی اہل تاویل اور فقہاء کی جماعت کا نظریہ ہے، چھوٹا اور دیکھنا یقینی طور پر بڑے گناہوں سے اجتناب کے ساتھ معاف ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور اس کا قول حق ہے لیکن اس پر یہ چیز واجب نہیں۔ اس کی نظیر پہلے اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ کے ارشاد میں توبہ کی قبولیت کے بارے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے گناہوں سے اجتناب کی وجہ سے چھوٹے گناہ معاف فرما دیتا ہے لیکن ایک اور چیز بھی اجتناب کبائر کے ساتھ متصل ہو تو یہ صغیر گناہ معاف ہوں گے اور وہ ہے فرائض کا قائم کرنا۔ امام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 43-42　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 43

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ نمازیں، جمعہ سے جمعہ تک، رمضان سے رمضان تک گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جب کبائر سے اجتناب کرے (1)۔ ابو حاتم البستی نے مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر بیٹھے پھر تین مرتبہ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! (2) پھر خاموش ہو گئے ہم میں سے ہر شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم کی وجہ سے سر جھکا کر رو رہا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو بندہ پانچ نمازیں ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور سات بڑے گناہوں سے اجتناب کرے تو قیامت کے روز اس کے لیے جنت کے آٹھ دروازے کھولے جائیں گے حتیٰ کہ انہیں زور سے بند کیا جائے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ کتاب وسنت سے چھوٹے گناہوں کی تکفیر کی تائید ملتی ہے مثلاً غیر محرم کو دیکھنا اور اس کے مشابہ گناہ۔ اور سنت نے بیان فرمایا کہ تَجْتَنِبُوْا سے مراد تمام بڑے گناہوں سے کامل اجتناب نہیں ہے واللہ اعلم۔ اصولیوں نے فرمایا: کبیرہ گناہوں سے اجتناب کے ساتھ چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہونا قطعی طور پر واجب نہیں بلکہ یہ غلبہ ظن، قوت رجا پر محمول ہے اور مشیت ثابت ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والے کے لیے اور فرائض ادا کرنے والے کے لیے ہم قطعی طور پر صغیر گناہوں کے کفارہ کا حکم لگائیں تو یہ اس کے لیے اس مباح کے حکم میں ہوں گے جس میں قطعی طور پر گناہ نہیں ہوتا اور یہ شریعت میں نقص ہے۔ اور ہمارے نزدیک کوئی صغیر نہیں ہوگا۔ قشیری عبد الرحیم نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ کبائر ہیں، لیکن بعض دوسروں سے بڑے گناہ ہیں۔ تمیز نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بندہ تمام گناہوں سے اجتناب کرے۔

میں کہتا ہوں: جس نے نفس کی مخالفت کی طرف دیکھا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا تو گناہ کے چھوٹا ہونے کی طرف نہ دیکھ بلکہ تو اس کی طرف دیکھ جس کی تو نے نافرمانی کی۔ اس نسبت سے تمام گناہ بڑے ہیں اس طریقہ پر قاضی ابو بکر، استاذ ابو اسحاق اسفرائینی، ابو المعالی، ابو النصر عبد الرحیم قشیری کا کلام اسی پر محمول کیا جائے گا۔ انہوں نے فرمایا: بعض گناہوں کو دوسروں کی نسبت سے صغیرہ گناہ کہا جاتا ہے جس طرح زنا کو کفر کی نسبت صغیرہ کہا جاتا ہے بلکہ یہ تمام کبیرہ ہیں اور کفر کے علاوہ جس کے لیے وہ چاہے گا اسے معاف کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

اور انہوں نے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ کی قرأت سے بھی حجت پکڑی ہے اور بڑا گناہ شرک ہے اور علماء اصول نے فرمایا: کبائر کی صورت میں اس سے مراد کفر کی اجناس ہوگی۔ وہ آیت جس نے حکم کو مقید کیا ہے تمام مطلقات کو اس کی طرف پھیرا جائے گا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ اسی طرح علماء اصول نے مسلم وغیرہ کی اس روایت سے بھی حجت پکڑی ہے جو ابو امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آگ کو واجب کر دے گا اور اس پر جنت حرام کر دے گا''۔ ایک شخص نے عرض کی یا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 122

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 44

رسول اللہ! اگر چہ وہ حق تھوڑا سا بھی ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر چہ وہ کیکر کی چھڑی ہی ہو'' (1)۔ پس تھوڑے سے گناہ پر بھی شدید وعید آئی ہے جس طرح زیادہ گناہ پر آئی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آگ یا غضب یا لعنت یا عذاب کی وعید سنائی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں سے منع فرمایا ہے وہ تینتیس تک ہیں اور اس کی تصدیق یہ ارشاد ہے: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ۔ طاؤس نے کہا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا گناہ کبیرہ سات ہیں؟ فرمایا: یہ ستر کے قریب ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا: ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے کہا: کبیرہ گناہ سات ہیں؟ فرمایا: یہ سات سو تک ہیں ان میں بڑے سات ہیں مگر استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں اور اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی فرمایا: کبیرہ گناہ چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوی اور رحمت الٰہیہ سے قنوط اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے امن میں ہونا (2) اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، اس پر قرآن دلیل ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ گناہ کبیرہ نو ہیں اور وہ یہ ہیں (1) کسی نفس کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، محصنہ پر تہمت لگانا، جھوٹی گواہی دینا، والدین کی نافرمانی کرنا، میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، جادو کرنا اور بیت الحرام میں الحاد کرنا (3)۔ اور علماء کے نزدیک مندرجہ ذیل گناہ بھی کبائر میں سے ہیں جوا، چوری، شراب پینا، سلف صالحین کو گالی دینا، شرعی احکام سے عدول کرنا، خواہش کی اتباع کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، انسان کا اپنے والدین کو گالی دینا۔ آدمی کسی کے والدین کو گالی دیتا ہے پھر وہ اس کے والدین کو گالی دیتا ہے۔ زمین میں فساد کی کوشش کرنا۔ اس کے علاوہ بھی کثرت سے گناہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں اور احادیث میں آیا ہے جن کو ائمہ نے تخریج کیا ہے۔ مسلم نے کتاب الایمان میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے۔ کبائر کے متعلق آثار کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد اور حصر میں علماء کا اختلاف ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کبائر کے متعلق صحیح اور حسن احادیث وارد ہیں ان میں حصر اور شمار کا قصد نہیں کیا گیا ہے، لیکن بعض دوسروں کی نسبت بڑے ہیں جن کا ضرر و نقصان زیادہ ہے۔ شرک تمام کبائر سے بڑا ہے یہ وہ ہے جس کی بخشش نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص قائم فرمائی ہے اور اس کے بعد بڑا گناہ رحمت الٰہیہ سے مایوسی ہے، کیونکہ اس میں قرآن کی تکذیب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا قول حق ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (الاعراف: 156) پس جو کہتا ہے کہ وہ اسے نہیں بخشے گا تو اس نے ایک وسیع چیز کو محدود کر دیا۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہو۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَا یَایْــٴَـسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (یوسف) اس کے بعد بڑا گناہ قنوط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۝ (الحجر) اس کے بعد بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے امن میں ہونا ہے پس وہ گناہوں میں لگا رہتا ہے اور بغیر عمل کے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۝ (الاعراف) (تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ہیں اللہ کی خفیہ تدبیر سے، پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) اور فرمایا: ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 80　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 43　　3۔ ایضاً

الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (حم السجدہ) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم ہو گئے نقصان اٹھانے والوں سے) اس کے بعد بڑا گناہ کسی کو قتل کرنا ہے، کیونکہ نفس کا ضیاع اور وجود کو ختم کرنا ہے، لواطت، اس میں نسل کو ختم کرنا ہے، زنا، اس میں نسب کا اختلاط ہے، شراب پینا، اس میں عقل کا چلا جانا ہے جس پر تکلیف کا مدار ہے، نماز کا ترک کرنا اور آذان کو ترک کرنا اس میں شعائر اسلام کے اظہار کا ترک ہے، جھوٹی گواہی دینا، اس میں خونوں، شرمگاہوں اور اموال وغیرہ کا مباح کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے امور جن کا نقصان واضح ہے۔ ہر وہ گناہ جس کو شرع نے برا کہا اس پر عقاب کی دھمکی دی اور اس پر سختی فرمائی یا اس کا نقصان وجود میں زیادہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے تو وہ گناہ کبیرہ ہے اس کے علاوہ گناہ صغیرہ ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ابو عمرو اور اکثر کوفیوں نے مُّدْخَلًا کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس میں احتمال ہے کہ مصدر ہو یعنی ادخالاً اور مفعول محذوف ہے یعنی ہم تمہیں جنت میں داخل کریں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مُّدْخَلًا مکان کے معنی میں ہو، تو اس صورت میں مفعول ہوگا۔ اہل مدینہ نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دخل کا مصدر ہو اور فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ندخلکم فتدخلون مدخلاً اور کلام اس پر دلیل ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اسم مکان ہو پھر اس کو نصب مفعول بہ کی حیثیت سے ہوگی یعنی ہم تمہیں معزز جگہ یعنی جنت میں داخل کریں گے۔ یہ ابو سعید بن اعرابی نے کہا: میں نے ابوداؤد بجستانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابو عبد اللہ احمد بن حنبل کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مسلمان تمام جنت میں جائیں گے، میں نے پوچھا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ۝ یعنی اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (نامہ اعمال) سے تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں یعنی جنت میں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ذخیرہ کیا ہے" (1)۔ جب اللہ تعالیٰ کبائر کے علاوہ معاف فرمادے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبیرہ گناہوں کی سفارش کریں گے تو پھر مسلمانوں پر کون سا گناہ باقی رہے گا۔ اور ہمارے علماء نے فرمایا: اہل سنت کے نزدیک کبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے ہر اس شخص کے لیے جو موت سے پہلے انہیں ترک کر دے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور مسلمانوں میں سے جو ان پر مرے گا اسے بھی بخش دیا جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ یعنی شرک کے علاوہ گناہ معاف فرمادے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہوں پر مرا ہو اگر موت سے پہلے توبہ کرنے والا مراد ہو تو پھر شرک اور دوسرے گناہوں میں فرق کا کوئی معنی نہیں رہے گا، کیونکہ شرک سے توبہ کرنے والے کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے فرمایا: سورۂ نساء کی پانچ آیات ایسی ہیں جو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں (1) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ (2) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ

1۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 4، صفحہ 282، دار المسیرہ بیروت

يُشْرَكَ بِهٖ (۳) وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (۴) وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا (۵) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ۔ ابن عباس نے فرمایا: سورۂ نساء میں آٹھ آیات ہیں جو اس امت کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن پر سورج طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے (۱) يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ (۲) وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ (۳) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (۴) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ (۸) مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ (الآیۃ)

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۳۲

"اور نہ آرزو کرو اس چیز کی بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر، مردوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا، اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور مانگتے رہو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (وکرم) کو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مرد جہاد کرتے ہیں اور عورتیں جہاد نہیں کرتی ہیں، ہمارے لیے نصف میراث ہے (اس کی کیا حکمت ہے؟) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ اور مجاہد نے کہا: اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الخ (الاحزاب:35) اور حضرت ام سلمہ پہلی سفر کرنے والی عورت تھی جو مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آئی تھی۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث مرسل ہے، بعض نے اس حدیث کو ابن ابی نجیح عن مجاہد کے سلسلہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ حضرت ام سلمہ نے اس طرح کہا ہے (1)۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں لوگ عورتوں اور بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے، جب انہیں وارث بنایا گیا تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصوں کے برابر حصہ رکھا گیا عورتوں نے خواہش کی کہ کاش ان کے حصے بھی مردوں کے حصوں کی طرح ہوتے اور مردوں نے کہا: ہم امید کرتے ہیں کہ آخرت میں ہماری نیکیوں کی وجہ سے ہمیں عورتوں پر فضیلت دی جائے گی جس طرح میراث میں ہمیں ان پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَمَنَّوْا، التمنی ارادہ کی ایک قسم ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے جس طرح التلھف اس کی ایک قسم ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو التمنی (آرزو) سے منع فرمایا،

1۔ جامع الترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127

کیونکہ اس میں تعلق خاطر ہے اور موت کو بھولنا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اس تمنی کی نہی میں رشک داخل ہے یا نہیں؟ رشک یہ ہے کہ ایک شخص خواہش کرے کہ اس کے پاس فلاں آدمی جیسی حالت ہو اگرچہ اس سے اس حالت کے زوال کی خواہش نہ کرے۔ جمہور علماء رشک کی اجازت دیتے ہیں مثلاً امام مالک وغیرہ اور بعض علماء کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: لاحسد الا فی اثنتین (1) رشک نہیں ہے مگر دو شخصوں میں ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن عطا فرمایا ہو وہ اسے دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو وہ اسے دن، رات کے اوقات میں اس سے لوگوں کو نفع دیتا ہو۔ اور لاحسد کا معنی ہے کوئی رشک ان دو امور میں رشک سے اعظم و افضل نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس مفہوم پر متنبہ کیا ہے، کیونکہ انہوں نے باب ان الفاظ میں باندھا ہے باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ مہلب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا جو تمنا جائز نہیں ہے اور یہ دنیا کے ساز و سامان کی خواہش کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اعمال صالحہ کی تمنا یہ اچھی چیز ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ پر تمنا کرے مگر اپنی تمنا کو ایسی چیزوں سے نہ ملائے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے تو یہ جائز ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں موجود ہے: وَدِدْتُ ان أُحْيَا ثم أُقتل میں خواہش کرتا ہوں کہ میں زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔

میں کہتا ہوں: حدیث جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب التمنی میں ذکر کی ہے وہ خیر کی تمنا نیک افعال اور ان میں رغبت پر دلیل ہے اس میں نیکی کے تمام اعمال پر شہادت کی فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی تمنا کی، کسی دوسری چیز کی تمنا نہ کی، یہ شہادت کا بلند مرتبہ ہے اور اہل شہادت کی کرامت و عزت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے شہادت عطا فرمائی تھی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خیبر کا کھانا زہر کی تکلیف کو مجھ پر لوٹاتا ہے یہ وہ وقت ہے کہ میری رگ جان (اس کی وجہ سے) کٹ گئی۔ اور صحیح میں ہے شہید کو کہا جائے گا تو تمنا کر، پس وہ کہے گا: میں تمنا کرتا ہوں کہ میں دنیا کی طرف لوٹ جاؤں حتیٰ کہ تیرے راستہ میں دوبارہ شہید کیا جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے ایمان اور ابولہب اور قریش کے سرداروں کے ایمان کی تمنا کرتے تھے، حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ہائے میرا شوق ان بھائیوں کی طرف جو میرے بعد آئیں گے مجھ پر ایمان لائیں گے جب کہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ یہ تمام احادیث دلیل ہیں کہ ایسی تمنا سے منع نہیں کیا گیا جو حسد اور بغض کی داعی نہ ہو۔ اور اس آیت میں جس تمنا سے نہی کی گئی ہے وہ اسی قبیل سے ہے اور اس میں وہ تمنا داخل ہے جس میں انسان دوسرے کی حالت کی تمنا کرتا ہے خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے ہو اور ساتھ یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمت دوسرے سے چھن جائے، برابر ہے تو نے اس کے ساتھ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ چیز لوٹ آئے یا نہیں۔ یہ بعینہ حسد ہے اس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے ارشاد فرمایا: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے) اور اس میں داخل ہے اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح بھیجنا، یا اس کی بیع پر بیع کرنا، کیونکہ یہ حسد اور ناراضگی کی داعی ہے۔ بعض علماء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 272

رشک کو بھی مکروہ کہا ہے ان کے نزدیک یہ بھی نہی میں داخل ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دینے والا ہے۔ ضحاک نے کہا: کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کے مال کی تمنا کرے کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں سنا جنہوں نے کہا تھا: یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ...... وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ (القصص: 79 تا 82) (اے کاش ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ وجلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو　اور صبح کی ان لوگوں نے جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے۔ جب اسے زمین میں اپنے محل اور مال کے ساتھ دھنسا دیا گیا۔ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا (القصص: 82) اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا۔

کلبی نے کہا: کوئی شخص اپنے بھائی کے مال، عورت، خادم اور سواری کی تمنا نہ کرے بلکہ اسے یوں کہنا چاہیے: یا اللہ! مجھے بھی اس کی طرح یہ نعمتیں عطا فرما۔ اسی طرح تورات میں ہے اور اسی طرح قرآن میں ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی کے مال اور اہل کی تمنا سے منع فرمایا ہے اور اپنے مومنین بندوں کو حکم فرمایا کہ اس کا فضل اس سے طلب کرو۔ اور جمہور کی حجت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''دنیا چار افراد کے لیے ہے ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا ہو پھر وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا ہو اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس میں حق جانتا ہو یہ افضل ترین مرتبہ ہے، دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہو اور مال عطا نہ فرمایا ہو پس وہ سچی نیت سے یہ کہتا ہو: ''اگر میرے لیے مال ہوتا تو میں فلاں کی طرح اسے خرچ کرتا پس اس کی اس نیت کی وجہ سے دونوں کا اجر برابر ہوگا'' (1)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ حسن نے کہا: تم میں سے کوئی مال کی تمنا نہ کرے اسے کیا معلوم کہ اس کی ہلاکت اس میں ہو۔ یہ اس صورت میں صحیح ہے جب وہ دنیا کے لیے تمنا کرے۔ مگر جب وہ کسی خیر کے لیے تمنا کرے تو شریعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے پس بندہ تمنا کرے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے رب کا قرب حاصل کرے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا اس سے مراد ثواب اور عقاب ہے۔ وَ لِلنِّسَآءِ اسی طرح عورتوں کے لیے ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ عورت کے لیے بھی ایک نیکی کا بدل دس نیکیاں ہیں جس طرح مردوں کے لیے ایک نیکی کا بدل دس نیکیاں ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد میراث ہے۔ اس قول کے مطابق اکتساب بمعنی الاصابۃ ہوگا۔ مرد کے لیے حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بنا پر تمنا سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں حسد کے دواعی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مصالح کو زیادہ جانتا ہے پس اس نے ان کے مصالح کو جانتے ہوئے ان کے درمیان میراث کی تقسیم میں فرق رکھا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو وہ سوال کرنے کو پسند فرماتا ہے اور افضل عبادت کشادگی کا انتظار

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد عن رسول اللہ، جلد 2، صفحہ 56

کرنا ہے"۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے"(1)۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کا حکم واجب ہے۔ بعض علماء نے اس معنی کو لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

الله يغضب إن تركت سؤاله　　وبني آدم حين يُسال يَغضبُ

اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے اور انسان سے جب سوال کیا جاتا ہے تو ناراض ہوتا ہے۔

احمد بن المعذل ابوالفضل الفقیہ المالکی نے کیا خوب کہا ہے:

أَلتمِس الأرزاقَ عندَ الذي　　مادُونَه إن سِيلَ مِن حاجِبِ

مَنْ يُبغِض التاركَ تَسْآلَهُ　　جوداً ومن يَرضَى عن الطالبِ

ومَنْ إذا قال جَرَى قولُه　　بغير تَوْقِيعٍ إلى كاتبِ

ہم نے اپنی کتاب "قمع الحرص بالزهد والقناعة" میں اس کے قریب مفہوم میں کلام ذکر کی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی عبادت کا سوال کرو۔ فضل سے مراد امر دنیا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد پسندیدہ عمل کی توفیق طلب کرنا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں: اپنے رب سے سوال کرو حتیٰ کہ سیر ہو کر کھانے کا بھی اسی سے سوال کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر وہ عطا نہیں فرمائے گا تو کبھی بھی میسر نہ آئے گا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سوال کا حکم نہیں دیا مگر اس لیے کہ وہ عطا کرے۔

کسائی اور ابن کثیر نے وَسَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ پڑھا ہے یعنی تمام قرآن میں بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے وَسْئَلُوا اللّٰهَ اس کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہے مگر تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

"اور ہر ایک کے لیے بنا دیئے ہیں ہم نے وارث اس مال سے جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد و پیمان تو دو انہیں ان کا حصہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے"۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہر انسان کے ورثاء اور موالی ہیں، ہر ایک کو اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے اس کے لیے تقسیم فرمایا ہے اور غیر کے مال کی خواہش نہ کرے۔ بخاری نے کتاب الفرائض میں حضرت سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا...... الخ کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کے تحت فرمایا مہاجرین جب مدینہ طیبہ آئے تو انصار کا مہاجر وارث ہوتا تھا، حالانکہ وہ اس کا ذی محرم نہیں ہوتا

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن الرسول، جلد 2، صفحہ 173

تھا۔ یہ اس اخوت کی وجہ سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان قائم فرمائی تھی پھر جب لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کی آیت نازل ہوئی تو اسے وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ سے منسوخ کر دیا (1)۔ ابو الحسن بن بطال نے کہا: تمام نسخوں میں یہی ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ کو وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ نے منسوخ کر دیا جب کہ صحیح یہ ہے کہ ناسخ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ ہے اور منسوخ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ ہے۔ اس طرح طبری نے اپنی روایت میں ذکر کیا ہے۔

سلف جمہور سے مروی ہے کہ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ کو منسوخ کرنے والی آیت 75 سورۂ انفال میں ہے وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ یہ انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے۔ ابو عبیدہ نے اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں اسی چیز کو ثابت کیا ہے۔ اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جسے زہری نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے فرمایا: جن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے بیٹوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اپنے متبنیٰ بنایا تھا اور اسلام میں وہ وارث بنتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ وصیت میں ان کے لیے حصہ مقرر کرو اور میراث کو اللہ تعالیٰ نے ذوی الرحم اور عصبہ ورثاء کی طرف لوٹا دیا۔ ایک جماعت نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا کہ اپنے حلیفوں کو نصرت ونصیحت وغیرہ کے اعتبار سے کچھ دو اور ان کے لیے وصیت کرو جب کہ میراث ختم ہو چکی ہے۔ یہ مجاہد اور سدی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور یہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے اور نسخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جمع کرنا ممکن ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا جو طبری نے ذکر کیا ہے۔ بخاری نے یہ مفہوم ''کتاب التفسیر'' میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ذوی الارحام کی میراث کا ذکر سورۂ انفال میں آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ کل کا لفظ عرب کلام میں احاطہ اور عموم کے لیے استعمال ہوتا ہے جب یہ مفرد آئے تو تمام نحویوں کے نزدیک یقیناً کلام میں حذف ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے قبل اور بعد کی طرح مررت بکل جائز قرار دیا حذف کی تقدیر یہ ہوگی۔ ولکل احدٍ جعلنا موالی۔ یعنی ورثاء بنائے۔ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلف کے ساتھ عہد وپیمان باندھتے ہیں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص کسی سے عہد وپیمان کرتا تھا اور کہتا تھا: میرا خون، تیرا خون، مدد ونصرت میں ہم ایک چیز ہوں گے اور میرا بدلہ اور تیرا بدلہ ایک ہوگا، میری جنگ اور تیری جنگ ایک ہوگی، میری صلح اور تیری صلح ایک ہوگی، تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہوں گا، تو میری وجہ سے طلب کیا جائے گا میں تیری طرف سے طلب کیا جاؤں گا، تو میری طرف سے دیت دے گا میں تیری طرف سے دیت دوں گا، پس حلیف کو اپنے دوسرے حلیف کی میراث میں چھٹا حصہ ملتا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ موالی کا لفظ مشترک ہے کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ آزاد کرنے والا، آزاد کیا گیا، آزاد کرنے والے کو مولی اعلیٰ اور آزاد کیے گئے کو مولی اسفل کہا جاتا ہے۔ مددگار کو بھی مولی کہا جاتا ہے: وَأَنَّ الْكٰفِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ ○

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 999

(محمد) یعنی کافروں کا کوئی مددگار نہیں۔ چچا کے بیٹے کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ پڑوسی کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ۔ اس سے مراد عصبہ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "فرائض سے جو بچ جائے وہ قریبی مذکر عصبہ کے لیے ہے"(1) اور عصبات میں سے مولی اعلیٰ ہے، نہ کہ مولی اسفل۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے، کیونکہ معتق (آزاد کرنے والا) معتق (آزاد کیا گیا) پر انعام کرنے والا ہے جیسے اس کا موجد ہے اس معنی کی وجہ سے اس کو میراث کا حق دیا جاتا ہے۔

طحاوی نے حسن بن زیاد سے روایت کیا ہے کہ مولی اسفل، مولی اعلی کا وارث ہوگا اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے کہ ایک شخص نے اپنا غلام آزاد کیا، پھر آزاد کرنے والا فوت ہو گیا اور اس نے اپنے آزاد کیے گئے غلام کے علاوہ کوئی وارث نہ چھوڑا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی میراث اس کے آزاد کردہ غلام کو دے دی(2)۔ امام طحاوی نے فرمایا: اس حدیث کی کوئی معارض حدیث نہیں ہے، پس اس پر عمل واجب ہے، کیونکہ جب آزاد کرنے والے کے لیے میراث کا ثابت کرنا ممکن ہے اس تقدیر پر کہ وہ اس کے لیے موجد کی طرح ہے تو وہ باپ کے مشابہ ہے اور مولی اسفل، بیٹے کے مشابہ ہے یہ چیز میراث میں برابری کا تقاضا کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اتصال عام ہوتا ہے اور حدیث میں ہے قوم کا مولی، ان میں سے ہے۔ اور جنہوں نے اس کی مخالفت کی وہ جمہور علماء ہیں وہ فرماتے ہیں: میراث قرابت کا تقاضا کرتی ہے اور یہاں کوئی قرابت نہیں ہے، مگر ہم نے معتق پر انعام کے حکم کی وجہ سے معتق کے لیے میراث کو ثابت کیا ہے اور انعام کا مقابلہ، مجازاۃ کا تقاضا کرتا ہے اور یہ مولی اسفل میں منعکس نہیں ہوتا۔ رہا بیٹا تو وہ سب لوگوں سے زیادہ میراث کا مستحق ہے، کیونکہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اس کے قائم مقام ہوتا ہے اور معتق اس کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے معتق (آزاد کرنے والا) کے قائم مقام ہو، معتق نے اس پر انعام کیا ہوتا ہے پس شرع نے اسے معتق کی میراث کا حق دار بنا دیا۔ پس یہ صفت مولی اسفل (آزاد کردہ غلام) میں نہیں پائی جاتی۔ پس ان کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ علی بن کبشہ نے حمزہ سے روایت کیا ہے عقدت یعنی کثرت پر دلالت کرنے کے لیے قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ سے مشہور قرأت عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ (قاف کی تخفیف) کے ساتھ ہے۔ یہی قرأت عاصم اور کسائی کی ہے۔ یہ قرأت بعید ہے، کیونکہ عہد و پیمان نہیں ہوتا مگر دو یا زیادہ شخصوں کے درمیان پس اس کا باب فاعل ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: حمزہ کی قرأت عربی میں غموض پر تجوز ہے اس تقدیر میں وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد قسم اٹھانا اور پختہ عہد و پیمان ہوگا۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اس کی تقدیر یوں ہوگی عقدت لهم ایمانکم الحلف۔ پھر لام کو حذف کیا گیا ہے جس طرح کہ اس ارشاد میں ہے: وَاِذَا كَالُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی كَالُوْهُمْ اور دوسرے مفعول کو حذف کیا گیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: کلتك یعنی کلت لک پر مفعول اول حذف کیا گیا، کیونکہ وہ صلہ میں متصل ہے۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2657

2۔ جامع ترمذی، کتاب الفرائض عن رسول اللہ، باب میراث العصبہ، حدیث نمبر 2024، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ان کے ساتھ عہد و پیمان دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ وفا کو پسند کرتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾

"مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر، اس وجہ سے کہ فضیلت دی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت و آرام کے لیے) تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں، حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (مردوں کی) غیر حاضری میں اللہ کی حفاظت سے اور وہ عورتیں اندیشہ ہو تمہیں جن کی نافرمانی کا تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور (پھر) الگ کردو انہیں خواب گاہوں سے اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو انہیں پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تمہاری تو نہ تلاش کرو ان پر (ظلم کرنے کی) راہ یقینا اللہ تعالیٰ (عظمت و کبریائی میں) سب سے بالا سب سے بڑا ہے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی مرد عورتوں کا خرچ اٹھاتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں اسی طرح مردوں میں حکام، امراء اور جہاد کرنے والے ہوتے ہیں، جب کہ یہ فرائض عورتوں پر نہیں۔ کہا جاتا ہے قوام و قیم (نگران)۔ یہ آیت حضرت سعد بن ربیع کے حق میں نازل ہوئی ان کی بیوی حضرت حبیبہ بنت زید بن خارجہ بن ابی زہیر نے نافرمانی کی تو انہوں نے اسے طمانچہ مارا، حضرت حبیبہ کے والد نے عرض کی: یارسول اللہ! میں نے اپنی بیٹی سعد کو دی، اس نے اسے طمانچہ مارا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اپنے خاوند سے قصاص لے، وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس لوٹی تاکہ اپنے خاوند سے قصاص لے"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوٹ آؤ میرے پاس جبریل آیا ہے"۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم نے ایک امر کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے امر کا ارادہ فرمایا"۔ دوسری روایت میں ہے: "میں نے ایک چیز کا ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا وہ بہتر ہے"۔ آپ نے پہلا حکم ختم کردیا(1)۔

بعض علماء نے فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤى اِلَیْكَ وَحْیُهٗ (طٰہٰ: 114) اسی حکم کے بارے میں نازل ہوا۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا اور فرمایا: حجاج بن منہال اور عارم بن فضل نے ہمیں بتایا۔ یہ الفاظ حجاج بن منہال کے

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 144

ہیں۔ فرمایا: ہمیں جریر بن حازم نے بتایا فرمایا میں نے حسن کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: میرے خاوند نے میرے چہرے پر مارا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے درمیان قصاص ہوگا“۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤى اِلَیْكَ وَحْیُهٗ۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ ابوروق نے کہا: یہ جمیلہ بنت ابی اور ان کے خاوند ثابت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی۔ کلبی نے کہا: یہ عمیرہ بنت محمد بن مسلمہ اور اس کے خاوند سعد بن ربیع کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا سبب ام سلمہ کا پہلا قول ہے۔ وجہ النظم یہ ہے کہ عورتوں نے میراث میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کے بارے میں بات کی تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَمَنَّوْا، پھر اللہ تعالیٰ نے میراث میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کو بیان فرمایا، کیونکہ مردوں پر مہر اور خرچ کی ذمہ داری ہے پھر مردوں کی فضیلت کا فائدہ عورتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مردوں کو عقل اور تدبیر میں زائد فضیلت حاصل ہے، پس مردوں کو عورتوں پر قیام کا حق دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفس اور طبع میں مردوں کے لیے زیادہ قوت ہے، جو عورتوں میں نہیں ہے، کیونکہ مردوں کی طبیعت پر حرارت اور سختی غالب ہے، پس اس میں قوت اور شدت ہوگی جب کہ عورتوں کی طبیعت میں رطوبت اور برودت غالب ہے، پس اس میں نرمی اور ضعف کا معنی ہوگا۔ پھر مردوں کے لیے عورتوں پر قیام کا حق اسی لیے رکھا گیا۔ اور دوسری وجہ یہ ارشاد ہے: وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مرد، عورتوں کو ادب سکھائیں۔ جب وہ مردوں کے حقوق کی حفاظت کریں تو پھر مرد کو ان کے ساتھ غیر مناسب طرز معاشرت نہیں اپنانا چاہیے۔ قوام، فعال کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا مطلب ہے کسی چیز کی نگرانی کرنا، خود اس چیز میں غور و فکر کرنا اور اجتہاد کے ساتھ اس چیز کی حفاظت کرنا، پس مردوں کا عورتوں پر قیام اس حد تک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تدبیر، تادیب، گھر میں انہیں روکے رکھنے اور زیب و زینت ظاہر کرنے سے منع کرنا ہے اور عورت پر مرد کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کو قبول کرنا ہے جب تک کہ معصیت نہ ہو، اس کی علت فضیلت، نفقہ، امر جہاد میں قوت و عقل، میراث، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے ہے۔ بعض نے تفضیل میں داڑھی کی رعایت کی ہے حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں ہے، کیونکہ کبھی داڑھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسری صفت نہیں ہوتی جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، اس کا رد سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ کے ارشاد سے علماء نے یہ سمجھا کہ جب مرد اس کے خرچہ سے عاجز ہوگا تو اس پر قوام نہیں ہوگا اور جب قوام نہیں ہوگا تو عورت کے لیے عقد کا فسخ کرنا جائز ہوگا، کیونکہ وہ مقصود زائل ہے جس کے لیے نکاح مشروع کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ نفقہ اور لباس سے عاجزی کے وقت نکاح کو فسخ کرنے کا ثبوت ہے۔ یہی امام مالک و امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ نے کہا: ایسی صورت میں نکاح فسخ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ (بقرہ: 280) اس پر کلام اسی سورت میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ یہ تمام خبر ہے اس سے مقصود خاوند کی

اطاعت، اس کے مال کے حق کو قائم کرنے اور خاوند کی عدم موجودگی میں اپنے نفس کی حفاظت کرنے کا حکم ہے۔ مسند ابی داؤد طیالسی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''بہتر عورت وہ ہے جسے جب تو دیکھے تو تجھے وہ خوش کرے، جب تو اسے حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس سے غائب ہو تو وہ اپنی عصمت کی اور تیرے مال کی حفاظت کرے''۔ فرمایا: پھر یہ آیت تلاوت کی: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ... الخ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: ''کیا میں تجھے مرد کے خزانہ میں سے بہتر چیز نہ بتاؤں، وہ نیک صالحہ بیوی ہے جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کرے، جب وہ اسے حکم دے تو وہ اطاعت کرے، جب وہ اس سے غائب ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے'' (1)۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: کیا میں تجھے اس بہترین چیز کے بارے میں نہ خبر دوں ایک مرد جسے خزانہ کرتا ہے؟ وہ صالح عورت ہے الخ، پھر سابقہ حدیث ذکر کی۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں فالصوالح قوانت حوافظ کے الفاظ ہیں۔ یہ وزن مؤنث کے ساتھ مختص ہیں۔ ابن جنی نے کہا: جمع مکسر از روئے لفظ کے معنی کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ وہ کثرت کا معنی دیتی ہے اور یہاں یہی مقصود ہے۔ اور بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ میں ما مصدریہ ہے یعنی بحفظ الله لهن۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ما بمعنی الذی ہو اور حفظ میں عائد ضمیر منصوب ہوگی۔ اور ابو جعفر کی قرأت میں بما حفظ الله (2) اسم جلالت نصب کے ساتھ ہے۔ نحاس نے کہا: رفع زیادہ واضح ہے یعنی حافظات لمغیب ازواجهن بحفظ الله و معونته و تسدیده وہ اپنے خاوندوں کی غیر حاضری کے وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت، معونت اور درستگی کے ساتھ حفاظت کرنے والی ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: بما حفظهن الله فی مهورهن وعشرتهن، یعنی اللہ ان کی حفاظت کرتا ہے ان کے مہور میں اور معاشرت میں۔ بعض علماء نے اس کا معنی یہ کیا ہے: بما استحفظهن الله ایاه من اداء الامانات الی ازواجهن۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے خاوندوں تک ان کی امانات کی ادائیگی کے لیے ان عورتوں کی حفاظت کی اور نصب کی قرأت کا معنی یہ ہے: بحفظهن الله۔ یعنی انہوں نے اللہ کے امر اور دین کی حفاظت کرنے کی وجہ سے۔ بعض نے یہ تقدیر بیان کی بما حفظن الله پھر فعل واحد ذکر کیا گیا جس طرح کہا گیا ہے: فان الحوادث أودى بها۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے بحفظ اللہ جیسے حفظتُ الله۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ، الّٰتِیْ، التی کی جمع ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تَخَافُوْنَ کا معنی علم اور یقین ہے۔ بعض نے فرمایا: اپنے معنی خوف پر ہے۔ النشوز کا معنی نافرمانی ہے۔ یہ النشز سے ماخوذ ہے۔ النشز زمین کی بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نشز الرجل ینشز جب کوئی بیٹھا ہو پھر سیدھا کھڑا ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ: 11) یعنی اٹھو اور جنگ کی طرف یا اللہ کے امور میں سے کسی امر کی طرف اٹھو۔ معنی یہ ہے کہ تمہیں ان کی نافرمانی کا خوف ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان پر خاوندوں کی اطاعت واجب کی تھی اس کے ادا نہ کرنے کا خوف ہو۔ ابو منصور اللغوی نے کہا: النشوز کا معنی ہے میاں، بیوی میں سے ہر ایک کا دوسرے کو ناپسند کرنا۔ کہا جاتا ہے: نشزت تنشز فهی ناشز (بغیر تاء کے) نشصت تنشص یہ معاشرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 423

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 47، دار الکتب العلمیہ بیروت

کے لیے برائی ہے۔ ابن فارس نے کہا: نشزت المرأۃ یعنی عورت نے اپنے خاوند پر سختی کی اور نشز بعلھا علیھا جب خاوند عورت کو مارے اور ظلم کرے۔ ابن درید نے کہا: نشزت المرأۃ ونشست ونشصت کا ایک معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِظُوْهُنَّ یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ انہیں نصیحت کرو یعنی انہیں خاوند کے ساتھ حسن صحبت اور حسن معاشرت میں سے جو ان پر اللہ نے واجب کیا ہے وہ انہیں یاد دلاؤ اور انہیں خاوند کا وہ بلند مرتبہ کا اعتراف کراؤ جو اللہ نے اسے ان پر عطا فرمایا ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو خاوند کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا'' اور فرمایا: ''عورت اپنے خاوند کو اپنے پاس آنے سے نہ روکے اگرچہ وہ پالان پر ہی ہو''۔ اور فرمایا: ''جو عورت اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑ کر رات گزارتی ہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں''۔ ایک روایت میں ہے ''حتیٰ کہ وہ واپس آ جائے اور اپنا ہاتھ اپنے خاوند کے ہاتھ میں رکھ دے۔ اور ایسا کام کرے جو اس کی مثل ہو''۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ ابن مسعود اور نخعی وغیرہما نے فی المضجع پڑھا ہے گویا اسم جنس ہے جو جمع کا مفہوم دیتا ہے۔ الھجر فی المضاجع کا مطلب ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہم بستر ہو اور پیٹھ پھیر کر سوئے اور اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کرے۔ یہ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ اور مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے ان کے بستروں سے دور ہو جاؤ۔ اس کلام پر حذف مقدر ہو گا اور اس کی تائید اهْجُرُوْهُنَّ کا لفظ کرتا ہے جو الھجران سے مشتق ہے جس کا معنی دوری ہے۔ کہا جاتا ہے: ہجرہ اس سے دور ہو جا اور اس سے علیحدہ ہو جا اور دور ہونا ممکن نہیں مگر ان کا بستر چھوڑنے کے ساتھ۔ یہ معنی ابراہیم نخعی، شعبی، قتادہ اور حسن بصری نے بیان کیا ہے۔ اور یہی معنی ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن عربی نے اس کو پسند کیا ہے۔ ان علماء نے امر کو اکثر اور مکمل معنی پر محمول کیا یہ اس طرح ہو گا جیسے تو کہتا ہے: اھجرہ فی اللہ۔ اللہ کے لیے اس کو چھوڑ دے۔ یہ امام مالک کی اصل ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول عمدہ ہے۔ خاوند جب اس کے بستر سے اعراض کرے گا پھر اگر عورت کو خاوند سے محبت ہو گی تو اس پر یہ چیز شاق ہو گی اور وہ اصلاح کی طرف لوٹ آئے گی اگر وہ بغض رکھنے والی ہو گی تو اس سے نافرمانی ظاہر ہو گی پھر ظاہر ہو گا کہ نشوز (نافرمانی) اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اهْجُرُوْهُنَّ یہ الھجر سے مشتق ہے اور اس سے مراد قبیح کلام ہے یعنی کلام میں ان سے سختی کرو اور جماع وغیرہ کے لیے ان سے ہم بستر ہو۔ یہ معنی سفیان نے بتایا فرمایا: یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کو ان کے گھروں میں پابند کر دو۔ یہ ان کے قول ھجر البعیر سے مشتق ہے یعنی رسی کے ساتھ اونٹ کو باندھ دیا۔ الھجار اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اونٹ کو باندھا جاتا ہے۔ یہ طبری کا مختار مذہب ہے اور انہوں نے تمام کلام پر جرح کی ہے اور ان کے کلام میں اس جگہ نظر (اعتراض کی گنجائش) ہے۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے ''احکام'' میں ان کا رد کیا ہے اور کہا ہائے قرآن وسنت کے عالم کی لغزش! اور اس مفہوم پر جس حدیث نے انہیں ابھارا وہ غریب حدیث ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق، حضرت زبیر بن عوام کی بیوی تھی

وہ باہر نکلی تھی حتیٰ کہ انہیں عتاب کیا گیا فرمایا: حضرت زبیر بن عوام نے اسے اور اس کی سوکن کو عتاب کیا پھر ایک کے بال دوسری کے بالوں کے ساتھ باندھ دیئے پھر انہیں سخت سزا دی سوکن بہت زیادہ بچنے والی تھی اور اسماء زیادہ بچنے والی نہ تھی پس اسے ضربیں بھی زیادہ لگیں۔ حضرت اسماء نے اپنے باپ حضرت ابوبکر سے شکایت کی، حضرت ابوبکر نے اسے کہا: اے بیٹی! صبر کر زبیر صالح آدمی ہے شاید تیرا خاوند جنت میں ہوگا، اور مجھے خبر پہنچی ہے کہ جب مرد بیوی سے ابتکار کرتا ہے تو جنت میں اس سے نکاح کرے گا۔ پس اهْجُرُوْهُنَّ کا ان علماء نے ربط اور عقد (باندھنا) معنی لیا کیونکہ لفظ میں احتمال تھا اور ساتھ ساتھ حضرت زبیر کا فعل تھا تو اس نے یہ تفسیر بیان کر دی۔ اور ان کے بستر کو چھوڑنے کا زیادہ سے زیادہ عرصہ علماء کے نزدیک ایک مہینہ ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے راز کی بات کی تھی تو انہوں نے حضرت عائشہ کو بتا دی تھی اور انہوں نے اس پر ایکا کر لیا تھا اور ان چار مہینوں تک یہ چھوڑنا نہ پہنچے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایلاء کی مدت بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاضْرِبُوْهُنَّ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مرد عورت کی اصلاح کے لیے پہلے انہیں وعظ و نصیحت کرے، پھر اس کے بستر سے جدا ہو جائے پھر اگر یہ دونوں صورتیں کارگر نہ ہوں تو پھر مارنا ہے، کیونکہ یہ چیز اس کے لیے اس کی اصلاح کرے گی اور اسے اس کا حق پورا کرنے پر ابھارے گی اور اس آیت میں مارنے سے مراد اس طرح مارنا ہے کہ وہ زخمی نہ کر دے اور وہ اس کی ہڈی نہ توڑ دے اور نہ زخم سے اس کو عیب لگا دے جیسے مکا مارنا وغیرہ، کیونکہ اس سے مقصود اصلاح ہے (نہ کہ اسے زخمی کرنا ہے) پس جب وہ اسے اتنی سزا دے گا کہ اسے ہلاک کر دے تو اس پر ضمانت واجب ہوگی۔ اور اسی طرح بچے کو تعلیم دینے اور ادب سکھانے میں سزا کا حکم ہے۔ صحیح مسلم میں ہے: ''عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امانت سے تم نے انہیں حاصل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کے ساتھ ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے بستر پر کسی کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو اگر وہ ایسا کریں تو انہیں سزا دو مگر ایسی نہیں جو زخمی کر دے'' (1)۔ امام مسلم نے حضرت جابر کی طویل حدیث کتاب الحج میں ذکر کی ہے یعنی وہ تمہارے گھروں میں ایسے رشتہ داروں اور اجنبی عورتوں کو داخل نہ کریں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اسی مفہوم پر اس روایت کو محمول کیا جائے گا جو امام ترمذی نے عمرو بن الاحوص سے روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ وہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر وعظ و نصیحت فرمائی پھر فرمایا: ''عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت حاصل کرو، کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں اس کے علاوہ تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو مگر یہ کہ وہ واضح برائی کا ارتکاب کریں، اگر وہ ایسا کریں تو ان کے بستروں سے جدا ہو جاؤ اور انہیں مارو مگر ایسی مار جو زخمی نہ کر دے۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پھر انہیں اذیت دینے کی راہ تلاش نہ کرو۔ خبردار تمہارے لیے تمہاری عورتوں پر حقوق ہیں اور تمہاری عورتوں کے لیے تم پر حقوق ہیں، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے گھروں میں ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور انہیں تمہارے گھروں میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 397

اجازت نہ دیں جنہیں تم اچھا نہیں سمجھتے۔ خبردار ان کا حق تم پر یہ ہے کہ لباس اور طعام کے سلسلہ میں تم ان سے حسن سلوک کرو"(1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو گھر میں داخل نہ کریں جن کو ان کے خاوند ناپسند کرتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اس سے مراد زنا نہیں ہے، کیونکہ زنا تو حرام ہے اور اس پر حد لازم ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کو مارو جب وہ کسی نیکی میں تمہاری نافرمانی کریں لیکن وہ مار زخمی کرنے والی نہ ہو"۔ عطا نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: نہ زخمی کرنے والی سزا کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: مسواک وغیرہ سے مارنا (2)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اپنی بیوی کو مارا تو انہیں اس سے منع کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مرد جو اپنی بیوی کو سزا دیتا ہے اس کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ یعنی وہ نافرمانی چھوڑ دیں۔ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا یعنی قول یا فعل کے ساتھ ان پر زیادتی نہ کرو۔ یہ ان پر ظلم کرنے سے نہی ہے اس کے بعد کہ ان پر مردوں کی فضیلت کو ثابت فرمایا اور ان کو ادب سکھانے کی قدرت عطا فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تم انہیں اپنے ساتھ محبت کرنے کی تکلیف نہ دو، کیونکہ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا یہ خاوندوں کو اشارہ ہے کہ نرمی اختیار کریں اور تواضع کا مظاہرہ کریں یعنی اگر تم عورتوں پر قادر ہو تو تم اللہ کی قدرت کو یاد کرو، اس کا دست قدرت، ہر ہاتھ سے بلند ہے پس کوئی شخص اپنی بیوی پر بلندی نہ چاہے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ تاڑ رہا ہے یہاں علو اور کبر کی صفات کا ذکر کرنا بہتر ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی چیز کو مارنے کا صراحۃً حکم نہیں دیا سوائے اس مقام کے اور حدود میں۔ تو معلوم ہوا کہ ان کے خاوند کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ کام ان کے خاوندوں کے سپرد ہے ائمہ کے سپرد نہیں ہے۔ یہ خاوندوں کے لیے روا رکھا جب کہ قاضیوں کے بغیر گواہوں اور دلائل کے کسی کو سزا دینا جائز نہیں۔ خاوند اللہ کی طرف سے عورتوں کے امین بنائے گئے ہیں۔ مہلب نے کہا: عورتوں کو مارنا جائز ہے جب وہ اپنے خاوندوں کو مباشرت سے منع کریں اور خدمت نہ کرنے کی صورت میں سزا دینے میں اختلاف ہے۔ قیاس اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے کہ جب مباشرت کے منع کرنے پر سزا دینا جائز ہے تو معروف طریقہ پر خاوند کی ایسی خدمت نہ کرنے پر بھی سزا دینا جائز ہو، جو خدمت عورت پر مرد کے لیے واجب تھی۔ ابن خویز منداد نے کہا: نافرمانی، نفقہ اور تمام حقوق زوجیت کو ساقط کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے خاوند کو تادیبی کارروائی کرنا جائز ہے جب کہ وہ سزا اسے زخمی کرنے والی نہ ہو اور اسے وعظ ونصیحت ہو اور اس کے بستر کو ترک کر دے حتیٰ کہ وہ نافرمانی سے باز آ جائے۔ جب وہ لوٹ آئے گی تو اس کے حقوق بھی لوٹ آئیں گے۔ اسی طرح ادب جس سزا کا تقاضا کرتا ہے خاوند کے لیے ایسی سزا دینا جائز ہے اور ارفع اور ادنیٰ ادب میں حالت مختلف ہوتی ہے۔ رفیع ادب کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 139 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 48، دار الکتب العلمیہ بیروت

لیے جدائی ہے اور ادنیٰ ادب کے لیے کوڑا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جس نے اپنا کوڑا لٹکائے رکھا اور اپنے گھر والوں کو ادب سکھایا" اور فرمایا: "ابوجہم اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے اتارتا ہی نہیں" (1)۔ بشار نے کہا:

الحر یلحی والعصا للعبد آزاد آدمی کو صرف ملامت کی جاتی ہے اور غلام کے لیے چھڑی ہے۔

ابن درید نے کہا:

واللوم للحر مقیم رادع والعبد لا یردعه الا العصا

آزاد آدمی کو ملامت ہی روکنے والی ہوتی ہے جب کہ غلام کو صرف ڈنڈا ہی باز رکھتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اہل علم کا عورت کے اخراجات کا خاوندوں پر واجب ہونے پر اتفاق ہے جب کہ وہ بالغ ہوں مگر عورتوں میں سے جو نافرمان اور اپنے نفس سے روکنے والی ہو اس کا نفقہ واجب نہیں۔ ابوعمر نے کہا: جو عورت دخول کے بعد اپنے خاوند کی نافرمان ہو تو اس کا نفقہ ساقط ہو جائے گا مگر یہ کہ وہ حاملہ ہو۔ ابن القاسم نے نافرمان کے نفقہ میں فقہاء کی جماعت کی مخالفت کی ہے انہوں نے نافرمان کا نفقہ بھی واجب کیا ہے جب نافرمان اپنے خاوند کی طرف لوٹ آئے تو پھر مستقبل کا نفقہ واجب ہوگا اور نافرمانی کے علاوہ کسی صورت میں عورت کا نفقہ خاوند سے ساقط نہ ہوگا نہ مرض سے، نہ حیض سے، نہ نفاس سے، نہ روزے سے، نہ حج سے، نہ اس کے خاوند کے غائب ہونے سے اور نہ کسی حق یا ظلم کی وجہ سے خاوند کے قیدی ہونے سے سوائے اسی صورت کے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

"اور اگر خوف کرو تم ناچاقی کا ان کے درمیان تو مقرر کرو ایک پنچ مرد کے کنبہ سے اور ایک پنچ عورت کے کنبہ سے اگر وہ دونوں (پنچ) ارادہ کریں گے صلح کرانے کا موافقت پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر بات سے خبردار ہے"۔

اس آیت میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا، الشقاق کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ گویا میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنی اپنی طرف لیتا ہے۔ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا مصدر کو ظرف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسا کہ تیرا قول یعجبنی سیر اللیلۃ المقمرۃ۔ صوم یوم عرفۃ اور قرآن حکیم میں ہے: بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ (سبا:33) بعض علماء نے فرمایا: بین اسماء کے قائم مقام ہے اور اس سے ظرفیت زائل کی گئی ہے، کیونکہ بینھما حالھما وعشرتھما کے معنی میں ہے یعنی اگر خوف کرو تم ان کی عشرت اور صحبت کا فابعثوا تو مقرر کرو۔ و خفتم گزشتہ اختلاف پر ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: حکم یہ ہے کہ پہلے خاوند اسے نصیحت کرے اگر اس کو قبول کرے تو فبہا ورنہ اس کا بستر چھوڑ دے، اگر وہ ایسی صورت میں اطاعت

1۔ سنن نسائی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 74

کرے تو فبہا ورنہ خاوند اسے مارے، اگر وہ ایسی صورت میں قبول کرے تو فبہا ورنہ حاکم وقت ایک پنچ مرد کی طرف سے اور ایک پنچ عورت کی طرف سے مقرر کرے وہ دونوں ان کے ضرر کو دیکھیں اگر صلح کی کوئی صورت نہ ہو تو خلع ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: خاوند کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے وعظ و نصیحت سے پہلے بھی سزا دے۔ لیکن آیت میں جو ترتیب ہے وہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور علماء نے کہا: وَ اِنْ خِفْتُمْ کا مخاطب حکام اور امراء ہیں اور اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا سے مراد حکمین یعنی پنچ ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہما کا قول ہے یعنی اگر پنچ اصلاح کا ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرمادے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: مخاطب میاں، بیوی ہیں یعنی اگر میاں بیوی اصلاح کا ارادہ کریں جو کچھ انہوں نے پنچوں کو بتایا اس میں سچ بولیں تو اللہ تعالیٰ ان میں مصالحت کی صورت پیدا فرمادے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب اولیاء کو ہے یعنی تم میاں بیوی کے درمیان اختلاف جان لو تو پھر مرد کی طرف سے ایک پنچ اور عورت کی طرف سے ایک پنچ مقرر کرو اور وہ پنچ مرد اور عورت کی طرف سے ہوں، کیونکہ وہ دونوں میاں بیوی کے احوال بگاڑ کی طرف جانے سے روکیں گے اور وہ دونوں عادل ہوں حسن بصیرت اور حسن نظر کے حامل ہوں اگر ان کے اہل میں سے ایسے دو شخص نہ ہوں تو پھر کوئی اور دو شخص جو عادل اور عالم ہوں یہ اس وقت ہے جب معاملہ سمجھنا مشکل ہو جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ زیادتی کس کی طرف سے ہے۔ اگر ظالم کا علم ہو جائے تو دوسرے کے لیے اس کا حق لیا جائے گا اور ضرر کو دور کرنے کے لیے ظالم کو مجبور کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے: خاوند کی طرف کا پنچ خاوند سے علیحدگی میں پوچھے کہ تم مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ کیا تم اس سے محبت کرتے ہو یا نہیں تا کہ میں تیری مراد جان لوں؟ اگر وہ کہے کہ مجھے اس عورت کی کوئی ضرورت نہیں میرے لیے اس سے وہ لے لو جس کی تو طاقت رکھتا ہے اور میرے اور اس کے درمیان تفریق کر دو، پس معلوم ہو جائے گا کہ مرد کی طرف سے زیادتی ہے اور اگر وہ کہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میرے مال سے اس کو خوش کرو جو تو چاہتا ہے اور میرے اور اس کے درمیان تفریق نہ کرو، پس معلوم ہو جائے گا کہ مرد زیادتی کرنے والا نہیں۔ اور عورت کی طرف والا حکم عورت سے علیحدگی میں پوچھے اسے کہے: کیا تو اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ میرے اور اس کے درمیان تفریق کر دو اور جو وہ ارادہ کرتا ہے میرے سے اسے دے دو۔ معلوم ہو جائے گا کہ زیادتی عورت کی طرف سے ہے۔ اگر وہ کہے کہ ہمارے درمیان تفریق نہ کرو بلکہ اسے اس بات پر ابھارو کہ وہ میرے خرچ میں اضافہ کرے اور میرے ساتھ حسن سلوک کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ زیادتی عورت کی طرف سے نہیں ہے۔ اگر دونوں پنچوں کے لیے ظاہر ہو جائے کہ زیادتی مرد کی طرف سے تھی تو دونوں پنچ اسے نصیحت کریں، اسے زجر و توبیخ کریں اور انہیں زیادتی سے منع کریں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَابْعَثُوْا حَكَمًا الایہ سے یہی مراد ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے فرمایا: اس آیت نے عورتوں کی عقلی تقسیم کی، کیونکہ وہ یا تو اطاعت شعار ہوتی ہیں یا نافرمان ہوتی ہیں۔ پھر نافرمانی اور زیادتی اطاعت شعاری کی طرف لوٹے گی یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ نسائی نے روایت کیا ہے کہ عقیل بن ابی طالب نے فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ سے نکاح کیا جب عقیل اپنی بیوی

کے پاس گیا تو وہ کہنے لگی: اے بنی ہاشم! اللہ کی قسم میرا دل تم سے محبت نہیں کرتا وہ لوگ کہاں جن کی گردنیں چاندی کے لوٹے کی طرح ہیں! جن کے ناک، ان کے ہونٹوں کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ عتبہ بن ربیعہ کہاں، ابن شیبہ بن ربیعہ کہاں۔ عقیل یہ سب کچھ سن کر خاموش رہے حتیٰ کہ وہ ایک دن اس کے پاس گئے جب کہ وہ پریشان و تنگ دل تھا۔ فاطمہ نے کہا: کہاں ہے عتبہ بن ربیعہ؟ عقیل نے کہا: تیری بائیں جانب آگ میں، جب تو داخل ہوگی۔ فاطمہ نے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور حضرت عثمان کے پاس آئی اور ان کے سامنے یہ سب ذکر کیا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ کو بلایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں ان کے درمیان تفریق کروں گا۔ حضرت معاویہ نے کہا: میں بنی عبد مناف کے دو شیخوں کے درمیان تفریق نہیں کروں گا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاویہ ان دونوں (میاں بیوی) کے پاس آئے تو انہوں نے انہیں پایا کہ انہوں نے اپنے اوپر دروازہ بند کیا ہوا ہے اور دونوں اپنے معاملہ میں صلح کر چکے ہیں۔ اگر پنچ میاں بیوی کو اختلاف پر پائیں اور صلح نہ کریں اور ان کا معاملہ ناہموار ہو تو پہلے وہ ان دونوں میں محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات یاد دلائیں اور ایک دوسرے سے تعاون پر برانگیختہ کریں اگر وہ واپس آجائیں اور رجوع کر لیں تو انہیں چھوڑ دیں اگر دوسری صورت ہو اور دونوں پنچ جدائی کی رائے قائم کریں تو ان کے درمیان جدائی کر دیں اور ان پنچوں کو جدائی کرنا میاں بیوی پر جائز ہے، خواہ شہر کے قاضی کا حکم اس فیصلہ کے موافق ہو یا مخالف ہو۔ میاں بیوی نے یہ معاملہ ان کے سپرد کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اور ان کے درمیان طلاق واقع نہ ہوگی جب تک کہ وہ دونوں انہیں اپنے پنچ نہ بنائیں اور وہ دونوں ان کے حالات سے امام وقت کو آگاہ نہ کریں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ دونوں رسول پیغام رساں اور گواہ ہیں۔ پھر امام اگر ارادہ کرے تو ان میں تفریق کرے اور تفریق کا حکم دے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور یہی ابو ثور کا قول ہے اور صحیح پہلا قول ہے۔ پنچوں کے لیے طلاق دینا ہے نہ وکالت کرنا ہے۔ یہ امام مالک، اوزاعی اور اسحاق کا قول ہے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس سے اور شعبی اور نخعی سے مروی ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا**۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص ہے کہ وہ دونوں پنچ قاضی ہیں، وکیل نہیں ہیں اور گواہ ہیں۔ وکیل کے لیے شریعت میں ایک نام اور معنی ہے اور شریعت میں پنچ کے لیے علیحدہ اسم اور معنی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو بیان فرمایا تو شاذ کے لیے مناسب نہیں تو پھر عالم کے لیے کیسے ہوگا کہ ایک کے معنی کو دوسرے پر جوڑے۔ دار قطنی نے محمد بن سیرین کی حدیث سے، عبیدہ سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے، **وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا**۔ فرمایا: ایک شخص اور ایک عورت حضرت علی کے پاس آئے ہر ایک کے ساتھ لوگوں کا ایک گروہ تھا، حضرت علی نے انہیں حکم دیا کہ ایک مرد کی طرف پنچ اور ایک عورت کی طرف سے پنچ مقرر کرو۔ پھر آپ نے ان پنچوں سے فرمایا: تم جانتے ہو تم پر کیا لازم ہے؟ تم پر یہ ہے کہ اگر تم ان کی جدائی کا نظریہ رکھو تو انہیں جدا کر دو۔ عورت نے کہا: میں اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر راضی ہوں جو مجھ پر مرد کے لیے لازم ہوتا ہے اور جو میرا حق بنتا ہے۔ خاوند نے کہا میں جدائی نہیں چاہتا۔ حضرت علی نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا ہے اللہ کی قسم! تو اس جگہ سے نہیں جائے گا حتیٰ کہ تو بھی اس عورت کی طرح اقرار کر لے۔ یہ سند صحیح ہے اور

ثابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کئی وجوہ سے ابن سیرین عن عبیدہ کے سلسلہ سے ثابت ہے۔ یہ ابو عمر کا قول ہے اگر یہ دونوں وکیل اور گواہ ہوتے تو حضرت علی انہیں یہ نہ کہتے کہ کیا تم جانتے ہو تم پر کیا واجب ہے؟ آپ فرماتے: کیا تم جانتے ہو جس کا تمہیں وکیل بنایا گیا ہے؟ یہ واضح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے حجت پکڑی ہے جو آپ نے خاوند سے کہا تھا: ''تو اپنی جگہ سے نہیں جائے گا حتیٰ کہ تو راضی ہو جائے گا جس سے وہ راضی ہوئی''۔ پس یہ دلیل ہے کہ حضرت علی کا مذہب یہ ہے کہ وہ پنچ جدائی نہیں کریں گے مگر خاوند کی رضا سے۔ امام ابو حنیفہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ اجتماعی مسئلہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے یا مرد جس کے سپرد یہ اختیار کر دے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے اس کو اس باب سے شمار کیا ہے کہ سلطان، غلام اور عنین کی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر دونوں پنچ مختلف ہو جائیں تو ان کا قول نافذ نہ ہو گا اور اس سے کچھ لازم نہ ہو گا مگر یہ کہ جس معاملہ پر دونوں پنچ متفق ہو جائیں۔ اسی طرح ہر پنچ کسی ایک معاملہ میں فیصلہ کرے، اگر ایک فرقت کا فیصلہ کرے اور دوسرا یہ فیصلہ نہ کرے یا ایک مال کا فیصلہ کرے اور دوسرا اس کا انکار کرے، کچھ بھی نہ ہو گا حتیٰ کہ دونوں متفق ہو جائیں۔ امام مالک نے پنچوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ تین طلاقیں دے دیں تو ایک لازم ہو گی اور ان دونوں کے لیے جدائی ایک طلاق بائنہ سے زیادہ کے ساتھ نہ ہو گی۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: تینوں طلاقیں بھی واقع ہو جائیں گی اگر دونوں پنچ ان پر جمع ہو جائیں۔ یہ مغیرہ، اشہب، ابن الماجشون اور اصبغ کا قول ہے۔ ابن المواز نے کہا: اگر ایک پنچ ایک طلاق کا فیصلہ کرے اور دوسرا تین طلاق کا فیصلہ کرے تو ایک ہو گی۔ ابن حبیب نے اصبغ سے حکایت کیا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایک شخص کو میاں، بیوی کی طرف بھیجنا بھی جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زنا میں چار گواہوں کا فیصلہ کیا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زانیہ عورت کی طرف انیس کو اکیلا بھیجا تھا اور اسے فرمایا کہ اگر وہ عورت زنا کا اعتراف کرے تو اسے سنگسار کر دو۔ عبد الملک نے ''المدونۃ'' میں اسی طرح کہا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: جب ایک آدمی کو بھیجنا جائز ہے تو پھر میاں، بیوی ایک پنچ مقرر کر لیں تو جائز ہو گا یہ جواز کے اعتبار سے اولیٰ ہے جب دونوں اس پر راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم بھیجنے کا حکم، حکام کو دیا ہے نہ کہ میاں، بیوی کو دیا ہے۔ اگر میاں بیوی دو پنچ مقرر کریں اور وہ کوئی فیصلہ کریں تو ان کا فیصلہ نافذ ہو گا، کیونکہ ہمارے نزدیک تحکیم جائز ہے اور پنچ کا فیصلہ ہر مسئلہ میں نافذ ہو گا جب ہر پنچ عادل ہو۔ اگر عادل نہ ہو تو عبد الملک نے کہا: اس کا فیصلہ ٹوٹ جائے گا، کیونکہ انہیں دھوکے کا خطرہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: صحیح یہ ہے کہ اس کا فیصلہ نافذ ہو گا، کیونکہ وہ وکیل بنایا گیا تھا اور وکیل کا فعل نافذ ہوتا ہے۔ اگر وہ حکم بنایا گیا تھا تو انہوں نے خود اسے اپنے نفسوں پر مقدم کیا اور دھوکا اس میں مؤثر نہیں جس طرح توکیل کے باب میں مؤثر نہیں۔ قضا کا باب تمام دھوکے پر مبنی ہے اس میں محکوم علیہ کا اس کو جاننا لازم نہیں جس کی وجہ سے فیصلہ اس کی طرف لوٹا ہے (2)۔ ابن عربی نے کہا پنچوں کا مسئلہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نص ہے اور میاں بیوی کے درمیان ناچاقی اور اختلاف کے ظہور کے وقت پنچ کے ساتھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 427	2۔ ایضاً

فیصلہ ہوگا یہ ایک عظیم مسئلہ ہے۔ اس کی اصل پر امت کا اجماع ہے کہ حکم مقرر کیے جائیں گے اگرچہ اس پر جو مسائل مرتب ہوتے ہیں ان کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ ہمارے شہر کے اہل علم پر تعجب ہے جو کتاب وسنت کے حکم سے غافل رہے اور انہوں نے کہا: ان دونوں کو ایک امین شخص کے سپرد کیا جائے گا اس قول میں نص کی مخالفت ہے جو تم پر مخفی نہیں ہے، نہ تو انہوں نے کتاب اللہ کے مطابق حکم دیا اور نہ قیاس سے یہ جسارت کی، میں نے اس کو حقیقت کی طرف بلایا تو اس نے مجھے ناچاقی کے وقت دو پنچوں کو بھیجنے کا جواب نہ دیا۔ مگر ایک قاضی کی طرف بھیجنے کو کہا اور نہ ایک گواہ کے ساتھ قسم کے ذریعے فیصلہ کرنے کو تسلیم کیا مگر دوسرے گواہ کی موجودگی ضروری قرار دی جب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس امر پر قدرت دی تو میں نے سنت کو اس طرح جاری کیا جس طرح مناسب تھا۔ ہمارے علاقہ کے علماء پر تعجب نہ کرو، کیونکہ انہیں جہالت نے گھیر رکھا ہے لیکن امام ابوحنیفہ پر تعجب ہے جن کے پاس دو پنچوں کے بارے کوئی خبر نہیں بلکہ اس سے دوگنا تعجب امام شافعی پر ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: وہ چیز جو ظاہر آیت کے مشابہ ہے وہ یہ ہے جس میں دونوں میاں، بیوی برابر ہوں حتیٰ کہ اس میں دونوں کے حالات مشابہ ہوں۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے کہ میں نے پایا کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کی زیادتی کی صورت میں صلح کی اجازت دی اور حدود الہیہ کو قائم نہ کرنے کی صورت میں خلع کی اجازت دی اور یہ عورت کی رضا کے مطابق ہونے کے مشابہ ہے اور منع فرمایا کہ مرد نے جو کچھ عورت کو دیا تھا اس میں سے واپس لے جب خاوند اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ جب میاں بیوی کی ناچاقی کی صورت میں دو پنچوں کو مقرر کرنے کا حکم دیا تو یہ دلیل ہے کہ ان کا فیصلہ میاں کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہوگا تو ایک پنچ خاوند کی طرف سے اور ایک پنچ عورت کی طرف سے مقرر کیا جائے گا اور دونوں پنچ میاں بیوی کی رضا پر متعین ہوں گے اور ان کے سپرد ہوگا ان کا جمع کرنا اور ان میں جدائی کرنا، جب وہ جدائی کو ہی بہتر دیکھیں یہ دلیل ہے کہ دونوں پنچ میاں بیوی کے وکیل ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ امام شافعی کے کلام کی انتہا ہے اور ان کے اصحاب اس پر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی چیز قابل التفات نہیں ہے اور نہ اس کا نصاب علم میں بہتر ہے۔ قاضی ابواسحاق نے ان کا رد کیا ہے لیکن اکثر کلام میں انہوں نے انصاف نہیں کیا۔ رہا امام شافعی کا قول کہ ''ظاہر آیت جس کے مشابہ ہے وہ یہ ہے کہ میاں بیوی برابر ہیں'' حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ واضح طور پر قرآن حکیم میں ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ اور جس کو اپنی بیوی سے زیادتی کا اندیشہ ہو تو وہ اسے وعظ کرے اگر وہ اطاعت کی طرف لوٹ آئے تو فبہا ورنہ اس کے بستر سے علیحدہ ہو جائے اگر وہ مان جائے تو فبہا ورنہ اسے سزا دے اگر پھر بھی عورت اپنی زیادتی پر قائم رہے تو دو پنچ ان کی طرف جائیں۔ یہ اس صورت میں ہے اگر نص نہ ہو اور قرآن میں بیان نہ ہو اور اس کو چھوڑ دے جو نص نہ ہو۔ وہ ظاہر ہوگا۔ رہا امام شافعی کا قول کہ ''ظاہر کے مشابہ ہے'' ہم نہیں جانتے کہ ظاہر کے مشابہ کیا ہے پھر امام شافعی نے کہا: جب انہیں حدود الہیہ کو قائم نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو خلع کا حکم فرمایا۔ یہ عورت کی رضا کے مشابہ ہے بلکہ ایسا ہونا واجب ہے۔ یہی اس حکم کی نص ہے۔ پھر فرمایا: جب دو پنچوں کا حکم دیا تو ہم نے جان لیا کہ پنچوں کا حکم خاوندوں کے حکم کے علاوہ ہے اور واجب ہے کہ وہ اس کا غیر ہو اس طرح کہ ان پر ان کا حکم بغیر اختیار کے نافذ ہو۔ پس غیریت متحقق ہوگی اور جب وہ ان پر وہ نافذ کریں جن کا میاں بیوی نے انہیں وکیل بنایا

تھا تو وہ میاں، بیوی کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ نہ کریں تو غیریت متحقق نہ ہوئی۔ رہا امام شافعی کا یہ قول کہ ''میاں بیوی کی رضا اور ان کی توکیل کے ساتھ''۔ یہ واضح خطا ہے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے علاوہ کو خطاب فرمایا ہے جب میاں بیوی کے درمیان پنچوں کو بھیجنے کے ساتھ بھی ناچاقی کا اندیشہ ہو اور جب مخاطب ان دونوں کے علاوہ ہوں تو یہ ان کی توکیل سے کیسے ہوگا؟ اور ان دونوں کے لیے حکم صحیح نہ ہوگا مگر جس پر دونوں پنچ جمع ہو جائیں (1)۔ یہ انصاف کی صورت ہے اور رد کی تحقیق ہے۔ آیت میں تحکیم کے اثبات پر دلیل ہے، اس طرح نہیں جس طرح خوارج کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے تحکیم نہیں ہے۔ یہ کلمہ حق ہے مگر وہ اس سے باطل مراد لیتے ہیں۔

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى
وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ
وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۟ۙ﴿۳۶﴾

''اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی کو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو نیز رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پڑوسی جو رشتہ دار ہے اور پڑوسی جو رشتہ دار نہیں اور ہم مجلس اور مسافر اور جو (لونڈی، غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں (ان سب سے حسن سلوک کرو) بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو''۔

اس آیت میں اٹھارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت محکم ہے اس میں سے کوئی چیز منسوخ نہیں ہے، یہ تمام کتب میں اسی طرح ہے اگر یہ اس طرح نہ بھی ہوتی تو یہ عقل کی جہت سے معلوم ہو جاتی، اگر اس کے ساتھ کتاب نازل نہ بھی ہوتی۔ عبودیت کا معنی تذلل اور افتقار پہلے گزر چکا ہے اور یہ فقط اس ذات کے لیے ہے جس کے لیے حکم اور اختیار ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے لیے عبادت کرنے اور عبادت میں اخلاص کا حکم دیا ہے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے لیے خالص اعمال کرنے اور اعمال کا ریا کاری سے پاک ہونے کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا** ﴿۱۱۰﴾ (الکہف) حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: جس نے ٹھنڈک کی خاطر طہارت کی یا معدہ کی اصلاح کے لیے روزہ رکھا اور ساتھ ساتھ تقرب کی بھی نیت کی تو یہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ تقرب کی نیت میں اس نے دنیوی نیت کو ملا دیا اور اللہ کے لیے صرف وہ عمل ہوتا ہے جو خالص ہو جیسا کہ اللہ نے فرمایا: **اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ** (الزمر: 3) (خبردار! صرف اللہ کے لیے ہے دین خالص) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ** (البینہ: 5) (حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے) اسی طرح جب کوئی امام رکوع میں ہو اور کسی کی آمد محسوس کرے تو اس کا انتظار نہ کرے کیونکہ رکوع میں اس کا انتظار اس کے رکوع کو خالص اللہ کے لیے ہونے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 422

سے نکال دے گا۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: میں شرکاء کے شرک سے غنی ہوں، جس نے ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا تو میں نے اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیا ہے (1)۔ دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز صحیفوں کو لایا جائے گا جن پر مہر لگائی گئی ہوگی پھر انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کو پھینک دو اور اس کو قبول کر لو۔ فرشتے عرض کریں گے: تیری عزت کی قسم! ہم نے نہیں دیکھا مگر خیر کو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے۔ یہ میرے غیر کے لیے تھا آج میں قبول نہیں کروں گا مگر صرف وہی عمل جو میری رضا کے لیے کیا گیا ہوگا'' (2)۔ ضحاک بن قیس فہری سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں شریک سے بہتر ہوں جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ میرے شریک کے لیے ہے۔ اے لوگو! خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اعمال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خاص اس کے لیے ہو اور یہ نہ کہو: یہ اللہ کے لیے ہے اور رحم کے لیے ہے۔ وہ عمل رحم کے لیے ہے اللہ کے لیے اس میں سے کچھ نہیں ہے۔ یہ نہ کہو کہ یہ اللہ کے لیے ہے، یہ تمہارے لیے ہے، یہ تمہارے لیے ہے اس میں سے اللہ کے لیے کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ: جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لو کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں: شرک کے تین مراتب ہوتے ہیں اور تمام حرام ہیں۔ شرک کی اصل یہ ہے کہ الوہیت میں اللہ تعالیٰ کے شریک کا اعتقاد رکھنا۔ یہ شرک اعظم ہے اور یہ جاہلیت کا شرک ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ سے یہی مراد ہے اور پھر اس سے متصل فعل میں اللہ تعالیٰ کے شریک کا اعتقاد رکھنا ہے۔ یہ اس کا قول ہے جو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا موجود ہے جو فعل کے کرنے اور ایجاد میں مستقل ہے اگرچہ وہ اس کے الٰہ ہونے کا اعتقاد نہ بھی رکھتا ہو جیسے قدریہ فرقہ جو اس امت کے مجوسی ہیں۔ حضرت ابن عمر نے ان سے براءت کا اظہار کیا جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے۔ اور پھر اس سے متصل شرک فی العبادۃ ہے اور یہ ریاکاری ہے۔ یعنی کوئی شخص ان عبادات میں سے کوئی عبادت غیر اللہ کے لیے کرے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی حرمت کے لیے آیات اور احادیث بیان کی گئی ہیں۔ یہ اعمال کو باطل کرنے والا ہے اور یہ مخفی ہے جس کو ہر جاہل کند ذہن نہیں پہچانتا۔ اللہ تعالیٰ محاسبی سے راضی ہو انہوں نے اپنی کتاب (الرعایۃ) میں اس کو اعمال کو فاسد کرنے والا بیان کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو سعید بن ابی فضالہ انصاری سے مروی ہے اور یہ صحابہ میں سے تھے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اولین وآخرین کو جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا: جس نے کسی عمل میں اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرایا تھا وہ اپنا بدلہ اس غیر اللہ سے طلب کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ شرکاء کے شرک سے مستغنی ہے'' (3)۔ سنن ابو داؤد میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے فرمایا: ہمارے پاس رسول اللہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، جلد 2، صفحہ 411
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 51
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 320

صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب کہ ہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس چیز کے متعلق نہ بتاؤں جو تم پر مسیح دجال سے بھی زیادہ خوفناک ہے؟ ہم نے عرض کی: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور کرم فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شرک خفی یہ ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو اور اپنی نماز کو اس کے لیے مزین کرے جو اسے دیکھ رہا ہے'' (1)۔ حضرت شداد بن اوس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سب سے زیادہ خوف اپنی امت پر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے میں نہیں کہتا کہ وہ سورج کی پوجا کریں گے یا چاند کی پوجا کریں گے یا بت کی پوجا کریں گے، لیکن وہ غیر اللہ کے لیے اور خفیہ شہوت کے لیے اعمال کریں گے'' (2)۔ اس حدیث کو حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے۔ سورۃ الکہف کے آخر میں مزید بیان آئے گا۔ اس میں خفیہ شہوت کا بیان ہے۔ ابن لہیعہ نے یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہوت خفیہ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ''وہ شخص جو علم حاصل کرے جو پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس بیٹھا جائے''۔ سہل بن عبد اللہ تستری نے کہا: ریا کی تین صورتیں ہیں (۱) جو اپنے فعل میں غیر اللہ کی نیت کرتا ہے اور اس سے ارادہ یہ کرتا ہے کہ یہ جانا جائے کہ یہ اللہ کے لیے ہے، یہ نفاق کی ایک قسم ہے اور ایمان میں تشکک ہے (۲) کسی عمل میں اللہ کے لیے داخل ہوتا ہے جب کوئی شخص اس پر مطلع ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ یہ جب توبہ کرے تو سابقہ تمام عمل کا اعادہ کرے۔ (۳) کسی عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہوا اور اس سے فارغ بھی اللہ کے لیے ہو پھر اس کا یہ عمل جانا گیا اور اس پر مدح کی گئی اور وہ لوگوں کی مدح پر خاموش رہا۔ یہ ریا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ سہل نے کہا: لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ریا یہ ہے کہ تو اپنے عمل کا ثواب دنیا میں طلب کرے، قوم کا عمل آخرت کے لیے تھا۔ لقمان سے پوچھا گیا: ریا کا علاج کیا ہے؟ لقمان نے کہا: عمل کا چھپانا۔ پھر پوچھا گیا: عمل کیسے چھپایا جائے گا؟ فرمایا: تو عمل کے ظاہر کرنے کا مکلف نہیں کیا گیا پس تو ہر عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہو اور جس کے اظہار کے ہم مکلف نہیں میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کے سوا کوئی مطلع نہ ہو۔ فرمایا: ہر وہ عمل جس پر مخلوق مطلع ہو جائے اس کو عمل سے شمار نہ کر۔ ایوب سختیانی نے کہا: وہ عقل مند نہیں جو اپنے عمل کی وجہ سے اپنا مقام پہچانا پسند کرے۔

میں کہتا ہوں: سہل کا قول کہ ''عمل میں اخلاص کے ساتھ داخل ہوا الخ''۔ اگر اس کا سکون اور سرور اس لیے ہوتا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہوگی پھر وہ اس کی تعریف کریں گے اور اس کا عزت و احترام کریں گے اور وہ ان سے مال وغیرہ حاصل کرنا چاہتا ہو تو یہ مذموم ہے، کیونکہ اس کا دل ان کے اطلاع پانے کی وجہ سے خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد مطلع ہوئے ہوں اور اللہ تعالیٰ اس پر مخلوق کو مطلع کر دے جب کہ وہ لوگوں کی اس پر اطلاع کو پسند نہیں کرتا تھا پھر وہ اللہ کی صنع اور اللہ کے فضل کے ساتھ خوش ہو تو اللہ کے فضل پر اس کا خوش ہونا اطاعت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝** (یونس) (اے حبیب! فرمایئے یہ کتاب محض اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں یہ بہتر ہے ان تمام

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 320　　2۔ ایضاً

چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں) اس کی تفصیل اور تتمیم محاسبی کی "الرعایۃ" میں ہے جو تفصیل پڑھنا چاہتا ہے وہ وہاں سے آگاہی حاصل کرے۔

سہل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے متعلق پوچھا گیا: "میں عمل کو مخفی کرتا ہوں پھر اس پر اطلاع ہو جاتی ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے" سہل نے فرمایا: وہ اللہ کے شکر کی وجہ سے خوش ہوتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ظاہر کر دیا۔ یہ کلام ریا میں اور اعمال میں خلوص کے بارے میں کافی ہے اور سورۂ بقرہ میں اخلاص کی حقیقت گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اس سورۃ کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ والدین سے احسان کا مطلب ان کو آزاد کرنا ہے اور سورۂ سبحان الذی میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم تفصیل سے آئے گا۔ ابن ابی عبلۃ نے احسانٌ یعنی رفع کے ساتھ پڑھا ہے یعنی واجب الاحسان الیہما۔ باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اس معنی کی بنا پر کہ احسنوا الیہما احساناً ان سے حسن سلوک کرو۔

علماء نے فرمایا: خالق اور احسان کرنے والے کے شکر کے بعد سب سے زیادہ احسان کرنے، حسن سلوک کرنے اور طاعت کے حق دار انسان کے والدین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت، اطاعت اور شکر کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کو ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ (لقمان:14) (کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا)

شعبۃ اور ہشیم الواسطیان نے یعلی بن عطا سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رب کی رضا والدین کی رضا ہے اور والدین کی ناراضگی میں رب کی ناراضگی ہے" (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ۔ اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ اللہ تعالیٰ نے پڑوسی کی حفاظت کے حقوق کا قیام، اس کے ذمہ کی رعایت کا حکم اپنی کتاب میں اور اپنے نبی کی زبان پر حکم دیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقرباء کے ذکر کے بعد پڑوسی کا ذکر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى یعنی قریبی پڑوسی اور الجار الجنب سے مراد دور کا پڑوسی ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ اسی طرح لغت میں ہے اسی سے ہے فلان اجنبی۔ اسی طرح الجنابۃ کا معنی دوری ہے اہل لغت نے بطور دلیل یہ شعر پڑھا ہے:

فلا تحرِمَنِّي نائلاً عن جَنابةٍ فإني امرؤٌ وسْطَ القِبابِ غَرِيبُ (2)

اور اعشیٰ نے کہا:

أتيتُ حُرَيثا زائراً عن جَنابةٍ فكان حُرَيثٌ عن عطائِ جَامِداً (3)

1۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 1، صفحہ 440
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت

اعمش اور مفضل نے والجار الجنب کو جیم کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: جنُب و جنُب، اجنب واجنبی۔ جب کہ ان دونوں کے درمیان رشتہ داری نہ ہو اور اس کی جمع اجانب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے یعنی والجار ذی الجنب یعنی طرف والا۔ نوف الشامی نے کہا: الجار ذی القربیٰ سے مراد مسلمان ہے اور الجار الجنب سے مراد یہودی و نصرانی ہے(1)۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر پڑوسی کے متعلق وصیت جس کا حکم دیا گیا ہے وہ مستحب ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر ہو۔ یہی صحیح ہے۔ الاحسان کبھی، مواساۃ (ہمدردی) کے معنی میں ہوتا ہے کبھی حسن معاشرت، اذیت کو روکنا اور حفاظت کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جبریل مجھے پڑوسی کے متعلق وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے گمان ہوا کہ یہ اسے وارث بنا دے گا'' (2)۔ ابو شریح سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''الله کی قسم مومن نہیں، الله کی قسم مومن نہیں، الله کی قسم مومن نہیں، عرض کی گئی یا رسول الله! کون؟ فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہیں'' (3)۔ یہ ہر پڑوسی میں عام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ قسم اٹھا کر پڑوسی کی اذیت کو ترک کرنے کو مؤکد فرمایا۔ جو اپنے پڑوسی کو اذیت دیتا ہے وہ مومن نہیں۔ مومن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی اذیت سے اجتناب کرے اور اس سے بچ جائے جس سے الله اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے اور اس چیز اور عمل میں رغبت رکھے جس پر الله اور اس کا رسول راضی ہیں اور جس پر برانگیختہ کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرمایا: ''پڑوسی تین ہیں پھر ایک پڑوسی کے تین حقوق ہیں اور ایک پڑوسی کے دو حق ہیں اور ایک پڑوسی کا ایک حق ہے۔ وہ پڑوسی جس کے تین حقوق ہیں وہ قریبی مسلمان پڑوسی ہے، اس کے لیے پڑوس کا حق ہے، قرابت کا حق ہے اور اسلام کا حق ہے اور وہ پڑوسی جس کے دو حق ہیں وہ مسلمان پڑوسی ہے اس کے لیے حق الاسلام اور پڑوس کا حق ہے اور وہ پڑوسی جس کا ایک حق ہے وہ کافر پڑوسی ہے اس کے لیے صرف پڑوس کا حق ہے''۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول الله! میرے دو پڑوسی ہیں میں کس کو ہدیہ بھیجوں۔ رسول الله ﷺ نے فرمایا: ''جو از روئے دروازے کے تمہارے زیادہ قریب ہو'' (4)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ حدیث الله تعالیٰ کے ارشاد وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی کی مراد کی تفسیر کرتی ہے یعنی وہ شخص جس کا مسکن تیرے قریب ہو۔ وَالْجَارِ الْجُنُبِ جس کا مسکن تجھ سے دور ہو۔ اس سے پڑوسی کے لیے شفعہ کے ثبوت پر حجت پکڑی گئی ہے اور نبی کریم کے اس ارشاد: الجار احق بصقبہ (5) (یعنی پڑوسی پڑوس کی وجہ سے شفعہ کا حق دار ہے) سے تائید دی ہے۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ تحفہ دینے میں آغاز

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889　3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الشفعہ، جلد 1، صفحہ 300　5۔ ایضاً

کس پڑوسی سے کروں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس کا دروازہ تمہارے زیادہ قریب ہو وہ دوسروں سے زیادہ حق دار ہے“۔ ابن المنذر نے کہا: یہ حدیث دلیل ہے کہ جار کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کا گھر ملا ہوا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث کے ظاہر سے یہ نکالا ہے کہ متصل پڑوسی جب شفعہ چھوڑ دے اور اس سے ملا ہوا پڑوسی شفعہ طلب کرے جب کہ اس کی نہ دیوار اس گھر کے ساتھ متصل ہے نہ اس کا راستہ متصل ہے تو اس میں اس کے لیے شفعہ کا حق نہیں۔ عام علماء کہتے ہیں: جب کوئی شخص اپنے پڑوسیوں کے لیے وصیت کرے تو متصل پڑوسی اور دوسرے پڑوسیوں کو اس کا مال دیا جائے گا مگر امام ابو حنیفہ کا قول عام علماء سے جدا ہے فرمایا: انہوں نے فرمایا: صرف متصل پڑوسی کو وہ وصیت ملے گی۔

مسئلہ نمبر 6۔ پڑوس کی حد میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی فرماتے تھے: ہر طرف سے چالیس گھر (1)۔ یہ ابن شہاب کا بھی قول ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میں ایک قوم کے محلہ میں اترا ہوں ان میں سے جو میرا زیادہ قریبی ہے وہ مجھے زیادہ اذیت دینے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی کو بھیجا کہ مساجد کے دروازوں پر اعلان کرو کہ ”خبردار چالیس گھر پڑوسی ہیں وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہیں“۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے آذان سنی وہ پڑوسی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جس نے نماز کی تکبیر سنی وہ مسجد کا پڑوسی ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جس نے کسی شخص کو کسی محلہ یا شہر میں ٹھہرایا وہ پڑوسی ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاحزاب) اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں ان کے اجتماع کو جوار (پڑوس) بنایا ہے۔ پڑوس کے مراتب میں بعض بعض سے زیادہ قریبی ہیں۔ قریب ترین پڑوسی زوجہ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أَيَا جَارَتَا بِيْنِيْ فَإِنَّكِ طَالِقَهْ

مسئلہ نمبر 7۔ پڑوسی کے اکرام کے متعلق مسلم میں حضرت ابوذر سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابوذر! جب تو شوربا پکائے تو اس کا پانی زیادہ بنا اور اپنے پڑوسیوں کا خیال کر“ (3)۔ نبی کریم ﷺ نے مکارم اخلاق پر برانگیختہ کیا، کیونکہ ان پر محبت، حسن معاشرت، حاجت دور کرنے اور فساد دور کرنے کا دارومدار ہے، کیونکہ پڑوسی اپنے پڑوسی کی ہنڈیا کی بو سے اذیت پاتا ہے بعض اوقات اس کے بچے ہوتے ہیں اور ان کی شہوت کو وہ ابھارتی ہے اور جوان بچوں کی کفالت کرنے والا ہوتا ہے اس پر الم اور کلفت زیادہ ہو جاتی ہے خصوصاً اگر کفالت کرنے والا کمزور ہو یا غریب ہو تو اس پر مشقت اور زیادہ ہوتی ہے اور اس پر تکلیف اور حسرت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی عقوبت تھی جیسا کہ کہا گیا ہے جس چیز میں ان کی پکانے وغیرہ میں شرکت ہوتی ہے وہ ان کو دینی چاہیے اسی معنی کی وجہ سے قریبی پڑوسی کو ہدیہ دینے پر ابھارا ہے، کیونکہ وہ اپنے پڑوسی کے گھر میں داخل ہونے والی اور خارج ہونے والی چیز کو دیکھتا ہے جب وہ اسے دیکھتا ہے تو وہ اس میں شرکت کو پسند کرتا ہے، نیز پڑوسی اپنے پڑوسی کی غفلت و دھوکا کے وقت جلدی ضرورت کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 50 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 329

پہنچتا ہے اسی وجہ سے اس سے ہدیہ کا آغاز کرے اور انہیں بعد میں دے جن کا دروازہ دور ہے اگرچہ ان کا گھر قریب ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے فرمایا: جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فاکثر ماءھا یعنی سالن کا شوربا زیادہ کر۔ اس کے ذریعے نبی کریم ﷺ نے بخیل پر معاملہ کو آسان کرنے کی تنبیہ لطیف فرمائی اور ایسی چیز کو زیادہ کرنے کا حکم فرمایا جس کی کوئی قیمت نہیں ہے یعنی پانی۔ اسی وجہ سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تو سالن بنائے تو گوشت زیادہ کر۔ کیونکہ یہ ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

کسی شاعر نے کتنا اچھا کہا ہے:

قِدْرِی وقِدْرُ الجار واحدۃٌ　　والیہ قَبْلِی تُرفعُ القِدر

میری اور میرے پڑوسی کی ہانڈی ایک ہے مجھ سے پہلے ہانڈی اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

اور کوئی حقیر گھٹیا تھوڑی سی چیز ہدیہ نہ دی جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنے پڑوسیوں کے گھر والوں کو دیکھ پھر انہیں ایسی چیز بھیجو جو عرفاً بھیجی جاتی ہے''(1)۔ تھوڑی چیز اگر وہ ایسی چیزوں میں سے ہے جو ہدیہ کے طور پر بھیجی جاتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر میسر نہ آئے مگر تھوڑی سی چیز تو وہ بھیج دو اسے حقیر نہ سمجھو اور وہ چیز اسے بھی قبول کرنی چاہیے جسے وہ بھیجی گئی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: یا نساء المؤمنات لا تحتقرن احدا کن لجارتھا ولو کُراع شاۃ مُحرقًا (2)۔ اے ایمان والیو! تم میں سے کوئی اپنی پڑوسن کو حقیر نہ جانے اگرچہ وہ بکری کا جلا ہوا کھر بھی ہو۔ اس حدیث کو امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔ ہم نے اس طرح اس کو ضبط کیا ہے یا نساء المومنات بغیر اضافت کے رفع کے ساتھ اور تقدیر اس طرح ہوگی یایھا النساء المومنات جیسے تو کہتا ہے: یا رجال الکرام۔ پس منادی محذوف ہے اور وہ یایھا ہے اور اس تقدیر میں النساء ایھا کی صفت ہے اور المومنات، النساء کی صفت ہے۔ اس میں یا نساء المومنات اضافت کے ساتھ بھی کہا گیا ہے لیکن پہلا قول زیادہ ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ پڑوسی کے اکرام میں سے یہ ہے کہ اسے اپنی دیوار میں شہتیر رکھنے سے منع نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے''۔ پھر حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: کیا وجہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم اس سے اعراض کرنے والے ہو؟ اللہ کی قسم! میں اس عمل کو تمہارے کندھوں کے درمیان ماروں گا (3) (یعنی تمہیں اس پر عمل کرنے پر مجبور کروں گا)۔ حدیث میں خُشُبِہ اور خَشَبَہ یعنی جمع اور مفرد دونوں طرح مروی ہے (جس کا معنی لکڑی ہے) اور اکتافکم تا کے ساتھ اور اکنافکم نون کے ساتھ بھی مروی ہے اور بھا ضمیر کا مرجع کلمہ اور قصہ ہے۔ پس کیا یہ وجوب یا ندب کا تقاضا کرتا ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا خیال ہے کہ یہ پڑوسی سے نیکی کرنے، اس سے درگزر کرنے اور اس سے احسان کرنے کے استحباب کے لیے ہے۔ اس میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 329
2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 717
3۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم والقصاص، جلد 1، صفحہ 333

وجوب نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ''کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر یہ کہ وہ خوشی سے عطا کرے''(1)۔ یہ علماء فرماتے ہیں: لا یمنع احدکم جارہ (2) کا معنی نبی کریم ﷺ کے اس قول کی مثل ہے اذا استاذنت احدکم امراتہ الی المسجد لا یمنعھا (3) تمام علماء کے نزدیک اس کا معنی استحباب ہے جب کہ آدمی اس میں صلاح اور خیر دیکھے۔ امام شافعی، اور ان کے اصحاب اور امام ابن حنبل، اسحاق، ابوثور، داؤد بن علی اور جماعت اہل حدیث کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد وجوب کے لیے ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے وجوب نہ سمجھا ہوتا تو وہ لوگوں پر غیر واجب کو واجب نہ کرتے۔ یہی حضرت عمر بن خطاب کا مذہب ہے۔ انہوں نے محمد بن مسلمہ پر ضحی ک بن خلیفہ کے لیے خلیج (نالہ) کے بارے میں فیصلہ فرمایا تھا کہ وہ محمد بن مسلمہ کی زمین سے گزارے گا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! وہ اسے گزارے گا اگر چہ تیرے پیٹ پر سے گزارے گا۔ حضرت ضحی ک کو وہ نالہ گزارنے کا حکم دیا تو ضحاک نے وہ نالہ گزارا۔ اس کو امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے کتاب ''الرد'' میں کہا۔ ہے کہ امام مالک نے کسی صحابی سے حضرت عمر کی اس مسئلہ میں مخالفت روایت نہیں کی۔ امام شافعی نے امام مالک پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے خود اس واقعہ کو روایت کیا اور اپنی کتاب میں داخل کیا لیکن اس پر خود عمل نہیں کیا بلکہ اپنی رائے سے اسے رد کیا۔ ابوعمر نے کہا: یہ اس طرح نہیں ہے جس طرح امام شافعی نے کہا ہے، کیونکہ محمد بن مسلمہ کی رائے حضرت عمر کی رائے کے خلاف تھی اور انصار کی رائے بھی حضرت عمر کی رائے کے خلاف تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے بھی نالی کو پھیرنے کے سلسلے میں حضرت عمر کی رائے سے مختلف تھی۔ جب صحابہ کرام کا اختلاف ثابت ہوا تو نظر کی طرف رجوع واجب ہوا اور نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مسلمانوں کے خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں مگر یہ کہ وہ خوش دلی سے دیں۔ یہی چیز نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہ کا قول بھی دلالت کرتا ہے مالی اراکم عنھا معرضین الخ کیا وجہ ہے کہ تم اس مسئلہ سے اعراض کرنے والے ہو؟ اللہ کی قسم! میں تمہیں اس مسئلہ پر مجبور کروں گا۔ پہلے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سہارا دینے کا فیصلہ سنت سے اس ارشاد لا یحل مالُ امرءٍ مسلم اِلاعن طیب نفس منہ (4) سے خارج ہے، کیونکہ اس کا معنی مالک بنانا، ہلاک کرنا ہے جب کہ لکڑی کا سہارا اس سے نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکم میں ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ پس اس چیز کو جمع کرنا واجب نہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے جدا جدا کیا ہے۔ امام مالک نے حکایت کیا ہے کہ مدینہ میں ایک قاضی تھا جو اس کے ساتھ فیصلہ کرتا تھا اسے ابوالمطلب کہا جاتا تھا۔ ان علماء نے اعمش عن انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا: جنگ احد میں ہم میں سے ایک نوجوان شہید ہوگیا۔ اس کی والدہ اس کے چہرے سے مٹی جھاڑ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: تجھے جنت مبارک ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''تجھے کیا معلوم؟ شاید یہ لایعنی کلام کرتا ہو اور ایسی چیز کو روکتا ہو جو اس کو نقصان دینے والی نہ ہو''۔ اعمش کا حضرت انس سے سماع ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔ یہ ابوعمرو کا قول ہے۔

1۔ مسند امام احمد حنبل، جلد 5، صفحہ 72
2۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 333
3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 183
4۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 72

مسئلہ نمبر 10۔ ایک حدیث وارد ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے پڑوسی کے منافع کو جمع فرمایا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا: ہم نے کہا: یارسول اللہ! پڑوسی کا حق کیا ہے؟ فرمایا: ''اگر وہ تجھ سے قرضہ طلب کرے تو اسے تو قرضہ دے، اگر وہ تجھ سے مدد طلب کرے تو اس کی مدد کر، اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے عطا کر، اگر وہ مریض ہو تو اس کی عیادت کر، اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ چل، اگر اسے خبر پہنچے تو وہ تجھے خوشی دے اور تو اسے مبارک دے، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تجھے بھی تکلیف ہو اور تو اس کی تعزیت کر اور اپنی ہانڈی کی خوشبو سے اسے اذیت نہ دے مگر یہ کہ تو اسے اس سے کچھ دے دے اور اس پر اپنی عمارت بلند نہ کر تا کہ تو اس پر جھانکے اور اس پر ہوا کو بند کر دے مگر یہ کہ اس کی اجازت سے، اگر تو پھل خریدے تو اس سے پڑوسی کو بھی ہدیہ دے ورنہ وہ پھل آہستہ سے اپنے گھر میں داخل کر، تیرا بچہ ایسی چیز کو باہر نہ لے جائے، جس سے پڑوسی کے بچے پریشان ہوں۔ کیا جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں تم اسے سمجھ رہے ہو؟ پڑوسی کا حق ادا نہیں کرتے مگر بہت تھوڑے جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے''۔ یا اس طرح کا کلمہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ ایک جامع حدیث ہے اس کی سند میں ابوالفصل بن مظہر الشیبانی ہے جو غیر پسندیدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ علماء نے فرمایا: پڑوسی کے اکرام میں احادیث مطلق ہیں مقید نہیں ہیں حتیٰ کہ کافر (بھی ان میں داخل ہے) جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ حدیث میں ہے صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا ہم قربانیوں کا گوشت ان کو کھلائیں؟ فرمایا: ''مسلمانوں کی قربانیوں سے مشرکوں کو مت کھلاؤ'' اور مسلمانوں کی قربانیوں سے مشرکوں کو کھلانے کی نہی یہ احتمال رکھتی ہے کہ یہ واجبی قربانیاں ہوں وہ قربانی کرنے والے کے ذمہ لازم ہوتی ہیں اور اس قربانی سے قربانی کرنے والے کے لیے خود کھانا اور دوستوں کو کھلانا جائز نہیں ہوتا۔ رہا غیر واجب جس کا اغنیاء کو کھلانا جائز ہوتا ہے تو ان کا اہل ذمہ کو کھلانا بھی جائز ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قربانی کے گوشت کی تقسیم کے وقت فرمایا: ''ہمارے یہودی پڑوسی سے شروع کر''۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی، جب حضرت عبداللہ آئے تو کہا: کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو یہ ہدیہ دیا ہے؟ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے ''جبریل مجھے پڑوسی کے بارے وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ میں گمان کرنے لگا کہ وہ اسے وارث بنا دے گا'' (1)۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ یعنی سفر کا رفیق۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ میں سے ایک شخص تھا، رسول اللہ ﷺ اور وہ شخص سواریوں پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ ایک درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے، وہاں سے دو چھڑیاں کاٹیں، ان میں سے ایک ٹیڑھی تھی، آپ ﷺ اس جھنڈ سے باہر آئے تو سیدھی چھڑی اپنے ساتھی کو دی، اس شخص نے کہا: یارسول اللہ! آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے فلاں! ایسا ہرگز نہیں ہر آدمی جو دوسرے کے ساتھ سنگت اختیار کرتا ہے اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے پوچھا جائے گا اگرچہ دن کی ایک گھڑی (2) (بھی سنگت اختیار کرے)'' ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے کہا: سفر کے لیے مروت ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 889
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 51، دار الکتب العلمیہ بیروت

حضر کے لیے مروّت ہے، سفر میں مروءت یہ ہے کہ زادِ راہ خرچ کرے اور اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرے اور کثرت سے مزاح کرے جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہ ہو۔ اور حضر میں مروءت یہ ہے کہ ہمیشہ مساجد کی طرف جانا، کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنا اور کثرت سے اللہ کی رضا میں بھائی بنانا۔ بنی اسد کے ایک شاعر نے کہا: بعض علماء نے کہا: وہ حاتم طائی تھا۔

إذا ما رفيقي لم يكن خلفَ ناقتي　　له مركب فضلاً فلا حمِلت رِجلي
ولم يك من زادي له شطرُ مِزوَدِي　　فلا كنت ذا زادٍ و كنت ذا فضل
شريكان فيما نحن فيه وقدأرى　　عليّ له فضلاً بما نال من فضلي

جب میرا ساتھی میری اونٹنی کے پیچھے اپنی سواری پر سوار نہ ہو تو میں اپنا پاؤں سواری پر نہیں رکھتا اور میرے زادِ راہ میں اس کے لیے نصف حصہ نہ ہو تو میں نہ زادِ راہ والا ہوتا ہوں، نہ میں فضل والا ہوتا ہوں، اس مال میں ہم دونوں شریک ہوتے ہیں میں اس کے لیے فضیلت دیکھتا ہوں اس وجہ سے جو اس نے میرے فضل (مال) سے پایا ہوتا ہے۔

حضرت علی اور حضرت ابن مسعود اور ابن ابی لیلی نے فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ سے مراد بیوی ہے (1)۔ ابن جریج نے کہا: وہ جو تیری سنگت اختیار کرتا ہے اور تیرے نفع کی امید پر تجھے لازم پکڑتا ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن جبیر، عکرمہ، مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔ آیت کریمہ ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ابْنِ السَّبِيْلِ۔ مجاہد نے کہا: جو تجھ سے گزرتا ہے۔ السبیل سے مراد راستہ ہے مسافر کو ابن السبیل اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ راستہ سے گزرتا ہے اور اسے لازم پکڑتا ہے۔ اسی سے احسان یہ ہے کہ اسے کچھ عطا کیا جائے، اس سے مہربانی کی جائے، اس کی راہنمائی کی جائے اور اسے صحیح راستہ بتایا جائے۔

مسئلہ نمبر 14۔ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اللہ تعالیٰ نے غلاموں سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیان کیا ہے۔ مسلم وغیرہ نے معرور بن سوید سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ربذہ کے مقام پر ابوذر کے پاس سے گزرے، ان پر ایک چادر تھی اور اسی قسم کی چادر ان کے غلام پر تھی، ہم نے کہا: اے ابوذر! اگر تم یہ دونوں چادریں لے لیتے تو تمہارا سوٹ بن جاتا۔ ابوذر نے کہا: میرے اور میرے ساتھیوں میں سے ایک کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی، اس کی ماں عجمی تھی میں نے اسے ماں کی عار دلائی۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کر دی، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! تو ایک ایسا شخص ہے جس میں ابھی جاہلیت کی خصلت ہے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جو آزاد مردوں کو گالیاں دیتا ہے وہ اس کے باپ اور ماں کو گالی دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! تو ایک ایسا شخص ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے۔ یہ (غلام) تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنایا ہے تم انہیں وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور انہیں وہ پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور انہیں ایسے کام کا مکلف نہ کرو جو انہیں مغلوب کر دے اگر انہیں ایسا مشکل کام دو تو ان کی مدد کرو'' (2)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 51، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 52

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ وہ ایک دن اپنے خچر پر سوار تھے اور ان کا غلام ان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، کسی نے حضرت ابوہریرہ سے کہا: اگر تم اس غلام کو اتار دو اور وہ پیچھے سے تمہاری سواری کو چلائے (تو بہتر ہوگا)۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: میرے ساتھ آگ کے دو شعلے ہوں میرے پیچھے وہ ہر چیز کو جلا دیں تو میرے نزدیک ان کا جلانا اس سے بہتر ہے کہ میرے غلام میرے پیچھے دوڑ رہا ہو، ابوداؤد نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تمہارے غلاموں میں سے تمہاری موافقت کرے اسے وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور اسے وہ پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور جو ان میں سے تمہاری موافقت نہ کرے تو اسے بیچ دو اور اللہ کی مخلوق کو عذاب نہ دو'' (1)۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غلام کے لیے کھانا اور لباس ہے اور اسے کسی ایسے عمل کی تکلیف نہیں دی جائے گی جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی عَبدِی اور أمتی نہ کہے بلکہ اسے فتای و فتاتی کہنا چاہیے'' (3)۔ اس کی مزید وضاحت سورۂ یوسف میں آئے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند و بالا مکارم اخلاق کی طرف بلایا اور ان پر امت کو ابھارا اور احسان کی طرف راہنمائی فرمائی اور تواضع کی روش اختیار کرنے کی راہنمائی فرمائی تا کہ وہ اپنے غلاموں پر اپنے آپ میں کوئی فضیلت نہ دیکھیں، کیونکہ تمام لوگ اللہ کے عبید (غلام) ہیں اور مال اللہ کا مال ہے، لیکن بعض کو بعض کے لیے مسخر کر دیا حکمت کے نفاذ اور نعمت کے اتمام کے لیے، بعض کو بعض کا مالک بنا دیا اگر لوگ انہیں وہ کھلائیں یا پہنائیں جو صفت و مقدار میں اس سے کم ہو جو وہ خود کھاتے اور پہنتے ہیں تو یہ بھی جائز ہے جب کہ وہ اس کے واجبات کو پورا کرتا ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے واللہ اعلم۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے جب اس کا ملازم آیا اور داخل ہوا تو آپ نے پوچھا: غلاموں کو ان کی خوراک دے دی ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: جاؤ اور انہیں خوراک دے آؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کے لیے یہی گناہ کے طور پر کافی ہے کہ وہ اپنے غلاموں سے خوراک روک لے'' (4)۔

مسئلہ نمبر 15۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غلام کو ایسی حد لگائی جس کا موجب اس نے جرم نہیں کیا تھا یا اس نے اسے طمانچہ مارا تو اس کا کفارہ اس کو آزاد کرنا ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غلام کو حد کی مقدار سزا دے حالانکہ اس پر حد واجب نہ تھی۔ کسی صحابہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں سے خادم کے لیے قصاص لیا اور خادم کو آزاد کر دیتے جب قصاص (بدلہ) کا ارادہ نہ کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائی تو اس پر قیامت کے روز اسی کوڑے حد قائم کی جائے گی'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے غلام سے اچھا سلوک نہ کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بدخلقی برائی ہے اور غلاموں سے حسن سلوک برھوتری ہے اور صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے اور صدقہ بری موت سے بچاتا ہے''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 52
3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 316
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 322

مسئلہ نمبر 16۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آزاد افضل ہے یا غلام افضل ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مصلح غلام کے دو اجر ہیں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابوہریرہ کی جان ہے! اگر اللہ کے راستہ میں جہاد، حج اور والدین سے حسن سلوک نہ ہوتا تو میں پسند کرتا کہ مجھے موت آئے تو میں غلام ہوں (1)۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غلام جب اپنے سردار سے خلوص کا اظہار کرے اور اچھی طرح اللہ کی عبادت کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں'' (2)۔ ایسی احادیث سے غلام کی فضیلت ظاہر ہوئی، کیونکہ وہ دو جہتوں سے مخاطب ہے ایک اس سے اللہ کی عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور دوسرا سردار کی خدمت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ابو عمر یوسف بن عبدالبر النمری، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن احمد العامری البغدادی الحافظ کا یہی نظریہ ہے۔

اور آزاد کو فضیلت دینے والے علماء اس سے استدلال کرتے ہیں کہ دنیا و دین کے امور میں مستقل آزاد ہوتا ہے۔ امور دنیا آزاد سے حاصل ہوتے ہیں اور غلام عدم استقلال کی وجہ سے مفقود کی مانند ہے، جس طرح آلہ ہوتا ہے جسے جبر کے ساتھ پھیرا جاتا ہے، جیسے جانور جبر کے ساتھ مسخر کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے شہادت کا منصب عظیم اور ولایت کا مرتبہ رفیع غلاموں سے چھینا گیا ہے اور ان کی حدود آزاد افراد کی حدود سے کم رکھی گئی ہیں تا کہ یہ شعور ملے کہ ان کی مقدار و منزلت کم ہے۔ آزاد سے اگر ایک جہت سے مطالبہ کیا گیا ہے تو اس میں اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور اس کا اہتمام عظیم ہے پس اس کا ثواب بھی زیادہ ہے اسی چیز کی طرف حضرت ابوہریرہ نے اشارہ کیا ہے کہ وہ اگر جہاد، حج نہ ہوتا الخ۔ اگر وہ نقص نہ ہوتا جو ان امور کے فوت ہونے کی وجہ سے غلام کو لاحق ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جبریل مجھے متواتر پڑوسی کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ یہ اسے وارث بنا دے گا اور مجھے عورتوں کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ یہ ان کی طلاق کو حرام کر دے گا اور مجھے غلاموں کے بارے وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا وہ ان کے لیے ایک مدت متعین کر دے گا جب وہ اس مدت کو پہنچیں گے تو آزاد ہو جائیں گے اور جبریل مجھے مسواک کی وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ میرا منہ گھسا دے گا۔ روایت ہے قریب تھا کہ وہ میرا منہ گھسا دے۔ اور جبریل مجھے قیام اللیل کے متعلق وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ میری امت کے نیک لوگ رات کو نہیں سوئیں گے۔ اس حدیث کو سمرقندی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ یعنی اللہ پسند نہیں فرماتا مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور رضا کی اس شخص سے نفی کر دی جو ان صفات سے متصف ہے یعنی اللہ تعالیٰ آخر میں اپنی نعمت کے آثار اس پر ظاہر نہیں فرمائے گا۔ اس میں ایک قسم کی دھمکی ہے۔ المختال تکبر کرنے والے کو کہتے ہیں اور الفخور جو تکبر کی وجہ سے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 53
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 52

اپنے مناقب شمار کرتا ہے۔ الفخر سے مراد تکبر کرنا اور بڑائی بیان کرنا ہے۔ ان دو صفات کو ذکر میں خاص کیا، کیونکہ یہ دونوں صفات انسان کو قریبی فقیر اور پڑوسی فقیر وغیرہ سے دوری پر ابھارتی ہیں۔ پس ان سے احسان کرنے کے امر الٰہی کو ضائع کر دیتا ہے۔ عاصم نے اسے الجار الجنب جیم کے فتحہ اور نون کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مفضل نے عاصم سے روایت کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: یہ مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے۔ یعنی الجار ذی الجنب، دور والا پڑوسی۔
اخفش نے یہ کہا ہے:

الناسُ جَنْبٌ والأمیر جَنْب

الجنب الناحیہ یعنی قرابت سے دور ہونے والا۔ واللہ اعلم

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۚ

"جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں لوگوں کو بھی بخل کرنے کا اور چھپاتے ہیں جو عطا فرمایا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب"۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ، اَلَّذِیْنَ، من کان سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور یہ صفت نہیں ہے۔ کیونکہ من اور ما نہ صفت بنتے ہیں نہ ان کی صفت بیان کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فخور میں مضمر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ محل رفع میں ہو اور اس پر عطف کیا گیا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور خبر محذوف ہو۔ یعنی الذین یبخلون لھم کذا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خبر یہ ہو اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یہ بھی جائز ہے کہ اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب ہو۔ پس پھر یہ آیت مومنین کے متعلق ہوگی اور یہ آیت اس تاویل پر ہوگی کہ بخل کرنے والوں سے اللہ کی محبت کی نفی کی گئی ہے پس اے مومنو! جس کا ذکر کیا گیا ہے ان سے احسان کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں فرماتا جس میں ایسی خصلتیں ہوں جو احسان سے مانع ہوں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ، بخل شرع میں مذموم ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان پر واجب کیا ہے اسے ادا نہ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 180) یہ آیت سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے اور بخل اور اس کی حقیقت کے متعلق کلام بھی ہو چکی ہے اور بخل اور شح کے فرق پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کے قول میں اس آیت سے مراد یہود ہیں، کیونکہ انہوں نے تکبر، فخر، مال پر بخل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تورات میں نازل شدہ صفات کو چھپانے کی قبیح صفات جمع کی ہوئی تھیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ منافق ہیں جن کا خرچ کرنا اور ایمان تقیہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے اور بخل کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ ان تمام اعرابی

صورتوں کی بنا پر ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والے مومنین کی دھمکی کو کافروں کی دھمکی سے جدا فرمایا ہے پہلے (مومنین) لوگوں کے لیے محبت کے نہ ہونے کی دھمکی دی اور کافروں کو عذاب مہین کی دھمکی دی۔

وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ۝

''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور وہ (بدقسمت) ہو جائے شیطان جس کا ساتھی پس وہ بہت برا ساتھی ہے''۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ اس کا الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ پر عطف فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا الکافرین پر عطف ہے اس صورت میں محل جر میں ہوگا اور جو واؤ کی زیادتی کی رائے رکھتے ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ دوسرا ان کے نزدیک پہلے کی خبر ہو۔ جمہور علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے بارے نازل ہوئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِئَآءَ النَّاسِ اور رِئَآ نفاق سے ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ یہود کے بارے نازل ہوئی۔ طبری نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس طائفہ سے ایمان باللہ اور یوم آخرت پر ایمان کی نفی کی ہے جب کہ یہودی ایسے نہ تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: مجاہد کا قول مبالغہ اور الزام پر مبنی ہے، کیونکہ آخرت کے متعلق ان کا ایمان، ایمان نہ ہونے کے مترادف تھا، کیونکہ ان کے لیے وہ نفع بخش نہیں تھا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بدر کے دن کھلانے والے لوگوں کے متعلق نازل ہوئی اور یہ مکہ کے رؤساء تھے جو لوگوں پر اس لیے خرچ کرتے تھے تاکہ وہ بدر کی طرف نکلیں۔ ابن عربی نے کہا: ریا کے طور پر خرچ کرنا احکام میں اس حیثیت سے داخل ہے کہ یہ کفایت نہیں کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ یُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ (توبہ:53) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا کلام میں اضمار ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے ولا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر فقرینھم الشیطان ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا۔ اور قرین، ساتھی اور دوست کو کہتے ہیں یہ الاقتران سے فعیل کے وزن پر ہے۔ عدی بن زید نے کہا:

عن المرء لا تسألْ وسَلْ عن قَرِينه فكلُّ قَرِينٍ بالمقارِن يَقْتَدِي

آدمی کے متعلق مت پوچھ، اس کے دوست کے بارے میں پوچھ ہر دوست اپنے دوست کی پیروی کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں شیطان کی بات کو قبول کیا اس نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 52، دار الکتب العلمیہ بیروت

کہ جس کا ساتھی آگ میں شیطان بنایا گیا وہ بہت برا ساتھی ہے۔ یعنی شیطان برا ساتھی ہے قرینا کو نصب تمیز کی بناء پر ہے۔

وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹

''کیا نقصان ہوتا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور روز آخرت پر اور خرچ کرتے اس سے جو دیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے''۔

اس آیت میں ما مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور ذا اس کی خبر ہے۔ اور ذا بمعنی الذی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما اور ذا ایک اسم ہو۔ پہلی صورت میں تقدیر یوں ہوگی وما الذی علیہم اور دوسری صورت میں تقدیر یوں ہوگی ای شیٔ علیہم (لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ) یعنی وہ واجب الوجود کی اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کی تفاصیل میں سے لے کر آئے تھے اس کی تصدیق کرتے اور خرچ کرتے اس سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا تھا۔ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا اس کا معنی و مفہوم کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰

''بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے عمل کے ثواب میں کچھ کمی نہیں فرمائے گا اگرچہ ذرہ برابر عمل ہوگا، بلکہ وہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا اور انہیں اعمال پر ثواب دے گا۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تھوڑے اور زیادہ عمل کے ثواب میں کمی نہیں فرمائے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (یونس: 44) (اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر) ذرۃ کا معنی سرخ چیونٹی ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے: یہ چیونٹیوں میں سے چھوٹی چیونٹی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ چیونٹی کا سر ہے۔ یزید بن ہارون نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ سرخ چیونٹی کا وزن نہیں ہوتا اور حکایت کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے روٹی رکھی حتیٰ کہ اس پر اتنی مقدار میں چیونٹیاں چڑھ گئی کہ انہوں نے روٹی کو ڈھانپ لیا پھر اس نے اس کا وزن کیا تو روٹی کے وزن پر کوئی اضافہ نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: قرآن و سنت چیونٹی کا وزن ہونے پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ دینار اور نصف دینار کا وزن ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: الذرۃ سے مراد رائی کا دانہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا (الانبیاء: 47) (پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو اسے بھی ہم لا حاضر کریں گے)

بعض علماء نے اس کے علاوہ قول کیے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے سے چھوٹے عمل کی بھی جزا دے گا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کسی مومن کی نیکی میں کمی نہیں فرماتا حتی کہ دنیا میں بھی اس کی برکت عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جزا عطا فرمائے گا۔ رہا کافر تو وہ اپنے اعمال خیر کے بدلے میں دنیا میں خوراک کھاتا ہے حتی کہ جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی نہ ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے گی'' (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا یعنی نیکی کا ثواب زیادہ فرمائے گا۔ اہل حجاز نے حسنةٌ یعنی رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عام قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے رفع کی صورت میں تَكُ بمعنی تحدث ہوگا اور تامہ ہوگا اور دوسری صورت میں یہ ناقصہ ہوگا۔ یعنی ان تلك فعلته حسنة یعنی اگر تیرا عمل نیکی ہوگا۔ اور حسن نے نضاعفها نون کے ساتھ پڑھا ہے جو عظمت پر دلالت کرتی ہے اور باقی قراء نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اصح ہے، کیونکہ آگے دیوتہ آیا ہوا ہے۔ ابو رجاء نے یضعفها پڑھا ہے اور باقی قراء نے یضاعفها پڑھا ہے ان دونوں لغتوں کا معنی کثرت ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا یضاعفها اس کا معنی ہے وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور یضعفها (تشدید کے ساتھ) اس کا معنی ہے وہ اسے دوگنا فرما دے گا۔

مِنْ لَّدُنْهُ یعنی من عندہ اس میں چار لغات ہیں لَدُن، لُدْن، لَدُ اور لَدَی۔ جب عرب اس کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں تو نون کو مشدد کرتے ہیں اور اس پر من داخل ہوتا ہے جہاں من ابتدائے غایت کے لیے ہوتا ہے۔ لُدُنْ بھی اسی طرح ہے۔ جب دونوں میں برابر ہو تو اس پر من کا دخول عمدہ ہے اسی وجہ سے سیبویہ نے کہا: لدن میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ابتدائے غایت کے لیے آتا ہے۔ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ یعنی جنت۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری سے ایک طویل حدیث شفاعت مروی ہے جس میں ہے کہ ''جب مومنین آگ سے نجات پائیں گے، فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ سے حق کا زیادہ مطالبہ کرنے والا نہیں جتنا کہ مومنین قیامت کے روز اپنے ان بھائیوں کے لیے کریں گے جو آگ میں ہوں گے۔ مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! وہ لوگ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، حج کرتے تھے۔ انہیں کہا جائے گا: جنہیں تم پہچانتے ہو انہیں نکالو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی وہ بہت سے لوگوں کو نکالیں گے آگ جن کی نصف پنڈلی تک اور گھٹنے تک پہنچی ہوگی، پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! آگ میں اب کوئی ایسا آدمی نہیں رہا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم دوبارہ لوٹ جاؤ تم جس کے دل میں دینار کے برابر نیکی پاؤ اسے نکالو، وہ پھر ایک جم غفیر کو نکالیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ان میں سے کوئی نہیں چھوڑا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر پاؤ اسے نکالو، وہ خلق کثیر کو نکالیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے کوئی نہیں چھوڑا جن کا تو نے ہمیں حکم دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم واپس جاؤ جس کے دل میں ذرہ برابر نیکی پاؤ اسے نکالو وہ پھر ایک خلق کثیر کو نکالیں گے، پھر کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے آگ میں کوئی نیکی نہیں چھوڑی''۔

1۔ صحیح مسلم، صفات المنافقین، جلد 2، صفحہ 374

حضرت ابوسعید خدری فرماتے تھے: اگر تم میری اس حدیث پر یقین نہ کرو تو یہ پڑھ لو اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ...... الخ (1) حضرت ابن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز ایک بندے کو لایا جائے گا اور اسے کھڑا کیا جائے گا، پھر ایک ندا دینے والا لوگوں کے سروں پر ندا دے گا، یہ فلاں بن فلاں ہے جس کا اس پر کوئی حق ہے وہ اس سے اپنا حق لے لے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا: انہیں اپنے حقوق ادا کر۔ وہ عرض کرے گا: یا رب! میں کہاں سے لوں؟ جب کہ دنیا تو ختم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کے اعمال صالحہ کو دیکھو اور ان میں سے کچھ ان پر حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو دے دو، اگر ایک ذرہ برابر نیکی بچ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے: یا رب! حالانکہ وہ ان سے زیادہ جانتا ہے۔ ہر صاحب حق کو اپنا حق دے دیا گیا ہے اور ذرہ برابر نیکی بچ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس ایک نیکی کو میرے بندے کے لیے کئی گنا کر دو اور اسے میری رحمت کے فضل کے طفیل جنت میں داخل کر دو۔ اس کا مصداق یہ آیت ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا۔

اگر وہ بندہ بدبخت ہوگا تو فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے الٰہ! اس کی نیکیاں ختم ہو گئی ہیں اور اس کی برائیاں باقی ہیں اور مطالبہ کرنے والے بہت سے باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: مطالبہ کرنے والوں کی برائیوں میں سے لے کر اس کی برائیوں کے ساتھ ملا دو، پھر اس کے لیے دوزخ کا پروانہ لکھ دو، اس تاویل پر آیت جھگڑنے والوں کے متعلق ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کسی خصم کے لیے کسی خصم پر ذرہ برابر حق نہیں چھوڑے گا، اس کے لیے اس سے حق وصول کرے گا اور ذرہ برابر کمی نہیں کرے گا جو اس کے لیے باقی ہوگی بلکہ اس کو اس پر ثواب دے گا اور اسے اس کے لیے کئی گنا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا سے یہی مراد ہے (2)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے بدلے میں بیس لاکھ نیکیاں عطا کرے گا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا عبیدہ نے کہا: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَجْرًا عَظِيْمًا تو کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے؟ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

''تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب!) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ''۔

فاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے فتحہ دیا گیا ہے اور (اِذَا) ظرف زمان ہے اور اس میں عامل جِئْنَا ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں خلیل بن احمد نے بتایا فرمایا: ہمیں ابن منیع نے بتایا فرمایا: ہمیں ابو کامل نے بتایا فرمایا: ہمیں فضیل نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103-102
2۔ تفسیر طبری، جلد 7، صفحہ 32

بتایا، انہوں نے یونس بن محمد بن فضالہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس بنی ظفر میں تشریف لائے، آپ اس چٹان پر بیٹھ گئے جو بنی ظفر میں تھی اور آپ کے ساتھ حضرت ابن مسعود، حضرت معاذ اور دوسرے چند صحابہ تھے آپ نے ایک قاری کو قرآن پڑھنے کا حکم دیا حتیٰ کہ جب وہ اس آیت پر پہنچا فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگ گئے حتیٰ کہ آپ کے رخسار تر ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: یا رب! یہ ان پر ہے جن کے درمیان میں ہوں، ان کی کیا حالت ہو گی جن کو میں نے نہیں دیکھا؟ بخاری نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ پر قرآن پڑھو، میں نے عرض کی: کیا میں آپ پر پڑھوں جب کہ آپ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ نساء پڑھی حتیٰ کہ میں فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا...... الخ پر پہنچا تو فرمایا: ٹھہر جا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو تھے'' (1)۔ مسلم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے لیکن اس میں امسك (ٹھہر جا) کے الفاظ کی جگہ رفعت راسی (میں نے اپنا سر اٹھایا) ہے یا فرمایا: غمزنی رجلٌ الی جنبی میرے پہلو میں ایک شخص تھا جس نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے اپنا سر اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا اس ہولنا کی اور شدت کی وجہ سے تھا جس کا بیان اس آیت میں ہے، کیونکہ انبیاء کو اپنی اپنی امتوں پر تصدیق وتکذیب کے لیے بطور گواہ لایا جائے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے روز بطور گواہ لایا جائے گا اور عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ سے اشارہ قریش کے کفار اور دوسرے کفار کی طرف ہے، کفار قریش کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ دوسروں کی بنسبت ان پر عذاب شدید ہو گا، کیونکہ معجزات کو دیکھنے کے وقت ان کا انکار عناد کی بنا پر تھا، وہ معجزات جو اللہ تعالیٰ نے آپ سے عادت کے خلاف ظاہر فرمائے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز ان کفار کا کیا حال ہو گا جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب!) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ۔ کیا یہ عذاب دیئے جائیں یا انعام کیے جائیں؟ یہ استفہام بمعنی توبیخ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: هٰۤؤُلَآءِ کا اشارہ تمام امت کی طرف ہے۔ ابن المبارک نے ذکر کیا کہ ہمیں ایک انصاری شخص نے بتایا اس نے منہال بن عمرو سے روایت کیا، اس نے اسے بتایا کہ اس نے سعید بن مسیب کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: لیس من یوم الا تعرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم امته غدوة وعشیة فیعرفهم بسیماهم واعمالهم فلذالك یشهد علیهم۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر صبح وشام آپ کی امت پیش کی جاتی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہر امتی کے چہرہ اور اس کے اعمال کو پہچانتے ہیں اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے متعلق گواہی دیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ۔ یعنی اس امت کے نبی کو ہم گواہ لائیں گے۔ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور آپ کو ان پر گواہ لائیں گے۔ کیف مضمر فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فکیف یکون حالهم۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور کبھی فعل مضمر کے قائم مقام اذا کو رکھا جاتا ہے اور اِذَا میں عامل جِئْنَا ہے اور شَهِيْدًا حال ہے اور حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ طالب کا شیخ پر پڑھنا اور اس پر کتاب پیش کرنا جائز ہے اور اس کا برعکس بھی جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

ہے اس کا بیان سورہ لم یکن میں حضرت ابی کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شَهِيدًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝

''اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات''۔

عَصَوُا میں واؤ کو التقاء ساکنین کی وجہ سے ضمہ دیا گیا ہے اور اس کو کسرہ دینا جائز ہے۔ نافع، ابن عامر نے تَسَّوّٰى تا کے فتحہ اور سین کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور باقیوں نے تا کے ضمہ اور سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جس کے فاعل کا ذکر نہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر زمین کو برابر کر دیتا۔ یعنی انہیں اور زمین کو برابر کر دیتا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ خواہش کریں گے کاش اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ نہ اٹھاتا اور ان پر زمین برابر رہتی، کیونکہ وہ مٹی سے نقل کیے گئے تھے پہلی اور دوسری قرأت پر الارض فاعل ہوگی معنی یہ ہوگا کہ وہ خواہش کریں گے اگر زمین ان کے لیے کھلتی اور وہ اس کے اندر چلے جاتے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: با بمعنی علی ہے یعنی کاش ان پر زمین پھٹتی اور پھر ان پر ہموار کر دی جاتی، یہ ابوالحسن سے مروی ہے۔ تشدید کی قرأت اور ادغام کی بنا پر ہے اور تخفیف تا کے حذف کی بنا پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ یہ تمنا کریں گے جب وہ دیکھیں گے کہ جانور مٹی ہو گئے ہیں اور وہ جان لیں گے کہ انہوں نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (النباء) کا یہی معنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ یہ تمنا کریں گے جب یہ امت انبیاء کو دیکھے گی جیسا کہ پہلے سورہ بقرہ آیت 143 میں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے تحت گزر چکا ہے، تو گزشتہ امتیں کہیں گی۔ ان میں زنا کار اور چور ہیں ان کی شہادت قبول نہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کا تزکیہ فرمائیں گے، پھر مشرک کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام)

پس ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا... کا یہی مطلب ہے یعنی انہیں دھنسا دیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا زجاج نے کہا: بعض نے کہا: یہ جملہ مستانفہ ہے، کیونکہ جو انہوں نے اعمال کیے وہ اللہ کی بارگاہ میں ظاہر ہیں وہ انہیں چھپانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معطوف ہے معنی ہے وہ خواہش کریں گے کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپائی نہ ہوتی، کیونکہ اس نے ان کے جھوٹ کو ظاہر کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے اس آیت کے متعلق اور وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ کے متعلق پوچھا گیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب وہ دیکھیں گے کہ جنت میں تو صرف اہل اسلام داخل ہوں گے، تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! ہم مشرک نہ تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 55، دار الکتب العلمیہ بیروت

کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔ حسن اور قتادہ نے کہا: آخرت کے بعض مقام پر وہ بولیں گے اور بعض مقام پر نہیں بول سکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے لیے ان کے اعمال ظاہر ہوں گے اور ان کا محاسبہ کیا جائے گا تو وہ کچھ نہیں چھپائیں گے۔ مزید بیان سورۂ انعام میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

''اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو (زبان سے) کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو یہاں تک کہ تم غسل کر لو اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے یا ہاتھ لگایا ہو تم نے (اپنی) عورتوں کو پھر نہ پاؤ تم پانی تو (اس صورت میں) تیمم کر لو پاک مٹی سے اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) ہاتھ پھیر دو اپنے چہروں پر اور اپنے بازوؤں پر بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا بڑا بخشنے والا ہے''۔

اس میں چوالیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى اللہ تعالیٰ نے اس خطاب کے ساتھ مومنین کو خاص فرمایا، کیونکہ وہ نماز پڑھتے تھے اور انہوں نے شراب پی تھی اور اس نے ان کے ذہنوں کو ختم کر دیا تھا پس وہ اس خطاب سے خاص کیے گئے، کیونکہ کفار تو نہ ہوش میں نماز پڑھتے تھے، نہ حالت نشہ میں۔ ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے فرمایا: جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو حضرت عمر نے دعا کی: اے اللہ! شراب کے بارے میں ہمارے لیے واضح حکم بیان فرما، تو سورہ بقرہ کی آیت يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ (بقرہ:219) نازل ہوئی۔ فرمایا: حضرت عمر کو بلایا گیا ان پر یہ آیت پڑھی گئی۔ پھر حضرت عمر نے کہا: اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے متعلق واضح حکم بیان فرما۔ تو سورۂ نساء کی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منادی ندا دیتا تھا جب نماز کھڑی ہوتی تھی کہ خبردار کوئی نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جائے۔ حضرت عمر کو بلایا گیا اور ان پر یہ آیت پڑھی گئی، حضرت عمر نے کہا: اللہ ہمارے لیے شراب کے متعلق کوئی شافی حکم بیان فرما، تو یہ آیت نازل ہوئی فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ) حضرت عمر نے کہا: ہم رک گئے (1)۔ سعید بن جبیر نے کہا: لوگ زمانہ جاہلیت کے امر پر تھے حتیٰ کہ انہیں کسی کا حکم دیا گیا یا منع کیا گیا۔ وہ ابتدائے اسلام میں شراب پیتے تھے حتیٰ کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب و من سورۃ المائدہ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 378

الْمَيْسِرِ ۚ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (بقرہ:219) کا ارشاد نازل ہوا۔ لوگوں نے کہا: ہم منفعت کے لیے پیتے ہیں گناہ کے لیے نہیں پیتے۔ پھر ایک شخص نے شراب پی اور آگے بڑھ کر نماز پڑھانے لگا اس نے قل یایھا الکافرون اعبد ما تعبدون پڑھ دیا، تو یہ آیت نازل ہوئی يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ لوگوں نے کہا: عین نماز کے علاوہ وقت میں ہم پئیں گے۔ حضرت عمر نے دعا کی: اے الله! ہم پر شراب کے بارے شافی بیان فرما، تو إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ (المائدہ:91) کا ارشاد نازل ہوا۔ حضرت عمر نے کہا: انتھینا انتھینا ہم رک گئے، ہم رک گئے۔ پھر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے چکر لگایا اور کہا: خبردار شراب حرام کی گئی ہے۔ اس کا بیان ان شاء الله سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمارے لیے حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کھانا تیار کیا ہمیں بلایا اور ہمیں شراب پلائی۔ شراب نے ہمیں مدہوش کر دیا۔ نماز کا وقت ہوا تو لوگوں نے مجھے آگے کیا۔ میں نے پڑھا قُلْ يَآ أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ ۙ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۙ، ونحن نعبد ما تعبدون۔ فرمایا الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ۔ (1)

ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال کی وجہ اور مقابل سے ترتیب کی وجہ اس طرح ہے کہ الله تعالیٰ نے پہلے فرمایا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا پھر ایمان کے بعد نماز کا ذکر فرمایا جو عبادت کی اصل ہے اسی وجہ سے نماز کے تارک کو قتل کیا جاتا ہے اور اس کا فرض ساقط نہیں ہوتا۔ کلام اس کی شروط میں جاری ہوئی جن کے بغیر یہ صحیح نہیں ہوتی۔

مسئلہ نمبر2۔ جمہور علماء اور فقہاء کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ سکر سے مراد شراب کا نشہ ہے مگر ضحاک نے کہا: سکر سے مراد نیند کا نشہ اور غلبہ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا نعس احد کم فی الصلاۃ فلیرقد حتی یذھب عنه النوم فانه لا یدری لعله یستغفر و فیسب نفسه (2)۔ جب تم میں سے نماز میں کسی پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو اسے سو جانا چاہیے حتیٰ کہ اس سے نیند کا غلبہ دور ہو جائے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ وہ تو استغفار کرنا چاہتا ہو اور وہ اپنے نفس کو (نیند کے غلبہ کی وجہ سے) گالی دے رہا ہو۔ عبیدہ سلیمانی نے کہا: وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى کا مطلب ہے جب تم پیشاب کو روکے ہوئے ہو، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی پیشاب روک کر نماز نہ پڑھے'' (3)۔ ایک روایت میں ''جبکہ وہ اپنی رانوں کو ملائے ہوئے ہو'' (4)۔

میں کہتا ہوں: ضحاک اور عبیدہ کا قول صحیح ہے، کیونکہ نماز سے مطلوب دل کے ساتھ الله تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے اور غیر الله کی طرف التفات کو ترک کرنا ہے اور نیند، حقنہ اور بھوک میں جو اس کی توجہ کو مشغول کرتی ہے اور اس کے دل کو الله تعالیٰ سے جدا کرتی ہے اور حالت کو تبدیل کرتی ہے اس سے خالی ہونا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب شام کا کھانا حاضر ہو اور نماز بھی کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا کھاؤ'' (5)۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر تشویش پیدا کرنے والی چیز کے زوال کی رعایت فرمائی ہے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127 2۔ صحیح بخاری، کتاب الوضو، جلد 1، صفحہ 34 3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، صفحہ 48

4۔ موطا امام مالک، کتاب قصر الصلوٰۃ فی سفر، صفحہ 144 5۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 208

جس سے دل متعلق ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے رب کی عبادت کی طرف خالص دل کے ساتھ متوجہ ہو اور نماز میں خشوع کرے۔ اس آیت میں یہ ارشاد قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (المومنون) بھی داخل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى سورۂ مائدہ کی آیت اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا (مائدہ:6) کے ساتھ منسوخ ہے۔ اس قول پر انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھیں پھر انہیں ہر حال میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ تحریم سے پہلے ہے۔ مجاہد نے کہا: شراب کی تحریم کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ اسی طرح عکرمہ اور قتادہ نے کہا ہے حضرت علی کی مذکور حدیث کی وجہ سے اس باب میں یہی صحیح ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: نماز کھڑی ہوگئی۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے ندا دی: نشہ والا شخص نماز کے قریب نہ جائے (1)۔ یہ نحاس نے ذکر فرمایا ہے۔ ضحاک اور عبیدہ کے قول پر یہ آیت محکمہ ہے، اس میں نسخ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْرَبُوْا۔ جب کہا جاتا ہے: لا تقرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) تو اس کا معنی ہوتا ہے یہ فعل نہ کر اور جب راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوتا ہے فعل کے قریب نہ جا۔ یہ حکم تمام امت کے غیر مدہوش لوگوں کے لیے ہے اور رہا نشہ والا، وہ چونکہ نشہ کی وجہ سے عقل ہی نہیں رکھتا تو وہ عقل نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت اس کا مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس کی پیروی کا مخاطب ہے جو اس پر واجب ہے اور نشہ کے وقت جو احکام اس نے ضائع کیے جن کا وہ نشہ سے پہلے مکلف تھا ان کا کفارہ دینے کے ساتھ مخاطب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصَّلٰوةَ یہاں الصَّلٰوةَ سے کیا مراد ہے؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس سے مراد عبادت معروفہ ہے (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد نماز کی جگہیں ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ (الحج:40) اس میں نماز کی جگہوں کو صلاۃ کہا گیا ہے اس تاویل پر دلیل یہ قول ہے وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جنبی شخص کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے نہ اس میں نماز جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے مراد مسافر ہے جب وہ پانی نہ پائے تو وہ تیمم کرے اور نماز پڑھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک جماعت نے کہا: الصلاۃ سے نماز اور نماز کی جگہیں دونوں مراد ہیں، کیونکہ وہ مسجد میں نہیں آتے تھے مگر نماز کے لیے اور وہ نماز نہیں پڑھتے تھے مگر اکٹھے ہو کر اور وہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى یہ مبتدا خبر ہیں اور تَقْرَبُوْا سے حال ہے۔ سُكٰرٰى، سکران کی جمع ہے جیسے کسلان کی جمع کسالیٰ ہے۔ نخعی نے سکری سین کے فتح کے ساتھ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے یہ سکران کی جمع مکسر ہے سکری پر اس کی جمع مکسر بنائی گئی، کیونکہ سکر ایک آفت ہے جو عقل کو لاحق ہوتی ہے پس یہ صرعی کے قائم مقام جاری ہوا اور اس کے باب پر جاری ہوا۔ اعمش نے اسے حُبلی کے وزن پر سُکریٰ پڑھا ہے اور یہ صفت مفردہ ہے اور جمع کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، جلد 2، صفحہ 161　2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57

خبر صفت مفردہ جائز ہے جس طرح جمع کے متعلق خبر واحد کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

السکر یہ صحو کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: سکر یسکر سکرا یہ باب حمد یحمد سے ہے سکرت عین تسکر یعنی اس کی آنکھ حیران ہوئی۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا (الحجر:15) سکرت الشق کا مطلب ہے میں نے اسے بند کر دیا۔

پس نشہ والا شخص اس سے رک جاتا ہے جو عقل کی وجہ سے اس پر ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں دلیل ہے بلکہ نص ہے کہ ابتداء اسلام میں شراب کا پینا حلال تھا حتیٰ کہ وہ پینے والے کو نشہ تک پہنچا دیتا۔ ایک قوم نے کہا: نشہ عقلاً حرام ہے اور کسی دین میں یہ مباح نہیں کیا گیا اور انہوں نے السکر کو اس آیت میں نیند پر محمول کیا ہے۔ قفال نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے لیے شراب مباح کی گئی تھی، کیونکہ یہ طبیعت میں سخاوت، شجاعت اور حمیت پیدا کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی عربوں کے اشعار میں موجود ہے، حضرت حسان نے کہا:

ونشربها فتترکنا ملوکا

ہم شراب پیتے ہیں یہ ہمیں بادشاہ بنا دیتی ہے۔ ہم نے اس معنی کا اشارہ سورۂ بقرہ میں کیا تھا۔ قفال نے کہا: جب وہ شراب جو عقل کو زائل کر دے حتیٰ کہ پینے والا جنون اور غشی کی حد کو پہنچ جائے تو قصداً اس کا پینا مباح نہیں کیا گیا اور اگر بغیر قصد کے اس حد تک پہنچ جائے تو وہ معاف ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اس کا بیان سورۂ المائدہ میں حضرت حمزہ کے قصہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمان نماز کے اوقات میں شراب سے اجتناب کرتے تھے اور جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو پھر شراب پیتے وہ ہمیشہ اسی معمول پر رہے حتیٰ کہ سورۂ مائدہ میں شراب کی حرمت نازل ہوئی فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ)

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یعنی حتیٰ کہ تم یقین رکھتے ہو کہ اس میں غلطی نہیں ہے اور نشہ والا شخص نہیں جانتا جو وہ کہتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: نشہ والے شخص کی طلاق لازم نہیں ہوتی (1)۔ حضرت ابن عباس، طاؤس، عطا، قاسم اور ربیعہ سے یہ مروی ہے یہی قول لیث ابن سعد، اسحاق، ابو ثور، مزنی کا ہے، طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے فرمایا: علماء کا اجماع ہے کہ معتوہ کی طلاق جائز نہیں اور سکران معتوہ (نیم پاگل) ہے، جس طرح وسواس میں مبتلا شخص وسواس کی وجہ سے معتوہ ہے اور اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ جس نے بھنگ پی اور اس کی عقل ضائع ہو گئی تو اس کی طلاق جائز نہیں اسی طرح شراب کی وجہ سے جو مدہوش ہو گیا اس کا حکم ہے۔ ایک جماعت نے نشہ والے شخص کی طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت معاویہ اور تابعین کی جماعت سے مروی ہے یہی قول امام ابو حنیفہ، ثوری اور اوزاعی کا ہے۔ اس میں امام شافعی کا قول مختلف ہے۔ امام مالک نے طلاق، زخم میں دیت اور قتل میں قصاص کو لازم کیا ہے اور نکاح اور بیع کو لازم نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: نشہ والے شخص کے افعال اور اس کی عقود تمام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57، دار الکتب العلمیہ بیروت

ثابت ہوں گی جس طرح غیر مدہوش کے ثابت ہوتے ہیں، سوائے ارتداد کے، کیونکہ جب وہ مرتد ہوگا تو اس کی بیوی اس سے جدا نہ ہوگی مگر استحساناً۔ امام ابو یوسف نے کہا: وہ نشہ کی حالت میں مرتد ہو جائے گا۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، لیکن اسے نشہ کی حالت میں نہ قتل کیا جائے گا اور نہ اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام ابو عبداللہ مازری نے کہا: ہمارے پاس ایک شاذ روایت ہے کہ نشہ والے کی طلاق لازم نہیں ہوتی۔ محمد بن عبد الحکم نے کہا: نشہ والے کی نہ طلاق لازم ہے، نہ آزادی۔ ابن شاس نے کہا: شیخ ابو الولید نے مخلط کے متعلق اختلاف ذکر کیا ہے جس کے پاس کچھ عقل باقی ہوتی ہے مگر وہ اختلاط پر ضبط کی قدرت نہیں رکھتا وہ کبھی غلط بات کرتا ہے اور کبھی درست بات کرتا ہے۔ فرمایا: نشہ والا وہ ہے جو آسمان اور زمین میں، مرد اور عورت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ تمام افعال اور احوال میں بندوں کے ساتھ معاملات میں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملات میں مجنون کی طرح ہے مگر اس صورت میں جب اس کی نمازوں کا وقت نکل جائے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے احکام ساقط نہیں ہوتے بخلاف مجنون کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نشہ اپنے اوپر خود داخل کیا جس طرح جان بوجھ کر نماز کو ترک کرنے والا ہوتا ہے حتیٰ کہ نماز کا وقت نکل جاتا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: نشہ کی حد، عقل کا اختلال ہے جب اس سے قرآن پڑھایا جائے تو قرأت میں خلط ملط کرے ایسی باتیں کرے جو معروف نہ ہوں تو اسے کوڑے لگائیں جائیں گے۔ امام احمد نے فرمایا: جب صحت کی حالت سے اس کی عقل بدل جائے تو وہ نشہ والا ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: جب اس کی قرأت میں خلط ملط ہو تو وہ نشہ والا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے استدلال کیا ہے۔ جب وہ ایسی حالت میں ہو کہ وہ نہ جانتا ہو جو وہ کہہ رہا ہو تو وہ تلویث مسجد کے خوف سے مسجد سے دور رہے اور اس کی نماز صحیح نہ ہوگی اگر وہ نماز پڑھے گا تو اسے پھر قضا کرے گا اور اگر وہ ایسی حالت میں ہو کہ وہ جانتا ہو جو وہ کہہ رہا ہو تو اسے نماز کے لیے لایا جائے گا اور اس کا حکم صحیح کا حکم ہوگا۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جُنُبًا اس کا عطف، حَتّٰى تَعْلَمُوْا میں جملہ منصوبہ کی جگہ پر ہے، یعنی تم نماز نہ پڑھو جب کہ تم جنبی ہو۔ کہا جاتا ہے: تجنبتم اجنبتم، جنبتم تمام کا ایک معنی ہے۔ الجنب کے لفظ کی نہ مونث آتی ہے، نہ تثنیہ، نہ جمع۔ چونکہ یہ مصدر کے وزن پر ہے جیسے بُعْدَ اور قُرْبَ ہیں۔ کبھی اس میں تخفیف کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جنب۔ ایک قوم نے اس طرح بھی پڑھا ہے، فراء نے کہا، کہا جاتا ہے: جنب الرجل و اجنب یہ جنابت سے مشتق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنب کی جمع ایک لغت میں اجناب آئی ہے جیسے عنق و اعناق، طنب و اطناب اور جس نے واحد کے لیے جانب کہا اس نے جمع میں جناب کہا جیسے راکب کی جمع رکاب۔ اس کا اصل معنی البعد ہے گویا جنبی آدمی ٹپک کر نکلنے والے پانی کی وجہ سے نماز سے دور ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

فلا تَحْرِمَنِّي نائلاً عن جنابةٍ فإنّي امرُؤٌ وَسْطَ القِبَاب غَرِيب

رجل جنبٌ۔ مسافر آدمی۔ الجنابہ مرد کا عورت سے ملنا۔

مسئلہ نمبر 9۔ جمہور علماء امت فرماتے ہیں: انزال کی وجہ سے یا شرمگاہ کے شرمگاہ میں تجاوز کی وجہ سے آدمی ناپاک ہو جاتا ہے مگر یہ کہ وہ غسل کر لے۔ بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انزال سے آدمی ناپاک ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انما الماء من الماء (1)۔ غسل صرف انزال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ بخاری میں ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب مرد، عورت سے جماع کرے اور اسے انزال نہ ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس حصہ کو دھو دے جو عورت سے مس ہوا ہے پھر وضو کرے اور نماز پڑھے''۔ ابو عبد اللہ (امام بخاری) نے کہا: غسل کرنا احوط ہے (2)۔ دوسری صورت ہم نے علماء کے اختلاف کے اظہار کے لیے بیان کی ہے۔ مسلم نے اس کے ہم معنی اپنی صحیح میں حدیث نقل کی ہے اور آخر میں فرمایا: ابو العلاء بن شخیر نے کہا: رسول اللہ ﷺ اپنی بعض احادیث کو بعض سے منسوخ کرتے تھے جس طرح قرآن، بعض قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ منسوخ ہے۔ ترمذی نے کہا: یہ حکم اسلام کے ابتدائی دور میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں: اسی مسئلہ پر صحابہ، تابعین اور فقہاء کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ التقاء ختانین (شرمگاہ کا شرمگاہ میں داخل ہونے) سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پہلے صحابہ کرام کا اختلاف تھا پھر تمام نے حضرت عائشہ کی اس حدیث کی طرف رجوع کیا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے فرمایا: ''جب مرد اپنی بیوی کی رانوں اور پنڈلیوں کے درمیان بیٹھے اور شرمگاہ، شرمگاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہے'' (3)۔ یہ مسلم نے روایت کی ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب مرد اپنی بیوی کی رانوں اور پنڈلیوں کے درمیان بیٹھے پھر شرمگاہ کو شرمگاہ میں داخل کر دے تو اس پر غسل واجب ہے''۔ مسلم نے یہ زائد نقل کیا ہے ''اگرچہ اسے انزال نہ بھی ہو''۔ ابن قصار نے کہا: تابعین اور بعد والے علماء کا التقاء ختانین (شرمگاہوں کا ملنا) والی حدیث پر عمل میں اجماع ہے، اس کے بعد کہ پہلے لوگوں میں اختلاف تھا۔ اختلاف کے بعد جب اجماع صحیح ہے تو یہ اختلاف کو ساقط کرنے والا ہوگا۔ قاضی عیاض نے فرمایا: ہم کسی کو نہیں جانتے صحابہ کے اختلاف کے بعد اس نے یہ کہا ہو مگر جو اعمش سے حکایت کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد داؤد اصبہانی سے حکایت کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو (الماء من الماء) والی حدیث کو چھوڑنے پر ابھارا جب لوگوں نے اس مسئلہ پر اختلاف کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس حدیث کو احتلام پر محمول کیا ہے یعنی احتلام میں پانی کے انزال سے پانی کے ساتھ غسل کرنا واجب ہوتا ہے جب انزال نہ ہو اگرچہ وہ خواب میں دیکھے کہ وہ جماع کر رہا ہے تو اس پر غسل نہیں ہے اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کہا جاتا ہے: عبرت الطریق یعنی ایک جانب سے دوسری جانب تک راستہ طے کیا۔ عبرت النهر عبورا میں نے نہر کو عبور کیا۔ هذا عبر النهر یہ نہر کا کنارہ ہے۔ کہا جاتا ہے: مَعْبر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 155
2۔ صحیح بخاری، کتاب الغسل، جلد 1، صفحہ 43
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 156

(عین کے ضمہ کے ساتھ) اور المعبر کشتی یا پل جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جاتا ہے۔ ھذا عابر السبیل یعنی راستہ سے گزرنے والا۔ ناقۃ عُبْرُ أسفار ایسی اونٹنی جس پر ہمیشہ سفر کیا جاتا ہے اور اس کے تیز چلنے کی وجہ سے صحراؤں اور گرمی کے وقت کو عبور کیا جاتا ہے۔

عَيْرَانَةٌ سُرُحُ اليَدَيْنِ شِمِلَّةٌ عُبْرُ الهَوَاجِرِ كالهِزَفِّ الخاضِبِ (1)

اونٹنی تیز رفتار، چاک وچوبند ہے گرمی کے لمحات کو عبور کرنے والی ہے جیسے لمبے پروں والے اور سرخ پنڈلیوں والی ہے۔

عبر القوم، قوم مرگئی۔ اور شاعر نے شعر کہا:

قضاء الله يغلب كلّ شئ ويلعب بالجَزُوعِ و بالصَبُورِ

فان نَعْبَرُ فإنّ لنا لُمَاتٍ وان نَغْبُرُ فنحن على نُذُورِ

شاعر کہتا ہے: اللہ کی قضا ہر چیز پر غالب ہے جزع فزع کی جائے یا صبر کیا جائے وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اگر ہم فوت ہو گئے تو ہمارے دوست ہیں اور اگر ہم بچ گئے تو بھی ہمیں ضرور موت آنے والی ہے گویا ہم نے اس کے آنے کی نذر مانی ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، مجاہد اور حکم نے فرمایا: عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے مراد مسافر ہے۔ اور نماز کے قریب جانا کسی کے لیے صحیح نہیں ہے جب کہ وہ جنبی ہو مگر غسل کے بعد مگر مسافر تیمم کرے (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے، کیونکہ عام طور پر حضر میں پانی معدوم نہیں ہوتا اور گھر میں مقیم شخص پانی کے پائے جانے کی وجہ سے غسل کر لیتا ہے اور مسافر جب پانی نہیں پاتا تو تیمم کرتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اصحاب الرائے نے مسافر جنبی کے بارے میں کہا: جو ایسی مسجد سے گزرتا ہے جس میں پانی کا چشمہ ہے تو وہ پاک مٹی سے تیمم کرے پھر مسجد میں داخل ہو، چشمے سے پانی بھرے پھر مسجد کو پانی سے باہر لے آئے۔ اور ایک جماعت نے جنبی آدمی کو مسجد میں داخل ہونے پر رخصت دی ہے۔ اور بعض نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: المومن لیس بنجیس مومن ناپاک نہیں ہے سے دلیل پکڑی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے بھی یہ کہا ہے۔ حضرت ابن مسعود، عکرمہ اور نخعی نے کہا: عابر السبیل سے مراد خطرے والا (3) جو مسجد سے گزرنے والا ہے۔ یہ عمرو بن دینار، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: جنبی آدمی مسجد سے نہ گزرے مگر یہ کہ مسجد کے علاوہ کوئی چارہ نہ پائے تو تیمم کرے اور اس میں سے گزر جائے، اسی طرح ثوری، اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے جنبی کے بارے میں کہا: جب وضو کرے تو مسجد میں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے آیت کے سبب میں روایت کیا ہے کہ انصار کی ایک قوم تھی جن کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جب ان میں سے کسی کو جنابت لاحق ہوتی تو وہ مسجد سے گزرنے پر مجبور ہوتے (4)۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے، اس کی تائید ابوداؤد کی روایت سے ہوتی ہے جو جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کی ہے فرماتی ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 57، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جبکہ ان کے اصحاب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹادو''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو لوگوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس امید سے کہ ان کے لیے رخصت نازل ہو جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹادو میں حیض والی عورت اور جنبی کے لیے مسجد کو حلال نہیں کرتا'' (1)۔ اور صحیح مسلم میں ہے ''مسجد میں کوئی کھڑکی باقی نہ رہے سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے'' (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دروازے بند کرنے کا حکم دیا، کیونکہ یہ مسجد کو گزرگاہ بنانے اور اس کو عبور کرنے کا موجب تھے حضرت ابوبکر کے اکرام اور خصوصیت کی خاطر ان کی کھڑکی کی استثناء فرمادی۔ کیونکہ عام طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جدا جدا نہیں ہوتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ''کسی کے لیے مسجد سے گزرنے اور مسجد میں بیٹھنے کی اجازت نہیں مگر علی بن ابی طالب کو اجازت ہے''۔ اس روایت کو عطیہ العوفی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں اور کسی کے لیے درست نہیں کہ وہ مسجد میں جنبی حالت میں ہو سوائے میرے اور حضرت علی کے''۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس طرح ہونا جائز ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کمرہ مسجد میں تھا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمرہ مسجد میں تھا اگرچہ وہ کمرے مسجد میں نہ تھے لیکن مسجد سے متصل تھے اور ان کے دروازے مسجد میں تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد میں شمار کیا فرمایا: ''مسلمان کے لیے مناسب نہیں'' ...... الخ۔ وہ روایت جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد میں تھا ابن شہاب کی روایت ہے جو انہوں نے سالم بن عبداللہ سے روایت کی ہے فرمایا: ایک شخص نے میرے باپ سے حضرت علی اور حضرت عثمان کے بارے پوچھا کہ ان میں سے کون بہتر ہے۔ عبداللہ نے اسے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے اور اس کے پہلو میں حضرت علی کے گھر کی طرف اشارہ کیا مسجد میں ان کے علاوہ کوئی گھر نہیں تھا۔ آگے حدیث ذکر کی۔ یہ دونوں حضرات مسجد میں جنبی نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے اپنے گھر میں جنبی ہوتے تھے۔ ان کے گھر مسجد میں سے تھے، کیونکہ ان کے دروازے مسجد میں تھے جب وہ حالت جنابت میں گھروں سے نکلتے تھے تو مسجد کے راستہ سے گزرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان دونوں حضرات کی تخصیص ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزوں کے ساتھ خاص کیا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ خاص احکام میں سے یہ بھی ہو۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص کیا ہو پس ان کے لیے وہ رخصت ہو جو دوسروں کے لیے نہ ہو اور اگر ان کے گھروں کے دروازے مسجد میں تھے حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے دروازے کے علاوہ سب دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عمرو بن میمون نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سدوا الابواب الا باب علی (3)۔ سب دروازے بند کردو سوائے حضرت علی کے دروازہ کے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 30
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 272
3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، جلد 2، صفحہ 214

فرمایا کہ ان کا دروازہ مسجد میں رہنے دیا۔ وہ اپنے گھر میں جنبی ہوتے تھے اور ان کا گھر مسجد میں تھا۔ رہا یہ قول کہ ''مسجد میں کسی کا دروازہ نہ رہے سوائے ابوبکر کے دروازہ کے''۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسجد میں کئی دروازے کھلتے تھے اور گھروں کے دروازے مسجد سے باہر تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کھڑکیوں کو بند کرنے کا حکم فرمایا لیکن حضرت ابوبکر کے اکرام کی خاطر اس کو چھوڑ دیا۔ الخوخات، سوراخ اور کھڑکی وغیرہ کو کہتے ہیں۔ حضرت علی کا دروازہ وہ مراد ہے جس سے آپ داخل ہوتے تھے اور نکلتے تھے۔ حضرت ابن عمر نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے علاوہ مسجد میں کوئی دروازہ نہ تھا۔
اگر یہ کہا جائے کہ عطا بن یسار سے ثابت ہے کہ وہ فرماتے تھے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو جنابت لاحق ہوتی تھی وہ وضو کرتے تھے پھر مسجد میں آتے تھے اور اس میں باتیں کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ جنبی آدمی کے لیے مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے جب وہ وضو کرے اور امام احمد اور اسحاق کا مذہب بھی یہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وضو، جنابت کی حدث کو دور نہیں کرتا۔ ہر جگہ جو عبادت کے لیے متعین کی جاتی ہے وہ نجاست ظاہرہ سے پاک رکھی جاتی ہے مناسب ہوتا ہے کہ وہ شخص اس جگہ داخل نہ ہو جو اس عبادت کے لیے پسندیدہ نہیں اور اس کے لیے اس عبادت سے ملتبس ہونا صحیح نہیں۔ ان کے منقولہ احوال میں سے غالب یہ ہے کہ وہ گھروں میں غسل کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ محدث (بے وضو) کا پھر کیا حکم ہے؟ ہم کہیں گے اس کا وقوع زیادہ ہوتا ہے اور ہر وقت وضو کرنا شاق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ** میں وہ ہے جو کفایت کرتا ہے۔ جب مسجد میں جنبی حالت میں ٹھہرنا جائز نہیں تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس کے لیے قرآن کو چھونا اور اس میں قرأت کرنا بھی جائز نہ ہو، کیونکہ اس کی زیادہ حرمت ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ واقعہ میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 12۔ ہمارے علماء کے نزدیک قرأت قرآن سے جنبی کو روکا جائے گا مگر یہ کہ تھوڑی سی آیات تعوذ کے لیے پڑھی جائیں (تلاوت قرآن کی نیت سے نہ ہوں)۔

موسیٰ بن عقبہ نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنبی اور حائض قرآن میں سے کوئی چیز نہ پڑھے'' (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے سفیان عن مسعر و شعبہ عن عمرو بن مرہ عن عبداللہ بن سلمہ عن علی کے سلسلہ سے روایت کی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت قرآن سے کسی کو نہیں روکتے تھے مگر یہ کہ وہ جنبی ہوتا۔ سفیان نے کہا: مجھے شعبہ نے کہا: میں نے اس سے بہتر حدیث بیان نہیں کی۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے فرمایا: حدثنا محمد بن بشار حدثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبہ عن عمرو بن مرہ۔ پھر اس کی ہم معنی حدیث روایت کی۔ یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس عن عبداللہ بن رواحہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی حالت میں ہر ایک کو قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ عکرمہ سے مروی ہے فرمایا: ابن رواحہ اپنی بیوی کے پہلو میں سوئے ہوئے تھے پھر وہ اپنی اس لونڈی کے پاس گئے جو حجرہ کے ایک کونہ میں تھی پھر اس سے مجامعت کی ان کی عورت گھبرا گئی اس نے اپنے بستر پر نہ پایا، ان کی بیوی اٹھی باہر نکلی تو اسے اپنی لونڈی پر پایا وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہاں سے چھری اٹھائی اور

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 49

نکل پڑی، اتنی دیر میں حضرت ابن رواحہ فارغ ہو چکے تھے وہ اسے ملے جب کہ وہ چھری اٹھائے ہوئے تھی۔ ابن رواحہ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ کیا ہے؟ اگر میں تجھے ایسی حالت میں پاتی جس میں پہلے میں نے تجھے دیکھا تھا تو میں تیرے کندھوں کے درمیان یہ چھری مارتی۔ ابن رواحہ نے کہا: تو نے مجھے دیکھا تھا؟ اس نے کہا: میں نے تجھے لونڈی پر دیکھا تھا۔ حضرت ابن رواحہ نے کہا: تو نے مجھے نہیں دیکھا، رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ ہم میں سے کوئی قرآن پڑھے جب کہ وہ جنبی ہو۔ بیوی نے کہا: تو پڑھ (وہ قرآن نہیں پڑھی ہوئی تھی) حضرت ابن رواحہ نے قرآن کی جگہ یہ اشعار پڑھ دیئے:

آتانا رسولُ اللهِ يَتْلُو كتابَه	كما لاحَ مشهورٌ من الفجر ساطِعُ

أتى بالهدى بعد العمى فقلوبُنا	به موقناتٌ أنّ ما قال واقِعُ

يَبِيتُ يُجافي جنبَه عن فراشه	إذا استثقلتْ بالمشركين المضاجِعُ

ہمارے پاس رسول اللہ تشریف لائے جب کہ وہ کتاب کی تلاوت کرتے تھے جس طرح فجر طلوع ہوتی ہے ہماری گمراہی کے بعد آپ ہدایت لے کر آئے ہمارے دل یقین رکھتے ہیں کہ جو آپ نے فرمایا ہے وہ یقیناً واقع ہونے والا ہے، وہ اپنے بستر سے جدا ہو کر رات گزارتا ہے جب کہ مشرکین پر بستر بھاری ہوتے ہیں۔

حضرت ابن رواحہ کی بیوی (سمجھ نہ سکی کہ یہ قرآن ہے یا اشعار ہیں) نے کہا: میں اللہ پر ایمان لائی اور میں نے آنکھ کو جھٹلایا۔ صبح ابن رواحہ رسول اللہ کے پاس گئے اور اپنا رات کا واقعہ ذکر فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے حتیٰ کہ آپ کی داڑھیں مبارک ظاہر ہو گئیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا اللہ تعالیٰ نے نماز سے منع فرمایا ہے مگر غسل کرنے کے بعد اور اغتسال کا معنی معقول ہے اور عربوں کے نزدیک اس کا لفظ معلوم ہے اس سے مراد مغسول پر پانی کے ساتھ ہاتھ ملنا ہے اسی وجہ سے عربوں نے اپنے قول غسلت الثوب اور أفضتُ عليه الماء و غمسته في الماء میں فرق کیا ہے جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لے کہ علماء کا جنبی کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ صرف اپنے جسم پر پانی انڈیل دے یا پانی میں غوطہ لگائے اور جسم کو ملے نہیں۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جسم کو ملے بغیر غسل کافی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنبی کو اغتسال کا حکم دیا ہے جس طرح وضو کرنے والے کو چہرہ اور ہاتھ دھونے کا حکم دیا ہے اور متوضی کے لیے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ پانی کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں پر ملے، اسی طرح جنبی آدمی کا جسم اور اس کا سر متوضی کے چہرہ اور ہاتھوں کے حکم میں ہے۔ یہ مزنی کا قول ہے اور اس کا اختیار ہے۔ ابو الفرج عمرو بن محمد مالکی نے فرمایا: یہ غسل کے لفظ سے معقول ہے، کیونکہ لغت میں اغتسال باب افتعال ہے اور جس نے اپنے ہاتھوں کو جسم پر نہیں مارا اور جس نے صرف پانی انڈیلا اور ہاتھ کو جسم پر نہیں مارا تو اہل زبان اسے غسل کرنے والا نہیں کہتے بلکہ اسے پانی کو انڈیلنے والا اور پانی میں غوطہ لگانے والا کہتے ہیں۔ فرمایا: اسی مفہوم پر نبی کریم سے آثار مروی ہیں، فرمایا: "ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے پس تم اپنے بالوں کو دھوؤ اور اپنی کھال کو صاف کر" (1)۔ فرمایا:

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 16

انقاء (صاف کرنا) نہیں ہوتا مگر اس پر پانی گزارنے کے ساتھ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ دو اعتبار سے حجت نہیں (۱) اس کی تاویل میں مخالفت کی گئی ہے سفیان بن عیینہ نے کہا: وانقوا البشرۃ سے مراد شرمگاہ کو دھونا اور اسے صاف کرنا ہے۔ البشرہ سے مراد شرمگاہ ہے۔ ابن وہب نے کہا: احادیث کی تفسیر میں ابن عیینہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

(۲) اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور اس میں فرمایا: یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسی طرح ابن داسہ کی روایت میں ہے اور اللولی کی روایت جوان سے مروی ہے اس میں حارث بن وجیہ ضعیف راوی ہے اور اس کی حدیث منکر ہے پس حدیث سے استدلال ساقط ہوا اور صرف زبان (لغت) پر اعتماد باقی رہ گیا جس طرح کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور اس کی تائید وہ قول کرتا ہے جو صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ لایا گیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور پیشاب کے پیچھے بہادیا اور اسے دھویا نہیں (1)۔ یہ حضرت عائشہ نے روایت کیا ہے اور اسی طرح ام قیس بنت محصن سے مروی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ جمہور علماء اور فقہاء کی ایک جماعت نے کہا: جنبی کے لیے پانی بہانا اور پانی میں غوطہ لگانا کافی ہے جب کہ پانی پورے جسم پر پہنچ جائے اگرچہ ہاتھوں سے نہ بھی ملے، کیونکہ حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ کی حدیث، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے متعلق یہی تقاضا کرتی ہے ان کی احادیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم پر پانی بہاتے تھے۔ محمد بن عبدالحکم نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوالفرج نے اس کی طرف رجوع کرلیا تھا اور اس کو امام مالک نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہاتھوں کو غسل میں جسم پر پھیرنے کا حکم دیا، کیونکہ ہوسکتا ہے جو ہاتھوں کو نہیں پھیرتا اس کے جسم کے اس حصہ تک پانی نہ پہنچے جہاں تک پانی پہنچانا واجب تھا۔ ابن عربی نے کہا: تعجب ہے ابوالفرج پر جس نے صاحب مذہب سے روایت کیا ہے کہ ہاتھ ملنے کے بغیر غسل نہیں ہوتا، حالانکہ امام مالک نے یہ نہ کبھی نصاً کہا ہے نہ تخریجاً، یہ ابوالفرج کے اوہام میں سے ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک سے نصاً روایت کیا گیا ہے۔ مروان بن محمد ظاہری نے کہا: جب کہ وہ شامی لوگوں میں ثقہ شخص ہے، فرماتے ہیں: میں نے مالک بن انس سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جس نے پانی میں غوطہ لگایا جب کہ وہ جنبی تھا اور اس نے وضو نہیں کیا تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کی نماز ہوگئی۔ ابوعمر نے کہا: اس روایت میں ہے کہ اس نے نہ ہاتھ سے جسم کو ملا اور نہ وضو کیا جب کہ امام مالک کے نزدیک غسل جائز ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ غسل جائز نہیں حتیٰ کہ وہ جسم کو ملے۔ انہوں نے چہرے اور ہاتھوں کو دھونے پر قیاس کیا ہے۔ اور جماعت کی حجت یہ ہے کہ جس نے اپنے اوپر پانی انڈیل دیا اس نے غسل کرلیا۔ عرب کہتے ہیں: بارش نے مجھے غسل دیا۔ حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا طریقہ بیان فرمایا تو انہوں نے ملنے کا ذکر نہیں فرمایا، اگر ملنا واجب ہوتا تو آپ ترک نہ فرماتے، کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں اگر آپ نے جسم کو ملا ہوتا تو آپ سے منقول ہوتا جیسا کہ پانی کے ساتھ بالوں کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 139

خلال کرنا منقول ہے اور سر پر چلو ڈالنا منقول ہے اس کے علاوہ غسل کا طریقہ اور آپ ﷺ کا وضو کرنا منقول ہے۔ ابو عمرو نے کہا: اس میں کوئی تعجب نہیں کہ عرب زبان میں ایک دفعہ ملنے، ایک دفعہ پانی انڈیلنے اور ایک دفعہ پانی بہانے سے غسل شمار کیا جاتا ہے جب ایسا ہے تو کوئی مانع نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وضو میں اپنے بندوں کو پانی کے ساتھ اپنے چہروں پر ہاتھوں کو گزارنے کا مکلف کیا ہو اور یہ اس کا غسل ہو اور وہ غسل جنابت اور حیض میں اپنے جسموں پر پانی بہا دینے کا مکلف ہو اور یہ اس کا غسل ہو جو سنت کے مطابق ہو اور لغت سے خارج نہ ہو اور ان دونوں امروں میں سے ہر امر فی نفسہ اصل ہو، ایک کو دوسرے کی طرف لوٹانا واجب نہ ہو، کیونکہ قیاساً اصول کو ایک دوسرے کی طرف نہیں لوٹایا جاتا۔ اس میں علماء امت کا کوئی اختلاف نہیں قیاساً اصول پر فروع کو لوٹایا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ کی حدیث اس کو رد کرتی ہے جو شعبہ مولی ابن عباس نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب وہ غسل جنابت کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو سات مرتبہ اور اپنی شرمگاہ کو بھی سات مرتبہ دھوتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے فرمایا: نمازیں پچاس فرض تھیں، غسل جنات سات مرتبہ تھا، کپڑے سے پیشاب کا دھونا سات مرتبہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ بار بار سوال کرتے رہے حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں، غسل جنابت ایک مرتبہ اور کپڑے سے پیشاب کو دھونا بھی ایک مرتبہ رہ گیا(1)۔ ابن عبد البر نے کہا: اس حدیث کی سند ابن عمر سے ہے اور اس میں ضعف اور لین ہے۔ اگرچہ ابو داؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور اس سے پہلے شعبہ مولیٰ ابن عباس مروی ہے اور شعبہ قوی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ کی حدیث ان دونوں احادیث کو رد کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ جو اپنے جسم پر اپنے ہاتھ نہ مار سکتا ہو تو سحنون نے کہا: قریب والا شخص اس کے جسم پر ہاتھ ملے یا وہ کپڑے کے ساتھ اس کے جسم کو ملے۔ اور ''الواضحہ'' میں ہے جہاں تک اس کے ہاتھ پہنچتے ہوں وہاں تک ہاتھوں کو گزارے پھر پانی بہائے یہاں تک کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے جہاں تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچے تھے۔

مسئلہ نمبر 16۔ جنبی آدمی کا اپنی داڑھی میں خلال کرنا۔ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ اس پر واجب نہیں ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اس پر داڑھی کا خلال واجب ہے۔ ابن عبد الحکم نے کہا: ہمارے نزدیک یہ محبوب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ غسل جنابت میں اپنے بالوں کا خلال کرتے تھے اور یہ عام ہے اگرچہ اس میں ظاہر سر کے بالوں کا خلال ہے۔ علماء کے یہی دو قول ہیں۔ معنی کے اعتبار سے غسل میں پورے جسم کو گھیرنا واجب ہے اور داڑھی کے نیچے کی جلد بھی جسم میں سے ہے پس اس تک پانی کا پہنچانا واجب ہے اور ہاتھ سے اس کو ملنا واجب ہے فرض طہارت صغریٰ میں بالوں کی طرف منتقل ہوا، کیونکہ وہ تخفیف پر مبنی ہے بدل کی نیابت کی ضرورت نہیں اسی وجہ سے خفین پر مسح جائز ہے لیکن غسل میں جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں نبی کریم کا یہ قول اس کی تائید کرتا ہے: ''ہر بال کے نیچے جنابت ہے''(2)۔

1۔ سنن ابی داود، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 33　2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 16

مسئلہ نمبر 17۔ ایک قوم نے مبالغہ کیا اور کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو واجب قرار دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ان علماء میں سے امام ابوحنیفہ بھی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناک اور منہ چہرہ سے ہیں ان کا حکم چہرے کے ظاہر کا حکم ہے جیسے رخسار اور پیشانی ہے۔ جو کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کو ترک کرے گا اور نماز پڑھے گا تو وہ نماز اعادہ کرے گا جس طرح جو شخص اعضاء کو دھوتے وقت کوئی جگہ دھونے سے چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن وضو میں جو کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو ترک کر دے اس پر اعادہ نہیں۔ امام مالک نے فرمایا: کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا نہ جنابت میں فرض ہیں، نہ وضو میں، کیونکہ یہ دونوں جگہیں پوشیدہ ہیں پس ان کا دھونا واجب نہیں جس طرح جسم کے اندر کے حصہ کو دھونا واجب نہیں۔ اسی وجہ سے محمد بن جریر طبری، لیث بن سعد، اوزاعی اور تابعین کی ایک جماعت نے بھی کہا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، حماد بن ابی سلیمان نے کہا: یہ دونوں وضو اور غسل میں فرض ہیں۔ یہ اسحاق، امام احمد بن حنبل اور بعض اصحاب داؤد کا قول ہے۔ زہری اور عطا سے اس قول کی مثل مروی ہے۔ امام احمد سے یہ بھی مروی ہے کہ کلی کرنا سنت ہے اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے۔ بعض اصحاب داؤد نے یہ بھی کہا ہے۔ اور ان علماء کی حجت جو ان کو واجب نہیں کہتے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا ذکر نہیں کیا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واجب کیا ہے اور نہ تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے۔ اور فرائض صرف ان صورتوں میں ثابت ہوتے ہیں۔ اور جنہوں نے ان دونوں کو واجب کیا، انہوں نے آیت کریمہ اور فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (المائدہ:6) سے دلیل پکڑی ہے، جو چیز دھونے میں ایک میں واجب ہوتی ہے دوسرے میں بھی واجب ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی محفوظ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو وضو میں یا غسل جنابت میں ترک کیا ہو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قولاً اور فعلاً اس کی مراد کو بیان کرنے والے ہیں اور جنہوں نے کلی اور ناک میں پانی ڈالنے میں فرق کیا ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے دلیل پکڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل تو کیا لیکن اس کا حکم نہیں دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال مستحب ہیں واجب نہیں مگر دلیل کے ساتھ اور ناک میں پانی ڈالنے کا فعل کیا بھی ہے اور اس کا حکم بھی دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہمیشہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ ہمارے علماء نے فرمایا: غسل جنابت میں نیت کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا یہ نیت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحٰق اور ابوثور کا ہے۔ اسی طرح وضو اور تیمم میں بھی نیت کرنے کا حکم ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینہ:5) سے تائید حاصل کی ہے اور اخلاص کا مطلب تقرب الی اللہ کی نیت کرنا ہے اور مومن بندوں پر جو اللہ نے فرض کیا ہے اس کی ادائیگی کا اللہ کی رضا کے لیے ارادہ کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما الاعمال بالنیات (1) اور یہ عمل ہے۔ اوزاعی اور حسن نے کہا: بغیر نیت کے وضو اور تیمم جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: پانی کے ساتھ جو طہارت حاصل کی جاتی ہے وہ بغیر نیت کے بھی جائز ہے اور تیمم نیت کے ساتھ جائز ہے۔ انہوں نے اس کو نجاست کے ازالہ پر قیاس کیا ہے کہ وہ بالا جماع بغیر

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2

نیت کے بدنوں اور کپڑوں سے دور کی جائے تو وہ پاک ہو جاتے ہیں۔ اس کو ولید بن مسلم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ پانی کی وہ مقدار جس سے غسل کیا جائے امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ بن زبیر سے انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت ایک فرق سے کرتے تھے (1)۔ الفرق را کے سکون اور حرکت کے ساتھ ہے۔ ابن وہب نے کہا: الفرق لکڑی کا یہ ایک برتن ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں: اس میں پانچ اقساط آتے تھے جو بنی امیہ کے اقساط تھے۔ محمد بن عیسیٰ اعشی نے الفرق کی تفسیر تین صاع سے کی ہے اور یہ پانچ اقساط ہیں اور فرمایا: پانچ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ مد آتے ہیں اور صحیح مسلم میں ہے سفیان نے فرمایا: الفرق، تین صاع ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد کے ساتھ وضو کرتے تھے اور ایک صاع سے لے کر پانچ مد پانی سے غسل کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے "پانچ مکا کیک سے غسل کرتے تھے اور ایک مکوک سے وضو کرتے تھے" (2)۔ یہ احادیث مخصوص کیل اور وزن کے بغیر پانی کے کم استعمال کے استحباب پر دلالت کرتی ہیں۔ انسان اتنا پانی استعمال کرے جو اسے کفایت کرے اور زیادہ پانی استعمال نہ کرے، کیونکہ زیادتی میں اسراف ہے اور اسراف مذموم ہے اور الاباضیہ کا مذہب زیادہ پانی کا استعمال کرنا ہے اور یہ شیطان کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ...... الخ۔ یہ آیت تیمم ہے یہ حضرت عبدالرحمن بن عوف کے بارے میں نازل ہوئی انہیں جنابت لاحق ہوئی جب کہ وہ زخمی تھے، تو انہیں تیمم کرنے کی رخصت دی گئی۔ پھر یہ عام لوگوں کے لیے ہوگئی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب غزوہ المریسیع میں صحابہ کو پانی کا نہ ملنا تھا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار ٹوٹ گیا تھا۔ اس حدیث کو امام مالک نے عبدالرحمن بن القاسم عن ابیہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اس آیت کو عنوان بنایا ہے۔ پھر یہ حدیث ذکر کی گئی ہے حدثنا محمد اخبرنا عبدۃ عن هشام بن عروۃ عن ابیه عن عائشه قالت هلکت قلادۃ لاسماء فبعث النبی صلی اللہ علیه وسلم فی طلبها رجالاً فحضرت الصلاۃ ولیسوا علی وضؤ ولم یجدوا ماء وصلوا وهم علی غیر وضؤ فانزل الله تعالیٰ آیة التیمم (3)۔ یعنی حضرت عائشہ نے فرمایا حضرت اسماء کا ہار گم ہوگیا (جو حضرت عائشہ نے عاریۃً ان سے لیا ہوا تھا) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اس کی تلاش میں بھیجا، نماز کا وقت ہوگیا جب کہ وہ وضو کیے ہوئے نہیں تھے انہوں نے پانی نہ پایا پس انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی، تو اللہ تعالیٰ نے آیت التیمم نازل فرمائی۔

میں کہتا ہوں: اس روایت کے ذکر کی جگہ نہیں اس میں ہے کہ حضرت اسماء کا ہار تھا۔ یہ امام مالک کی حدیث کے خلاف ہے۔ نسائی نے علی بن مسہر عن ہشام بن عروہ بن ابیہ عن عائشہ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے وہ حضرت اسماء سے عاریۃً لیا ہوا تھا حضرت عائشہ سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، وہ ہار آہستہ سے ٹوٹ کر گر گیا یہ وہ مقام تھا جس کو الصلصل کہا جاتا تھا۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اس روایت میں ہشام سے مروی ہے کہ ہار حضرت اسماء کا تھا اور حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 148		2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 149		3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

عائشہ نے ان سے عاریۃً لیا ہوا تھا۔ یہ امام مالک کی حدیث کا بیان ہے، کیونکہ انہوں نے فرمایا: حضرت عائشہ کا ہار گر گیا تھا۔ اور بخاری کی حدیث میں ہے: اسماء کا ہار گم ہو گیا تھا۔ اس میں ہے کہ اس جگہ کو الصلصل کہا جاتا تھا۔ ترمذی نے یہ حدیث اس طرح ذکر کی ہے حدثنا الحمیدی حدثنا سفیان حدثنا ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشہ انھا سقطت قلادتھا لیلۃ الابواء فارسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلین فی طلبھا۔ یعنی حضرت عائشہ کا ہار لیلۃ الابواء میں گر گیا آپ نے اس کی تلاش کے لیے دو آدمیوں کو بھیجا۔ اس روایت کو جو ہشام سے مروی ہے ہار کی نسبت حضرت اسماء کی طرف ہے لیکن حدیث نسائی کی وجہ سے یہ اضافت مستعیر ہے اور مکان کے بارے میں فرمایا: وہ الابواء تھا جیسا کہ امام مالک نے فرمایا ہے، لیکن اس میں بغیر شک کے ہے اور امام مالک کی حدیث میں فرمایا: ہم نے وہ اونٹ اٹھایا جس پر میں تھی تو ہم نے ہار اس کے نیچے پایا۔ بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہار پایا۔ ان تمام روایات کا معنی صحیح ہے۔ عقد اور قلادہ کے بارے میں نقل کرنے والوں کا اختلاف نہیں ہے اور نہ جگہ میں اختلاف ہے جو حدیث میں قدح کا باعث ہو اور نہ یہ حدیث کو کمزور کرتا ہے، کیونکہ حدیث سے مقصود اور مراد تیمم کا نزول ہے اور روایات قلادہ (ہار) کے بارے میں ثابت ہیں۔ رہا امام ترمذی کی حدیث میں یہ قول کہ آپ نے دو آدمی اس ہار کی تلاش میں بھیجے۔ بعض علماء نے فرمایا: ایک اسید بن حضیر تھا۔ شاید بخاری کی حدیث میں الرجال سے مراد یہی دو شخص ہوں اور انہیں جمع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو، کیونکہ جمع کا کم از کم فرد تثنیہ ہے یا ان دو کے پیچھے کسی اور کو بھیجا ہو پس لفظ کا اطلاق صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ وہ گئے انہوں نے تلاش کیا تو انہیں کوئی چیز نہ ملی جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اونٹ کو اٹھایا تو وہ ہار اس کے نیچے سے پالیا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو زخم لگے وہ پھیل گئے پھر وہ جنابت سے دو چار ہوئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ اس کے خلاف نہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ صحابہ کرام کو غزوات میں زخم لگے تھے جن سے وہ واپس آئے تھے، کیونکہ ان میں جنگ ہوتی تھی تو صحابہ نے شکایت کی اور ہار بھی گم ہوا تھا تو آیت تیمم نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: ہار کا گم ہونا بنی مصطلق کے غزوہ میں تھا یہ اس کے قول کے مخالف نہیں جس نے کہا کہ مریسیع کے غزوہ میں یہ معاملہ پیش آیا تھا، کیونکہ یہ ایک ہی غزوہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی المصطلق کا غزوہ شعبان 6ھ میں لڑا تھا جیسا کہ خلیفہ بن خیاط اور ابو عمرو بن عبد اللہ نے کہا ہے اور مدینہ پر حضرت ابوذر غفاری کو مقرر فرمایا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت نمیلۃ بن عبد اللہ اللیثی کو مدینہ پر مقرر فرمایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق پر حملہ کیا تھا جب کہ وہ حملہ کرنے والے تھے۔ وہ پانی پر تھے جس کو المریسیع کہا جاتا تھا یہ قدید کی طرف سے تھا جو ساحل سے متصل ہے پس آپ نے قتل کر دیا جن کو قتل کر دیا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنالیا اور اس دن مسلمانوں کا شعار تھا اُمِت اُمِت۔ بعض علماء نے کہا: بنی مصطلق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جمع ہوئے تھے اور انہوں نے آپ کا ارادہ کیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ان کی طرف نکلے اور انہیں پانی پر ملے۔ یہ تیمم کے آغاز اور اس کے سبب میں احادیث وارد ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: سورہ مائدہ کی آیت تیمم ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابو عمر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آیت تیمم نازل فرمائی اور یہی آیت وضو ہے جو سورۃ المائدہ میں ہے یا وہ آیت جو سورۃ

النساء میں ہے ان دو آیتوں کے علاوہ ہیں تیمم ذکر نہیں ہے اور یہ دونوں آیتیں مدنی ہیں۔

مسئلہ نمبر 21۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّرْضَىٰ مرض سے مراد بدن کا حد اعتدال سے نکل کر، اعوجاج اور شذوذ کی طرف چلا جانا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں زیادہ اور تھوڑا۔ جب مرض اتنی سخت ہو کہ پانی کی ٹھنڈک کی وجہ سے موت کا اندیشہ ہو یا اس بیماری کی وجہ سے جو اسے لاحق ہے پانی کے استعمال سے موت کا خطرہ ہو یا بعض اعضاء کے ضیاع کا خوف ہو تو بالا جماع تیمم کر سکتا ہے مگر حسن اور عطا سے مروی ہے کہ وہ طہارت حاصل کرے اگرچہ فوت بھی ہو جائے۔ یہ مردود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) (اور نہیں رکھی اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

دار قطنی نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ کے تحت روایت کیا ہے کہ جب آدمی کو اللہ کے راستے میں زخم لگے اور پھر وہ جنبی ہو جائے، پھر اسے خوف ہو کہ غسل کرے گا تو فوت ہو جائے گا(1) تو تیمم کر لے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: تیمم کی مریض کو رخصت دی گئی ہے۔

حضرت عمرو بن العاص نے تیمم کیا تھا جب انہیں سردی کی شدت سے ہلاک ہونے کا خوف ہوا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ غسل کا حکم دیا تھا اور نہ اعادہ کا حکم دیا تھا۔ اور اگر مرض تھوڑی ہو مگر اسے پانی کے استعمال سے مرض کے پیدا ہونے یا بڑھنے یا زخم کے آہستہ ٹھیک ہونے کا اندیشہ ہو تو بالا جماع ایسے لوگ بھی تیمم کریں۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے یہی محفوظ کیا ہے(2)۔

میں کہتا ہوں: الباجی نے اس میں اختلاف ذکر کیا ہے۔ قاضی ابو الحسن نے کہا: جیسے صحیح شخص کو نزلہ یا بخار کا اندیشہ ہو اور اسی طرح مریض کو مرض کی زیادتی کا اندیشہ ہو۔ امام ابو حنیفہ نے اس کی مثل کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: پانی کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہیں مگر اسے تلف ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر جائز ہے۔ یہ قاضی ابو الحسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: امام شافعی نے کہا: مریض کے لیے تیمم مباح نہیں ہے مگر جب تلف ہونے کا خوف ہو، کیونکہ مرض کی زیادتی متحقق نہیں ہے، کیونکہ مرض زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی زیادہ نہیں ہوتی یقینی فرض کو مشکوک خوف کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں۔ ہم نے کہا: آپ کے قول میں تناقض ہے آپ نے کہا: سردی سے تلف ہونے کا خوف ہو تو تیمم کر لے، پس جس طرح تلف ہونے کے خوف سے تیمم مباح ہے اسی طرح مرض کا خوف تیمم کو مباح کرتا ہے، کیونکہ مرض سے بچاؤ ضروری ہے جس طرح تلف سے بچاؤ ضروری ہے۔ فرمایا: امام شافعی پر تعجب ہے فرماتے ہیں: اگر پانی اپنی قیمت سے ایک حبہ (دانہ) زائد پر ملے تو اس کا خریدنا لازم نہیں تاکہ مال محفوظ رہے اور اسے تیمم کرنا لازم ہے جب کہ یہاں اسے اپنے بدن پر مرض کا خوف ہے۔ یہ ان کا ایسا کلام نہیں ہے جس کا سننا درست ہو(3)۔

میں کہتا ہوں: قشیری ابو نصر عبد الرحیم نے اپنی تفسیر میں امام شافعی کا صحیح قول ذکر کیا ہے۔ وہ مرض جس کے لیے تیمم مباح ہوتا ہے وہ ہے جس میں روح کے فوت ہونے یا بعض اعضاء کے ضائع ہونے کا خوف ہو اگر وہ پانی استعمال کرے۔ اور اگر

1۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 177 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 441

مرض کے لمبے ہونے کا خوف ہو تو صحیح قول امام شافعی کا یہ ہے کہ اس کے لیے تیمم جائز ہے۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے یحییٰ بن ایوب عن یزید بن ابی حبیب عن عمران بن ابی انس عن عبدالرحمٰن بن جبیر عن عمرو بن العاص کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: مجھے غزوہ ذات السلاسل میں ایک ٹھنڈی رات کو احتلام ہو گیا مجھے ڈر لگا کہ اگر میں غسل کروں گا تو ہلاک ہو جاؤں گا، میں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھادی، پس انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو! "تو نے اپنے ساتھیوں کو جنبی حالت میں نماز پڑھادی ہے"؟ میں نے غسل نہ کرنے کی وجہ عرض کی اور میں نے کہا: میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے سنا ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات سن کر مسکرا دیئے اور اسے کچھ بھی نہ فرمایا(1)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ خوف کی حالت میں تیمم مباح ہے اگرچہ یقین نہ بھی ہو۔ اس میں تیمم پر جنبی اسم کا اطلاق ہے اور اس میں یہ بھی جواز ہے کہ وضو کرنے والوں کو تیمم کرنے والا نماز پڑھا سکتا ہے۔ یہ ہمارے نزدیک دو اقوال میں سے ایک قول ہے اور یہ صحیح ہے۔ امام مالک نے اس کو مؤطا میں پڑھا ہے، موت تک اس کو آپ پر پڑھا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نماز نہ پڑھائے، کیونکہ وہ وضو کرنے والے سے فضیلت میں کم ہے اور امام کا حکم یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مرتبہ ہو۔ دارقطنی حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیمم کرنے والا، وضو کرنے والوں کو نماز نہ پڑھائے۔ اس کی سند ضعیف ہے(2)۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم ایک سفر میں نکلے ہم میں سے ایک شخص پر پتھر لگا اور اس کا سر زخمی کر دیا پھر اس زخمی کو احتلام ہو گیا اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: کیا تم میرے لیے تیمم میں رخصت دیکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم تیرے لیے رخصت نہیں پاتے جب کہ تو پانی پر قدرت رکھتا ہے۔ اس شخص نے غسل کیا اور وہ فوت ہو گیا۔ جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو ہم نے آپ کو بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہوں نے اسے قتل کیا ہے اللہ انہیں قتل کرے"۔ انہوں نے کیوں نہ پوچھا جب وہ جانتے نہ تھے؟ جہالت کی شفا سوال ہے، اسے تیمم کرنا کافی تھا اور زخم پر پٹی باندھنا، پھر اس پر مسح کرنا اور اپنے پورے جسم کو دھونا کافی تھا۔

دارقطنی نے کہا: حضرت ابوبکر نے کہا: یہ سنت ہے اس کے ساتھ اہل مکہ منفرد ہیں اور اہل جزیرہ نے اسے حاصل کیا اور اس کو عطا عن جابر کے سلسلہ سے زبیر بن خریق کے علاوہ کسی سے روایت نہیں کیا اور وہ قوی نہیں ہے۔ اوزاعی نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے یہ عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور یہی درست ہے۔ اوزاعی سے مختلف صورتوں میں مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اوزاعی عن عطاء۔ بعض نے فرمایا: اوزاعی سے مروی ہے کہ مجھے عطا سے یہ خبر پہنچی۔ آخر میں اوزاعی نے عطا سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کی ہے اور یہی درست ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا: میں نے ابی اور ابوزرعہ سے اس کے متعلق پوچھا تو ان دونوں نے کہا: اس کو ابن ابی العشرین نے اوزاعی سے انہوں نے اسماعیل بن مسلم سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ حدیث کو مسند ذکر فرمایا(3)۔ داؤد نے فرمایا: ہر شخص جس پر مریض کا اطلاق ہوتا ہو اس کے لیے تیمم کرنا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 178 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 185 3۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 190

مَّرۡضٰٓى (اگر تم بیمار ہو) ابن عطیہ نے کہا: یہ ایسا قول ہے جس کی مخالفت کی گئی ہے۔ علماء امت کے نزدیک تیمم اس کے لیے جائز ہے جس کو پانی کے استعمال سے موت کا خطرہ ہو یا پانی کا استعمال اسے اذیت دیتا ہو جیسے مجدور اور محصوب شخص۔ اور وہ دوسری بیماریاں جن پر پانی کے استعمال میں خوف ہوتا ہے (1) جیسا کہ حضرت ابن عباس سے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى سَفَرٍ، سَفَرٍ کے سبب تیمم جائز ہے خواہ سفر لمبا ہو یا مختصر ہو جب کہ پانی موجود نہ ہو۔ ایسے سفر کی کوئی شرط نہیں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ یہ امام مالک اور جمہور علماء کا مذہب ہے۔ ایک قوم نے کہا: وہ تیمم نہ کرے مگر اس سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے اور دوسرے علماء نے سفر طاعت کی شرط لگائی ہے یہ تمام اقوال ضعیف ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ سفر میں تیمم کے جواز پر علماء کا اجماع ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضر میں علماء کا تیمم کے جواز میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا نظریہ یہ ہے کہ تیمم سفر و حضر میں جائز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: صحیح مقیم کے لیے تیمم کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اسے تلف ہونے کا اندیشہ ہو یہی قول طبری کا ہے۔ امام شافعی، لیث اور طبری نے کہا: جب حضر میں پانی نہ ہو اور وقت کے ختم ہونے کا خوف بھی ہو تو صحیح اور بیمار تیمم کرے اور نماز پڑھے اور پھر نماز کا اعادہ کرے۔ ابو یوسف اور زفر نے کہا: حضر میں تیمم کرنا جائز نہیں نہ مرض کے لیے، نہ خوف وقت کے لیے۔ حسن اور عطا نے کہا: مریض تیمم نہ کرے جب وہ پانی پائے اور غیر مریض تیمم کرے اس اختلاف کا سبب آیت کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تیمم کی شرط میں مریضوں اور مسافروں کا ذکر کیا ہے، کیونکہ اغلب طور پر یہ وہ لوگ ہیں جو پانی نہیں پاتے جب کہ مقیم لوگ اغلب طور پر پانی پاتے ہیں اسی وجہ سے ان پر نص نہیں فرمائی۔ ہر وہ شخص جو پانی نہ پائے یا پانی کا استعمال اسے مانع ہو یا اسے نماز کے وقت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو مسافر نص کی وجہ سے تیمم کرے اور مقیم معنی کی وجہ سے تیمم کرے، اسی طرح مریض نص کی وجہ سے تیمم کرے اور صحیح معنی کی وجہ سے تیمم کرے، اسی طرح مریض نص صریح کی وجہ سے تیمم کرے اور صحیح معنی کی وجہ سے۔ اور جنہوں نے حضر میں تیمم سے منع کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیمم کی رخصت مریض اور مسافر کے لیے رکھی ہے جس طرح روزہ کا افطار اور نماز کی قصر بیمار اور مسافر کے لیے ہے اور تیمم صرف دو شرطوں کے ساتھ مباح ہے اور وہ مرض اور سفر ہیں صحیح مقیم اس میں داخل نہیں ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی شرط سے خارج ہے۔ رہا حسن اور عطا کا قول وہ پانی کے ہوتے ہوئے تمام لوگوں کو تیمم کرنے سے منع کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے پانی نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا** تیمم کسی کے لیے مباح نہیں فرمایا مگر پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ ابو عمرو نے کہا: اگر جمہور کا قول نہ ہوتا اور مروی اثر نہ ہوتا تو حسن اور عطا کا قول صحیح ہوتا۔ واللہ اعلم۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص کے لیے تیمم جائز فرمایا جب کہ وہ مسافر تھے، کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ پانی سے غسل کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے، پس مریض تیمم کا زیادہ مستحق ہے۔ میں کہتا ہوں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58

حضر میں تیمم کے جواز پر دلیل کتاب وسنت ہے جب کہ نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو جب وہ پانی کی طرف جائے۔
کتاب اللہ میں یہ ارشاد ہے: اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ یعنی مقیم جب پانی نہ پائے تو تیمم کرے۔ اس پر قشیری عبدالرحیم نے نص قائم کی انہوں نے کہا: قضا کے وجوب میں نظر قطعی ہے، کیونکہ حضر میں پانی کا عدم نادر عذر ہے اور قضا میں دو قول ہیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے اصحاب نے اس شخص کے بارے میں اسی طرح واضح فرمایا ہے جو حضر میں تیمم کرتا ہے۔ پس کیا جب وہ پانی پالے گا تو وہ نماز کا اعادہ کرے گا؟ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا اور یہی صحیح ہے۔ ابن حبیب اور محمد بن عبدالحکم نے فرمایا: وہ اعادہ کرے گا۔ یہ ابن المنذر نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ولید نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ غسل کرے اگرچہ سورج طلوع بھی ہو جائے۔

اور رہی سنت تو اس میں بخاری کی روایت ہے، جو انہوں نے ابوالجہیم بن حارث صمۃ انصاری سے روایت کی ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بئر جمل کی طرف سے آئے انہیں ایک شخص ملا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سلام کا جواب نہ دیا حتیٰ کہ آپ دیوار پر آئے، اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا پھر اسے سلام کا جواب دیا (1)۔ اس کو مسلم نے بھی نقل کیا ہے، اس میں بئر کا لفظ نہیں ہے۔ اس کو دار قطنی نے حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے اس میں ہے ثم رد علی الرجل السلام۔ یعنی پھر اس شخص پر سلام لوٹایا اور فرمایا: ”مجھے تجھ پر سلام لوٹانے سے کوئی چیز مانع نہ تھی مگر میں باوضو نہ تھا“ (2)۔

مسئلہ نمبر 24۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ، الْغَآىِٕطِ کا اصل معنی زمین کی پست جگہ ہے اور اس کی جمع الغیطان یا الاغواط آتی ہے، اسی وجہ سے غوطۃ دمشق کہتے ہیں۔ عرب قضاء حاجت کے لیے پست جگہ کا قصد کرتے تھے تا کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جائیں انسان سے نکلنے والے حدث کو بھی اتصال کی وجہ سے الغائط کہتے ہیں۔ غاط فی الارض یغوط بولا جاتا ہے زمین میں کوئی چیز غائب ہو جائے۔ زہری نے اسے الغیط سے مشتق کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ اس کی اصل الغیط ہو پھر تخفیف کی گئی ہو۔ الغوط کی واؤ کو یاء سے بدل دیا گیا۔ جس طرح لاحول میں لاحیل کہتے ہیں۔ اور او بمعنی واؤ ہے یعنی اگر تم مریض ہو یا سفر پر ہو اور تم میں سے کوئی پاخانہ سے آئے تو تیمم کرے پس تیمم کا موجب سبب حدث ہے نہ کہ مرض اور سفر۔ پس یہ حضر میں تیمم کے جواز کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور ”او“ میں صحیح یہ ہے کہ یہ اہل نظر کے نزدیک اپنے معنی میں ہے۔ ”او“ کا اپنا معنی ہے اور واؤ کا اپنا معنی ہے۔ یہ ان کے نزدیک حذف پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تم ایسے مرض میں مبتلا ہو جس میں تم پانی کو چھونے پر قدرت نہیں رکھتے یا سفر پر ہو اور پانی نہ پاؤ اور تمہیں پانی کی ضرورت ہو۔

مسئلہ نمبر 25۔ الغائط کا لفظ طہارت صغریٰ کو توڑنے والے تمام احداث کو شامل ہے۔ علماء کا ان احداث کے حصر میں اختلاف ہے۔ ان کے بارے میں عمدہ قول جو کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تین اقسام ہیں، ہمارے مذہب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے (۱) عقل کا زائل ہونا (۲) جسم سے عادۃً خارج ہونے والی اشیاء (۳) عورت کو چھونا۔ اور امام ابوحنیفہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 48　　2۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 177

کے نزدیک جسم سے جو نجاست خارج ہوتی ہے۔ امام صاحب مخرج کی رعایت نہیں رکھتے اور لمس کو بھی ناقص وضو نہیں سمجھتے۔ اور امام شافعی اور محمد بن عبد الحکم کے مذہب پر وہ چیز جو سبیلین (شرمگاہیں) سے خارج ہو۔ وہ بھی معتاد کی رعایت نہیں کرتے اور یہ لمس کو ناقص شمار کرتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو جان لے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس کی عقل، اغماء یا جنوں یا سکر (نشہ) کی وجہ سے زائل ہو جائے اس پر وضو ہے اور نیند کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ دوسرے احداث کی طرح حدث ہے یا حدث نہیں ہے یا حدث کے گمان کی جگہ ہے؟ تین اقوال ہیں دو اطراف اور ایک وسط۔

طرف اول: مزنی ابو ابراہیم اسماعیل کا خیال ہے کہ نیند حدث ہے۔ دوسرے احداث کی طرح نیند کم ہو یا زیادہ اس کی وجہ سے وضو واجب ہوتا ہے۔ امام مالک کے قول کا مقتضی بھی یہی ہے انہوں نے فرمایا: وہ وضو نہ کرے مگر اس حدث کی وجہ سے جو ذکر، دبر سے نکلے یا نیند کی وجہ سے۔ حضرت صفوان بن عسال کی حدیث کا مقتضی بھی یہی ہے، نسائی، دار قطنی، ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے(1)۔ اور تمام سے عاصم بن ابی النجود کی حدیث سے زر بن جیش سے روایت کیا ہے فرمایا: میں صفوان بن عسال مرادی کے پاس آیا، میں نے کہا: میں آپ سے خفین پر مسح کے متعلق پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت صفوان نے فرمایا: ہاں میں ایک لشکر میں تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خفین پر مسح کرنے کا حکم دیا جب ہم پاؤں دھو کر ان میں داخل کریں جب سفر میں ہوں تو تین دن مسح کریں اور جب مقیم ہوں تو ایک دن مسح کریں اور ہم پیشاب، پاخانہ اور نیند کی وجہ سے خفین کو نہ اتاریں مگر جنابت کی وجہ سے۔ اس حدیث میں اور امام مالک کے قول میں الغائط، البول اور النوم میں برابری ہے۔ علماء نے فرمایا: قیاس یہ ہے کہ نیند جب زیادہ ہو اور عقل پر غالب آ جائے تو وہ حدث ہوتی ہے پس کم نیند کا بھی یہی حکم ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دُبر کا دھاگہ آنکھیں ہیں پس جب کوئی سو جائے تو وہ وضو کرے"(2)۔ یہ حکم عام ہے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت معاویہ بن سفیان کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

دوسری طرف۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے وہ دلیل ہے کہ نیند ان کے نزدیک کسی حال میں بھی حدث نہیں ہے حتیٰ کہ سونے والے کو نیند کے علاوہ کوئی حدث لاحق ہو جائے، کیونکہ وہ اس کے سپرد ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے جب وہ سو جاتا ہے۔ اگر اس سے حدث نہ نکلے تو وہ نیند سے اٹھے اور نماز پڑھے۔ عبیدہ، سعید بن مسیب، اوزاعی اور ایک روایت میں محمود بن خالد سے یہ مروی ہے۔ جمہور علماء ان دونوں اطراف کے مخالف ہیں۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ہر سونے والا جو نیند کی وجہ سے بوجھل ہو جائے اور اس کی نیند لمبی ہو جائے تو اس پر وضو واجب ہے خواہ نیند کی حالت میں بھی ہو۔ یہی قول زہری، ربیعہ، اوزاعی اور ایک روایت میں ولید بن مسلم کا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا: اگر نیند ہلکی پھلکی ہو اس کے دل پر غالب نہ آئے تو وہ مضر نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: وضو نہیں ہے مگر اس پر جو پہلو کے بل سو جائے یا سرین کے بل سو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات عن الرسول۔ ایضاً حدیث نمبر 3458، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 27

جائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو بیٹھے ہوئے سو جائے اس پر وضو نہیں۔ ابن وہب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ ان اقوال میں سے صحیح امام مالک کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات عشاء کی نماز سے مشغول رہے آپ نے اسے مؤخر کر دیا حتیٰ کہ ہم مسجد میں سو گئے، پھر ہم بیدار ہوئے، پھر سو گئے پھر بیدار ہوئے، پھر ہمارے پاس نبی کریم ﷺ تشریف لائے پھر فرمایا: ''اہل زمین میں سے کوئی ایسا نہیں جو تمہارے علاوہ نماز کا انتظار کر رہا ہو۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے (1)'' اور یہ لفظ بخاری کے ہیں اور اسناد اور عمل کی جہت سے اس باب میں یہ حدیث واضح ہے۔ رہا مؤطا میں امام مالک کا قول اور حضرت صفوان بن عسال کا قول ان کی حدیث میں ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بھاری نیند جو نفس پر بھاری ہو جائے۔ اس حدیث کی دلیل کی وجہ سے اور اس کے ہم معنی احادیث کی وجہ سے یہی معنی مناسب ہے۔ حضرت صفوان کی حدیث کو وکیع نے مسعر سے انہوں نے عاصم بن ابی النجود سے روایت کیا ہے اس میں او نوم کی جگہ او ریح کے الفاظ ہیں۔ دارقطنی نے کہا: وکیع عن مسعر کے علاوہ کسی نے اس حدیث میں او ریح کے الفاظ روایت نہیں کیے۔

میں کہتا ہوں: وکیع امام ہے، ثقہ ہے۔ بخاری، مسلم اور دوسرے ائمہ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، پس حدیث حضرت صفوان سے اس شخص کا استدلال ساقط ہو گیا جس نے کہا کہ نیند حدث ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ضعیف ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو گئے جب کہ آپ سجدہ میں تھے حتیٰ کہ آپ نے خراٹے لیے پھر آپ اٹھے اور نماز پڑھی۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ تو سو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وضو اس پر ہے جو پہلو کے بل سو جائے جب وہ پہلو کے بل سو جائے گا تو اس کے مفاصل ڈھیلے ہو جائیں گے''۔ ابو خالد، قتادہ سے روایت کرنے میں اس میں منفرد ہے اور یہ صحیح نہیں ہے (2)۔ یہ دارقطنی کا قول ہے۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور یہ قول کہ 'وضو اس پر ہے جو پہلو کے بل سو جائے (3)'' یہ حدیث منکر ہے، اس کو ابو یزید الدالانی کے علاوہ قتادہ سے کسی نے روایت نہیں کیا اس کا ابتدائی حصہ ایک جماعت نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس میں سے کوئی چیز ذکر نہیں فرمائی۔ ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: یہ حدیث منکر ہے۔ قتادہ کے ثقہ اصحاب میں سے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا۔ ابو خالد الدلانی اس میں منفرد ہے، علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور جو کچھ ان سے نقل کیا گیا ہے وہ حجت نہیں ہے۔ رہا امام شافعی کا قول کہ ہر سونے والے پر وضو ہے مگر جو تنہا بیٹھا ہو اور ہر وہ شخص جو استوا کی حد سے زائل ہو جائے اور سو جائے تو اس پر وضو ہے۔ یہ طبری اور داؤد کا قول ہے۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ بیٹھنے والا نیند سے بوجھل نہیں ہوتا وہ خفیف نیند کے معنی میں ہوتا ہے اور دارقطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بیٹھ کر سو جائے اس پر وضو نہیں ہے اور جس نے پہلو رکھا اس پر وضو ہے'' (4)۔ رہا خارج ہونے والا عارضہ تو ہم کہتے ہیں امام

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 81
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 160
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 27۔ ایضاً حدیث نمبر 173، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 161

بخاری نے حدثنا قتیبہ قال حدثنا یزید بن زریع عن خالد عن عکرمہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک زوجہ محترمہ نے اعتکاف کیا، اس نے خون اور زردی دیکھی جب کہ تھال ان کے نیچے تھا اور وہ نماز پڑھ رہی تھی (1)، یہ نکلنے والا مواد غیر معتاد تھا، یہ ایک رگ تھی جو مرض کی وجہ سے پھٹ گئی تھی، جو اس طرح سبیلین سے نکلے ہمارے نزدیک اس کی وجہ سے وضو واجب نہیں ہوتا، جب کہ امام شافعی کا قول اس کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور ہماری توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حنفی پر رد ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ نجس خارج کی رعایت کرتا ہے پس امام مالک بن انس کا مذہب واضح اور صحیح ہے نفس میں کوئی تردد نہیں۔

مسئلہ نمبر 26۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ، نافع، ابن کثیر، ابو عمرو، عاصم اور ابن عامر نے لامستم پڑھا ہے، حمزہ اور کسائی نے لمستم پڑھا ہے (2)۔ اس کے معنی میں تین اقوال ہیں (۱) تم جماع کرو (۲) تم مباشرت (جسم کا جسم کو چھونا) کرو (۳) یہ دونوں امر جمع ہوں۔ اور اکثر علماء کے نزدیک لامستم کا بھی یہی معنی ہے مگر محمد بن یزید سے حکایت کیا جاتا ہے کہ اس نے کہا: لغت میں لامستم کا معنی قبلتم تم نے بوسہ دیا یا اس کی مثل کوئی فعل ہے، کیونکہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کے لیے فعل ہوتا ہے اور فرمایا: لمستم کا معنی چھا جانا اور جماع کرنا ہے، اس میں عورت کے لیے کوئی فعل نہیں ہے۔

علماء کے اس آیت کے حکم میں پانچ مذاہب ہیں (۱) ایک جماعت نے کہا: یہاں ملامست، ہاتھ کے ساتھ چھونے کے ساتھ مختص ہے اور جنبی کا ذکر نہیں ہے مگر پانی کے ساتھ معنی مراد میں وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى کی وجہ سے وہ اس میں داخل نہیں پس اسے تیمم کی کوئی گنجائش نہیں وہ غسل کرے گا یا نماز کو چھوڑ دے گا حتیٰ کہ وہ پانی پالے گا۔ یہ قول حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ کے قول کے ساتھ اس مسئلہ میں کسی مجتہد اور حاملین آثار میں سے کسی نے فتویٰ نہیں دیا۔ اس کی وجہ حضرت عمار، حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوذر کی حدیث ہے جو نبی کریم ﷺ سے جنبی کے تیمم کے بارے مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس قول کے برعکس قول کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ملامست سے مراد یہاں جماع ہے پس جنبی تیمم کرے گا اور ہاتھ کے ساتھ چھونے والے کا یہاں کوئی ذکر نہیں اور ہاتھ کے ساتھ چھونا نہ حدث ہے، نہ وضو کے لیے ناقص ہے۔ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو لذت کے لیے بوسہ دے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا (3) اور انہوں نے اس کو تائید دارقطنی کی حضرت عائشہ کی روایت سے دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کو بوسہ دیتے تھے پھر نماز کے لیے نکلتے تھے اور وضو نہیں فرماتے تھے۔ عروہ نے کہا: میں نے کہا: وہ نہیں ہوگی مگر تم؟ تو حضرت عائشہ ہنس پڑیں (4)۔ امام مالک نے کہا: جماع کرنے والا تیمم کرے گا اور جب ہاتھ سے چھوئے جب کہ لذت محسوس کرے تو تیمم کرے گا اور جب بغیر شہوت کے چھوئے گا تو اس پر وضو نہیں ہے۔ امام احمد اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ یہی آیت کا مقتضی ہے۔ علی بن زیاد نے کہا: اگر عورت پر موٹا کپڑا ہو تو مرد پر کچھ نہیں ہے، اگر باریک کپڑا ہو تو مرد پر وضو ہے۔ عبد الملک بن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 45
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 58
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 59
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الوضوء، جلد 1، صفحہ 138

الماجشون نے کہا: جس نے اپنی بیوی کو ملاعبت کے لیے چھوا تو وہ وضو کرے خواہ لذت محسوس ہو یا نہ ہو۔ القاضی ابو الولید الباجی نے "المنتقی" میں فرمایا: امام مالک اور ان کے اصحاب کے مذہب کی تحقیق یہ ہے کہ وضو لذت کے قصد کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اس کے بغیر نہیں اور جس نے چھونے سے لذت کا قصد کیا اس پر وضو واجب ہے، اس سے اسے لذت آئے یا لذت نہ آئے یہی معنی ہے جو "العتبیہ" میں عیسیٰ عن ابن القاسم کی روایت سے ہے۔ اور صرف حرکت کا ہونا تو ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر وضو واجب نہیں ہوتا اور ذکر کا دھونا بھی نہیں ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ لمس یا مذی ہو۔ شیخ ابو اسحاق نے کہا: اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ یہی قول امام مالک کا "مدونہ" میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب مرد اپنے جسم کو عورت کے جسم کے ساتھ لگائے خواہ وہ ہاتھ ہو یا کوئی اور عضو ہو تو اس کی طہارت ٹوٹ جائے گی۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، زہری اور ربیعہ کا یہی قول ہے۔ اوزاعی نے کہا: جب ہاتھ کے ساتھ لمس ہو تو طہارت ٹوٹ جائے گی اور اگر بغیر ہاتھ کے ہو تو طہارت نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلمسوہ بایدیھم یہ پانچ مذاہب ہیں۔ ان میں سے مضبوط امام مالک کا مذہب ہے اور یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ ملامست جماع کے علاوہ ہے اور اس سے وضو واجب ہوتا ہے اس کی طرف کثیر علماء کی رائے ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہی آیت کے معنی سے ظاہر ہے، کیونکہ اس آیت کی ابتدا میں ہے: وَلَا جُنُبًا۔ یہ جماع کا فائدہ دیتا ہے اور اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ یہ حدث کا فائدہ دیتا ہے اور لامستم، لمس اور بوسہ دینے کا فائدہ دیتا ہے پس یہ تین جملے تین احکام کے لیے ہیں یہ علم اور اعلام میں غایت ہے۔ اگر لمس سے مراد جماع ہوتا تو کلام میں تکرار ہوتا (1)۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ نے جس حضرت عائشہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ مرسل ہے اس کو وکیع نے اعمش سے انہوں نے حبیب بن ابی ثابت سے انہوں نے عروۃ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ یحییٰ بن سعید نے کہا: اعمش عن حبیب عن عروہ کی حدیث کو ذکر کیا اور فرمایا: سفیان ثوری اس کو تمام لوگوں سے زیادہ جاننے والے تھے۔ انہوں نے کہا: حبیب نے عروہ سے کچھ نہیں سنا ہے۔ یہ دارقطنی نے کہا ہے۔ اگر کہا جائے کہ تم مرسل کو بیان کرتے ہو تمہیں اس کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ ہم کہتے ہیں ہم نے آیت کے ظاہر اور صحابہ کے عمل کی وجہ سے اس حدیث کو چھوڑ دیا۔ اگر کہا جائے کہ ملامست سے مراد جماع ہے اور یہ حضرت ابن عباس سے مروی بھی ہے۔ ہم کہیں گے ان کی حضرت عمر، حضرت ابن عمر نے مخالفت کی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود جو کوفی ہیں انہوں نے بھی حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کی متابعت کی ہے پھر تم کیوں ان کی مخالفت کرتے ہو؟ اگر کہا جائے کہ ملامسۃ باب مفاعلہ ہے اور باب مفاعلہ دو آدمیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ہاتھ سے چھونا تو ایک شخص کی طرف سے ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ ملامست سے مراد جماع ہے۔ ہم کہیں گے ملامست کا مقتضیٰ دونوں جسموں کا ملانا ہے خواہ وہ ایک کی طرف سے ہو یا دونوں کی طرف سے ہو، کیونکہ ان میں سے ہر ایک لامس اور ملموس ہوتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ملامست کبھی ایک کی طرف سے بھی ہوتی ہے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملامسہ سے منع

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 444

فرمایا۔ کپڑا ممسوس (چھوا گیا) ہوتا ہے لامس (چھونے والا) نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عمر نے اپنے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: انا یومئذ قد ناھزت الاحتلام (میں اس وقت قریب البلوغ تھا) اس میں باب مفاعلہ ایک کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگر کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حدث کا سبب ذکر فرمایا اور وہ ہے پائخانہ سے آنا تو جنابت کا سبب بھی ذکر فرمایا اور وہ ہے ملامست۔ پس پانی کے نہ ہونے کے وقت حدث اور جنابت کا حکم بیان فرمایا جس طرح کہ پانی کے موجود ہونے کے وقت ان دونوں کا حکم بیان فرمایا۔ تو ہم کہیں گے ہم لفظ کو جماع اور لمس پر محمول کرنے سے منع نہیں کرتے۔ یہ دونوں حکموں کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور لمستم بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا امام شافعی کا مذہب کہ جو عورت کو اپنے بعض اعضاء سے چھوئے جب کہ اس کے اور عورت کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو شہوت کے لیے ہو یا بغیر شہوت کے ہو اس پر وضو واجب ہے۔ یہ قرآن کا ظاہر ہے۔ اس طرح اگر عورت نے مرد کو چھوا تو پھر بھی مرد پر وضو واجب ہے، لیکن بالوں کو چھوا تو وضو واجب نہ ہوگا، کیونکہ جس نے عورت کے بالوں کو چھوا اس پر وضو نہیں خواہ اس نے شہوت سے چھوا ہو یا بغیر شہوت کے۔ اسی طرح دانتوں اور ناخنوں کو چھونے کا حکم ہے، کیونکہ یہ جسم کے مخالف ہیں اگر احتیاطاً بالوں کو چھونے والا وضو کر لے تو اچھا ہے۔ اگر مرد نے ہاتھ سے چھوا یا عورت نے مرد کو اپنے ہاتھ سے چھوا کپڑے کے اوپر سے، پھر لذت محسوس کی یا لذت محسوس نہ کی تو اس پر کچھ نہیں ہوگا حتیٰ کہ دوسرے جسم تک جسم کو پہنچائے، خواہ عمداً ایسا کرے یا بھول کر کرے، عورت زندہ ہو یا مردہ ہو جب کہ وہ اجنبیہ ہو۔ جب کوئی چھوٹی بچی کو چھوئے یا بوڑھی کے ہاتھ سے چھوئے یا اپنی کسی محرم عورت کو چھوئے جس سے اس کا نکاح حلال نہیں ہے، اس کے متعلق ان کا قول مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: وضو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ اس میں بچی، بوڑھی کی کوئی تفریق نہیں فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وضو نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ ان میں شہوت کا کوئی دخل نہیں۔ مروزی نے کہا: امام شافعی کا قول ظاہر کتاب کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔ شہوت اور غیر شہوت کا ذکر نہیں فرمایا۔ اسی طرح جن صحابہ نے وضو کو واجب کہا ہے انہوں نے بھی شہوت کی شرط نہیں لگائی۔ فرمایا: یہی عام تابعین کا قول ہے۔ مروزی نے کہا: امام مالک جو کپڑے کے اوپر سے لذت اور شہوت کی رعایت کرتے ہیں اور وضو کو واجب کرتے ہیں اس پر ان کی موافقت لیث بن سعد نے کی ہے۔ ہم نہیں جانتے ان کے علاوہ کسی نے ایسا کہا ہو۔ فرمایا: یہ نظر میں بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس نے ایسا کیا وہ عورت کے کپڑے کو چھونے والا ہے۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر چھونے سے اسے لذت محسوس ہو تو اس پر وضو واجب نہیں اسی طرح کپڑے کے اوپر سے جس نے چھوا وہ عورت کو چھونے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: مروزی نے جو ذکر کیا ہے کہ امام مالک کی صرف لیث بن سعد موافقت کرنے والے ہیں۔ حافظ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ یہی قول اسحاق اور امام احمد کا ہے۔ امام شعبی اور امام نخعی سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: جب چھوئے اور لذت محسوس ہو تو وضو واجب ہے اگر لذت محسوس نہ ہو تو وضو واجب نہیں رہا۔ یہ قول کہ نظر میں یہ صحیح نہیں۔ یہ بھی ان کا قول صحیح نہیں۔ حضرت عائشہ سے صحیح خبر میں آیا ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سوئی ہوئی تھی اور میرے پاؤں آپ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ سے اشارہ

کرتے تو میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی اور جب آپ کھڑے ہوتے تو میں پھر پاؤں پھیلا دیتی، فرمایا: اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے (1)۔ یہ نص ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کو چھوتے تھے، کیونکہ آپ حضرت عائشہ کے پاؤں چھوتے، جیسا کہ قاسم کی روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے،" جب آپ سجدہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو میرے پاؤں کو چھوتے تو میں پاؤں سکیڑ لیتی (2)" اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ اَوْ لٰمَسْتُمُ کے قول کے عموم کو خاص کرتی ہے۔ آیت کے ظاہر کی وجہ سے ہر چھونے والے کا وضو ٹوٹ جانا واجب ہے خواہ وہ جیسے بھی چھوئے۔ سنت اور کتاب اللہ کا بیان ہے کہ وضو بعض چھونے والوں پر ہے اور بعض پر نہیں ہے اور جن پر وضو نہیں ہے وہ ایسے افراد ہیں جو لذت محسوس نہ کریں اور نہ لذت کا قصد کریں۔ اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ شاید حضرت عائشہ کے قدموں پر کپڑا ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے پاؤں کو اپنی آستین ماری ہو۔ ہم کہیں گے الغمز کی حقیقت ہاتھ مارنا ہے۔ اسی سے ہے: غمز الکبش۔ یعنی تو مینڈھے کو روک لیتا ہے تا کہ تو دیکھے کہ کیا وہ موٹا ہے یا نہیں؟ آستین کے ساتھ مارنا غمز نہیں کہلاتا۔ عام طور پر سونے والے آدمی کا پاؤں ظاہر ہوتا ہے خصوصاً اس کے پاؤں لمبے کرنے اور اس کو سکیڑنے کی حالت میں۔ یہی حالت اس وقت بھی تھی۔ کیا آپ نے حضرت عائشہ کا عمل ملاحظہ نہیں فرمایا کہ جب آپ کھڑے ہوتے تو حضرت عائشہ ٹانگیں پھیلا دیتیں اور آپ کا قول کہ" اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے"۔ حضرت عائشہ سے صراحۃً مروی ہے فرماتی ہیں میں اپنی ٹانگیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمت کیے ہوئے ہوتی تھی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے تھے، جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے اپنا ہاتھ مارتے تو میں ٹانگیں سکیڑ لیتی جب آپ کھڑے ہوتے تو اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غمز حقیقت میں ہاتھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا میں نے آپ کو تلاش کیا تو میرے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے بطن پر پڑے جب کہ آپ مسجد (سجدہ) میں تھے اور آپ کے پاؤں سیدھے کھڑے تھے (3)۔ (الحدیث) جب حضرت عائشہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ہاتھ رکھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کو لمبا کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا مگر بعض چھونے والوں کا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کے قدموں پر کوئی چیز موجود ہو جیسا کہ مزنی نے کہا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قدم، قدم تب کہلاتا ہے جب کوئی چیز حائل نہ ہو حتیٰ کہ حائل ثابت ہو جائے۔ اصل یہی ہے کہ ہر چیز ظاہر پر محمول ہوتی ہے بلکہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے نص کی مانند مواد جمع ہو جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کو مجبور کرے اور مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ سے مل جائے جب کہ عورت کو لذت نہ ہوئی ہو یا وہ سوئی ہوئی ہو اور لذت محسوس نہ کرے اور اسے شہوت نہ ہو تب بھی عورت پر غسل واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کا حکم ہے جس نے شہوت کے ساتھ بغیر شہوت کے بوسہ دیا یا چھوا تو اس کی طہارت ٹوٹ گئی اور اس پر وضو واجب ہے، کیونکہ ٹٹولنے، چھونے اور بوسہ دینے میں فعل ہے نہ کہ لذت۔ ہم کہیں گے ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اعمش وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے جس اجماع کا تم نے دعویٰ یا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 56 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 74 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 192

تھا ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ اجماع سے استدلال محل نزاع ہے پس یہ لازم نہیں ہوگا اور ہم نے اپنے مذہب کی صحت پر احادیث صحیحہ سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے کہا: جیسا کہ تم نے کہا ہے کہ اس قول کی طرف پہلے کوئی نہیں گیا، حالانکہ ان کے شیخ امام مالک کا یہی قول ہے جیسا کہ ہمارے نزدیک مشہور ہے۔ "جب حدیث صحیح ہے تو تم اس کو لازم پکڑو اور میرے قول کو چھوڑ دو"۔ جب حدیث اس کے متعلق ثابت ہے تو پھر تم اس کا اقرار کیوں نہیں کرتے پس تمہارے مذہب کے مطابق جو شخص اپنی بیوی کو مارے اور اسے ادب سکھانے کے لیے ہاتھ سے طمانچہ مارے اور اس پر سختی کرنے کے لیے ایسا کرے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ مقصود فعل کا وجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق کوئی بھی ایسا نہیں کہتا۔ امام مالک اور دوسرے ائمہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نواسی امامہ بنت ابی العاص کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے نماز پڑھی جب آپ رکوع فرماتے تو اسے اتار دیتے اور جب سجدہ سے اٹھتے تو اسے پھر سے اٹھا لیتے (1)۔ یہ امام شافعی کے ایک قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا ہے کہ اگر کسی نے چھوٹی بچی کو چھوا تو اس کی طہارت ٹوٹ گئی آپ نے النساء کے لفظ سے دلیل پکڑی ہے۔ یہ ضعیف ہے، کیونکہ چھوٹی بچی کا چھونا دیوار کو چھونے کی مانند ہے اور ذوات المحارم کے بارے میں امام شافعی کا قول مختلف ہے، کیونکہ اس میں لذت کا اعتبار نہیں کرتے۔ ہم لذت کا اعتبار کرتے ہیں جہاں لذت پائی جائے گی وہاں حکم پایا جائے گا اور یہ وضو کا وجوب ہے۔ رہا اوزاعی کا قول کہ وہ خاص ہاتھ سے چھونے کا اعتبار کرتے ہیں، کیونکہ چھونا اکثر ہاتھ سے ہوتا ہے، پس اس نے ہاتھ سے چھونے کو خاص کیا ہے دوسرے اعضاء کا اعتبار نہیں کیا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے پاؤں اپنی عورت کے کپڑوں میں داخل کرے اور اس کی شرمگاہ یا اس کے بطن کو مس کرے تو اس سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور جو اپنی بیوی کو بوسہ دیتا ہے اس کے بارے میں فرمایا: اگر وہ مجھ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے گا تو میں اسے وضو کرنے کو کہوں گا اور اگر وہ وضو نہیں کرے گا تو میں اس کو عیب نہیں لگاؤں گا۔ ابوثور نے کہا: اس پر وضو نہیں جس نے اپنی بیوی کو بوسہ دیا یا جسم سے جسم لگایا یا اسے چھوا۔ یہ امام ابوحنیفہ کے مذہب پر مسئلہ تخریج کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 27۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً یعنی تم وہ اسباب نہ پاؤ جن کے ساتھ مسافر پانی پاتا ہے اور وہ یا تو سارے اسباب نہ پائے یا بعض اسباب نہ پائے یا اسے دوست کے فوت ہونے کا خوف ہو یا پانی طلب کرنے کی صورت میں سواری پر خوف ہو یا اسے چوروں یا درندوں کا خطرہ ہو یا وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا اپنے اوپر پیاس کا اندیشہ ہو یا دوسروں کی پیاس کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح اسے شوربا کی ضرورت ہو جو وہ اپنے نفس کی مصلحت کے لیے پکاتا ہے۔ ان مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت پائی جائے تو وہ تیمم کرے اور نماز پڑھے اور مریض کے لیے پانی کا نہ ہونا سمجھا جائے گا اگر وہ ایسا شخص نہ پائے جو اسے پانی دے یا اسے پانی کے استعمال سے نقصان کا خدشہ ہو اور صحیح مقیم کے لیے پانی کا نہ ہونا سمجھا جائے گا جب کہ وہ بہت مہنگا ملتا ہو اور یہ مہنگائی تمام صورتوں کو شامل ہے یا وہ مقیم شخص قید کیا گیا ہو یا باندھا گیا ہو۔ حسن نے کہا: آدمی اپنے تمام مال سے پانی کو خریدے اور خود مال سے محروم رہ جائے۔ یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ دین آسان

1۔ موطا امام مالک، کتاب جامع الصلوٰۃ، صفحہ 156

ہے۔ایک گروہ نے کہا: وہ شخص مال کے ساتھ پانی خریدے جب اسے قیمت سے تہائی یا کچھ زائد قیمت نہ دینی پڑے۔ایک طائفہ نے کہا: درہم کی قیمت کا پانی دو اور تین دراہم کے ساتھ خریدے۔ یہ تمام امام مالک کے مذہب میں اقوال ہیں۔اشہب سے پوچھا گیا: کیا ایک مشکیزہ دس دراہم میں خریدا جائے گا؟ انہوں نے کہا: میں لوگوں پر یہ تکلیف نہیں دیکھتا۔امام شافعی نے فرمایا: بغیر زیادہ قیمت کے خریدے۔

مسئلہ نمبر 28۔علماء کا اختلاف ہے کہ کیا صحت تیمم میں پانی کا طلب کرنا شرط ہے یا نہیں؟ امام مالک کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ یہ شرط ہے۔یہی امام شافعی کا قول ہے۔قاضی ابو محمد بن نصر کا نظریہ ہے کہ پانی طلب کرنا صحت تیمم کے لیے شرط نہیں۔یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ان کے راستہ سے دوغلوۃ (600 سو ہاتھ سے لے کر 800 ہاتھ) تک کے فاصلے پر سفر میں پانی ہوتا تو وہ اپنے راستہ سے نہ پھرتے۔اسحاق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی طلب کرنا لازم نہیں مگر اپنی جگہ میں (جہاں وہ ہے) اور انہوں نے حضرت ابن عمر کی حدیث ذکر کی ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔اور مؤطا میں امام مالک کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ تیمم کا استعمال کرنا جائز نہیں مگر پانی طلب کرنے کے بعد۔اور قیاس کی جہت سے بھی یہی درست ہے، کیونکہ یہ بدل ہے اس کا حکم دیا گیا ہے مبدل سے عجز کی صورت میں اور اس کا فعل جائز نہیں مگر مبدل کے یقینی طور پر نہ ہونے کے ساتھ جس طرح کفارہ میں غلام آزاد کرنے کے ساتھ روزہ ہے۔

مسئلہ نمبر 29۔جب یہ ثابت ہو جائے گا اور پانی معدوم ہوگا تو مندرجہ ذیل صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔مکلف وقت کے اندر پانی ملنے سے مایوس ہوگا یا اسے پانی ملنے کا گمان غالب ہوگا اور اسے پانی ملنے کی قوی امید ہوگی یا دونوں صورتیں برابر ہوں گی۔یہ تین احوال ہیں (1) اس کے لیے اوّل وقت میں تیمم کرنا اور نماز پڑھنا مستحب ہے، لیکن جب پانی کی فضیلت فوت ہوگی تو اس کے لیے اوّل وقت کی فضیلت بچانا مستحب ہے۔

(۲) وقت کے درمیان تیمم کرے یہ امام مالک کے اصحاب نے امام مالک سے حکایت کیا ہے پس وہ پانی کی فضیلت کے ادراک کی امید پر نماز کو مؤخر کرے جب تک کہ پہلے وقت کی فضیلت فوت نہ ہو، کیونکہ پہلے وقت کی فضیلت درمیانے وقت میں پائی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ پہلے وقت کے قریب ہے

(۳) نماز کو آخر وقت میں پانی ملنے تک مؤخر کرے، کیونکہ پانی کی فضیلت اوّل وقت کی فضیلت سے اعظم ہے، کیونکہ اول وقت کی فضیلت مختلف فیہ ہے اور پانی کی فضیلت متفق علیہ ہے اور اوّل وقت کی فضیلت کا بغیر ضرورت کے ترک کرنا جائز نہیں اور پانی کی فضیلت کا ترک کرنا ضرورت کے لیے جائز ہے اور اس میں وقت، آخری وقت مختار ہے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ اگر وقت کے آخر میں پانی کو پالینا جان لے پھر وقت کی ابتدا میں تیمم کرے اور نماز پڑھ لے تو ابن قاسم نے کہا: یہ جائز ہوگا اگر پانی پالے گا تو وقت میں اعادہ کرے گا۔عبد الملک بن الماجشون نے کہا: اگر پانی اس کے بعد پالے گا تو اعادہ کرے گا۔

مسئلہ نمبر 30۔اس پانی کے پانے کا اعتبار ہوگا جو طہارت کے لیے کافی ہو، کیونکہ اگر کفایت سے کم پانی پائے تو تیمم

کرے اور جو تھوڑا سا پانی پائے اس کو وضو کے لیے استعمال نہ کرے۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا ایک قول یہی ہے۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو فرض کیا ہے پانی یا مٹی۔ اگر پانی اتنا نہ ہو جو تیمم سے مستغنی کر دے تو اس پانی کا شرعاً موجود نہ ہونا سمجھا جائے گا، کیونکہ اس کے پائے جانے سے مراد اس کا کفایت کرنا ہے۔ امام شافعی نے دوسرے قول میں فرمایا: جو پانی موجود ہے اس کو استعمال کرے اور تیمم بھی کرے، کیونکہ وہ پانی پانے والا ہے اور تیمم کی شرط متحقق نہیں ہے، جب وہ اس کو استعمال کر دے گا تو پھر پانی مفقود ہو جائے گا اب وہ پانی نہ پانے والا ہوگا۔ امام شافعی کا قول اس صورت میں مختلف ہے جب کوئی شخص اپنے کجاوہ میں پانی بھول جائے اور تیمم کرے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کرے، کیونکہ جب اس کے پاس پانی موجود تھا تو وہ پانی پانے والا تھا اس نے خود کوتاہی کی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نماز کا اعادہ نہ کرے یہ امام مالک کا قول ہے، کیونکہ اسے معلوم نہ تھا تو اس نے پانی (گویا) پایا ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 31۔ امام ابو حنیفہ نے متغیر پانی کے ساتھ وضو کرنا جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً (پانی نہ پاؤ) فرمایا: نکرہ نفی کے تحت آیا ہے اور لغت میں یہ عموم پر دلالت کرتا ہے پس یہ متغیر اور غیر متغیر پانی کے ساتھ وضو کے جواز میں مفید ہوگا اس لیے کہ متغیر پانی پر بھی ماء کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکرہ نفی کے تحت عموم پر دلالت کرتا ہے ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں جس طرح تم کہتے ہو لیکن جنس میں اور یہ ہر پانی میں عام ہے خواہ وہ آسمان کا پانی ہو یا نہر کا پانی ہو یہ میٹھا چشمہ ہو یا نمکین چشمہ ہو لیکن رہا جنس کے علاوہ تو وہ متغیر پانی ہے وہ اس میں داخل نہیں جس طرح بیگن اور پھول کا پانی اس میں داخل نہیں۔ پانیوں کا حکم سورۂ فرقان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 32۔ علماء کا اجماع ہے کہ وضو اور غسل پانی کے نہ ہونے کے وقت نبیذ کے علاوہ کسی مشروب سے جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا اس کا رد کرتا ہے۔ اور وہ حدیث جس میں نبیذ سے وضو کرنے کا ذکر ہے اس کو حضرت ابن مسعود نے روایت کیا ہے وہ ثابت نہیں ہے، کیونکہ جو ابو زید نے روایت کیا ہے وہ مجہول ہے۔ حضرت عبد اللہ کی صحبت سے معروف نہیں ہے یہ ابن المنذر وغیرہ کا قول ہے مزید بیان سورۃ الفرقان میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 33۔ وہ پانی جس کی عدم موجودگی تیمم کو مباح کرتی ہے وہ ایسا پانی ہے جو پاک ہو، پاک کرنے والا ہو اور اپنے خلقی اوصاف پر باقی ہو۔ اور بعض علماء جنہوں نے قرآن کے احکام میں تالیفات کیں انہوں نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا تو اللہ تعالیٰ نے پانی کے ہر جز کے نہ ہونے کے وقت تیمم مباح فرمایا، کیونکہ یہ لفظ نکرہ ہے پانی کے ہر جز کو شامل ہے خواہ وہ کسی دوسری چیز سے ملا ہوا ہو یا اکیلا ہو۔ نبیذ تمر کو ماء کہنا ممنوع نہیں جب معاملہ اس طرح ہے تو کسی بھی پانی کے موجود ہوتے ہوئے تیمم جائز نہ ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے اور انہوں نے اخبار ضعیفہ سے استدلال کیا ہے جن کا ذکر سورۃ الفرقان میں آئے گا اور وہاں ان شاء اللہ پانی کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوگی۔

مسئلہ نمبر 34۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَيَمَّمُوْا تیمم اس امت کے ساتھ خاص ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت پر وسعت کے لیے اس کی رخصت دی گئی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمیں دوسرے لوگوں پر تین چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے (ا) ہمارے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنایا گیا ہے اور اس کی مٹی ہمارے لیے باعث طہارت بنائی گئی ہے''(1)۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اس کے نزول کا ذکر آچکا ہے اور یہ ہار کے سبب سے رخصت ملی تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، وہ اسباب جو تیمم کو مباح کرتے ہیں ان کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔ یہاں اس کے لغوی اور شرعی معنی، اس کی صفت، اس کا طریقہ اور جن چیزوں کے ساتھ اور جن کے لیے تیمم کیا جائے گا اور کس کے لیے تیمم جائز ہے اور تیمم کی شرائط وغیرہ پر کلام ہوگی۔

تیمم کا لغوی معنی قصد کرنا ہے، تیممت الشیٔ کا معنی ہے میں نے فلاں کا قصد کیا۔ تیممت الصعید میں نے مٹی کا قصد کیا۔ تیممتہ برمحی و سھمی میں نے اپنے نیزے اور تیر کے ساتھ صرف اس کا قصد کیا۔

خلیل نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

یممتہ الرمح شزراً ثم قلت لہ ہذی البسالہ لالعب الزحالیق

خلیل نے کہا: جس نے اس بیت میں امممتہ کہا اس نے غلطی کی، کیونکہ اس نے کہا: شزراً اور الشزر ایک طرف سے ہوتا ہے اس کے ساتھ سامنے کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔

امرؤالقیس نے کہا:

تیممتھا من أذرعاتٍ واھلُھا بیثرب أدنٰی دارِھا نظرٌ عالِ

امرءالقیس کا دوسرا شعر ہے:

تیممتِ العینَ التی عند ضارجٍ یفئ علیھا الظلُّ عرمضُھا طامِ(2)

ایک اور نے کہا:

إنّي کذالك اذا ما ساء ني بلدٌ یممتُ بعیری غیرہ بلداً

اعشٰی نے کہا:

تیممتُ قیساً وکم دونہ من الأرض من مَھمَہٍ ذی شَزَنْ(3)

حمید بن ثور نے کہا:

سل الربعَ أنّی یممتْ أمُّ طارقٍ وھل عادۃٌ للربعِ أن یتکلّما

امام شافعی نے فرمایا:

عِلمی معی حیثما یممتُ أحملہ بطنی وِعاءٌ لہ لا بطن صُندوق

ان تمام اشعار میں تیممت کا معنی قصد کرنا ہے۔

ابن السکیت نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا یعنی تم قصد کرو۔ پھر اس کلمہ کا استعمال بہت زیادہ ہوگیا حتیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 59، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً

کہ تیمم چہرے اور ہاتھوں کا مٹی سے مسح کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ابن الانباری نے کہا: عربوں کے قول میں تیمم الرجل کا معنی ہے مٹی سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرنا۔

میں کہتا ہوں: یہ تیمم شرعی ہے جب اس سے قربت مقصود ہو۔ یممت المریض فتیمم للصلاۃ۔ رجل مُیَمَّم۔ وہ شخص جو طلب کرے اس میں کامیاب ہو جائے۔ شیبانی سے مروی ہے:

إنا وجدنا أعصَرَ بن سعد مُيَمَّم البيتِ رفيعَ المجدِ

ایک اور شاعر نے کہا:

أزْهَر لم يولَد بنَجْمِ الشُّحّ مُيَمَّم البيت كريم السِّنْخِ

مسئلہ نمبر 35۔ لفظ تیمم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سورۂ بقرہ میں، سورۂ مائدہ میں اور اس سورۃ میں ذکر کیا ہے اور اس سورۃ میں یہ آیۃ التیمم ہے۔ قاضی ابو بکر ابن العربی نے کہا: یہ ایک مشکل مسئلہ ہے، میں نے کسی کے پاس اس کا حل نہیں پایا یہ دو آیتیں ہیں ان میں تیمم کا ذکر ہے۔ ایک سورۃ النساء میں ہے اور دوسری مائدہ میں ہے ہمیں معلوم نہیں حضرت عائشہ نے اپنے قول انزل اللہ آیۃ التیمم سے کونسی آیت مراد لی ہے۔ پھر فرمایا: حضرت عائشہ کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ تیمم اس سے پہلے معلوم نہ تھا اور نہ صحابہ اس پر عمل کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ابو بکر ابن عربی کا یہ قول کہ ہم نہیں جانتے کہ حضرت عائشہ نے کون سی آیت مراد لی ہے۔ یہ یہی آیت ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

قاضی کا یہ کہنا کہ اس کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس سے پہلے تیمم معلوم نہ تھا اور اس پر عمل نہ تھا۔ یہ صحیح ہے سیرت نگاروں میں اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ غسل جنابت وضو سے پہلے فرض نہ تھا جس طرح کہ تمام سیرت نگاروں کے ہاں معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز مکہ میں فرض ہوئی تو آپ نے آج کے وضو کی طرح وضو کر کے نماز پڑھی۔ پس یہ دلیل ہے کہ وضو کی آیت نازل ہوئی، کیونکہ اس کا پہلا فرض قرآن میں متصل ہے اور فرمایا کہ آیت التیمم نازل ہوئی، آیت الوضوء نہیں فرمایا۔ یہ بیان ہے کہ اس وقت جو ان کو علم ہوا وہ تیمم کا حکم تھا نہ کہ وضو کا حکم تھا یہ بالکل واضح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 36۔ تیمم ہر مکلف پر لازم ہوتا ہے جس پر نماز لازم ہوتی ہے جب پانی نہ ہو اور نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ امام ابو حنیفہ اور صاحبین اور مزنی جو امام شافعی کے پیروکار ہیں فرماتے ہیں: وقت سے پہلے بھی تیمم کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کے نزدیک پانی کا طلب کرنا شرط نہیں ہے۔ یہ انہوں نے نوافل پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے۔ جب پانی تلاش کیے بغیر نوافل کے لیے تیمم کرنا جائز ہے تو فرائض کے لیے بھی جائز ہے اور ان علماء نے حدیث سے استدلال کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا: ''پاکیزہ مٹی مسلمان کا وضو ہے اگرچہ دس سال بھی پانی نہ پائے'' (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کو

1۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 187

وضو کہا ہے جس طرح پانی کو وضو کہا جاتا ہے پس تیمم کا حکم پانی کا حکم ہے۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً اور یہ نہیں کہا جاتا۔ اس نے پانی نہیں پایا مگر جو طلب کرے اور پانی نہ پائے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ تیمم ضرورۃً طہارت ہے جس طرح مستحاضہ ہوتی ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تیمم کر لے اور نماز پڑھ لے'' (1)۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے یہی حضرت علی، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 37۔ علماء کا اجماع ہے کہ تیمم جنابت اور حدث کو نہیں اٹھاتا ہے، جنابت اور حدث کے لیے تیمم کرنے والا جب پانی پالے گا تو پھر جنبی یا محدث شمار ہو جائے گا جس طرح پہلے تھا، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا: ''جب تو پانی پائے تو اپنی جلد پر پانی بہا'' (2)۔ مگر ایک چیز جو ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے اسے ابن جریج اور عبدالحمید بن جبیر بن شیبہ نے ان سے روایت کیا ہے اور ابن ابی ذئب نے عبدالرحمٰن بن حرملہ سے اور انہوں نے بھی ان سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: جنبی تیمم پانی پالے تو بھی طہارت پر ہوتا ہے وہ نہ غسل کا محتاج ہے، نہ وضو کا حتیٰ کہ اسے حدث لاحق ہو جائے۔ ابوسلمہ سے اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو تیمم کرے اور نماز پڑھے پھر وقت میں پانی پالے تو وہ وضو کرے اور نماز کا اعادہ کرے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ تناقض ہے اور قلت رویت ہے، ابوسلمہ ان کے نزدیک اس طرح فقیہ نہ تھے جس طرح مدینہ کے تابعین فقیہ تھے۔

مسئلہ نمبر 38۔ علماء کا اجماع ہے کہ جس نے تیمم کیا پھر نماز میں داخل ہونے سے پہلے پانی پالیا تو اس کا تیمم باطل ہو جائے گا اور اس پر پانی کا استعمال واجب ہوگا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: جس نے تیمم کیا اور نماز پڑھی اور نماز سے فارغ ہوا جب کہ اس نے پانی کی تلاش میں کوشش کی تھی اور اس کی سواری میں بھی پانی نہ تھا تو اس کی نماز مکمل ہے، کیونکہ اس نے فرض ادا کیا جس طرح اس کو حکم دیا گیا تھا پس اس پر اعادہ کا بغیر حجت کے واجب کرنا جائز نہیں۔ بعض علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جب وضو کرے اور غسل کرے تو وقت کے اندر اعادہ کرنا مستحب ہے۔ طاؤس، عطا، قاسم بن محمد، ابن سیرین، زہری اور ربیعہ یہ تمام علماء فرماتے ہیں: نماز کا اعادہ کرے۔ اوزاعی نے بھی اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: نماز کا اعادہ واجب نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے فرمایا: دو آدمی ایک سفر پر نکلے نماز کا وقت ہو گیا ان کے ساتھ پانی نہیں تھا ان دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھی پھر وقت کے اندر پانی پالیا پس ان میں سے ایک نے نماز کا وضو کر کے اعادہ کیا اور دوسرے نے اعادہ نہ کیا پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا مسئلہ ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا اعادہ نہ کرنے والے کو کہا: تو ''سنت کو پہنچا اور تیری نماز درست ہے'' اور جس نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کیا تھا اسے فرمایا: ''تیرے لیے دوہرا اجر ہے'' (3)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور فرمایا: ابن نافع کے علاوہ نے یہ حدیث لیث سے انہوں نے عمیرہ بن ابی ناجیہ سے انہوں نے بکر بن سوادہ سے انہوں نے عطا سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ حضرت ابوسعید کا ذکر اس حدیث میں محفوظ نہیں ہے دارقطنی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس میں فرمایا: پھر وقت میں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7068　2۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 187　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 189

بعد میں پانی پالیا(1)۔

مسئلہ نمبر 39۔ علماء کا اختلاف ہے جب نماز میں داخل ہونے کے بعد پانی پالے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر نماز کا توڑنا اور پانی کا استعمال کرنا واجب نہیں بلکہ وہ اپنی اس نماز کو مکمل کرے اور آئندہ نماز کے لیے وضو کرے۔ امام شافعی نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ابن المنذر نے اس کو اختیار فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل اور مزنی کا قول ہے کہ وہ نماز کو توڑ دے اور وضو کرے اور پانی کے پائے جانے کی وجہ سے نماز کو نئے سرے سے شروع کرے اور ان کی حجت یہ ہے کہ تیمم جس طرح نماز سے پہلے پانی کی موجودگی کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے اسی طرح بقیہ نماز بھی پانی کے وجود کی وجہ سے باطل ہو جائے گی، جب بعض نماز باطل ہو گی تو تمام نماز باطل ہو گی، کیونکہ علماء کا اجماع ہے وہ عورت جو مہینوں کے ساتھ عدت گزار رہی ہو اور اس کی تھوڑی سی عدت باقی ہو پھر اسے حیض آجائے تو اپنی عدت نئے سرے سے حیض کے ساتھ گزارے گی۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جس کو پانی میسر آجائے جب کہ وہ نماز میں ہو تو اس کے لیے بھی قیاساً اور نظراً یہی حکم ہے یعنی نئے سرے سے نماز پڑھے۔ اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) اور پانی کی عدم موجودگی کے وقت تیمم کے ساتھ نماز میں داخل ہونے کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے اور نماز توڑنے میں اختلاف ہے جب پانی دیکھا جائے اور نماز کا توڑنا نہ تو سنت ثابت کرتی ہے نہ اجماع۔ اور بھی حجت میں سے یہ بھی ہے کہ جس پر ظہار میں یا قتل میں روزہ واجب ہو پھر وہ اکثر روزے رکھ چکا ہو پھر وہ غلام پالے تو اس کے روزے لغو نہ ہوں گے اور نہ غلام آزاد کرنے کی طرف رجوع کرے گا اسی طرح جو تیمم کے ساتھ نماز میں داخل ہو تو وہ نہ نماز کو توڑے گا اور نہ پانی کے ساتھ وضو کی طرف رجوع کرے گا۔

مسئلہ نمبر 40۔ علماء کا اختلاف ہے کیا ایک تیمم کے ساتھ بہت سی نمازیں پڑھ سکتا ہے یا ہر نماز فرض اور نفل کے لیے تیمم لازم ہے؟ شریک بن عبداللہ القاضی نے کہا: ہر نفلی اور فرضی نماز کے لیے تیمم کرے۔ اور امام مالک نے فرمایا: ہر فرض کے لیے تیمم کرے، کیونکہ اس پر ہر نماز کے لیے پانی تلاش کرنا ضروری ہے اور جو پانی تلاش کرے اور اسے نہ پائے تو وہ تیمم کرے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری، لیث، حسن بن حی اور داؤد نے فرمایا: ایک تیمم کے ساتھ جتنی نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے جب تک کہ اسے حدث لاحق نہ ہو، کیونکہ وہ پاک ہے جب تک کہ وہ پانی نہ پائے اور اس پر پانی طلب کرنا واجب نہیں جب وہ پانی سے مایوس ہو چکا ہو۔ اور جو ہم نے کہا ہے: وہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نماز قائم کرنے والے پر پانی کا طلب کرنا واجب کیا ہے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں وقت نکلنے سے پہلے نماز کی استباحت کے لیے تیمم کو واجب کیا ہے۔ یہ طہارت ضروریہ ناقصہ ہے، کیونکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ پانی کے پائے جانے کے وقت تیمم باطل ہو جاتا ہے اگرچہ اسے حدث لاحق نہ بھی ہو جب کہ پانی کی طہارت ایسی نہیں ہے۔ وقت کے داخل ہونے سے پہلے تیمم کے جواز میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی اور پہلے مقالہ والے اس کو جائز قرار نہیں دیتے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا اس سے تیمم کا جواز حاجت سے ثابت ہوا اور وقت سے پہلے کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس بنا پر ایک تیمم کے ساتھ دو فرض نہیں پڑھے گا۔ یہ واضح ہے۔

1۔ سنن دار قطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 189

ہمارے علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے ایک تیمم کے ساتھ دو نمازیں پڑھیں۔ یحییٰ بن یحییٰ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ وہ دوسری نماز کا اعادہ کرے جب تک وقت کے اندر ہے۔ ابوزید بن ابی الغمر نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ ہر صورت میں اعادہ کرے گا۔ اسی طرح مطرف، ابن ماجشون سے مروی ہے کہ وہ ہر صورت میں دوسری نماز کا اعادہ کرے گا۔ اس پر ہمارے علماء جھگڑتے ہیں، کیونکہ پانی کا طلب کرنا شرط ہے۔ ابن عبدوس نے ذکر کیا ہے کہ نافع نے امام مالک سے اس شخص کے متعلق روایت کیا ہے جو دو نمازوں کو جمع کرتا ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے علیحدہ تیمم کرے۔ ابو الفرج نے اس شخص کے بارے فرمایا: جس نے اپنی بہت سی نمازیں یاد کیں پھر اگر وہ انہیں ایک تیمم کے ساتھ قضا کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں اور یہ اس کے لیے جائز ہے، یہ اس لیے کہ پانی کا طلب کرنا شرط نہیں۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 41۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صَعِيْدًا طَيِّبًا، صعید زمین کی اس سطح کو کہتے ہیں جس پر مٹی ہو یا نہ ہو۔ یہ خلیل، ابن الاعرابی اور زجاج کا قول ہے۔ اس کے متعلق اہل لغت کا کوئی اختلاف میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝ (الکہف) یعنی ایسی سخت زمین جو کوئی چیز نہ اگاتی ہو اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ (الکہف) اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

كأنّه بالضّحٰى تَرمِي الصعِيدَ به　دَبَّابَةٌ فی عظام الرأس خُرطُومُ (1)

اس کو صعید کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ زمین کی بلند جگہ ہوتی ہے۔ الصعید کی جمع صعدات ہے۔ اسی سے حدیث شریف ہے ایاکم والجلوس فی الصعدات راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ الصعید کو طیب سے مقید کرنے کی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ زمین کی ہر سطح کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے خواہ وہ مٹی ہو یا ریت ہو یا پتھر ہو یا کان ہو یا شور یلی ہو۔ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، ثوری اور طبری کا مذہب ہے اور طَيِّبًا کا معنی پاک ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: طَيِّبًا کا معنی حلال ہے۔ یہ تشویش کن قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو یوسف نے فرمایا: الصعید سے مراد وہ مٹی ہے جو اگاتی ہے وہ طیب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (الاعراف: 58) ان علماء کے نزدیک اس کے علاوہ مٹی کے ساتھ تیمم جائز نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: الصعید کے لفظ کا اطلاق صرف ایسی مٹی پر ہوتا ہے جو غبار والی ہو۔ عبدالرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کون سی مٹی پاک ہے؟ فرمایا: الحرث (کھیت) ابوعمر نے فرمایا: حضرت ابن عباس کے قول میں دلیل ہے کہ الصعید سے مراد کھیت کی زمین کے علاوہ جگہ ہے۔ حضرت علی نے فرمایا: خاص طور پر مٹی مراد ہے۔ خلیل کی کتاب میں ہے تیمم بالصعید یعنی اس کے غبار سے لو۔ یہ ابن فارس نے حکایت کیا ہے۔ یہ قول مٹی کے ساتھ تیمم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ سخت پتھر پر غبار نہیں ہوتا۔ الکیا طبری نے فرمایا: امام شافعی نے شرط قرار دیا ہے کہ مٹی ہاتھ سے لگے اور اس کے ساتھ تیمم کرے اعضاء تیمم کی طرف اسے نقل کرے۔ جس طرح پانی اعضاء وضو کی طرف نقل کیا جاتا ہے۔ الکیا نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ الصعید، امام شافعی کے قول میں نص نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جعلت لی الارض

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 59

مسجدا وترابہا طھورا(1) نے اس کو بیان فرمایا۔

میں کہتا ہوں: اس مقالہ والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے وجعلت تربتھا لنا طھورا(2) یہ علماء فرماتے ہیں: اس کا تعلق مطلق اور مقید کے باب سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (الرحمٰن) ہم نے سورۂ بقرہ میں وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ (بقرہ:98) کے تحت اس بحث کو ذکر کیا ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے کہ الصعید سطح زمین کا نام ہے جس طرح کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ قرآن کی نص ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی کے بارے میں فرمایا: علیك بالصعید فانه یکفیك(3) تجھ پر مٹی سے تیمم کرنا لازم ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ اسی بناء پر صعیداً ظرف مکان ہوگا اور جنہوں نے اس کو مٹی کے لیے بنایا ان کے نزدیک باء کے حذف کی تقدیر کے ساتھ مفعول بہ ہے۔ یعنی بصعیدٍ اور طَيِّبًا اس کی صفت ہے اور جنہوں نے طَيِّبًا بمعنی حلال کیا ہے انہوں نے اسے حال یا مصدر کی بناء پر منصوب کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 42۔ جب یہ مسلم ہو گیا تو جان لو کہ جو ہم نے ذکر کیا ہے اس میں سے جامع بات یہ ہے کہ آدمی ایسی مٹی پر تیمم کرے جو اگانے والی ہو، پاک ہو، منقول اور مغصوب نہ ہو اور منع میں اجماع یہ ہے کہ آدمی خالص سونے، چاندی، یاقوت، زمرد اور کھانے والی چیزوں، روٹی، گوشت وغیرہ پر یا نجاسات پر تیمم نہ کرے اس کے علاوہ میں اختلاف ہے جیسے معدن (کانیں)۔ بعض علماء نے ان پر تیمم جائز قرار دیا۔ یہی امام مالک وغیرہ کا مذہب ہے اور بعض نے منع فرمایا۔ یہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے۔ ابن خویز منداد نے فرمایا: امام مالک کے نزدیک گھاس پر تیمم جائز ہے جب کہ وہ زمین سے جدا ہوا اور برف پر تیمم کرنے کے بارے میں امام مالک سے مختلف قول مروی ہے۔ مدونہ اور مبسوط میں اس کا جواز مروی ہے اور دوسری کتب میں منع مروی ہے لکڑی پر تیمم کرنے کے بارے میں مذاہب مختلف ہیں۔ جمہور علماء منع فرماتے ہیں اور "مختصر الوقار" میں ہے کہ جائز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمین سے متصل اور منفصل لکڑی کے بارے میں فرق ہے متصل پر جائز ہے اور منفصل پر جائز نہیں۔ ثعلبی نے کہا: امام مالک نے فرمایا: اگر درخت پر ہاتھ مارا پھر اس سے مسح کیا تو جائز ہوگا۔ فرمایا: اوزاعی اور ثوری نے کہا: زمین پر اور ہر اس چیز پر جو زمین پر ہے تیمم جائز ہے خواہ وہ درخت ہو، پتھر ہو، روڑا وغیرہ ہو حتیٰ کہ ان دونوں حضرات نے کہا: اگر برف اور اولوں پر بھی تیمم کیا تو جائز ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا: منقول مٹی کے بارے میں جمہور کا فتویٰ جواز پر ہے اور المذہب میں منع ہے اور غیر المذہب میں یہ زیادہ ہے۔ رہا وہ جو پکایا گیا ہو جیسے کانچ، پکی اینٹ اس کے بارے مذہب میں دو قول ہیں اجازت اور منع۔ اور دیوار پر تیمم کے بارے اختلاف ہے(4)۔

میں کہتا ہوں صحیح جواز ہے، کیونکہ ابو جہیم بن حارث بن ضمہ انصاری کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بئر جمل سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 43　2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199

3۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 49　4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 60

تشریف لائے آپ کو ایک شخص ملا اس نے آپ پر سلام کیا، نبی کریم ﷺ نے جواب نہ دیا حتیٰ کہ آپ دیوار کے پاس آئے اور اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں پر مسح کیا پھر سلام کا جواب دیا (1)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ بغیر مٹی کے تیمم کی صحت پر دلیل ہے جس طرح امام مالک اور ان کے موافق علماء نے کہا اور یہ رد ہے امام شافعی اور ان کے موافق علماء کا جو کہتے ہیں کہ جس چیز پر مسح کیا جائے گا وہ غبار والی پاک مٹی ہوگی جو ہاتھ کے ساتھ لگے گی۔ نقاش نے ابن علیہ اور ابن کیسان سے روایت کیا ہے کہ وہ دونوں کستوری اور زعفران کے ساتھ تیمم کو جائز قرار دیتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ کئی جہات سے خالص خطا ہے (2)۔ ابوعمر نے کہا: علماء کی جماعت شوریلی زمین پر تیمم کی اجازت دیتی ہے مگر اسحاق بن راہویہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت ابن عباس سے اس شخص کے بارے مروی ہے جس کو تیمم کی ضرورت تھی جب کہ وہ گیلی مٹی پر ہے فرمایا: وہ گیلی مٹی میں سے کچھ لے لے اسے اپنے جسم کے کسی حصہ پر مل لے پھر جب وہ خشک ہو جائے تو اس سے تیمم کر لے۔ ثوری اور امام احمد نے کہا: نمدہ کے غبار سے تیمم کرنا جائز ہے۔ ثعلبی نے کہا: امام ابوحنیفہ نے سرمہ، ہڑتال، چونا حص پسے ہوئے جوہر سے تیمم جائز قرار دیا ہے، جب سونے، چاندی، تانبا، نحاس اور شیشہ کے برادہ سے تیمم کرے تو جائز نہ ہوگا، کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 43۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مس لفظ مشترک ہے۔ جماع کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: مسح الرجل المرأة۔ مرد نے عورت سے جماع کیا۔ اور مسح الشئ بالسیف۔ چیز کو تلوار سے کاٹا۔ مسحت الابل یومھا۔ اونٹ پورا دن چلا۔ المسحاء ایسی عورت جس کی سرین نہ ہو۔ بفلان مسحة من جمال۔ جمال والا شخص۔ یہاں مسح سے مراد ممسوح چیز پر ہاتھ کو کھینچنا۔ اگر وہ آلہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد آلہ کو ہاتھ کی طرف نقل کرنا اور پھر ممسوح چیز پر اسے کھینچنا۔ سورۂ مائدہ کی آیت فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (المائدہ: 6) سے یہی مراد ہے۔ اور منه کا قول دلیل ہے کہ محل تیمم کی طرف مٹی کا نقل کرنا ضروری ہے اور یہ امام شافعی کا مذہب ہے اور ہم یہ شرط نہیں لگاتے، کیونکہ نبی کریم ﷺ جب اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے تھے اور پھر انہیں اٹھاتے تھے تو ہاتھوں پر پھونک مارتے تھے۔ ایک روایت میں نفخ (پھونک مارنا) کی جگہ نفض (جھاڑنا) ہے یہ دلیل ہے کہ آلہ شرط نہیں ہے اور آپ کا دیوار پر تیمم اس کی وضاحت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب پانی کے ساتھ سر کا مسح کرنا ضروری ہے جس میں پانی کی تری کو سر کی طرف نقل کیا جاتا ہے تو اسی طرح مٹی سے مسح کرنے کے وقت مٹی کا نقل کرنا بھی ضروری ہو۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تیمم اور وضو میں چہرے کا حکم اس کو ڈھانپ لینا ہے اور ہر ہر جگہ کی تلاش ہے۔ بعض نے جائز قرار دیا ہے کہ ہر ہر جگہ پر ہاتھ مسح میں پہنچانا ضروری نہیں جس طرح خفین پر مسح کے وقت دراڑوں کا حکم ہے اور جو حصہ انگلیوں کے درمیان ہے۔ یہ المذہب میں محمد بن مسلمہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے اس کو حکایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ہاتھوں سے پہلے چہرے کا مسح کرے یہی جمہور کا قول ہے۔ بخاری نے باب التیمم ضربة میں عمار کی حدیث لکھی ہے اس میں چہرے سے پہلے ہاتھوں کا ذکر ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 48
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 60

بعض اہل علم نے وضو کی تنکیس (الٹ کرنا) پر قیاس کرتے ہوئے یہ قول کیا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 44۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ہاتھوں میں تیمم کہاں تک کرے؟ ابن شہاب نے کہا: کندھوں تک کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے۔ مصنف ابوداؤد میں اعمش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نصف ذراع (بازو) تک مسح کیا (☆)۔ ابن عطیہ نے کہا: میری یاداشت میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے (2)۔ بعض علماء نے وضو پر قیاس کرتے ہوئے کہنیوں تک مسح کرنے کو کہا ہے یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان دونوں کے اصحاب، ثوری، ابن ابی سلمہ اور لیث کا قول ہے تمام کہنیوں تک مسح کرنے کو فرض، واجب خیال کرتے ہیں۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم اور ابن نافع کا یہی قول ہے۔ اسماعیل القاضی کا یہی نظریہ ہے۔ ابن نافع نے کہا: جس نے ہاتھ کی کلائی تک تیمم کیا وہ ہر حال میں نماز کا اعادہ کرے۔ امام مالک نے مدونہ میں کہا ہے: وقت کے اندر اعادہ کرے۔ کہنیوں تک تیمم کو نبی کریم ﷺ سے حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر یہی کہتے تھے۔ دارقطنی نے کہا: قتادہ سے سفر میں تیمم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر کہنیوں تک تیمم کرنے کو کہتے تھے۔ حسن اور ابراہیم نخعی دونوں کہنیوں تک مسح کرنے کا کہتے تھے۔ فرمایا: مجھے ایک محدث نے شعبی سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابزی سے انہوں نے حضرت عمار بن یاسر سے روایت کر کے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کہنیوں تک مسح کرنے کو فرمایا۔ ابواسحاق نے کہا: میں نے اس کا ذکر امام احمد بن حنبل سے کیا تو انہیں اس سے تعجب ہوا اور فرمایا: یہ کتنا خوبصورت قول ہے (3)۔ ایک جماعت نے کہا: وہ کلائیوں تک مسح کرے۔ حضرت علی بن ابی طالب، اوزاعی، عطاء ایک روایت میں شعبی سے یہی مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، داؤد بن علی اور طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے یہی مروی ہے اور امام شافعی کا قدیم قول یہی ہے اور مکحول نے کہا: میں اور زہری جمع ہوئے ہم نے تیمم پر گفتگو کی زہری نے کہا: بغلوں تک مسح ہے۔ میں نے پوچھا: تم نے یہ کہاں سے لیا ہے؟ اس نے کہا: کتاب اللہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ**۔ یہ پورا ہاتھ ہے۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا** (المائدہ: 38) چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا؟ اس نے کہا: کنارہ سے۔ دراوردی سے حکایت کیا جاتا ہے کہ کلائیوں تک مسح کرنا فرض ہے اور بغلوں تک فضیلت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ایسا قول ہے جس کی نہ قیاس تائید کرتا ہے اور نہ دلیل۔ ایک قوم نے لفظ ید کو عام کیا اور کندھے تک مسح کو واجب کیا۔ ایک قوم نے وضو پر قیاس کیا اور انہوں نے کہنیوں تک مسح کو واجب کیا۔ یہی جمہور علماء امت کا قول ہے۔ ایک قوم حدیث کے باوجود کلائیوں تک مسح کرنے کو کہتی ہے اور انہوں نے اس کو چور کے ہاتھ کاٹنے پر قیاس کیا ہے، کیونکہ وہ حکم شرعی ہے اور تطہیر ہے جس طرح یہ تطہیر ہے۔ ایک قوم نے حضرت عمار کی حدیث کے ساتھ کفین ہتھیلیوں پر مسح کرنے کو کہا ہے (4)۔ یہی شعبی کا قول ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 60، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ ایضاً

3۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم جلد 1، صفحہ 182

4۔ سنن دارقطنی، کتاب التیمم، جلد 1، صفحہ 182

☆ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 275، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 45۔ علماء کا اختلاف ہے کہ تیمم میں ایک ضرب کافی ہے یا نہیں؟ مالک کا مدونہ میں یہ نظریہ ہے کہ تیمم دو ضربیں ہیں۔ ایک ضرب چہرہ کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے۔ یہ اوزاعی، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا قول ہے اور ثوری، لیث اور ابن ابی سلمہ کا نظریہ ہے۔ یہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن عمر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی جہم نے کہا: تیمم ایک ضرب ہے۔ اوزاعی سے مشہور قول یہی مروی ہے۔ عطا اور شعبی کا ایک روایت میں یہی قول ہے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق، داؤد اور طبری کا یہی نظریہ ہے۔ جو حدیث حضرت عمار سے اس کے متعلق مروی ہے اس سے یہ زیادہ ثابت ہے۔ امام مالک نے کتاب محمد میں کہا: تیمم ایک ضرب سے کرنا جائز ہے۔ ابن نافع نے کہا: ایسی صورت میں نماز کا اعادہ کرے گا۔ ابو عمرو نے کہا، ابن ابی لیلی اور حسن بن حی نے کہا: دو ضربیں ہیں، ایک ضرب کے ساتھ چہرے کا مسح کرے اور ایک ضرب کے ساتھ دونوں ہاتھ اور کہنیوں کا مسح کرے۔ ان دو علماء کے علاوہ کسی صاحب علم نے یہ نہیں کہا۔ ابو عمر نے کہا: جب تیمم کی کیفیت میں آثار مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے متعارض ہیں تو ظاہر کتاب کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے۔ یہ دو ضربوں پر دلالت کرتی ہے ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔ انہوں نے وضو پر قیاس کیا ہے اور حضرت ابن عمر کے عمل کی اتباع کی ہے۔ ان کا علم کتاب اللہ کے حکم کو دور نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز ثابت ہوتی تو اس پر وقوف واجب تھا۔ وباللہ التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا اللہ تعالیٰ ہمیشہ عفو کو قبول فرماتا ہے۔ عفو سے مراد سہل ہے۔ یغفر الذنب وہ گناہ کو بخشتا ہے یعنی اپنی عقوبت کو ڈھانپ دیتا ہے اور سزا نہیں دیتا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۡ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓي اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ
الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝۵۲ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝۵۳

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ مول لے رہے ہیں گمراہی کو اور (یہ بھی) چاہتے ہیں کہ بہک جاؤ تم بھی راہ راست سے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ حمایتی اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ تعالیٰ مددگار۔ کچھ لوگ جو یہودی ہیں پھیر دیتے ہیں اللہ کے کلام کو اس کی اصلی جگہوں سے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور (کہتے ہیں:) سنو تم نہ سنائے جاؤ اور (کہتے ہیں:) راعنا بل دیتے ہوئے اپنی زبانوں کو اور طعنہ زنی کرتے ہوئے دین میں اور اگر وہ (یوں) کہتے: ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اسے) مان لیا اور (ہماری عرض) سنیے اور نگاہ (کرم) فرمایئے ہم پر تو ہوتا بہت بہتر ان کے لیے اور بہت درست۔ لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے۔ اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب! ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے تاکہ تصدیق کرے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم مسخ کر دیں چہرے پھر پھیر دیں انہیں پشتوں کی طرف یا لعنت کریں ان پر جس طرح ہم نے لعنت کی سبت والوں پر۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا۔ کیا نہیں دیکھا آپ نے لوگوں کی طرف جو پاکباز بتلاتے ہیں اپنے آپ کو بلکہ (یہ تو) اللہ (کی شان ہے کہ) پاکباز بنا دے جسے چاہے اور وہ نہیں ظلم کیے جائیں گے کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔ دیکھیے کیسے گھڑتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور کافی ہے (انہیں رسوا کرنے کے لیے) یہ کھلا گناہ۔ کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ (اب) اعتقاد رکھنے لگے ہیں جبت اور طاغوت پر اور کہتے ہیں ان کے بارے میں جنہوں نے کفر کیا کہ یہ کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ان سے جو ایمان لائے ہیں۔ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ تعالیٰ نے اور جس پر لعنت بھیجے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار۔ کیا ان کے لیے کوئی حصہ ہے حکومت میں اگر ایسا ہوتا تو نہ دیتے یہ لوگوں کو تل برابر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ** سے لے کر **فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ** تک۔ یہ آیات کریمہ مدینہ طیبہ اور اس کے قریب رہنے والے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا: رفاعۃ بن زید بن التابوت یہود کے علماء میں سے تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتا تو اپنی زبان کو ٹیڑھا کرتا اور کہتا:

ارعنا سمعک یا محمد حتی نفهمک اے محمد! ہمارے سننے کی رعایت کریں تاکہ آپ کی بات سمجھ جائیں، پھر اس نے اسلام میں طعن کیا اور اسلام کو عیب لگایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿﴾ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿﴾ (1) اور يَشْتَرُوْنَ کا معنی تبدیل کرنا ہے۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے یشترون الضلالہ بالھدی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ:16) یہ قتبی وغیرہ کا قول ہے۔

وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ اس کا يَشْتَرُوْنَ پر عطف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تم حق کے راستہ سے گمراہ ہو جاؤ۔ حسن نے تَضَلُّوا ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ یعنی اللہ تم سے چاہتا ہے پس تم اپنے دشمنوں (یہود) کی سنگت اختیار نہ کرو وہ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعلم بمعنی علیم ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم:27) یہاں اھون بمعنی ھین ہے (وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا) الباء زائدہ ہے۔ یہ اس لیے زائدہ کی گئی ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے اکتفوا باللہ تم اللہ پر بھروسہ کرو وہ تمہارے دشمنوں کو کافی ہے وَلِيًّا اور نَصِيْرًا کو نصب بیان کی بناء پر ہے۔ اگر تو چاہے تو حال کی بنا پر منصوب پڑھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا۔ زجاج نے کہا: اگر من کا تعلق ماقبل سے ہو تو پھر نَصِيْرًا پر وقف نہیں کیا جائے گا اگر من کو ماقبل کلام کے متعلق نہ کیا جائے تو پھر نَصِيْرًا پر وقف جائز ہوگا تقدیر عبارت اس طرح ہے من الذین ھادوا قوم یحرفون الکلم۔ پھر حذف کیا گیا (2)۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ نحویوں نے اس کی یہ دلیل دی ہے:

لو قلت ما فی قومها لم تیثَمِ یفضُلها فی حسبٍ و مَیْسِمِ

فرماتے ہیں: اس کی تقدیر اس طرح ہے لو قلت ما فی قومها احدٌ یفضلها۔ پھر حذف کیا گیا۔ فراء نے کہا: محذوف مَنْ ہے مطلب یہ ہے من الذین ھادوا من یحرفون۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ مَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿﴾ (الصافات) یعنی من له اور ذوالرمہ نے کہا:

فظلّوا ومنهم دمعُه سابقٌ له وآخر یُذرِی عبرۃَ العینِ بالهَمْلِ (3)

اس سے مراد ومنھم من دمعه ہے، پس موصول حذف کیا گیا، مبرد اور زجاج نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ موصول کا

1۔ سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 189، مطبعہ حجازی بالقاہرہ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 62
3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 141

حذف بعض کلمہ کے حذف کی طرح ہے۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی اور ابراہیم نخعی نے "الکلام" پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہاں "الکلم" اولیٰ ہے، کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے کلمات کو بدلتے تھے یا جو ان کے پاس تورات میں تھا وہ تمام کلام میں تحریف کرتے تھے۔ یحرفون کا معنی ہے وہ غلط تاویل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے ان کی مذمت کی ہے، کیونکہ وہ اعتماد سے ایسا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَنْ مَّوَاضِعِهٖ یعنی نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدلتے تھے۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے تمہاری بات سنی اور تمہارے حکم کی نافرمانی کی وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ نبی کریم ﷺ کو کہتے تھے تم سنو، تم کبھی نہ سن سکو۔ یہ ان کی مراد تھی۔ اللہ ان پر لعنت کرے۔ وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ وہ چاہتے ہیں تم سنو اور مکروہ و اذیت نہ سنو۔ حسن اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے تجھ سے نہ سنا جائے یعنی تمہاری بات مقبول نہ ہو اور تمہاری بات کا جواب نہ دیا جائے۔ نحاس نے کہا: اگر یہ معنی ہوتا تو عبارت اس طرح ہوتی غیر مسموع منك۔ رَاعِنَا کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وہ اپنی زبانوں کو حق سے پھیرتے ہیں یعنی وہ اس کی طرف پھیرتے ہیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ الیٰ کا اصل معنی بٹنا ہے اس کو نصب مصدر کی بنا پر ہے اگر تو چاہے تو اسے مفعول لاجلہ بنا دے اس کی اصل لویا تھی پھر واؤ کو یا میں ادغام کیا گیا۔ وَطَعْنًا یہ لَيًّا پر معطوف ہے یعنی وہ دین میں طعن کرتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کو کہتے ہیں: اگر یہ نبی ہوتے تو جان لیتے کہ ہم انہیں برا کہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بتلا دیا۔ پس یہ علامات نبوت سے تھا اور انہیں اس بات سے منع کیا۔ اَقْوَمَ کا معنی ہے ان کے لیے رائے میں درست تھا۔ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ یعنی اتنا تھوڑا ایمان لائے ہیں کہ اس کی وجہ سے ایمان کے اسم کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ایمان نہیں لائے مگر ان میں سے تھوڑے (1)۔ یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا۔ ابن اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے یہود کے علماء سے بات کی جن میں عبد اللہ بن صوریا الاعور اور کعب بن اسد بھی تھا۔ آپ نے انہیں فرمایا: اے یہود کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کر لو، اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ جو میں لے کر آیا ہوں وہ حق ہے۔ انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) ہم یہ نہیں جانتے انہوں نے اس کا انکار کیا جس کو وہ جانتے تھے اور کفر پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے نازل فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ... الخ (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس کو نصب حال کی بنا ہے: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا، الطمس کا معنی ہے کسی چیز کے اثر کو بالکل مٹا دینا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ (المرسلات) نطمس اور نطمس میم کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ کلام میں کہا جاتا ہے: طمس، یطمس اور یطمس بمعنی طمس ہے۔ کہا جاتا ہے: طمس الاثر و طمس اس کا معنی مٹا دینا ہے۔ یہ تمام لغات ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ (یونس: 88) یعنی ان کے اموال کو ہلاک کر دے۔ ابن عرفہ سے مروی ہے کہا جاتا ہے: طمسته فطمس، لازم اور متعدی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 63
2۔ سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 189

استعمال ہوتا ہے۔ طمس اللہ بصرہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مٹا دیا۔ وھو مطموس البصر وہ جس کی آنکھ کا اثر ہی ختم ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ (یٰسین: 66) یعنی ہم انہیں نابینا کر دیں۔

علماء کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے کیا یہ حقیقت ہے اور چہرہ کو گدی کی طرح کر دیا جائے گا، ناک، منہ، ابرو، آنکھ سب مٹ جائیں گے یا یہ ان کی گمراہی مراد ہے جو ان کے دلوں میں ہوگی اور ان سے توفیق سلب کر لی جائے گی؟ یہ دو قول ہیں۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ یعنی ہم تمہیں ایسا گمراہ کر دیں گے کہ تم اس کے بعد ہدایت نہ پاؤ گے۔ حضرت ابی بن کعب کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمثیل ہے اور وہ اگر ایمان نہیں لائیں گے تو ان کے ساتھ یہ بطور سزا ہوگا۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہم ان کے چہروں کو گدیوں کی طرح کر دیں گے، یعنی ناک، ہونٹ، آنکھیں اور ابرو ختم کر دیئے جائیں گے۔ اہل لغت کے نزدیک یہی معنی ہے۔ حضرت ابن عباس اور عطیہ العوفی سے مروی ہے کہ الطمس کا معنی ہے آنکھیں زائل کر دی جائیں گی اور گدی میں لوٹا دی جائیں گی۔ آنکھیں پیچھے لگا دی جائیں گی وہ الٹے پاؤں چلے گا(1)۔ امام مالک نے کہا: ابتدائے اسلام کا زمانہ تھا کعب الاحبار رات کے وقت ایک شخص کے پاس سے گزرے اور وہ یہ آیت پڑھ رہا تھا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا۔ پس کعب نے اپنے چہرے پر اپنے ہاتھ رکھ لیے اور اپنے گھر کی طرف الٹے چلنے لگے پھر اسی جگہ اسلام قبول کیا اور فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے خوف ہوا کہ میں اپنے گھر نہیں پہنچ سکوں گا حتی کہ میرا چہرہ مٹا دیا جائے گا(2) (تو پھر کیا حالت ہوگی)۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن سلام نے کیا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور اسے سنا تو اپنے گھر جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نہیں جانتا تھا کہ میں آپ تک پہنچوں گا جب کہ میرا چہرہ میری گدی کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اگر کہا جائے: یہ کیسے جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں چہروں کے مٹانے کی دھمکی دے اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے پھر وہ ایمان نہ لائے تو ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے جب یہ ایمان لائے اور ان کے متبعین ایمان لائے تو باقی لوگوں سے وعید اٹھا لی گئی تھی۔ مبرد نے کہا: وعید باقی ہے اور اس کا انتظار باقی ہے اور فرمایا: یہود میں یہ طمس ہوگا اور قیامت کے دن سے پہلے ان کا مسخ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ نَلْعَنَهُمْ یعنی جن کے چہرے مٹائے جائیں گے ہم ان پر لعنت کریں گے۔ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ یعنی ہم انہیں بندروں اور خنازیر میں مسخ کر دیں گے۔ یہ حسن اور قتادہ سے مروی ہے(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب سے غائب کی طرف خروج ہے۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا یعنی اللہ کا امر موجود ہے یہاں امر بمعنی مامور ہے۔ یہ مصدر ہے مفعول کی جگہ واقع ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے تو اسے پیدا کر دیتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے ہر کام جس کی اللہ نے ہونے کی خبر دی ہے وہ ایسا ہی ہوگا جس طرح اس نے بتایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ تلاوت فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر: 53) ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! شرک بھی؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 63 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 150

بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (1)۔

یہ آیت محکم، متفق علیہ ہے۔ اس میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ متشابہ میں سے ہے جس میں علماء نے کلام کی ہے۔ محمد بن جریر طبری نے کہا: اس آیت نے ظاہر کیا کہ ہر گناہ کبیرہ کرنے والا اللہ کی مشیت میں ہے اگر چاہے گا تو اس کا گناہ معاف کر دے گا اور اگر چاہے گا تو اس کو سزا دے گا جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ اللہ کے ساتھ شرک نہ ہوگا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ تو جان لو کہ وہ اس شخص کے صغیرہ گناہ معاف فرما دے گا جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے گا اور اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف نہیں فرمائے گا جو کبیرہ گناہ کرے گا۔ بعض اہل تاویل کا یہ نظریہ ہے کہ یہ آیت اس آیت کی ناسخ ہے جو سورۃ الفرقان میں ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے کہا: سورۂ نساء سورۂ فرقان کے چھ ماہ بعد نازل ہوئی۔ صحیح یہ ہے کہ نسخ نہیں ہے، کیونکہ اخبار میں نسخ محال ہوتا ہے۔ ان آیات کی جمع کا بیان اس سورت میں اور سورۂ فرقان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرمایا: "قرآن میں مجھے اس آیت سے زیادہ کوئی محبوب آیت نہیں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہ لفظ اپنے ظاہر میں عام ہے اور کسی مفسر کا اختلاف نہیں کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ اس مفہوم میں اختلاف ہے جس کے ساتھ وہ اپنی تعریف کرتے تھے۔ قتادہ اور حسن نے کہا: ان کا یہ قول ہے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں) اور ان کا یہ قول ہے: لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (بقرہ: 111) نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو کہ یہودی ہیں یا عیسائی۔ اور ضحاک اور سدی نے کہا: ان کا یہ قول ہے ہمارا کوئی گناہ نہیں ہے، جو ہم دن کے وقت کرتے ہیں وہ رات کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جو ہم رات کو کرتے ہیں وہ دن کو معاف کر دیئے جاتے ہیں، ہم گناہوں کے نہ ہونے میں بچوں کی طرح ہیں۔ مجاہد، ابو مالک اور عکرمہ نے کہا: ان کا نماز کے لیے چھوٹے بچوں کا آگے کرنا اس لیے تھا، کیونکہ ان پر گناہ نہیں ہیں۔ یہ آیت کے مقصد سے بعید ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: یہ ان کا قول ہے کہ جو ہمارے آباء فوت ہو گئے ہیں وہ ہمارے لیے شفاعت کریں گے اور ہمارا تزکیہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: یہ ان کی ایک دوسرے پر ثنا ہے (4)۔ جو کچھ کہا گیا ہے یہ قول اس سے بہتر ہے، کیونکہ یہ آیت کے معنی سے ظاہر ہے۔ الزکیۃ کا معنی

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 152
2۔ ایضاً
3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 65

گناہوں سے پاک کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اور فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النجم:32) کا ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ مزکی اپنی تعریف سے اپنی زبان کو روکے اور کسی کو اپنے اعمال کے بارے نہ بتائے، کیونکہ حقیقت میں قابل ستائش وہ ہے جس کے افعال اچھے ہوں اور الله تعالیٰ اس کا تزکیہ فرمائے (1)۔ انسان کے اپنے تزکیہ کا کوئی اعتبار نہیں اصل اعتبار الله تعالیٰ کا اپنے بندے کا تزکیہ کرنا ہے۔ صحیح مسلم میں محمد بن عمرو بن عطا سے مروی ہے فرمایا: میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ رکھا، مجھے زینب بنت ابی سلمہ نے کہا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام سے منع کیا ہے اور تو نے اس کا نام برہ رکھا ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنی تعریف خود نہ کرو الله تعالیٰ تم سے نیکوکاروں کو بہتر جانتا ہے''۔ صحابہ نے کہا: ہم اس کا کیا نام رکھیں۔ فرمایا: ''اس کا نام زینب رکھو'' (2)۔ کتاب وسنت دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنا تزکیہ نہ کرے۔ اس طرح اب مصری شہروں میں کثرت سے اپنی صفات لوگ ذکر کرتے ہیں جو تزکیہ کا تقاضا کرتی ہیں مثلاً زکی الدین، محی الدین اور اس کے مشابہ القاب لیکن جب ان اسماء کے ساتھ مسلمانوں کی قباحتیں زیادہ ہوگئیں تو ان صفات کا اپنے اصل سے دور ہونا ظاہر ہوگیا اور یہ اس طرح ہوگئیں کہ اب کوئی فائدہ نہیں دیتیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ کسی دوسرے کا تزکیہ کرنا اور اس کی مدح کرنا، بخاری میں ابوبکرہ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ذکر کیا گیا اور ایک شخص نے اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس تو نے اپنے بھائی کی گردن توڑ دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کئی مرتبہ فرمایا۔ اگر تم میں سے کوئی لامحالہ کسی کی تعریف کرنے والا ہو تو اسے کہنا چاہیے میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں اگر وہ اسے اس طرح دیکھتا ہو اور اسے الله تعالیٰ کافی ہے اور کوئی شخص الله تعالیٰ پر کسی کا تزکیہ نہ کرے'' (3)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی ایسی تعریف کرنے سے منع فرمایا جو اس میں نہ ہو ورنہ اس میں اعجاب و کبر داخل ہو جائے گا اور گمان کرے گا کہ وہ حقیقت میں اس مقام پر فائز ہے اور یہ چیز اسے عمل کے ضائع کرنے اور فضیلت کی زیادتی کو ترک کرنے تک پہنچا دے گی۔ اسی وجہ سے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ویحك قطعت عنق صاحبك تجھ پر افسوس تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔ اور دوسری حدیث میں ہے: قطعتم ظهر الرجل (4)۔ تم نے آدمی کی پیٹھ توڑ دی۔ یہ آپ نے اس وقت فرمایا جب لوگوں نے ایک شخص کی ایسی تعریف کی جو اس میں نہیں تھی۔ اس بناء پر علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: احثوا التراب فی وجوہ المداحین (5) (تعریف کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی ڈالو) کی تاویل کی ہے۔ یہاں ایسے تعریف کرنے والے مراد ہیں جو باطل طریقہ سے مدح کریں اور ایسی صفات بیان کریں جو انسان میں نہ ہوں حتیٰ کہ اس کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہوں۔ اس کے ذریعے ممدوح سے کھانا حاصل کرتے ہوں اور اسے فتنہ میں مبتلا کرتے ہوں۔ رہا کسی کا کسی کی ایسے اچھے عمل اور محمود امر پر تعریف کرنا جو واقعی اس میں ہے تاکہ اس میں مزید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 66-65
2۔ صحیح مسلم، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 208
3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 895
4۔ ایضاً
5۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 7، صفحہ 214

اچھے اعمال کی ترغیب ہو اور لوگوں کو اس کی اقتدا پر ابھارا جائے تو یہ وہ مدح نہیں ہوگی (جس کی مذمت کی گئی ہے) اگرچہ وہ انسان کے اچھے افعال و اقوال کی تعریف کرنے والا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار، خطبوں اور کلام کی خود تعریف فرمائی اور تعریف کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی نہ ڈالی اور نہ اس کا حکم دیا جیسے ابو طالب کا قول ہے:

وأبیض یُستسقَی الغمامُ بوجهه ثِمال الیتامی عِصْمة للأراملِ

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس اور حضرت حسان کی ان کے اشعار کی وجہ سے تعریف فرمائی، حضرت کعب بن زہیر کی مدح فرمائی اور اپنے صحابہ کی مدح فرمائی فرمایا: ''تم طمع کے وقت کم ہوگے اور گھبراہٹ کے وقت زیادہ ہوگے'' صحیح حدیث میں ربانی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسی بن مریم وقولوا عبداللہ ورسولہ(1) (یعنی تم میری اس طرح تعریف میں مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا اور تم کہو عبداللہ ورسولہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میری ایسی صفات بیان نہ کرو جو مجھ میں نہیں ہیں جن کے ذریعے میری مدح تلاش کرتے ہو، جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایسی صفات بیان کی تھیں جو ان میں نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، پس اس طرح انہوں نے کفر کیا اور گمراہ ہوئے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جس کسی کو اس کی حد سے بلند کیا اور اس کی ایسی صفات بیان کیں کہ اس کی قدر سے تجاوز کیا تو وہ شخص حد سے بڑھنے والا گنہگار ہے، کیونکہ یہ اگر کسی میں جائز ہوتا تو سب مخلوق سے زیادہ اس کے مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا، يُظْلَمُوْنَ میں ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو اپنا تزکیہ کرتے ہیں اور جن کا اللہ تعالیٰ تزکیہ فرماتا ہے اور ان دو اصناف کے علاوہ جو لوگ ہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرنے والا نہیں۔ الفتیل کھجور کی گٹھلی کی شق میں جو سفید دھاگا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں: یہ حضرت ابن عباس، عطا اور مجاہد کا قول ہے(2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ باریک پردہ ہے جو گٹھلی کے ارد گرد ہوتا ہے جب کھجور پکی اور کچی کیفیت کے درمیان ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابو مالک اور سدی کا قول ہے جب تو اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں کو ملتا ہے تو جو میل نکلتی ہے اس کو فتیل کہتے ہیں(3)۔ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ تمام مفہوم کسی شے کی تحقیر اور تصغیر سے کنایہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اسی تحقیر کی مثال یہ ارشاد ہے: ولا یظلمون نقیرا، نقیر اس نکتہ کو کہتے ہیں جو گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے۔ اسی سے کھجور پیدا ہوتی ہے۔ شاعر نے کسی بادشاہ کی مذمت میں کہا:

تَجمعُ الجَیْشَ ذا الألوف و تغزُو ثم لا ترزأ العدوّ فتیلاً

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے تعجب کرایا، فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (دیکھیے کیسے اللہ پر افترا باندھتے ہیں) اپنے اس قول میں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اپنی ستائش خود کرتے ہیں(4)۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی گناہ نہیں سوائے اس کے جس طرح

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 490 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہمارے بیٹوں کے گناہ ہیں جس دن کی پیدائش ہوتی ہے۔ الافتراء کا معنی جھوٹ گھڑنا ہے۔ اسی سے ہے: افتریٰ فلان علی فلان یعنی اس نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی۔ فریت الشئ۔ میں نے اسے کاٹ دیا۔ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا بیان کی بنا پر منصوب ہے مطلب گناہ کی بڑائی اور اس کی مذمت ہے۔ عرب اس کی مثل مدح اور مذمت میں استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یعنی یہود۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ۔ اہل تاویل کا الجبت اور الطاغوت کی تاویل میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور ابو العالیہ نے کہا: حبشی زبان میں الجبت جادوگر کو کہتے ہیں اور الطاغوت کاہن کو کہتے ہیں (1)۔ حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر نے فرمایا: الجبت سے مراد جادو ہے اور الطاغوت سے مراد شیطان ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود سے فرمایا: الجبت اور الطاغوت سے مراد یہاں کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب ہے۔ عکرمہ نے کہا: الجبت سے مراد حیی بن اخطب ہے اور الطاغوت سے مراد کعب بن اشرف ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ۔ قتادہ نے کہا: الجبت سے مراد شیطان ہے اور الطاغوت سے مراد کاہن ہے (3)۔ ابن وہب نے حضرت مالک بن انس سے روایت کیا ہے الطاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔ فرمایا: میں نے کسی شخص کو یہ کہتے سنا کہ جبت سے مراد شیطان ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ دونوں اللہ کے سوا ہر معبود کے لیے استعمال ہوتے ہیں یا وہ جس کی اللہ کی معصیت میں اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ احسن ہے۔ الجبت کا اصل الجبس ہے وہ جس میں خیر نہ ہو، تا سین کا بدل ہے۔ یہ قطرب کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجبت سے مراد ابلیس ہے اور الطاغوت سے مراد اس کے اولیاء ہیں۔ اس باب میں امام مالک کا قول بہتر ہے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل: 36) اور فرمایا: وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا (الزمر: 17) قطن بن المخارق نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الطرق والطیرۃ والعیافۃ من الجبت (4)، الطرق سے مراد جھڑکنا ہے اور العیافۃ سے مراد خط ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے بعض علماء نے فرمایا: الجبت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو اللہ نے حرام کیا اور الطاغوت سے مراد ہر سرکش انسان ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہود، قریش کے کفار کو کہتے: تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ کعب بن اشرف ستر سوار لے کر مکہ کی طرف جنگ احد کے بعد نکلا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ پر قریش سے معاہدہ کرے۔ کعب ابو سفیان کے پاس اترا اس نے اسے اچھا ٹھکانا دیا اور باقی یہود دوسرے قریش کے گھروں میں ٹھہرے سب نے معاہدہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑیں گے۔ ابو سفیان نے کہا: تو ایک ایسا شخص ہے جو کتاب پڑھتا ہے اور جانتا ہے اور ہم امی (ان پڑھ) لوگ ہیں، ہم نہیں جانتے ہم میں سے کون حق کے زیادہ قریب اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 66
2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 158
3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 158
4۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 477

ہدایت یافتہ ہے، ہم یا محمد؟ کعب نے کہا: اللہ کی قسم! تم محمد ﷺ سے زیادہ راہ راست پر ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ۔ ام متصلہ ہے، نصیبٌ کا معنی حصہ ہے۔ مِّنَ الْمُلْكِ، ملک سے ہے۔ یہ بطور انکار ہے یعنی ان کے لیے کوئی ملک نہیں ہے اگر اس میں سے ان کے لیے کچھ ہوتا تو اپنے بخل اور حسد کی وجہ سے کسی کو کچھ نہ دیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے بلکہ کیا ان کے لیے حصہ ہے (1)؟ اس صورت میں اَم منقطعہ ہوگا اس کا معنی پہلی بات سے اضراب اور دوسری کے لیے آغاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عاطفہ ہے، محذوف پر عطف ہے کیونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی اتباع سے نفرت کرتے تھے۔ تقدیر اس طرح ہے أهم اولی بالنبوة ممن ارسلته ام لهم نصيب من الملك۔

فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا یعنی وہ لوگوں کے حقوق روکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق ان کے عمل کی خبر دی جو ان کے متعلق وہ جانتا ہے۔ النقیر گٹھلی کی پیٹھ پر نکتہ کو کہتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ النقیر جو انسان اپنی انگلی سے کریدتا ہے جس طرح وہ زمین کو کریدتا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا میں نے حضرت ابن عباس سے النقیر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اپنے انگوٹھے کی طرف اپنی شہادت کی انگلی کے باطن پر رکھی پھر دونوں کو بلند کیا اور کہا یہ نقیر ہے (2)۔ النقیر اصل میں وہ لکڑی ہے جس کو کریدا جاتا ہے اور اس میں نبیذ بنائی جاتی ہے۔ اس کے استعمال میں پہلے نہی وارد ہوئی تھی پھر منسوخ ہوگئی۔ فلان کریم النقیر یعنی کریم الاصل ہے۔ اذاً یہاں ملغہ ہے، غیر عاملہ ہے، کیونکہ اس پر فا عاطفہ داخل ہے اور اگر نصب دیتا تو جائز ہوتا۔ سیبویہ نے کہا: اذاً افعال کے عوامل میں اس طرح ہے جس طرح اسماء کے عوامل میں اظن ہے۔ یعنی جب کلام کا اعتماد اس پر نہ ہو تو لغو ہوتا ہے اور اگر کلام کی ابتدا میں ہو تو اس کے بعد فعل مستقبل ہو تو یہ نصب دیتا ہے جیسے تیرا قول ہے: انا ازورک میں تیری زیارت کو آؤں گا۔ وہ تجھے جوابا کہے: اذاً اکرمک۔ عبد اللہ بن عنمۃ الضبی نے کہا:

أُرْدُدْ حِمَارَكَ لَا يَرْتَعْ بِرَوْضَتِنَا   إِذَنْ يُرَدَّ وَقَيْدُ الْعَيْرِ مَكْرُوبُ

یہاں اذن نے نصب دی ہے، کیونکہ اذن سے پہلے جو کلام ہے وہ مکمل ہے اور یہ ابتدائے کلام میں واقع ہوا ہے اگر یہ دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جیسے تیرا قول ہے، زید اذا یزورک تو لغو ہوتا ہے۔ اگر اس پر یا عاطفہ یا واؤ عاطفہ داخل ہو تو اس میں اعمال اور الغا جائز ہے۔ اعمال اس لیے کہ واؤ کے بعد نئی کلام ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ اور غیر قرآن میں فاذاً لا یوتوا جائز ہے۔ قرآن میں ہے: وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ (الاسراء: 76) اور مصحف ابی میں تھا: واذا لا یلبثوا۔ اور الغا اس لیے کہ واؤ کے بعد جو ہوتا ہے وہ اس کلام کے بعد ہوتا ہے جس پر عطف کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک فعل کے لیے ناصب اذن ہے اور خلیل کے نزدیک اذن کے بعد ان مضمرہ ناصب ہے۔ فراء نے کہا: اذاً الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور یہ منون ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ابو العباس محمد بن یزید کو یہ کہتے سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اس شخص کے ہاتھ کو داغ دوں جو اذا کو الف کے ساتھ لکھتا ہے کیونکہ یہ لن اور ان کی مثل ہے اور حروف میں تنوین داخل نہیں ہوتی۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 67   2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 165

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۗ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

''کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (وہ حسد کی آگ میں جلا کریں) ہم نے تو مرحمت فرما دی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرما دی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت، تو ان سے کوئی ایمان لائے اس کے ساتھ اور کسی نے منہ پھیر لیا اس سے اور کافی ہے (انہیں جلانے کے لیے) جہنم کی دہکتی ہوئی آگ''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ اس سے مراد یہود ہیں۔ النَّاسَ سے مراد خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد وغیرہما سے روایت ہے (1) یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نبوت ملنے پر حسد کیا تھا اور آپ کے صحابہ پر حسد کیا تھا ان کے ایمان لانے پر۔ قتادہ نے کہا: ''الناس'' سے مراد عرب ہیں (2)، یہود نے نبوت کی وجہ سے ان سے حسد کیا۔ ضحاک نے کہا: یہود نے قریش سے حسد کیا، کیونکہ ان میں نبوت تھی۔ حسد مذموم ہے اور حسد کرنے والا مغموم ہے حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھاتی ہے۔ حضرت انس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: میں نے حاسد سے زیادہ کوئی ظالم نہیں دیکھا جو مظلوم کے زیادہ مشابہ ہو جس کا نفس ہمیشہ قلق میں رہتا ہے۔ غم لاحق رہتا ہے اور اس کے آنسو ختم ہی نہیں ہوتے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: اللہ کی نعمتوں سے دشمنی نہ کرو۔ ان سے کہا گیا: کون اللہ کی نعمتوں سے دشمنی کرتا ہے؟ فرمایا: وہ لوگ جو لوگوں سے حسد کرتے ہیں ان نعمتوں پر جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی بعض کتب میں فرماتا ہے: حسد کرنے والا میری نعمتوں کا دشمن ہے، میری قضا سے ناراض ہے اور میری تقسیم پر خوش نہیں ہے۔ منصور الفقیہ نے کہا:

أَلَا قُلْ لِمَنْ ظَلَّ لِي حَاسِداً ... أَ تَدْرِي عَلَى مَنْ أَسَاءْتَ الأَدَبْ

أَسَأْتَ عَلَى اللهِ فِي حُكْمِهِ ... إِذَا أَنْتَ لَمْ تَرْضَ لِي مَا وَهَبْ

''خبردار میرے حاسد کو کہو: کیا تو جانتا ہے تو نے کس کی بے ادبی کی؟ تو نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سلسلہ میں اس کی بے ادبی کی جب تو مجھ سے خوش نہیں جو اس نے مجھے عطا فرمایا''۔

کہا جاتا ہے: حسد پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ آسمان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی اور پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ زمین میں نافرمانی کی گئی۔ آسمان میں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اور زمین میں قابیل نے ہابیل سے حسد کیا۔ ابو العتاہیہ نے لوگوں کے بارے میں کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً

فیاربِ إن الناس لا یُنصفونَنِی فکیف ولو أنصفتُھم ظلَمونی
وإن کان لی شیٔ تصدّوا لأخذہ وإن شئتُ أبغی شیئھم منعونِی
وإن نالھم بذلی فلا شُکرَ عندھم وإن أنا لم أبذُلْ لھم شتمونِی
وإن طَرَقتْنِی نکبۃٌ فکِھُوا بھا وإن صَحِبتنِی نعمۃٌ حسدونِی
سأمنع قلبی ان یَحِن إلیھمو وأحجب عنھم ناظری و جُفونِی (1)

بعض علماء نے فرمایا: جب تجھے پسند ہو کہ تو حاسد سے سلامت رہے تو اس پر اپنا معاملہ ظاہر نہ کر۔ قریش سے ایک شخص نے کہا:

حسدوا النعمۃَ لما ظھرتْ فرموھا بأباطیل الکَلِمْ
وإذا ما اللہ أسدی نعمہ لم یَضِرْھا قولُ أعداءِ النِعَمْ

اور کتنا خوب کہا ہے:

إصبِر علی حسدِ الحسودِ فإن صبرک قاتلُہ
فالنار تاکُل بعضھا إن لم تجِد ما تاکلُہ

بعض اہل تفسیر نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ (حم السجدہ) کے تحت فرمایا کہ الذین سے مراد جنوں میں سے ابلیس ہے اور انسانوں میں سے قابیل ہے۔ کیونکہ ابلیس پہلا فرد ہے جس نے کفر کا طریقہ جاری کیا اور قابیل پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ جاری کیا۔ اس کی اصل حسد ہے۔ شاعر نے کہا:

إن الغُرابَ وکان یمشی مشیۃً فیما مضی من سالف الأحوال
حسد القطاۃَ فرامَ یمشی مشیَھا فأصابہ ضربٌ من التعقالِ

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَدْ اٰتَيْنَآ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی اور انہیں ملک عظیم بخشا۔ ہمام بن حارث نے کہا: ان کی فرشتوں کے ذریعے تائید کی گئی (2)۔ بعض نے فرمایا: یہاں ملک سے مراد حضرت سلیمان کی بادشاہی ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کیا وہ حضرت محمد ﷺ سے حسد کرتے ہیں اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عورتیں حلال کیں؟ پس اس بنا پر ملک عظیم سے مراد یہ ہوگا کہ اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ننانوے عورتیں حلال کیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس سے بھی زائد عورتیں حلال کیں۔ طبری نے فرمایا: اس سے مراد جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہی اور عورتوں کی حلت عطا فرمائی تھی۔ اور مراد یہود کی تکذیب اور ان پر رد ہے انہوں نے جو کہا تھا کہ اگر یہ محمد ﷺ نبی ہوتے تو زیادہ عورتوں میں رغبت نہ رکھتے

1۔ دیوان ابی العتاھیۃ، صفحہ 308 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68 3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 169

اور نبوت انہیں ان سے علیحدہ رکھتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے لیے تھا۔ انہیں (یہود) توبیخ فرمائی پس یہود نے اقرار کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ہزار عورتیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ ان کی ہزار عورتیں تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، تین سو مہر والی اور سات سو لونڈیاں اور حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس سو عورتیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''ایک شخص کے پاس ہزار عورتیں تھیں ایک شخص کے پاس سو عورتیں تھیں یہ زیادہ ہیں یا نو عورتیں زیادہ ہیں''۔ یہود خاموش ہو گئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو ازواج مطہرات تھیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تمام انبیاء سے زیادہ بیویاں تھیں۔ کثرت ازواج میں فائدہ یہ تھا کہ ان میں چالیس انبیاء کی قوت تھی، جو جتنا طاقت ور ہوتا ہے وہ زیادہ نکاح کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: نکاح سے آپ نے زیادہ تعلقات قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ ہر عورت کے دو قبیلے ہوتے ہیں ایک باپ کی طرف سے، ایک ماں کی طرف سے۔ پس جب کوئی کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو دو قبیلے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ہر قبیلہ اس کے لیے اس کے دشمنوں کے خلاف مددگار ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: جو متقی ہوتا ہے اس کی شہوت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ جو متقی نہیں ہوتا وہ نظر اور لمس کے ذریعے اپنی شہوت کم کرتا رہتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جو حدیث میں مروی ہے کہ ''آنکھیں زنا کرتی ہیں، ہاتھ زنا کرتے ہیں'' (1)۔ جب دیکھنا اور چھونا شہوت کے پورا کرنے کی ایک قسم ہے تو جماع کم ہوتا ہے اور متقی نہ کسی کی طرف دیکھتا ہے، نہ چھوتا ہے تو اس کی شہوت اس کے نفس میں جمع ہوتی ہیں پس وہ زیادہ جماع پر قادر ہوتا ہے۔ ابوبکر الوراق نے کہا: ہر شہوت دل کو سخت کرتی ہے مگر جماع دل کو صاف کرتا ہے اسی وجہ سے انبیاء زیادہ نکاح کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ یعنی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کیا جاتا تھا۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ یعنی جس نے اعراض کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لایا۔ بعض علماء نے فرمایا: بہ کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں (2)۔ معنی یہ ہوگا کہ آل ابراہیم میں سے جو حضرت ابراہیم پر ایمان لایا اور جنہوں نے اس سے روکا۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع الکتاب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

''بے شک جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا ہم ڈال دیں گے انہیں آگ میں جب بھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دے دیں گے ہم انہیں کھالیں دوسری تاکہ وہ (مسلسل) چکھتے رہیں عذاب کو۔ بے شک اللہ

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 412

2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 68، دار الکتب العلمیہ بیروت

تعالیٰ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے عنقریب ہم داخل کریں گے انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں تا ابد، ان کے لیے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم داخل کریں گے انہیں گھنے سایہ میں"۔

الاصلاء کا معنی اس سورہ کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ حمید بن قیس نے نون کے فتحہ کے ساتھ نصليهم پڑھا ہے یعنی ہم انہیں بھون دیں گے، کہا جاتا ہے: شاة مصلية (بھونی ہوئی بکری)۔ نارا اس قرأت پر حرف جر کے حذف کے ساتھ ہے تقدیر عبارت بنار ہوگی۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ کہا جاتا ہے: نضج الشيء نُضجاً ونَضجاً فلان نضيج الرأي یعنی وہ پختہ رائے والا ہے۔ آیت کا معنی ہے ہم انہیں دوسری کھالیں تبدیل کر دیں گے۔ زنادقہ میں سے جو قرآن پر طعن کرتے ہیں اگر وہ کہیں کہ جلد کو کیسے عذاب دیا جائے گا جب اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اسے کہا جائے گا: جلد کو عذاب وعقاب نہیں کیا گیا حقیقت تکلیف نفوس پر واقع ہے، کیونکہ یہی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور کھالوں کی تبدیلی نفوس کے عذاب میں زیادتی ہے۔ اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اور ارشاد ہے كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۞ (الاسراء)

پس مقصود ابدان کو عذاب دینا اور روحوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اگر کھالوں کا ارادہ ہوتا تو یوں کہا جاتا: ليذقن العذاب۔ مقاتل نے کہا: آگ اسے ہر روز سات مرتبہ کھائے گی۔ حسن نے کہا: ستر مرتبہ کھائے گی۔ جب وہ انہیں کھالے گی تو انہیں کہا جائے گا: دوبارہ اسی طرح ہو جاؤ جس طرح پہلے تھے، تو وہ پہلی کیفیت میں ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جب وہ جل جائیں گے تو کاغذوں کی طرح سفید کھالیں ان کے لیے بدل جائیں گی (1)۔ بعض نے فرمایا: کھالوں سے مراد ان کے لباس ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۞ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (ابراہیم)

لباس کو کھال کہا گیا ہے، کیونکہ لباس کھالوں کو قرب کی وجہ سے لازم ہوتا ہے جس طرح جو چیز انسان کے ساتھ خاص ہوتی ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے: هو جلدة مابين عينيه۔ حضرت ابن عمر نے یہ شعر کہا تھا:

يلومونني في سالم وألومهم وجِلدةُ بَيْنَ العينِ والأنفِ سالم

وہ مجھے سالم کے بارے ملامت کرتے ہیں اور میں انہیں ملامت کرتا ہوں سالم تو میرے ساتھ خاص ہے۔

جب ایک لباس جل جائے گا تو پھر دوبارہ دے دیا جائے گا۔ شاعر نے کہا:

كسا اللؤمُ تَيْمًا خضرةً في جلودها فويلٌ لتيمٍ مِن سرابيلها الخُضرِ

پس جلود، سرابیل سے کنایہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم انہیں پہلی کھالیں نئی کر کے لوٹا دیں گے جس طرح تو کاری گر کو کہتا ہے: تو میرے لیے اس انگوٹھی سے نئی انگوٹھی بنا دے۔ پس وہ اسے توڑتا ہے اور اس سے تیرے لیے نئی انگوٹھی بنا دیتا ہے۔ انگوٹھی جو بنائی گئی حقیقت میں وہی پہلی انگوٹھی ہے، لیکن بناوٹ بدل گئی جب کہ چاندی ایک تھی۔ یہ نفس کی طرح ہے جب وہ مٹی بن جائے گا تو وہ لاشئ ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا جیسے تیرا اپنے صحیح بھائی کے لیے عہد تھا پھر تو اسے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 69، دار الکتب العلمیہ بیروت

بعد میں بیمار کمزور دیکھتا ہے تو تو اسے کہتا ہے: تو کیسا ہے؟ وہ کہتا ہے: میں اس کے علاوہ ہوں جس کے ساتھ تیرا عہد تھا، حالانکہ وہ وہی ہے لیکن اس کی حالت بدل گئی ہے۔ قائل کا قول کہ میں وہ نہیں جس کا تیرا عہد تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد غَيْرَهَا مجاز ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ (ابراہیم: 48) اس دن زمین، دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، حالانکہ بعینہ یہ وہی زمین ہوگی مگر ان کے لیے ٹیلے، پہاڑ، انہار، اشجار بدل جائیں گے اس کی وسعت میں اضافہ کردیا جائے گا اور اس کو برابر کردیا جائے گا۔ مزید بیان سورۃ ابراہیم میں آئے گا۔ اس معنی سے شاعر کا قول ہے:

فما الناسُ بالناس الذين عهدتم ولا الدار بالدار التی کنتُ أعرفُ

اور شعبی نے کہا: ایک شخص حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور کہا: کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے عائشہ نے کیا کہا؟ اس نے اپنے زمانہ کی مذمت کی۔ اور انہوں نے لبید کے دو بیت پڑھے ہیں۔

ذهب الذین یُعاشُ فی أکنافِهم وبقِیتُ فی خَلْفٍ کجلْدِ الأجْربِ

یتلذذون مجانَةً و مَذلةً ویُعاب قائلهم وإن لم یَشْغَبِ

حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ لبید پر رحم فرمائے، یہ اگر وہ ہمارے زمانہ کو دیکھتا تو وہ کیسے کہتا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اگر حضرت عائشہ نے اپنے زمانہ کی مذمت کی ہے تو عاد نے اپنے زمانہ کی مذمت کی، کیونکہ عاد کی ایک الماری میں ان کے ہلاک ہونے کے طویل زمانہ بعد ایک تیر پایا گیا وہ اس زمانہ کے نیزہ سے بھی لمبا تھا اس پر لکھا ہوا تھا:

بلاد بهاکُنا و نحن بأهلها إذِ النّاسُ ناسٌ والبلادُ بِلادُ

شہر تو اسی طرح باقی تھے مگر ان کے احوال اور ان کے رہنے والوں کے احوال بدل گئے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا یعنی کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرتی نہ اس سے کوئی چیز فوت ہوتی ہے۔ حَكِيْمًا اپنے بندوں کو لوٹانے میں اس کی حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی صفت میں فرمایا: وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا یعنی اتنے گھنے سائے کہ ان میں دھوپ نہیں لگے گی۔ حسن نے کہا: ظلا کی صفت ظليلا لگائی گئی۔ کیونکہ اس میں وہ چیزیں داخل نہ ہوں گی جو دنیا کے سایہ میں داخل ہوتی ہیں مثلاً گرم ہوا وغیرہ۔ ضحاک نے کہا: درختوں کے سائے اور محلات کے سائے۔ کلبی نے کہا: ظِلًّا ظَلِيْلًا سے مراد دائمی سایہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝

”بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو انصاف سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، ہر چیز کو دیکھنے والا ہے“۔

اس آیت میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ یہ آیت اہم ترین احکام سے ہے یہ اپنے ضمن میں دین وشرع کی تمام تفصیلات کی جامع ہے نہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس آیت کا مخاطب کون ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب، زید بن اسلم، شہر بن حوشب اور ابن زید نے کہا: یہ خطاب مسلمانوں کے والیوں کو ہے(1)۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے امراء کے لیے ہے پھر بعد کے تمام امراء کو شامل ہے۔ ابن جریج وغیرہ نے کہا: یہ خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی چابی کے بارے میں خطاب ہے جب آپ نے عثمان بن ابی طلحہ اور اس کے چچازاد شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ سے وہ چابی لی تھی۔ یہ دونوں حضرات فتح مکہ کے وقت کافر تھے، حضرت ابن عباس بن عبدالمطلب نے چابی کو طلب کیا تاکہ پانی پلانے کے عمل کے ساتھ سدانہ کے عمل کو بھی ساتھ ملالیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے اور اس میں جو بت تھے انہیں توڑ دیا اور مقام ابراہیم کو نکالا، تو جبریل امین اس آیت کے ساتھ نازل ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے نکلے تو یہ آیت پڑھ رہے تھے، میں نے اس سے پہلے آپ سے یہ نہیں سنی تھی۔ عثمان اور شیبہ کو بلایا اور کہا: یہ کعبہ کی چابی لے لو ہمیشہ ہمیشہ یہ تمہارے پاس رہے گی تم سے کوئی نہیں چھینے گا مگر ظالم۔ کسی نے حکایت کیا ہے کہ شیبہ نے چابی نہ دینے کا ارادہ کیا پھر چابی اس نے پیش کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''یہ اللہ کی امانت لے لے''(2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت والیوں کے ساتھ خاص ہے کہ وہ عورتوں کو نافرمانی وغیرہ سے بچنے کی نصیحت کریں اور ان عورتوں کو اپنے خاوندوں کی طرف لوٹا دیں(3)۔ اس آیت میں ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ یہ ولاۃ کو شامل ہے کہ ان کے پاس جو امانات ہیں انہیں تقسیم کرنے میں اور ظلم کو دور کرنے میں اور فیصلوں میں عدل کرنے میں امانت کا مظاہرہ کریں۔ یہ طبری کا اختیار ہے۔ دوسرے لوگوں کو شامل ہے کہ وہ ودیعتوں کی حفاظت کریں، جھوٹی شہادت سے اجتناب کریں وغیرہ۔ جس طرح ایک شخص کسی نازل شدہ معاملہ میں فیصلہ کرتا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ یہ معنی حضرت ابن مسعود کی حدیث سے مرفوعاً بھی مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستہ میں شہید ہونا سارے گناہوں کا کفارہ ہے'' یا فرمایا: ''ہر چیز کا کفارہ ہے سوائے امانت کے۔ نماز میں امانت، روزے میں امانت، بات میں امانت اور سب سے سخت ودیعتیں ہیں''(4)۔ یہ حدیث ابونعیم حافظ نے الحلیۃ میں روایت کی ہے۔ جن علماء نے کہا کہ یہ آیت تمام لوگوں کو شامل ہے ان میں حضرت براء بن عازب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہر چیز میں امانت ہے وضو، نماز، زکوٰۃ، جنابت، روزہ، کیل، وزن اور ودائع۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی تنگ دست اور خوشحال کو امانت روکنے کی رخصت نہیں دی(5)۔

میں کہتا ہوں: یہ اجماع ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ امانتیں، ان کے حق داروں کو لوٹائی جائیں گی خواہ نیکوکار ہوں یا فجار ہوں۔ یہ ابن المنذر کا قول ہے۔ امانت مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے اسی وجہ سے اس کی جمع بنائی گئی ہے۔ لظم یہ کہ پہلے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 70، دار الکتب العلمیہ بیروت	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 10، صفحہ 219، حدیث نمبر 10627	5۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 70

گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو چھپایا تھا اور انہوں نے مشرکوں کو کہا: تم زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ یہ ان کی طرف سے خیانت تھی۔ پس کلام تمام امانات کے ذکر تک جاری ہوئی۔ پس یہ آیت اپنے نظم کی وجہ سے ہر امانت کو شامل ہے یہ بہت زیادہ ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ بڑی بڑی امانتیں احکام میں ہیں: ودیعت، لقطہ، رہن، عاریۃ۔ حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ أدِّ الأمانةَ الی من ائتمنك ولا تخُن من خانك(1)۔ جس نے تیرے پاس امانت رکھی تھی اسے امانت ادا کرو اور اس کے ساتھ بھی خیانت نہ کرو جو تم سے خیانت کرے۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس اور حضرت ابوہریرہ نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا مفہوم گزر چکا ہے۔

حضرت ابوامامہ نے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں یہ فرماتے سنا: ''عاریۃ لی ہوئی چیز واپس کی جائے گی، دودھ والا جانور جو تمہیں دودھ پینے کے لیے دیا گیا ہے وہ لوٹایا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے'' (2)۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے اس کو نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے یہ زائد روایت کیا ہے: ایک شخص نے کہا: اللہ کا عہد (اس کا کیا حکم ہے)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا حق ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے'' (3)۔ اس آیت اور حدیث کی بنا پر ودیعت لوٹائی جائے گی اور ہر حال میں یہ لوٹائی جائے گی خواہ اس کو چھپایا گیا ہو یا نہ چھپایا گیا ہو۔ اس میں تعدی کی گئی ہو یا تعدی نہ کی گئی ہو۔ یہ عطا، امام شافعی، امام احمد اور اشہب کا قول ہے۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے حیوان یا کوئی اور چیز عاریۃ لی اور وہ ایسی چیزوں میں سے ہو جس کو چھپایا نہ جا سکتا ہو پھر وہ عاریۃ لینے والے شخص کے پاس تلف ہو گئی تو اس شخص کی تلف میں تصدیق کی جائے گی اور وہ ضامن نہ ہو گا مگر تعدی کے ساتھ یہ حسن بصری اور نخعی کا قول ہے اور یہی قول کوفیوں اور اوزاعی کا قول ہے۔ ان علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: العاریة مؤداۃ (عاریۃ لی گئی چیز واپس کی جائے گی) کا معنی اس ارشاد الٰہی کے معنی کی طرح ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ جب امانت تلف ہو جائے گی تو امین پر اس کی چٹی لازم نہ ہو گی، کیونکہ اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اسی طرح عاریۃ لی گئی چیز بغیر تعدی کے تلف ہو جائے تو اس کی ضمانت نہیں لی جائے گی اور جب تعدی کے ساتھ تلف کرے گا تو اس پر خیانت کی وجہ سے اس کی قیمت اس پر لازم ہو گی۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عاریۃ لی گئی چیز میں ضمانت نہیں ہے۔ دار قطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس پر ضمانت نہیں'' (4)۔ امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں حضرت صفوان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا، جب آپ نے اس سے زرہیں عاریۃ لی تھیں۔ کیا یہ عاریۃ مضمونۃ ہیں یا عاریۃ مؤداۃ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عاریۃ مؤداۃ ہیں (5)۔

1۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 35، حدیث نمبر 141 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 41، حدیث نمبر 166

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 165 4۔ ایضاً، حدیث نمبر 167 5۔ ایضاً، حدیث نمبر 160

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ ضحاک نے کہا: اس کا مطلب ہے مدعی پر دلیل اور منکر پر قسم کے اصول کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یہ خطاب والیوں، امراء اور حکام کو ہے اور معنی کے اعتبار سے تمام مخلوق کو شامل ہے جیسا کہ ہم نے اداء امانات میں ذکر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انصاف کرنے والے قیامت کے روز رحمن کی دائیں جانب نور کے منبروں پر ہوں گے اور رحمن کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں وہ لوگ جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل کے بارے میں اور جن کے والی ہوتے ہیں، ان کے بارے میں عدل کرتے ہیں''(1) اور فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا، امام نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا، آدمی اپنے اہل پر نگران ہے اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا، عورت اپنے خاوند کے گھر پر نگران ہے اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا، غلام اپنے آقا کے مال پر نگران ہے اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ خبردار! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے پوچھا جائے گا''(2)۔ ان احادیث صحیحہ میں یہ تمام نگران اور حکام ہیں اپنے اپنے مراتب پر۔ اسی طرح عالم اور حاکم بھی نگران ہے، کیونکہ جب وہ فتویٰ دیتا ہے تو حکم لگاتا ہے اور وہ حلال اور حرام، فرض اور ندب، صحت اور فساد کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ تمام امانت ہے جو ادا کی جاتی ہے اور حکم ہے جس کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ نعما کے بارے میں سورۂ بقرہ میں کلام گزر چکی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت سمیع و بصیر کو بیان فرمایا وہ سنتا اور دیکھتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾ (طٰہٰ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔ یہ سمع کا طریق ہے اور عقل اس پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ سمع اور بصر کا انتفاع اس کی نقیض اندھے پن اور بہرے پن پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ دو ضدوں کو قبول کرنے والا المحل ایک چیز سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نقائص سے پاک ہے اور یہ محال ہے کہ جو نقائص سے متصف ہو اس سے افعل کاملہ کا صدور ہو جیسے سننے اور دیکھنے کی تخلیق اس سے جس کے لیے سمع و بصر نہیں ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نقائص سے پاک ہے یہ دلیل سمعی ہے اصل قرآن کے ساتھ ان لوگوں کے مناظرہ میں اس پر اکتفا کیا جائے گا جن کو کلمہ اسلام جمع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہم کرنے والوں کے وہم سے اور جھوٹ گھڑنے والوں کے افترا سے بلند و بالا ہے۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ (الصافات)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذی شان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 121
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 122

ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر، یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کا انجام"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ جب پہلی آیت میں ولاۃ کو خطاب فرمایا اور انہیں اداء امانات کا حکم دیا اور انہیں لوگوں کے درمیان عدل کا حکم دیا، تو اس آیت میں رعیت کو خطاب فرمایا، انہیں پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا۔ اس سے مراد اس کے احکام کی پیروی کرنا، اس کی نواہی سے اجتناب کرنا ہے پھر رسول کی اطاعت کا حکم دیا۔ یعنی جو حکم دیا اور جو نہی فرمائی اس کی اطاعت کرنا۔ پھر امراء کی اطاعت کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا: سات چیزوں میں سلطان کی اطاعت کرو، دراہم و دنانیر بنانے میں، کیل اور وزن میں، احکام، حج، جمعہ، عیدین اور جہاد میں۔ سہل نے کہا: جب کوئی سلطان عالم کو فتویٰ دینے سے منع کر دے تو اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے اگر وہ فتویٰ دے گا تو گناہ گار ہوگا اگرچہ امیر ظالم بھی ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: سلطان کی اطاعت ایسے امر میں واجب ہوتی ہے جس میں اللہ کی اطاعت ہو، اللہ کی معصیت میں اطاعت واجب نہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ہمارے زمانہ کے والیوں کی اطاعت، معاونت اور تعظیم جائز نہیں اور ان کے ساتھ جہاد ثابت ہوگا اگر وہ ہمیں نماز پڑھائیں تو ان کے ساتھ نماز جائز ہوگی جب کہ وہ گناہوں کے اعتبار سے فاسق بھی ہوں۔ اگر وہ بدعتی ہوں تو ان کے ساتھ نماز جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ ان کا خوف ہو تو ان کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے گی اور نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرمایا: امام پر حق ہے کہ وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے جب وہ ایسا کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اداء امانت اور عدل کا حکم دیا پھر امام کی اطاعت کا حکم دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ اور مجاہد نے کہا: اولوالامر سے مراد اہل قرآن اور اہل علم ہیں۔ یہی قول امام مالک کا مختار ہے اور یہی ضحاک کا قول ہے۔ اس سے مراد ہیں فقہاء اور علماء دین۔

مجاہد سے حکایت ہے کہ اس سے مراد خالص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں (1)۔ اور عکرمہ سے حکایت ہے کہ یہ خاص حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی طرف اشارہ ہے (2)۔ سفیان بن عیینہ نے حکم بن ابان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عکرمہ سے امہات الاولاد کے بارے پوچھا: عکرمہ نے کہا: وہ آزاد ہیں۔ میں نے کہا: کس چیز سے؟ انہوں نے کہا: قرآن سے۔ میں نے کہا: قرآن میں کس آیت سے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ اور حضرت عمر اولی الامر میں سے تھے۔ حضرت عمر نے فرمایا: ام الولد آزاد ہوگی اگرچہ بچہ گرا دے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ الحشر میں وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ الخ (الحشر: 7) کے تحت آئے گا۔ ابن کیسان نے کہا: اس سے مراد عقل والے اور اہل الرائے ہیں جو لوگوں کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: ان اقوال میں صحیح ترین قول پہلا اور دوسرا ہے۔ پہلا قول اس لیے کہ اہل قرآن سے امر کی اصل ہے اور حکم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 71 2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 180

ان کی طرف لوٹتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کا ارشاد حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیس بن عدی السہمی کے بارے نازل ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریۃ (چھوٹا سا لشکر) میں اسے امیر بنا کر بھیجا (1)۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عبداللہ بن حذافہ کا مزاح معروف تھا ان کے مزاح سے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک لشکر میں امیر بنایا۔ انہوں نے اپنے لشکریوں کو کہا: لکڑیاں اکٹھی کرو اور آگ جلاؤ، جب انہوں نے آگ جلادی تو انہیں آگ میں گھسنے کا حکم دیا۔ پھر انہیں کہا: کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ وہ صحابہ کہنے لگے: ہم اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تاکہ ہم آگ سے بچ جائیں (اور تم پھر ہمیں آگ میں گھسنے کا حکم دے رہے ہو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے فعل کو درست کہا اور فرمایا: ''خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت (کا حکم) نہیں ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ مشہور ہے۔

محمد بن عمرو بن علقمہ عن عمر بن حکم بن ثوبان کے سلسلہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی اصحاب بدر میں سے تھے اور ان کی طبیعت میں مزاح تھا۔ اور حضرت زبیر نے ذکر کیا فرمایا: مجھے عبدالجبار بن سعید نے بتایا انہوں نے عبداللہ بن وہب سے انہوں نے لیث بن سعد سے روایت کیا۔ فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حزام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کو کسی سفر میں بٹھایا قریب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گر پڑتے۔ ابن وہب نے کہا: میں نے لیث سے پوچھا یہ انہوں نے آپ کو ہنسانے کے لیے کیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہاں ان میں خوش طبعی تھی۔ میمون بن مہران، مقاتل اور کلبی نے کہا اُولِی الْاَمْرِ سے مراد اصحاب السریۃ، (جہاد کرنے والے) ہیں۔ اور رہا دوسرا قول تو اس کی صحت پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ اللہ تعالیٰ نے متنازع فیہ معاملہ کو کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹانے کا حکم دیا ہے اور علماء کے علاوہ کسی کو کتاب وسنت کی طرف لوٹانے کی طاقت نہیں۔ علماء سے سوال کرنے کے وجوب کی صحت پر یہ دلیل ہے اور ان کے فتویٰ کی پیروی کے لزوم کی صحت پر دلیل ہے۔ سہل بن عبداللہ نے فرمایا: لوگ خیر پر رہیں گے جب تک سلطان اور علماء کی تعظیم کرتے رہیں گے اور جب لوگ ان دو شخصیات کی تعظیم کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح فرمادے گا اور جب لوگ اپنے سلطان اور علماء کی تحقیر کریں گے تو ان کی دنیا و آخرت کو وہ خراب کردے گا۔ رہا تیسرا قول تو وہ خاص ہے اور چوتھا قول اس سے بھی خاص ہے اور رہا پانچواں قول ظاہر لفظ اس کی تائید نہیں کرتے، اگرچہ معناً صحیح ہے، کیونکہ عقل پر فضیلت کی بنیاد ہے اور ہر ادب کا سرچشمہ ہے عقل کو ہی اللہ تعالیٰ نے دین کے لیے اصل دنیا کے لیے سہارا بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقل کے کمال کے ساتھ تکلیف کو واجب کیا ہے اور عقل کے احکام کے ساتھ دنیا کی تدبیر بنائی ہے اور ایک عقل مند کوشش کرنے والوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ معنی حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اولی الامر سے مراد حضرت علی اور ائمہ معصومین

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 659

ہیں۔ اگر یہ معاملہ ہو تو پھر فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا کوئی معنی نہیں رہتا بلکہ اللہ فرماتا: فردوہ الی الامام و اولی الامر۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ کتاب وسنت پر حکم لگانے والا ہے۔ یہ قول متروک ہے اور جمہور کے نظریہ کے مخالف ہے۔

اطاعت کی حقیقت، حکم کی پیروی کرنا ہے جس طرح کہ معصیت اس کی ضد ہے اور معصیت کا مطلب حکم کی مخالفت کرنا ہے اطاعت یہ اطاع سے ماخوذ ہے جب کوئی پیروی کرے اور معصیت، عصی سے ماخوذ ہے جب کوئی سخت ہو جائے۔ اولو اس کا واحد ذو ہے یہ بغیر قیاس کے ہے جس طرح النساء، الابل اور الخیل بغیر قیاس کے جمع ہیں ان میں سے ہر ایک اسم جمع ہے اس کا اس کے لفظ سے واحد نہیں ہے۔ بعض نے الخیل کا واحد خائل کہا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ یعنی تم جھگڑو اور اختلاف کرو گویا ہر ایک دوسرے کی حجت کو کھینچتا اور ختم کرتا ہے۔ النزع کا معنی کھینچنا ہے المنازعۃ کا معنی حجتوں کا کھینچنا ہے اسی سے حدیث ہے (1) وانا اقول مالی ینازعنی القرآن۔ میں کہتا ہوں: مجھے کیا ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

نازعتُهم قُضُبَ الرّيحان مُتَّكِئاً وقهوةً مُزَّةً رَاوُوقها خَضِلُ

الخضل نرم بوٹیوں کو کہتے ہیں الخضیلۃ باغ کو کہتے ہیں۔ فی شیء یعنی تمہارے دینی معاملہ میں۔ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ یعنی یہ حکم کتاب اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی رسول کریم کی ظاہری حیات میں تو آپ سے سوال کرو اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی سنن میں غور وفکر کے ساتھ مسئلہ کا حل نکالو۔ یہ مجاہد، اعمش اور قتادہ کا قول ہے (2) اور یہ صحیح ہے۔ جس نے ایسا نظریہ نہیں دیکھا اس کے ایمان میں خلل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ بعض علماء نے کہا: اس کا مطلب ہے تم کہو اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ یہ رد کا مطلب ہے (3)۔ یہ اس طرح ہے جیسے حضرت عمر بن خطاب نے کہا تھا: حق کی طرف رجوع، باطل پر ڈٹے رہنے سے بہتر ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ہمارے پاس وہ ہے جو کتاب اللہ میں ہے اور جو اس صحیفہ میں ہے یا وہ فہم ہے جو کسی مسلمان آدمی کو عطا کیا جاتا ہے۔ اگر اس طرح ہوتا جس طرح اس قائل نے کہا ہے تو وہ اجتہاد باطل ہو جائے گا جو اس امت کی خصوصیت ہے اور وہ استنباط بھی باطل ہو جائے گا جو ایک مسلمان کو عطا کیا جاتا ہے۔ لیکن مثالیں دی جاتی ہیں اور مثال تلاش کی جاتی ہے تاکہ درست نتیجہ نکالا جائے۔

ابو العالیہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور با اقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ مگر وہ چیزیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں فرمایا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے: اللہ اعلم یعنی اللہ بہتر جانتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف: 15)۔ اور وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 119 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 71 3۔ ایضاً

حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (بقرہ:233) سے استنباط کی ہے جب ہم نے تیس مہینوں سے دو سال جدا کیے تو باقی چھ ماہ رہ گئے۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى الرَّسُوْلِ میں دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا جائے گا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی پیروی کی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں جس چیز سے منع کروں اس سے اجتناب کرو اور جس کا میں تمہیں حکم دوں اس پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرو، تم سے پہلے لوگوں کو اپنے انبیاء پر اختلاف کرنے اور کثرت سے سوال کرنے نے ہلاک کیا تھا'' (1)۔

اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے ابورافع سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے صوفے پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اس کے پاس میرے امر میں سے کوئی امر آئے جس کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے میں نے منع کیا ہے اور وہ کہے: ہم نہیں جانتے ہم جو کتاب اللہ میں پائیں گے اس کی اتباع کریں گے'' (2)۔ حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جب کہ آپ لوگوں کو خطاب فرما رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے ''کیا تم میں سے کوئی اپنے صوفے پر ٹیک لگائے ہوئے گمان کرتا ہے کہ اللہ نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا مگر جو اس قرآن میں ہے، خبردار! میں نے اللہ کی قسم حکم بھی دیا، وعظ بھی کیا اور کچھ چیزوں سے منع بھی کیا وہ قرآن کی مثل ہیں یا اس سے بھی زیادہ ہیں''۔ یہ حدیث ترمذی نے مقدام بن معدیکرب سے اس کے ہم معنی روایت کی ہے، فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (3)۔ اور قطعی اس میں یہ ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ (النور:63) (پس ڈرنا چاہیے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے)

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ خَيْرٌ مختلف فیہ مسئلہ کو کتاب وسنت کی طرف لوٹانا، اس میں جھگڑنے سے بہتر ہے۔ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا تاویل کا معنی مرجع ہے یہ آل یئول الی کذا سے مشتق ہے یعنی وہ ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ألت الشئی سے مشتق ہے جب تو اسے جمع کرے اور اس کی اصلاح کرے۔ تاویل کا معنی ان الفاظ کے معانی کو جمع کرنا ہے، جن کا سمجھنا مشکل ہے، ایسے لفظ کے ساتھ جس میں کوئی مشکل نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: اول اللہ علیك امرك۔ یعنی اللہ نے تجھ پر تیرا عمل جمع کر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ معنی ہو تمہاری تاویل سے بہتر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 215

2۔ سنن ابی داود، کتاب السنۃ، جلد 2، صفحہ 279۔ ایضاً، حدیث نمبر 3989، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، جلد 2، صفحہ 91

اَنۡ یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ۝ وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا ۝

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا کہ انکار کریں طاغوت کا اور چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک۔ اور جب کہا جائے انہیں کہ آؤ اس (کتاب) کی طرف جو اتاری ہے اللہ نے اور (آؤ) رسول (پاک) کی طرف تو آپ دیکھیں گے منافقوں کو کہ منہ موڑ لیتے ہیں آپ سے روگردانی کرتے ہوئے''۔

یزید بن زریع عن داؤد بن ابی ہند عن الشعبی کے سلسلہ سے مروی ہے شعبی نے فرمایا: ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا ہوا۔ یہودی نے منافق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کرانے کی طرف بلایا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رشوت قبول نہیں کرتے۔ منافق نے یہودی کو یہود کے حکام سے فیصلہ کرانے کی طرف بلایا، کیونکہ جانتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں رشوت لیتے ہیں۔ جب اختلاف ہوا تو دونوں نے جہینہ قبیلہ میں ایک کاہن کو اپنا حکم بنانے پر اتفاق کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ یعنی منافق اور وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ یعنی یہودی یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ ۔۔۔ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ۝

ضحاک نے کہا: یہودی نے منافق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا اور منافق نے کعب بن اشرف کی طرف بلایا۔ طاغوت یہی ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: منافقین میں سے ایک شخص جس کو بشر کہا جاتا تھا اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا تھا یہودی نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو اور منافق نے کہا: بلکہ کعب بن اشرف کے پاس چلو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام طاغوت رکھا، یعنی سرکشی کرنے والا۔ یہودی نے انکار کیا اس لیے کہ فیصلہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائیں گے جب اس منافق نے یہ دیکھا تو وہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ جب وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس آئے تو منافق نے کہا میں اس پر راضی نہیں ہوں۔ تم ہمارے ساتھ ابو بکر کے پاس چلو۔ حضرت ابو بکر نے بھی یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ منافق اس سے بھی راضی نہ ہوا۔ زجاج نے ذکر کیا ہے اس منافق نے کہا: عمر کے پاس چلو۔ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے تو یہودی نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے پھر ابو بکر کے پاس گئے تھے لیکن یہ ان کے فیصلوں سے راضی نہیں ہوا۔ حضرت عمر نے منافق کو کہا: واقعی مسئلہ اسی طرح ہے؟ منافق نے کہا: ہاں۔ حضرت عمر نے کہا: تم دونوں یہاں ٹھہرے رہو حتیٰ کہ میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ حضرت عمر گھر میں داخل ہوئے تلوار پکڑی (باہر آئے) اور منافق کو مار دی حتیٰ کہ منافق مر گیا۔ حضرت عمر نے فرمایا: جو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا میں اس کا فیصلہ اس طرح کرتا ہوں۔ یہودی بھاگ گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انت الفاروق (1) (تو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے) جبریل امین نازل ہوئے اور کہا: حضرت عمر نے حق و باطل کے درمیان فرق کر دیا۔ پس آپ کو فاروق کا نام دیا گیا۔ یہ تمام آیات وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۶۵﴾ تک اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔ ضلالاً معنی کی بنا پر منصوب ہے یعنی فیضلون ضلالاً۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿﴾ (نوح) یہ معنی پہلے تفصیلاً گزر چکا ہے صُدُوْدًا خلیل کے نزدیک مصدر کا اسم ہے اور مصدر الصد ہے۔ کوفی علماء کہتے ہیں: یہ دونوں مصدر ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

"پس کیا حال ہوتا ہے جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے پھر حاضر ہوتے ہیں آپ کے پاس قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی (کہتے ہوئے بخدا) نہیں قصد کیا تھا ہم نے مگر بھلائی اور باہمی مصالحت کا۔ یہ لوگ ہیں خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے (اے حبیب!) چشم پوشی فرمایئے ان سے اور نصیحت کرتے رہیے انہیں اور کہیے انہیں تنہائی میں ایسی بات جو موثر ہو"۔

یعنی فَكَيْفَ کیا حال ہوگا یا فکیف، یصنعون یعنی وہ کیا کریں گے۔ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ یعنی صحابہ کرام سے استعانت ترک کرنے کی وجہ سے جب انہیں کوئی مصیبت آ پہنچتی ہے اور جو ذلت انہیں لاحق ہوتی ہے اس ارشاد میں: فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا (توبہ: 83) بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ان کے اپنے سردار کا قتل ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یہاں تک کلام مکمل ہے پھر ان کے فعل کے متعلق خبر دی۔ یہ اس طرح ہے کہ حضرت عمر نے جب ان کے ساتھی کو قتل کر دیا تو ان کی قوم اس کی دیت کا مطالبہ کرنے کے لیے آئی اور قسمیں اٹھانے لگے کہ ہم دیت طلب نہیں کر رہے ہیں مگر احسان کے لیے اور موافقت حق کے لیے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ میں آپ سے عدول نہیں کیا مگر جھگڑے میں مصالحت کے لیے اور فیصلہ میں بھلائی کے لیے۔ ابن کیسان نے کہا: اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ کا معنی عدلاً اور حقاً ہے۔ اس کی مثال یہ ہے وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى (توبہ: 107) اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ منافق ہیں اور ہمارے لیے فائدہ ہے کہ تم جان لو کہ یہ منافق ہیں۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ان کی سزا سے اعراض فرمائیں۔ بعض نے فرمایا: ان کے عذر قبول کرنے سے اعراض فرمائیں۔ وَعِظْهُمْ ان کو خوف دلائیں۔ بعض نے فرمایا: بھرے مجمع میں انہیں ڈرائیں۔ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا یعنی انہیں خلوت واندرون خانہ خوب زجر و توبیخ کریں۔ حسن نے کہا: انہیں کہو اگر تم نے اپنے دلوں کی بات ظاہر کر دی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ عرب کہتے

1۔ تفسیر الکشاف تفسیر سورۂ نساء، جلد 1، صفحہ 525

ہیں: بدغ القول بلاغة، رجل بدیغ یبدغ بلسانه کنه مافی قلبه یعنی زبان کے ساتھ اپنے دل کی حقیقت تک پہنچا۔ عرب کہتے ہیں: احمق بدغ وبدغ یعنی وہ حماقت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ چاہتا ہے اس کو پہنچتا ہے اگر چہ وہ احمق تھا۔ کہا جاتا ہے: فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ مسجد ضرار بنانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کو ظاہر فرمادیا اور ان کی مسجد گرانے کا حکم دیا تو انہوں نے اپنے دفاع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسمیں اٹھائیں ہم نے مسجد کی تعمیر فقط اللہ کی اطاعت اور کتاب کی موافقت میں کی ہے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَٱسْتَغْفَرُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْتَغْفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُوا۟ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے اللہ سے نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لیے رسول (کریم) بھی تو وہ ضرور پاتے اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول فرمانے، والا نہایت رحم کرنے والا''۔

إِلَّا لِيُطَاعَ جس کا حکم دے اور جس سے منع کرے۔ بِإِذْنِ ٱللَّهِ، اللہ کے علم کے مطابق۔ بعض نے اس کا معنی کیا ہے اللہ کی توفیق سے۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ۔ ابو صادق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمارے پاس ایک اعرابی آیا جب کہ ہم تین دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر چکے تھے۔ اس اعرابی نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور پر ڈال دیا اور قبر انور کی مٹی اپنے سر پر ڈالنے لگا اور کہا: یا رسول اللہ! آپ نے کہا تو ہم نے آپ کا قول سنا، آپ نے اللہ تعالیٰ سے کلام یاد کیا اور ہم نے آپ سے کلام یاد کیا۔ جو اس نے تجھ پر نازل کیا اس میں ہے: وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ (الآیۃ) میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تا کہ آپ میرے لیے استغفار کریں تو قبر انور سے آواز آئی ''تجھے بخش دیا گیا ہے'' (☆)۔

لَوَجَدُوا۟ ٱللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا پائیں گے۔ یہ دونوں مفعول ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾

''پس (اے مصطفیٰ!) تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان پھر نہ بنائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کرلیں دل وجان سے''۔

☆۔ المجالس لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 275۔ المجموع للنووی، جلد 8، صفحہ 217

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے جنہوں نے طاغوت کے پاس فیصلہ لے جانے کا ارادہ کیا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ طبری نے کہا: فلا کا قول پیچھے جو ذکر ہو چکا ہے اس کا رد ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ کہ معاملہ اس طرح نہیں جس طرح وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ پھر قسم سے آغاز فرمایا: وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2)۔ دوسرے ائمہ نے فرمایا: قسم پر لا کو نفی کے ساتھ اہتمام اور اس کو قوت کے اظہار کے لیے مقدم کیا گیا ہے پھر قسم کے بعد دوبارہ نفی کے ساتھ اہتمام کی تاکید کے لیے ذکر فرمایا اور دوسرے (لا) کا ساقط کرنا صحیح تھا اور پہلے لا کی تقدیم کے ساتھ اکثر اہتمام باقی تھا اور پہلے لا کو ساقط کرنا صحیح تھا اور نفی کا معنی باقی ہوگا لیکن اہتمام کا معنی ختم ہو جائے گا (3)۔ شجر اس کا معنی اختلاف کرنا اور خلط ملط ہونا ہے۔ درخت کو شجر اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ اس کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہوتی ہیں ہودج کی لکڑیوں کو شجار کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں۔ شاعر نے کہا:

نفسی فداءك والرّماح شَوَاجِر والقوم ضُنك لِلقاءِ قیام

میرا نفس تجھ پر فدا تھا جب نیزے گتھم گتھا تھے

طرفہ نے کہا:

وهُمُ الحكام ارباب الهدیٰ وسعاة الناس فی الأمر الشّجر

حکام ارباب الھدی اور ایک مختلف امر میں کوشش کر رہے تھے۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ آیت حضرت زبیر اور ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی ان کا باغ کو پانی پلانے میں جھگڑا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر کو کہا: تو اپنی زمین کو پانی پلا، پھر پانی اپنے پڑوسی کی زمین کی طرف چھوڑ دے۔ انصاری کہنے لگا: میں تیری طرف دیکھتا ہوں کہ آپ اپنی پھوپھی کے بیٹے سے محبت کرتے ہیں۔ یہ جملہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ سے رنگ بدل گیا اور آپ نے پھر حضرت زبیر سے کہا: تو اپنی زمین کو پانی پلا، پھر پانی روک لے حتیٰ کہ پانی وٹوں تک پہنچ جائے۔ اور پھر یہ آیت نازل ہوئی فَلَا وَ رَبِّكَ الخ۔ یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے (4)۔ امام بخاری کی سند یہ ہے عن علی بن عبد اللہ عن محمد بن جعفر عن معمر۔ اور مسلم نے قتیبہ سے پھر دونوں نے زہری سے روایت کی ہے۔ انصاری شخص کے بارے اختلاف ہے، بعض نے فرمایا: وہ اہل بدر میں سے ایک انصاری تھا۔ مکی اور نحاس نے کہا: وہ حاطب بن ابی بلتعہ تھا۔ ثعلبی، وحدی اور مہدوی نے کہا: وہ حاطب تھا۔ بعض نے کہا: ثعلبہ بن حاطب تھا۔ اس کے علاوہ بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 75، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 74
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، جلد 1، صفحہ 373

اقوال ہیں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ وہ غیر متعین اور غیر مسمی ہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم میں بھی رجل من الانصار ذکر ہے۔ طبری نے منافق اور یہودی میں اس کے نزول کو اختیار کیا ہے (1) جیسا کہ مجاہد نے کہا: یہ اپنے عموم کے ساتھ حضرت زبیر کے واقعہ کو شامل ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے پس جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی فیصلہ میں متہم کیا وہ کافر ہے لیکن انصاری سے لغزش ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور اس کی لغزش کو معاف کر دیا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے یقین کی صحت کا علم تھا۔ ان سے یہ لغزش عجلت میں ہو گئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے یہ حکم نہیں ہے ہر وہ شخص جو حاکم کے حکم سے راضی نہ ہوگا اور وہ اس میں طعن کرے گا اور اسے رد کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور جو حاکم میں طعن کرے اس کے فیصلہ میں طعن نہ کرے تو اس کو تعزیر لگانے اور اسے معاف کرنے کا حق ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ اعراف کے آخر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اس آیت کے نزول کا سبب وہ ہے جو ہم نے حدیث سے ذکر کیا تو اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر اور اس کے خصم کے بارے فیصلہ دیا وہ بطور صلح تھا۔ آپ نے فرمایا: ''اے زبیر تو پانی پلا''۔ کیونکہ پانی اس کے قریب تھا۔ ''پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دے'' یعنی اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور پورا پورا حق نہ لے اور اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑنے میں جلدی کر (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر کو مسامحت اور آسانی کرنے پر ابھارا جب انصاری نے یہ سنا اور اس سے راضی نہ ہوا اور ناراض ہوا، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حضرت زبیر بالکل پانی کو نہ روکے۔ تو اس نے اپنی زبان سے غلط ہلاک کرنے والا، شان رسالت کے جو لائق نہ تھا وہ کلمہ بولا۔ اس نے کہا: یہ اس لیے فیصلہ فرمایا ہے کہ زبیر تمہاری پھوپھی کا بیٹا ہے۔ اس کے جملہ میں آن ہے یہ ان مفتوحہ انکار کی جہت پر ہمزہ کی مد کے ساتھ ہے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ کی وجہ سے چہرہ متغیر ہو گیا، پھر آپ نے حضرت زبیر کے لیے پورا پورا حق لینے کا فیصلہ دیا وہ کسی قسم کی مسامحت کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت غضب میں کیسے فیصلہ فرمایا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے'' (3)۔ ہم کہیں گے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ اور احکام میں خطا سے معصوم تھے۔ عقل کی دلیل کے ساتھ جو دلالت کرتی ہے کہ آپ جو اللہ کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اس میں سچے ہیں۔ دوسرا کوئی آپ کی مثل نہیں ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حاکم جھگڑنے والوں کے درمیان اصلاح کا راستہ اختیار کرے اگرچہ اس پر حق ظاہر بھی ہو جائے۔ امام مالک نے اس سے منع کیا ہے، امام شافعی کا قول اس میں مختلف ہے۔ اس حدیث میں جواز پر واضح حجت ہے۔ اگر وہ صلح کر لیں تو فبہا ورنہ صاحب حق اپنا پورا حق وصول کرے گا اور حکم ثابت ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام مالک کے اصحاب کا اوپر والے کا نیچے والے کی طرف پانی چھوڑنے کی صفت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے کہا: اوپر والا تمام پانی اپنے باغ میں داخل کرے گا اس سے اپنے باغ کو سیراب کرے گا حتیٰ کہ پانی باغ میں

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 190
2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، جلد 1، صفحہ 373
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، جلد 2، صفحہ 149

اتنا ہو جائے کہ کھڑا ہونے والے کے ٹخنوں تک پہنچ جائے تو پھر پانی کا راستہ بند کرے اور ٹخنوں سے جو زائد مقدار میں پانی ہو وہ اپنے قریبی کی طرف چھوڑے معاملہ اسی طرح چلتا جائے حتیٰ کہ پانی آخری کھیت والے کو پہنچ جائے میرے لیے مطرف اور ابن الماجشون نے اسی طرح تفسیر بیان کی ہے۔ یہ ابن وہب کا قول ہے۔ ابن القاسم نے کہا: جب پانی باغ میں ٹخنوں کی مقدار تک پہنچ جائے تو تمام پانی نیچے والے کی طرف چھوڑ دے اور اپنے باغ میں کچھ بھی نہ روکے۔ ابن حبیب نے کہا: مطرف اور ابن الماجشون کا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے وہ اسے زیادہ جانتے تھے، کیونکہ مدینہ طیبہ میں ان دونوں کا گھر تھا وہاں یہ واقعہ پیش آیا اور وہاں یہ عمل جاری تھا۔

مسئلہ نمبر 4۔ امام مالک نے حضرت عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہزور اور مذینب (مدینہ طیبہ کی دو وادیاں جن میں بارش کا پانی بہتا تھا) کے پانی کے بارے میں فرمایا: ''(پہلے باغ والا) پانی کو ٹخنوں تک روک لے پھر وہ نیچے والے کی طرف چھوڑ دے''(1)۔ ابو عمر نے کہا: میں یہ حدیث نہیں جانتا کہ کسی طریق سے نبی کریم ﷺ سے متصل مروی ہو اس کی ارفع سند یہ ہے محمد بن اسحاق عن ابی مالک بن ثعلبة عن ابیہ۔ نبی کریم ﷺ کے پاس مہزور والے آئے تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ پانی جب ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اوپر والا پانی کو نہ روکے (2)۔ عبدالرزاق نے ابو حازم قرطبی سے انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ''مہزور کے پانی میں یہ فیصلہ فرمایا کہ ہر کھیت میں پانی کو روک لیا جائے گا حتیٰ کہ ٹخنوں تک پہنچ جائے گا تو پھر چھوڑ دیا جائے گا اس کے علاوہ پانیوں کا یہی حکم ہوگا''۔ ابو بکر البزار سے اس حدیث کے بارے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے میں حدیث محفوظ نہیں کی جو ثابت ہو۔ ابو عمر نے کہا: اس معنی میں اگرچہ اس لفظ کے ساتھ حدیث ثابت نہیں ہے جس کی صحت پر اجماع ہے، اسے ابن وہب نے لیث بن سعد اور یونس بن یزید سے، ان دونوں نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ عروہ بن زبیر نے انہیں بیان فرمایا کہ انہیں حضرت عبداللہ بن زبیر انہیں حضرت زبیر سے روایت کر کے بتایا کہ ان کا ایک انصاری شخص سے پانی کی نالی میں جھگڑا ہوا دونوں اس نالی سے اپنے کھجوروں کے باغات کو سیراب کرتے تھے۔ یہ انصاری شخص نبی کریم کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوا تھا۔ انصاری نے کہا: ''تو پانی چھوڑ دے''۔ زبیر نے انکار کیا۔ دونوں اپنا جھگڑا نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئے۔ آگے مکمل حدیث ذکر کی۔

ابو عمر نے کہا: ایک حدیث میں یرسل کے الفاظ ہیں اور دوسری میں اذا بلغ الماء الکعبین لم یحبس الاعلی (جب پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اوپر والا نہ روکے) یہ ابن القاسم کے قول کی تائید کرتے ہیں۔ نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اوپر والا اگر پانی نہیں چھوڑے گا مگر جو ٹخنوں سے زائد ہوگا تو وہ پانی تھوڑی مدت میں ختم نہیں ہوگا اور وہ نہیں پہنچے گا وہاں تک جہاں اس نے پہنچنا ہے جب تمام پانی چھوڑے اور اوپر والا اگر ٹخنوں تک پانی لینے کے بعد چھوڑ دے تو اس میں عام فائدہ ہے اور زیادہ نفع ہے اس صورت میں تمام لوگوں کو شریک بنایا گیا ہے پس ہر حال میں ابن القاسم کا قول اولیٰ ہے جب کہ اسفل (نیچے والا) کے

1۔ موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 643　　2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 86، حدیث نمبر 1386

لیے اس کی اصل ملک نہ ہو جو اس کے ساتھ خاص ہو اگر کوئی کسی عمل کی وجہ سے یا ملک صحیح کی وجہ سے یا قدیمی استحقاق اور ملک کے ثبوت کی وجہ سے پانی کا مستحق ہو تو ہر ایک اپنے حق پر قائم رہے گا جیسا کہ اس کا قبضہ ہے اور اصل مسئلہ ہے۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ، حَرَجًا کا معنی تنگی اور شک ہے اسی وجہ سے گھنے درخت کو حرج وحرجۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع حراج ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے جو اب آپ نے فیصلہ فرمایا اس کا انکار کر کے گناہ نہ پائیں۔ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا یعنی فیصلہ میں آپ کے امر کی اطاعت کریں۔ زجاج نے کہا: تَسْلِيمًا مصدر مؤکد ہے اور جب تو کہتا ہے: ضربت ضربًا تو گویا تو کہتا ہے: میں اس میں شک نہیں کرتا، اسی طرح وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا یعنی وہ آپ کے فیصلہ کو اس طرح تسلیم کریں کہ ان کے نفسوں میں کوئی شک نہ ہو۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

”اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کرو اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے تو نہ بجالاتے اس کو مگر چند آدمی ان میں سے اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہوتا بہتر ان کے لیے اور (اسی طرح) سختی سے (اللہ کے احکام پر) ثابت قدم ہو جاتے، تو اس وقت ہم بھی عطا فرماتے انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم۔ اور ضرور پہنچاتے انہیں سیدھے راستے تک“۔

ان آیات کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس اور ایک یہودی نے باہم تفاخر کیا، یہودی نے کہا: اللہ کی قسم! ہم پر اپنے آپ کو قتل کرنا فرض کیا گیا تھا ہم نے اپنے آپ کو قتل کیا(1)، اور ہمارے مقتول ستر ہزار تک پہنچ گئے۔ ثابت نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ ہم پر فرض کرتا کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو تو ہم ایسا کرتے۔ ابو اسحاق السبیعی نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ تو ایک شخص نے کہا: اگر ہمیں حکم دیا جاتا تو ہم ایسا کرتے، سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے ہمیں عافیت دی۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان من امتی رجالاً الایمان أثبت فی قلوبھم من الجبال الرواسی (2)۔ میری امت کے کچھ ایسے لوگ ہیں ایمان ان کے دل میں مستحکم پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوطی سے موجود ہے۔ ابن وہب نے کہا: مالک نے کہا: یہ کہنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، اسی طرح مکی نے کہا: وہ حضرت ابوبکر تھے۔ نقاش نے ذکر کیا کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر ہم پر یہ فرض کیا جاتا تو میں اپنے نفس اور اپنے گھر والوں سے اس حکم کی تعمیل کا آغاز کرتا (3)۔ ابو اللیث سمرقندی نے ذکر کیا ہے کہ وہ قائل حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ثابت بن قیس تھے، انہوں نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 75، دار الکتب العلمیہ بیروت　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

کہا: اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیتا یا ہمیں اپنے گھروں سے نکلنے کا حکم دیتا تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان لوگوں کے دلوں میں ایمان مستحکم پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوطی سے موجود ہے''۔ (لو) حرف ہے، کسی دوسری چیز کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اس نے ہم پر مہربانی کرتے ہوئے ہم پر یہ فرض نہیں کیا تا کہ ہماری معصیت ظاہر نہ ہو کتنے ایسے احکامات ہیں جن کے خفیف ہونے کے باوجود ہم نے کوتاہی کی تو اتنا بھاری حکم آجاتا تو کیا حالت ہوتی۔ لیکن اللہ کی قسم! مہاجرین نے اپنے گھروں کو خالی چھوڑ دیا اور وہ ان کے ذریعے پسندیدہ زندگی کی تلاش میں نکلے۔ مَّا فَعَلُوْهُ انہوں نے اپنے آپ کو قتل نہ کیا اور نہ انہوں نے گھروں کو چھوڑا۔ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ، قليلٌ، واؤ سے بدل ہے تقدیر اس طرح ہے ما فعله احدٌ الا قليل۔ اہل کوفہ کہتے ہیں یہ تکریر پر ہے ما فعلوه ما فعله الا قليل منهم۔ عبد اللہ بن عامر اور عیسیٰ بن عمر نے استثنا کی بنا پر الا قليلاً پڑھا ہے، اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔ اور باقی قراء نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع تمام نحویوں کے نزدیک عمدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: نصب فعل کے اضمار پر ہے تقدیر اس طرح ہوگی الا ان يكون قليلاً منهم۔ رفع بہتر ہے، کیونکہ لفظ معنی سے اولیٰ ہوتا ہے اور وہ معنی پر بھی مشتمل ہے اور ان قلیل میں سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت ثابت بن قیس تھے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ حسن اور مقاتل نے حضرت عمار اور حضرت ابن مسعود کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہم نے بھی پہلے ان کا ذکر کیا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یعنی اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہوتا۔ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا یعنی حق پر مضبوطی سے ثابت قدم ہو۔ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا یعنی آخرت میں ثواب۔ بعض نے فرمایا: لام، لام الجواب ہے اور اذا جزا پر دال ہے، معنی یہ ہے لو فعلوا ما يوعظون به لاتيناهم۔ اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تو ہم انہیں عطا فرماتے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

''اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔ یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ جب اللہ تعالیٰ نے اس امر کا ذکر کیا کہ اگر منافقین اس امر کو بجا لاتے جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اور وہ اس کی طرف رجوع کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر انعام فرماتا۔ اس کے بعد ان کا ثواب ذکر

فرمایا جو ایسا کرتا ہے۔ یہ آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال کے وقت کہا تھا: اللھم الرفیق الاعلی (1)۔ اے اللہ رفیق اعلیٰ کی سنگت عطا فرما۔ اس سے یہی مراد ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تھا: ما من نبی یمرض الا خیر بین الدنیا والاخرۃ۔ جو نبی مریض ہوتا ہے اسے دنیا اور آخرت میں اختیار دیا جاتا ہے۔

وہ تکلیف جس میں آپ مریض تھے آپ کو بولنے میں سخت دقت محسوس ہو رہی تھی تو میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ان لوگوں کی معیت جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ تو میں جان گئی کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے (2)۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عبداللہ بن زید عبد ربہ انصاری جسے اذان دکھائی گئی تھی نے کہا: یا رسول اللہ! جب آپ کا وصال ہو جائے گا اور ہم بھی فوت ہو جائیں گے تو آپ علیین میں ہوں گے ہم آپ کو دیکھ نہیں سکیں گے اور نہ آپ کے ساتھ جمع ہوں گے۔ حضرت عبداللہ نے اس پر اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ کسی نے اس عبداللہ سے ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو انہوں نے دعا کی تھی: اللھم اعمنی فلا اری شیئا بعدہ (3)۔ اے اللہ مجھے نابینا کر دے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نہ دیکھوں۔ فعمی مکانہ تو وہ اسی جگہ نابینا ہو گئے۔ قشیری نے اس کو حکایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللھم اعمنی فلا اری شیئا بعد حبیبی حتی القی حبیبی، فعمی مکانہ۔ اے اللہ مجھے اندھا کر دے میں اپنے حبیب کے بعد کسی کو نہ دیکھوں حتیٰ کہ میں اپنے حبیب سے ملاقات کروں پس وہ اس جگہ نابینا ہو گئے۔ ثعلبی نے حکایت کیا ہے کہ یہ ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نازل ہوئی، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت رکھتے تھے اور آپ کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جب کہ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور جسم کمزور ہو چکا تھا اور حزن ان کے چہرے پر عیاں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اے ثوبان! تمہارا رنگ کیوں متغیر ہے۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے مگر میں جب آپ کو نہیں دیکھتا تو میرا اشتیاق بڑھ جاتا ہے اور مجھے انتہائی وحشت لاحق ہوتی ہے تو میں آپ سے ملاقات کرتا ہوں (اپنے عشق کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہوں) پھر میں نے آخرت کو یاد کیا اور مجھے خوف ہوا کہ میں وہاں تو آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا میں جانتا ہوں کہ آپ کا مرتبہ تو انبیاء کے ساتھ بلند ہوگا اور میں اگر جنت میں داخل بھی ہوا تو آپ سے نیچے درجے پر ہوں گا اور اگر میں جنت میں داخل نہ ہوا تو پھر کبھی بھی آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (4)۔

واحدی نے یہ کلبی سے ذکر کیا ہے اور مسروق سے سند اروایت کیا ہے فرمایا: صحابہ کرام نے کہا: ہمارے لیے مناسب نہیں کہ دنیا میں ہم آپ سے جدا ہوں لیکن جب آپ ہم سے جدا ہوں گے تو آپ کا مرتبہ ہم سے بلند ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 939
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 660
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 76
4۔ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، جلد 3، صفحہ 383

نازل فرمائی۔ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ......الخ۔ اور اللہ کی اطاعت میں اللہ کے رسول کی اطاعت ہے لیکن آپ ﷺ کا ذکر آپ کے اسم کی قدر و منزلت کے اظہار کے لیے کیا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ یعنی وہ ان کے ساتھ ایک گھر میں اور ایک جیسی نعمتوں میں ہوں گے وہ ان کی زیارت سے متمتع ہوں گے اور ان کے ساتھ حاضر ہوں گے لیکن وہ درجہ میں ان کے مساوی نہ ہوں گے وہ درجہ میں تو مختلف ہوں گے لیکن دنیا میں اتباع اور اقتدا کی وجہ سے ایک دوسرے کی زیارت کریں گے۔ جو بھی جنت میں ہوگا اسے اس کے حال کے مطابق رضا ملے گی، تو اس سے مفضول ہونے کا اعتقاد ختم ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ونزعنا ما فی صدورھم من غل۔ صدیق فعیل کا وزن ہے صدق یا تصدیق میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ صدیق وہ ہوتا ہے جو اپنے فعل سے اس کو ثابت کرتا ہے جو وہ زبان سے کہتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انبیاء کی اتباع کرنے والے فضلاء ہیں جنہوں نے تصدیق میں سبقت کی جیسے حضرت ابو بکر صدیق، سورۂ بقرہ میں صدیق کا اشتقاق اور شہید کا معنی گزر چکا ہے۔ شہداء سے یہاں مراد حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی ہیں اور صالحین سے تمام صحابہ کرام ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: الشُّهَدَآءِ سے مراد اللہ کے راستہ میں شہید ہونے والے ہیں۔ صالحین سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے نیک لوگ ہیں۔

میں کہتا ہوں: لفظ ہر صالح اور شہید کو شامل ہے۔ واللہ اعلم۔ رفیق نرم پہلو والے کو کہتے ہیں، ساتھی کو رفیق کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی صحبت کے ساتھ تجھ سے نرمی کرتا ہے۔ اسی سے الرفقۃ ہے۔ بعض، بعض سے مہربانی اور نرمی کرتے ہیں اور وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾ بھی جائز ہے۔ اخفش نے کہا: رَفِیْقًا حال کی بنا پر منصوب ہے یہ بمعنی رفقاء ہے اور کہا کہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے اسی وجہ سے واحد کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے گویا معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک رفیق ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثم نخرجکم طفلا یعنی تم میں سے ہر ایک کو نکالیں گے بطور بچہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ینظرون من طرف خفی۔

اس کا معنی نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ظاہر کرتا ہے خیر الرفقاء اربعۃ بہتر رفیق (دوست) چار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہاں چار کا ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ہے یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب میں اپنے اولیاء کے مراتب کا ذکر کیا تو پہلے ان سے آغاز فرمایا جو صدیقین سے اعلیٰ ہیں اور وہ انبیاء ہیں پھر صدیقین کا ذکر فرمایا اور ان کے درمیان واسطہ نہیں بنایا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام صدیق رکھنے پر مسلمانوں کا اجماع ہے جس طرح محمد ﷺ کا نام رسول رکھنے پر اجماع ہے جب یہ ثابت ہو گیا اور صحیح یہ ہے کہ آپ صدیق ہے اور رسول اللہ ﷺ دوسرے ہیں تو ان کے بعد کسی کا مقدم ہو جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ذٰلِكَ الْفَضْلُ، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انہوں نے اپنی طاعت سے یہ مرتبہ نہیں پایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ مرتبہ پایا۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے کہ بندہ یہ مقام اپنے فعل سے حاصل کرتا ہے

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء پر احسان کا اظہار فرمایا اس کے ساتھ جو اس نے ان پر نوازشات فرمائی تھیں اور کسی کے لیے اس کام پر اپنی تعریف کرنا جائز نہیں ہوتا جو اس نے کیا نہیں ہوتا تو یہ معتزلہ کے قول کے بطلان کی دلیل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝

"اے ایمان والو! ہوشیار رہو پھر (وقت آجائے تو) نکلو ٹولیاں بن کر یا نکلو سب مل کر"

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ، یہ امت محمدیہ میں سے مخلص مومنین کو خطاب ہے اور انہیں کفار سے جہاد کرنے، اللہ کے راستہ میں نکلنے اور شرع کی حمایت کرنے کا خطاب ہے، ماقبل آیت سے اس کی نظم اور اتصال کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طاعت کا ذکر کیا تو اہل طاعت کو دین کے احیاء، اپنی دعوت کے اعلاء کے قیام کا حکم دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ بلا سوچے سمجھے دشمن کی صفوں میں گھس نہ جائیں حتیٰ کہ جو ہتھیار، سامان جنگ ان کے پاس ہے اس کا خوب پتا لگالیں اور جان لیں کہ وہ ان پر کیسے حملہ کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ مضبوطی کا باعث ہے فرمایا خُذُوْا حِذْرَكُمْ تو جنگ کرنے کا اسلوب سکھایا اور یہ توکل کے منافی نہیں بلکہ یہ عین توکل کا مقام ہے جیسا کہ پہلے سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے اور مزید آگے آئے گا۔

الحِذْر، الحَذَر دونوں لغتیں ہیں جیسے مِثل اور مَثل۔ الفراء نے کہا اکثر کلام میں الحذر استعمال ہوتا ہے الحِذر بھی مسموع ہے کہا جاتا ہے خذ حذرک یعنی احذر (احتیاط کر) اور کہا جاتا ہے خذوا السلاح حذرا کیونکہ ہتھیار کے ساتھ احتیاط ہوتی ہے اور احتیاط تقدیر کو دور نہیں کرتی۔

مسئلہ نمبر 2۔ قدریہ اپنے اس قول میں کہ احتیاط دشمن کے مکائد اور سازشوں کو دور کرتا ہے۔ اہل سنت سے مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر احتیاط فائدہ نہ دیتی تو لوگوں کو احتیاط کا حکم دینے کا کوئی معنی نہیں تھا پس معتزلہ کو کہا جائے گا کہ آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں کہ احتیاط تقدیر سے کچھ فائدہ دیتی ہے لیکن ہمیں مکلف کیا گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ اسی سے یہ حدیث ہے اونٹ کو باندھو اور توکل کرو (1)۔ اگرچہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق جاری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس سے مراد دل کا اطمینان ہے نہ کہ یہ کہ احتیاط تقدیر سے کچھ فائدہ دیتی ہے اسی طرح احتیاط کرتا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبہ: 51) سے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی ہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا جو ان پر فیصلہ تھا اس کے خلاف نہیں پہنچتا تو اس کلام کا کوئی معنی نہیں رہتا۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ کہا جاتا ہے نفر ینفر نفیرا فا کے کسرہ کے ساتھ، نفرت الدابۃ نفر نفورا (فا کے ضمہ کے ساتھ) اس کا مطلب ہے دشمن سے جنگ کرنے کے لیے اٹھو، استنفر الامام الناس،

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام نے لوگوں کو نصر کی طرف بلایا یعنی دشمن سے لڑنے کی دعوت دی۔ النفیر اس قوم کو کہتے ہیں جو جنگ کے لیے نکلتے ہیں اس کی اصل النفار اور النفور سے ہے اور اس کا معنی گھبراہٹ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولوعلی ادبارھم نفورا یعنی وہ اسی سے ہے نفر الجلد یعنی جلد سوج گئی۔ تخلل رجل بالقصب فنفر فمہ یعنی آدمی نے سرکنڈے کے ساتھ خلال کیا تو اس کا منہ سوج گیا۔ ابوعبید نے کہا یہ نفار الشی من الشی سے مشتق ہے اور یہ ایک چیز کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے۔ ابن الفارس نے کہا النفر تین سے لے کر دس تک لوگوں کو کہتے ہیں النفیر اور النفر بھی ہے اسی طرح النفر اور النفرۃ بھی ہے۔ الفراء نے اس کو ہا کے ساتھ حکایت کیا ہے۔ یوم النفر جس دن لوگ منیٰ سے نکلتے ہیں وثبات اس کا معنی ہے متفرق جماعتیں۔ کہا جاتا ہے ثبین جمع مذکر سالم اور جمع مونث سالم بنائی جاتی ہے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

فاما یوم خشیتنا علیھم فتصبح خلینا عصبا ثبینا

پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثُبَاتٍ یہ سرایا سے کنایہ ہے اس کا مفرد ثبۃ ہے۔ اس سے مراد لوگوں کا گروہ ہے اصل میں یہ الثبیۃ ہے۔ قد ثبیت الجیش کا مطلب ہے تو نے لشکر کو گروہ گروہ بنا دیا۔ الثبۃ حوض کے وسط کو کہتے ہیں جس کی طرف پانی لوٹتا ہے۔ النحاس نے کہا عربی میں کمزور کا گمان ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں اور ہر ایک دوسرے سے ہے حالانکہ ان کے درمیان فرق ہے۔ ثبۃ الحوض کی تصغیر میں کہا جاتا ثویبۃ کیونکہ یہ ثاب یثوب سے مشتق ہے اور ثبۃ جس کا معنی جماعت ہے اس کی تصغیر میں ثبیۃ کہا جاتا ہے۔ نحاس کے علاوہ نے کہا ثبۃ الحوض میں واؤ محذوف ہے۔ اور واؤ عین کلمہ ہے اور ثبۃ الجماعۃ، معتل اللام ہے یہ ثبا یثبو جیسے خلا یخلو سے مشتق ہے اور الثبۃ بمعنی الجماعت کا ثبۃ الحوض سے مشتق ہونا بھی جائز ہے۔ کیونکہ پانی جب لوٹتا ہے تو جمع ہوتا ہے اس بناء پر ایک جماعت نے اس کی تصغیر ثویبہ بنائی ہے پس ایک یا کو دوسری یا میں داخل ہو گئی۔ حالانکہ کہا گیا ہے کہ ثبۃ الجماعۃ یہ ثبیت علی الرجل سے مشتق ہے جب تو اس کی زندگی میں اس کی تعریف کرے اور تو نے اس کے ذکر کے محاسن جمع کیے پس وہ اجتماع کی طرف لوٹتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوِانْفِرُوْا جَمِیْعًا اس کا معنی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کثیر تعداد میں لشکر بن کر نکلو یہ حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ سرایا، غنائم اور لشکروں کے احکام اور وجوب النفیر کے احکامات سورۃ الانفال اور سورہ برأت میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے کہا یہ آیت اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (توبہ: 31) اور اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ (توبہ: 39) کے ارشادات سے منسوخ ہے اور اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (کا منسوخ ہونا فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا اور وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً (توبہ: 122) کے ارشادات کے ساتھ اولیٰ ہے۔ کیونکہ جہاد فرض کفایہ ہے جب بعض مسلمان سرحدوں پر ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دونوں آیتیں محکم ہیں ایک اس وقت کے بارے میں ہے جب تمام پر ج فرض ہو جاتا ہے اور دوسری اس وقت کے بارے میں ہے جب کچھ لوگ ادا کر رہے ہوں تو کافی ہوتا ہے۔

وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِیۡدًا ۝ وَ لَئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَیَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡۢ بَیۡنَكُمۡ وَ بَیۡنَهٗ مَوَدَّةٌ یّٰلَیۡتَنِیۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ۝

''اور بے شک تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ضرور دیر لگائیں گے پھر اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ کہے: احسان فرمایا ہے اللہ نے مجھ پر کہ میں نہیں تھا ان کے ہمراہ (جنگ میں) حاضر۔ اور اگر ملے تمہیں فضل (فتح اور مال غنیمت) اللہ کی مہربانی سے تو ضرور کہے جیسے نہیں تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی کاش میں بھی ہوتا ان کے ہمراہ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ اس سے مراد منافقین ہیں۔ التبطئة اور الابطاء کا معنی ہے پیچھے رہنا۔ تو کہتا ہے: ما ابطأك عنا تمہیں ہم سے کس چیز نے پیچھے رکھا۔ یہ لازم ہے اور بطأت فلانا عن کذا بھی جائز ہے یعنی میں نے اس کو پیچھے کر دیا تو یہ متعدی ہے۔ اس آیت میں دونوں معانی مراد ہیں۔ منافقین خود بھی جہاد کے لیے نہیں نکلتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے اندر سے ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور ان میں سے ہیں جس نے تمہارے لیے اپنا ایمان ظاہر کیا۔ منافقین ظاہر حال میں مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان پر مسلمانوں کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں اور لمن میں لام تاکید کے لیے ہے اور دوسرا لام، لام قسم ہے اور من محل نصب میں ہے اور اس کے لیے صلہ لیبطئن ہے۔ کیونکہ اس میں قسم کا معنی ہے خبر منکم ہے۔ مجاہد، نخعی اور کلبی نے وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ یعنی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں قراءتوں میں معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ سے مراد بعض مومنین ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ کے ساتھ خطاب کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین اور منافقین کے درمیان وَ مَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ (توبہ:56) کے قول کے ساتھ فرق کیا ہے۔ کلام کا سیاق اور ظاہر اس قول کی تائید نہیں کرتا اور ان کو جنس اور نسب کے اعتبار سے خطاب میں جمع فرمایا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے نہ کہ ایمان کے اعتبار سے جمع کیا ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر دلیل یہ آیت ہے فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِیۡبَةٌ یعنی قتل اور شکست تمہیں پہنچے۔ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے پیچھے رکھ کر مجھ پر احسان فرمایا اور یہ عمل اور قول منافق سے ہی صادر ہوتا ہے خصوصاً اس مقدس دور میں مومن کا یہ کہنا تو بعید ہے۔ اس آیت کی تفسیر وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ائمہ حدیث نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: ''منافقوں پر بھاری ترین نماز عشاء اور فجر کی نماز ہے اگر وہ جانتے جو ان دو نمازوں میں فضیلت ہے تو وہ ان نمازوں کی طرف آتے خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑتا''۔ ایک روایت میں آیا ہے ''اگر انہیں معلوم ہو کہ انہیں موٹی ہڈی ملے گی تو یہ عشاء کی نماز میں حاضر ہوتے'' (1)۔ یعنی اگر دنیا کی کوئی چیز ظاہر ہو تو اس کو لے سکتے ہیں اور انہیں اس کے ملنے کا یقین ہو تو وہ اس کی طرف دوڑ کر آئیں گے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232

وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غنیمت اور فتح تمہیں ملے۔ لَيَقُوْلَنَّ تو یہ منافق، حاسد اور نادم کے قول جیسا قول کرے گا۔ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو میں عظیم کامیابی حاصل کرتا۔ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ یعنی اس نے تم سے جہاد پر کوئی عہد نہیں کیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن نے لیقولَنَ (من) کے معنی کے اعتبار سے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے(1) کیونکہ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ کے قول کا معنی کسی ایک خاص شخص کے لیے نہیں ہے اور جنہوں نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، لفظ (من) کے اعتبار سے واحد کی ضمیر لوٹائی ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے عاصم سے کان لم تکن، مودۃ کے لفظ کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے اور جس نے یا کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے مودۃ کو الود کے معنی میں تصور کیا ہے۔ اور منافقین کا قول يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ مال غنیمت کے فوت ہونے پر تاسف اور حسد کی بنا پر اللہ کی جزا میں شک کے ساتھ یہ کہے گا۔ فافوز تمنی کا جواب ہے اسی وجہ سے نصب دیا گیا ہے۔ حسن نے فافوز رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ فوز کی تمنا ہے گویا یوں کہا: یالیتنی افوز فوزا عظیما اور نصب جواب کی بنا پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو کامیاب ہوتا، اس میں نصب ان کے اضمار کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ مصدر کی تاویل پر محمول ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: یالیتنی کان لی حضور ففوزٌ کاش میرے لیے حاضری اور کامیابی ہوتی۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝

"پس چاہیے کہ لڑا کریں اللہ کی راہ میں (صرف) وہ لوگ جنہوں نے بیچ دی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض اور جو شخص لڑے اللہ کی راہ میں پھر (خواہ) مارا جائے یا غالب آئے تو (دونوں حالتوں میں) ہم دیں گے اسے اجر عظیم"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ مومنین کو خطاب ہے یعنی اللہ کے راستہ میں لڑیں کفار سے الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ جنہوں نے بیچ دیں اپنی جانیں اور اپنے اموال اللہ کے لیے بِالْاٰخِرَةِ یعنی آخرت کے ثواب کے بدلے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ شرط ہے فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ اس پر معطوف ہے اور جزا فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ہے۔ فَيُقْتَلْ کا معنی ہے جو شہید ہو گا یا کامیاب ہو گا اور مال غنیمت لے گا۔ ایک جماعت نے من یقاتل اور فلیقاتل (لام امر کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ایک جماعت نے: فلیقاتل (لام امر کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والے کی دونوں حالتوں کا ذکر فرمایا اور جو ان دونوں کے درمیان غایتیں تھیں ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 78

پر اکتفا کیا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ آیت کا ظاہر تقاضا کرتا ہے جو شہید کیا جائے گا یا مال غنیمت لے کر لوٹے گا ان کے درمیان برابری ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کفیل ہوتا ہے اس شخص کا جو اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے اور اسے نہیں نکالتا مگر اللہ کے راستہ میں جہاد، مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق، تو وہ میری کفالت ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں گا یا اسے اپنے مسکن کی طرف لوٹاؤں گا جس سے وہ نکلا اجر یا غنیمت حاصل کرتے ہوئے'' (1)۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مجاہدین اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں پھر وہ مال غنیمت حاصل کرتے ہیں وہ اپنے آخرت کے اجر میں سے دو ثلث (2/3) جلدی حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے لیے 1/3 حصہ باقی رہتا ہے، اگر انہیں غنیمت نہ ملی تو ان کے لیے اجر مکمل ہوگا'' (2)۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد: نائلا ما نال من اجر او غنیمۃ (اجر یا مال غنیمت حاصل کرتے ہوئے) یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو مجاہدین سے شہید ہوتا ہے وہ دو امور میں سے ایک امر پائے گا یا اجر اگر مال غنیمت نہ پایا یا مال غنیمت پائے گا اور اجر نہیں ہوگا۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث اس کے خلاف مفہوم رکھتی ہے۔ جب صورت حال اس طرح ہو تو ایک قوم نے کہا حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث کوئی حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ اس کی سند میں حمید بن ہانی ہے وہ مشہور نہیں ہے اور انہوں نے پہلی حدیث کو اس کی شہرت کی وجہ سے ترجیح دی۔ اور دوسرے ائمہ نے کہا: ان کے درمیان اور اختلاف نہیں ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں او بمعنی واؤ ہے جیسا کہ کوئی علماء کہتے ہیں۔ اس پر ابوداؤد کی روایت دلالت کرتی ہے اس میں من اجر و غنیمۃ (3) کے الفاظ ہیں یعنی واؤ ہے جو جمع پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض مسلم کے راویوں نے واؤ جمع بھی روایت کی ہے۔ اور حمید بن ہانی مصری ہیں انہوں نے ابو عبدالرحمٰن الحبلی اور عمرو بن مالک سے سنا ہے حیوہ بن شریح اور ابن وہب نے ان سے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث جہاد میں اخلاص اور مجرد نیت پر محمول ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ضمانت دی ہے یا تو اسے شہادت ملے گی یا وہ اپنے گھر والوں کے لیے مال غنیمت اور اجر حاصل کر کے لوٹے گا۔ اور دوسری کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ جب وہ جہاد کی نیت کرتا ہے لیکن مال غنیمت پانے کے ساتھ۔ جب اس کی نیت تقسیم ہو گئی تو اس کا اجر کم ہوگا۔ اور سنت اس پر دلالت کرتی ہے مال غنیمت پانے والے کے لیے اجر ہے جیسا کہ قرآن کریم اس پر دال ہے پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ پھر کہا گیا کہ مال غنیمت پانے والے کے اجر کی کمی اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا اس سے وہ متمتع ہوتا ہے اور اس زندگی کی سختی زائل فرما دیتا ہے اور جو مال غنیمت سے محروم ہوتا ہے تو اس نے کچھ نہ پایا اور وہ اپنی زندگی کی سختی پر باقی ہوتا ہے اور اپنی حالت پر صبر کرتا ہے تو اس کا پورا اجر باقی رہتا ہے بخلاف پہلے شخص کے۔ اس کی مثال دوسری حدیث میں ہے۔ فمنا من مات لم یاکل من اجرہ شیئا۔ منھم مصعب بن عمیر ومنا من اینعت لہ ثمرتہ فھو یھدبھا۔ جو ہم میں سے فوت ہوا اور اپنے اجر میں سے کچھ نہیں کھایا ان میں سے مصعب بن عمیر ہے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 133 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 337

اور ہم میں سے کچھ لوگوں کا پھل پک چکا ہے وہ اسے چن رہا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ۟

''کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو راہ خدا میں حالانکہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہ جہاد پر برانگیختہ کرنا ہے۔ یہ اپنے ضمن میں اس بات کو لیے ہوئے ہے کہ کمزور لوگوں کو ان مشرکوں کے ہاتھوں سے آزاد کرانا ہے جو ان کمزور لوگوں کو سزا دیتے ہیں اور انہیں دین کے سلسلہ میں فتنہ میں ڈالتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ، دین کے غلبہ اور کمزور مومنین کو نجات دلانے کے لیے جہاد کو واجب فرمایا اگرچہ اس میں نفوس کا تلف بھی ہو۔ اور قیدیوں کا چھڑانا مسلمانوں کی جماعت پر واجب ہے، خواہ وہ جہاد سے ہو یا اموال خرچ کرنے کے ساتھ ہو۔ اور یہ ضروری ہے، کیونکہ یہ نفس سے کم درجہ رکھتے ہیں۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے تمام اموال کے ذریعے قیدیوں کا فدیہ دیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فکوا العانی (1) قیدی کو چھڑاؤ۔ سورۂ بقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ اسی طرح علماء نے فرمایا: ان پر لازم ہے کہ وہ قیدیوں سے غم خواری کریں، کیونکہ مواسات (غم خواری) فدیہ دینے سے کم ہے۔ اگر قیدی غنی ہو تو وہ فدیہ دینے والے کو مال لوٹائے یا نہیں اس میں علماء کے دونوں قول ہیں لیکن اصح یہ ہے کہ وہ رجوع کرے۔

مسئلہ نمبر 2۔ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ اسم جلالت اللہ پر معطوف ہے یعنی وفی سبیل المستضعفین۔ کیونکہ مستضعفین (کمزور لوگوں) کو خلاصی دینا بھی فی سبیل اللہ میں سے ہے۔ یہ زجاج کا اختیار ہے اور یہی زہری کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: میرا پسندیدہ قول ہے کہ اس کا معنی ہے فی المستضعفین، اس صورت میں السبیل پر عطف ہوگا یعنی وفی المستضعفین یعنی وہ جہاد کریں کمزور لوگوں کو بچانے کے لیے۔ پس یہ دونوں راستے مختلف ہیں۔ یعنی مکہ میں مومنین میں سے جو لوگ کفار قریش کی تکلیف میں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہی معنی ہے: اللھم انج الولید بن الولید و سلمۃ بن ھشام و عیاش بن ابی ربیعہ و المستضعفین من المومنین (2)۔ اے اللہ ولید بن ولید، سلمۃ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو نجات عطا فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اور میری والدہ کمزور لوگوں میں سے تھے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے الا المستضعفین من الرجالِ و النِّساءِ و الوِلدانِ۔ میں اور میری والدہ

1۔ شعب الایمان، کتاب فی الزکوۃ، جلد 3، صفحہ 21
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 661

ان میں سے تھے جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور میں بچوں میں سے تھا اور میری والدہ عورتوں میں سے تھی۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں قریۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ ظالم کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا اگرچہ یہ فعل مکہ والوں کا تھا، کیونکہ ضمیر کے ساتھ تعلق ہے یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: مررت بالرجل الواسعة دارہ، الکریم ابوہ الحسنة جاریتة۔ اس کے ساتھ آدمی کا وصف بیان کیا گیا ان کے درمیان لفظی تعلق ہے اگر تو کہے: مررت بالرجل الکریم عمرو تو یہ جائز نہیں کیونکہ کرم، عمرو کے لیے ہے جب تک اس کو رجل کی صفت بنانا جائز نہیں مگر تعلق کے ساتھ اور وہ ضمیر ہے اس صفت کا نہ تثنیہ ہوتا ہے نہ جمع، کیونکہ یہ فعل کے قائم مقام ہوتی ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ شہر جس کے بسنے والوں نے ظلم کیا اسی وجہ سے الظالمین نہیں فرمایا۔ تو کہتا ہے: مررت برجلین کریم ابواھما حسنة جاریتاھما و برجال کریم اباءھم حسنة جواریھم۔ یعنی دو آدمیوں کے پاس سے گزرا جن کے باپ کریم تھے ان کی لونڈی خوبصورت تھی اور ایسے مردوں کے پاس سے گزرا جن کے آباء کریم تھے ان کی لونڈیاں خوبصورت ہیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ، لَدُنْكَ بمعنی عندك ہے۔ وَلِيًّا جو ہمیں بچائے۔ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا جو ہماری ان کے خلاف مدد کرے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝76

''جو ایمان لائے ہیں وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں وہ جنگ کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں تو (اے ایمان والو) لڑو شیطان کے حامیوں سے بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد فی طاعتہ ہے یعنی جو اللہ کی اطاعت میں جنگ کرتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا: طاغوت مذکر اور مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ مذکر، مونث استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ کاہن اور کاہنہ کو طاغوت کہتے تھے۔ فرمایا ہمیں حجاج نے بتایا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں ابو الزبیر نے بتایا کہ انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنا ان طاغوتوں کے بارے میں پوچھا گیا جن کے پاس لوگ فیصلے کے لیے جاتے تھے، تو انہوں نے فرمایا: ایک طاغوت جہینہ میں تھا ایک اسلم میں تھا اور ہر قبیلہ میں ایک طاغوت تھا۔ ابو اسحاق نے کہا: اس پر دلیل کہ وہ شیطان ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ یعنی شیطان کا مکر اور اس کے پیروکاروں کا مکر۔ کہا جاتا ہے: اس سے مراد بدر کا دن ہے جب مشرکین کو شیطان نے کہا تھا: لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ (الانفال: 48) تو جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور بولا میں بری الذمہ ہوں تم سے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں جب کہا گیا کہ روکو اپنے ہاتھوں کو اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوۃ (ان باتوں کو تو مان لیا) پھر جب فرض کیا گیا ان پر جہاد تب ایک گروہ ان میں سے ڈرنے لگ گیا لوگوں سے جیسے ڈرا جاتا ہے خدا سے یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے: اے ہمارے پروردگار! کیوں فرض کر دیا تو نے ہم پر جہاد اور کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک؟ (اے ترجمان حقیقت انہیں) کہو: دنیا کا سامان بہت قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کے لیے جو تقوی اختیار کرتے ہے اور نہیں ظلم کیا جائے گا تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر“۔

عمرو بن دینار نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ میں آئے اور کہا: اے اللہ کے نبی! ہم عزت میں تھے جب کہ ہم مشرک تھے جب ہم ایمان لائے تو ہم ذلیل ہو گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انی امرت بالعفو فلا تقاتلوا القوم (1)۔ مجھے عفو کا حکم دیا گیا ہے پس تم قوم سے نہ لڑو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ طیبہ کی طرف جانے کا حکم دیا تو آپ کو قتال کرنے کا حکم دیا پس وہ لوگ اس وقت جہاد سے رک گئے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حدیث کو نسائی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ اور یہ کلبی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ یہود تھے (2)۔ حسن نے کہا: یہ مومنین کے بارے میں ہے (3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَخْشَوْنَ النَّاسَ، النَّاسَ سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یہ بشری تقاضا کے مطابق خوف تھا نہ مخالفت کی وجہ سے تھا۔ سدی نے کہا: یہ وہ لوگ تھے جو جہاد کے فرض ہونے سے پہلے اسلام لائے تھے جب جہاد فرض کیا گیا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کا وصف بیان کیا گیا ہے (4) معنی یہ ہے کہ وہ مشرکین کی طرف سے قتل سے ڈرتے تھے جس طرح وہ اللہ کی طرف سے موت سے ڈرتے تھے۔ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً یعنی وہ اپنے اعتقاد میں اس سے بھی زیادہ ڈرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت کے سیاق کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ یعنی لَوْ لَاۤ، ھلا کے معنی میں ہے اس سے متصل فعل ہوتا ہے۔ اللہ کی پناہ کہ کسی معزز صحابی سے یہ قول صادر ہو جو جانتا ہو کہ یہ زندگی کی عمر محدود ہے اور رزق تقسیم شدہ ہے بلکہ صحابہ تو اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پیروی کرنے والے،

1۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 51
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 79
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 80
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 79

سننے اور اطاعت کرنے والے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں رہنے کی نسبت آخرت کے گھر میں پہنچنا بہتر ہے جیسا کہ ان کی سیرت سے ظاہر ہے مگر یہ کہ اس کا قائل ایسا شخص ہو جس کا ایمان ابھی راسخ نہ ہوا اور ابھی اس کا دل اسلام کی عظمتوں کے ساتھ کشادہ نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اہل ایمان ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے تھے ان میں سے کچھ کامل تھے اور کچھ ناقص تھے۔ یہ وہ تھے جس کا نفس متنفر تھا اس حکم سے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا جس میں اسے مشقت لاحق ہوتی تھی اور شدت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ۔ یہ مبتدا خبر ہے اسی طرح وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ یعنی جو گناہوں سے بچا۔ اس پر کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا دنیا کی منفعت اور اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا مراد ہے۔ دنیا کی منفعت کو قلیل کہا کیونکہ اس کے لیے بقا نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری مثال اور دنیا کی مثال سوار کی طرح ہے جس نے ایک درخت کے نیچے قیلولہ کیا'' (1)۔ پھر وہ پچھلے پہر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں تفصیلی مفہوم کے ساتھ گزر چکا ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝

''جہاں کہیں تم ہو گے آلے گی تمہیں موت اگرچہ (پناہ گزین) ہو تم مضبوط قلعوں میں اور اگر پہنچے انہیں کوئی بھلائی تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے انہیں کوئی تکلیف تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے۔ (اے میرے رسول) آپ فرمائیے سب اللہ کی طرف سے ہے۔ تو کیا ہو گیا اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے؟''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ شرط اور جزا ہے اور ما زائدہ ہے یہ خطاب عام ہے اگرچہ مراد منافقین یا وہ کمزور مومن ہیں جنہوں نے کہا تھا: لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ یعنی تو نے ہمیں کیونکہ ڈھیل نہ دی تاکہ ہم اپنی عمریں پوری کر کے فوت ہوتے۔ یہ منافقین کے زیادہ مشابہ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انہوں نے کہا: لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا (آل عمران: 156) اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے، ابو صالح نے ان سے روایت کیا ہے البروج کا واحد برج ہے، بلند عمارت اور عظیم محل کو کہتے ہیں۔ طرفہ نے اپنی اونٹنی کی تعریف میں کہا:

كأنها برج رومي تكنفها بان بشيد وآجر و أحجار

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 312۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 2299، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اونٹنی کو شاعر نے بلند روی محل سے تشبیہ دی ہے۔

طلحہ بن سلیمان نے یُدْرِكُكُمْ، کاف کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور فا کے اضمار کا اعتبار کیا ہے۔ یہ بہت قلیل ہے، یہ صرف اشعار میں ہوتا ہے۔

من یفعلِ الحسناتِ اللهُ یشکرُھا

اس میں لفظ اللہ سے پہلے فا مضمر ہے۔

علماء تفسیر کا بروج کی مراد میں اختلاف ہے۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ زمین میں جو قلعے بنے ہوئے تھے وہ مراد ہیں۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ بچاؤ اور حفاظت میں انسان کی غایت ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی مثال دی۔ قتادہ نے کہا: قصورٌ محصنۃ۔ محفوظ قلعے۔ یہ ابن جریج اور جمہور کا قول ہے(1)۔ اسی سے ہے عامر بن طفیل کا قول جو اس نے نبی کریم ﷺ سے کیا تھا ھل لک فی حصن حصین و منعۃ؟ کیا آپ کے لیے کوئی محفوظ قلعہ ہے؟ مجاہد نے کہا: البروج سے مراد محلات ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: البروج سے مراد حصون، قلعے اور محلات ہیں اور مُّشَیَّدَۃٍ کا معنی بلند و بالا ہے۔ یہ زجاج اور قتبی کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: جو جص کے ساتھ بنائے گئے ہوں۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے محفوظ۔ المشید اور المشَیَّد دونوں کا ایک معنی ہے۔ اسی سے ہے قصر مشید اور تشدید تکثیر کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: الشَّیَّد سے مراد بلند و بالا ہے۔ الشید سے مراد وہ جو جس کے ساتھ لپائی کیے گئے ہوں۔ کہا جاتا ہے: شاد البنیان واشاد بذکرہ۔ سدی نے کہا: البروج سے مراد آسمان دنیا میں بنائے گئے بروج ہیں۔ یہ قول مکی نے امام مالک سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: کیا تم نے ملاحظہ نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ (البروج) جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (فرقان:61) وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (الحجر:16) ابن عربی نے ابن القاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ نقاش نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ کا معنی ہے وہ لوہے کے محلات میں ہیں(2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس قول کی تائید ظاہر لفظ نہیں کرتے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت عمروں کے بارے میں قدریہ کا رد کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ الایۃ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جب عمر ختم ہو جاتی ہے تو روح کا جسم سے جدا ہونا ضروری ہوتا ہے خواہ وہ بذریعہ قتل ہو یا طبعی موت ہو یا کوئی اور طرح ہو جس کو اللہ تعالیٰ جاری فرمائے تاکہ روح جسم سے نکل جائے۔ معتزلہ نے کہا: مقتول کو اگر قاتل قتل نہ کرتا تو وہ زندہ رہتا۔ سورۂ آل عمران میں ان کا رد گزر چکا ہے مزید آگے آئے گا۔ انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ کفار اور منافقین کی موافقت کی۔

مسئلہ نمبر 3۔ شہروں کا بنانا اور ان کی تعمیر کرنا تاکہ ان کے ذریعے اموال اور نفوس کی حفاظت کی جائے یہ بندوں میں اللہ کی سنت ہے۔ اس میں اس کی رد کی بہت بڑی دلیل ہے جو کہتے ہیں: توکل ترک اسباب کا نام ہے۔ شہروں کا بنانا بہت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 80 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 81

بڑا سبب ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ انبیاء کرام نے قلعے بنائے اور اپنی حفاظت میں اضافہ کرنے کے لیے شہروں کے اردگرد خندقیں کھودیں۔ احنف سے پوچھا گیا: دیواروں کی کیا حکمت ہے؟ اس نے کہا: تا کہ وہ سفیہ (بے وقوف) کو روکے تا کہ حکیم آئے اور وہ اس کی حفاظت کرے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر ہم امام مالک اور سدی کے قول کو تسلیم کریں کہ یہ آسمان کے بروج ہیں تو پھر فلک کے بروج بارہ ہیں اور اس سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ان ستاروں کے لیے بروج ہیں تا کہ وہ ظاہر ہوں۔ یہ برج یبرج سے مشتق ہے جب کوئی چیز ظاہر ہو اور بلند ہو اسی سے ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب: 33)

ان کو اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کے لیے منازل بنایا اور ان میں اس کو مقدور کیا اور ان پر زمانوں کو مرتب کیا اور ان کو جنوبی اور شمالی بنایا، مصالح پر دلیل بنایا اور قبلہ پر علامت بنایا اور رات اور دن کے اوقات کے تحصیل کا راستہ بنایا تا کہ تہجد اور احوال معاش وغیرہ کے اوقات کی معرفت حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ یعنی منافقین کو جب خوشحالی اور شادابی میسر آتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ یعنی قحط سالی اور خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے یعنی یہ سب کچھ آپ کی، آپ کے صحابہ کی وجہ سے بے برکتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد سلامتی اور امن ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد امراض اور خوف ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد غنا ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد فقر ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد بدر کے دن کی نعمت فتح اور غنیمت ہے اور سَيِّئَةٌ سے مراد جنگ احد کی مصیبت، شدت اور قتل ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَنَةٌ سے مراد خوشی ہے، سَيِّئَةٌ سے مراد تکلیف ہے۔ یہ تمام مفسرین اور علماء تاویل کے اقوال ہیں جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ۔

یہ یہود اور منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ ان کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے کہا: جب سے یہ شخص اور اس کے صحابہ ہمارے پاس آئے ہیں اس وقت سے ہمارے پھلوں اور کھیتوں میں کمی آگئی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مِنْ عِنْدِكَ کا معنی ہے تمہاری بے تدبیری کی وجہ سے۔ بعض نے فرمایا: تمہاری نحوست کی وجہ سے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تمہاری نحوست کی وجہ سے جو ہمیں لاحق ہوئی۔ یہ انہوں نے فال کی جہت سے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ یعنی شدت، خوشحالی، کامیابی، ناکامی سب اللہ کی طرف سے ہے یعنی اس کے فیصلہ اور قدرت سے ہے۔ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ یعنی منافقین۔ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا یعنی کیا وجہ ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾

"جو پہنچے آپ کو بھلائی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے آپ کو تکلیف سو وہ آپ کی طرف سے ہے اور بھیجا

ہے ہم نے آپ کو سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کا) گواہ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ یعنی اے پیارے محمد! جو آپ کو شادابی، صحت اور سلامتی میسر آئے تو وہ تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے اور جو انسان کو قحط سالی اور شدت لاحق ہو وہ اس کے گناہ کی وجہ سے ہے جس پر اسے عقاب کیا گیا ہے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے یعنی اے لوگو! تمہیں جو شادابی، وسعت رزق میسر آئے تو وہ تم پر اللہ کا فضل ہے اور جو قحط سالی اور تنگی رزق پہنچے تو تمہاری اپنی طرف سے ہے یعنی تمہارے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ یہ حسن اور سدی وغیرہما کا قول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (طلاق: 1) بعض علماء نے فرمایا: خطاب ایک انسان کو ہے اور مراد پوری جنس ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (العصر) یعنی لوگ خسارے میں ہیں۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ان سے استثنا کی فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور استثنا جملہ یا جماعت سے ہوئی ہے۔ اس تاویل پر مَآ اَصَابَكَ نئی کلام ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے یقولون۔ اس پر کلام متصل ہوگی۔ معنی یہ ہوگا تو کیا ہوگیا اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے حتیٰ کہ کہتے ہیں، جب پہنچے آپ کو بھلائی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف استفہام مضمرہ ہے معنی ہے فَمِنْ نَّفْسِكَ کیا آپ کی طرف سے ہے؟ اس کی مثل ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ (الشعراء: 22) معنی یہ ہے او تلك نعمة اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (الانعام: 77) ای اھذا ربی (یہ تمام مثالیں ہمزہ استفہام کی تقدیر کے ساتھ ہیں)۔

ابو الخراش الہذالی نے کہا:

رَمَوْنِي وقالوا يا خُوَيْلِدُ لم تُرَعْ فقلت وأنكرتُ الوجوهَ هُمُ هُمُ

شاعر نے أهم کا ارادہ کیا ہے۔ ہمزہ استفہام مضمر ہے۔ یہ کثرت سے ہوتا ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔ اخفش نے کہا: ما بمعنی الذی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شرط ہے۔ نحاس نے کہا: درست اخفش کا قول ہے، کیونکہ یہ قحط سالی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کا گناہوں سے کوئی تعلق نہیں اگر اس کا تعلق گناہوں سے ہوتا تو عبارت یوں ہوتی وما اصبت من سیئة۔ عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے: ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك وانا كتبتها عليك۔ یہ قرأت تفسیر کی بنا پر ہے۔ بعض کج رو لوگوں نے اس کو قرآن سے ثابت کیا ہے اور اس کے متعلق حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی سے مروی حدیث منقطع ہے، کیونکہ مجاہد نے نہ حضرت عبداللہ بن مسعود کو دیکھا اور نہ حضرت ابی کو دیکھا۔ اور جنہوں نے کہا: الحسنة سے مراد جنگ بدر کی فتح اور غنیمت ہے اور السیئة سے مراد جنگ احد کی شکست ہے۔ صحابہ کرام کو سزا ملی جب ان تیر اندازوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ وہ پیچھے سے حفاظت کریں اور اپنی جگہ کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑیں، پس ان صحابہ نے قریش کی ہزیمت کو دیکھا اور مسلمانوں کو مال غنیمت اکٹھا کرتے ہوئے دیکھا تو

انہوں نے اپنی صفیں چھوڑ دیں۔ خالد بن ولید جو اس وقت کفار کے ساتھ تھے انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ تیر اندازوں کے گروہ سے خالی ہے، تو انہوں نے گھوڑوں کا ایک دستہ لیا اور مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صرف صاحب علم موجود تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی حفاظت کی تھی پس وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا اور شہید ہو گیا جیسا کہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی مثال نازل فرمائی۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ (آل عمران: 165) یعنی جنگ احد میں جو تمہیں مصیبت پہنچی۔ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا (آل عمران: 165) یعنی بدر کے روز اس کی دو مثل حاصل کر چکے ہو۔ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (آل عمران: 165)

اور یہاں حَسَنَةٍ سے مراد اطاعت اور سَيِّئَةٍ سے مراد معصیت لینا جائز نہیں جیسا کہ قدریہ نے کہا اگر یہ اس طرح ہوتا تو مااصبت ہوتا جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ فعل کے معنی میں ہے اور ہمارے نزدیک سب کے معنی میں ہے۔ حَسَنَةٍ طاعت کے معنی میں اور سَيِّئَةٍ معصیت کے معنی میں ہے اسی قول میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (الانعام: 160) لیکن اس آیت میں یہ خوشحالی، قحط سالی، راحت و شدت کے معنی میں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے وضاحت کی ہے اور اسی طرح سورۂ اعراف میں آیا ہے وہ یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ السنین سے مراد یکے بعد دیگرے قحط سالی ہے، ان سے بارش روک لی اور پھلوں میں کمی ہوگئی اور قیمتیں بہت چڑھ گئیں۔ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (الاعراف: 131) تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور) تو کہتے: ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے۔

یعنی وہ ان سے بری فال پکڑتے تھے اور کہتے تھے: یہ مہنگائی اور قحط سالی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے تیری اتباع کی اور تیری پیروی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس آیت سے رد فرمایا: اَلَآ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ (الاعراف: 131) یعنی برکت کی فال اور شؤم کی فال خیر اور شر، نفع و ضرر یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس میں مخلوق کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان چیزوں کو منسوب کیا فرمایا: وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران: 166) اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور علم کے ساتھ۔ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لاتا ہے وہ شک نہیں کرتا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور اس کے ارادہ و مشیت سے ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء: 35) اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝ (الرعد) اور جب

ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی ان کے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔

مسئلہ: بعض اہل سنت کے جہال نے اس آیت سے اسی طرح حجت پکڑی ہے جس طرح قدریہ نے اس سے حجت پکڑی ہے ان کے احتجاج کی وجہ یہ ہے کہ قدریہ کہتے ہیں: یہاں الحسنۃ بمعنی اطاعت ہے اور السیئۃ بمعنی معصیت ہے اور انہوں نے کہا: معصیت کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ** میں انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ یہ اس آیت سے ان کے تعلق کی وجہ ہے۔ دوسرے علماء کے تعلق کی وجہ یہ ارشاد ہے: **قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ** ان علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں الحسنۃ اور السیئۃ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، نہ کہ مخلوق کی طرف۔ یہ آیت ہے دونوں فریق کے جہال اس کے متعلق ہیں، کیونکہ انہوں نے اس کی بنیاد اس پر رکھی کہ سیئۃ یہاں معصیت کے معنی میں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ واللہ اعلم۔ قدریہ اگر کہیں کہ **مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ** یعنی طاعت میں سے **فَمِنَ اللّٰهِ** تو اللہ کی طرف سے تو ان کا یہ عقیدہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ جس پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ نیکی، نیکی کرنے والے کا فعل ہے اور برائی، برائی کرنے والے کا فعل ہے۔ اسی طرح اگر ان کی اس آیت میں حجت ہوتی تو کلام اس طرح ہوتا ما اصبت من حسنۃ وما اصبت من سیئۃ۔ کیونکہ وہ نیکی اور برائی کا فاعل ہے اس کی طرف مضاف نہیں کیا جاتا مگر ان دونوں افعال کے کرنے کے ساتھ جن کو کسی غیر نے نہ کیا ہو۔ اس مقالہ پر امام ابو الحسن شبیب بن ابراہیم بن محمد بن حیدرہ نے اپنی کتاب احز الغلاصم فی إفحام المخاصم میں نص قائم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا** مصدر مؤکد ہے یہ معنی بھی جائز ہے کہ ذا رسالۃ۔ **وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا** ﴿۷۹﴾ بیان کی بنا پر نصب ہے اور با زائد ہے یعنی **وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا** یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی رسالت کی سچائی پر گواہ ہے اور وہ گواہ ہے کہ وہ سچا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾

''جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جس نے منہ پھیرا تو نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ** اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس کی اطاعت ہے۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''(1)۔ اور ایک روایت میں ہے: ''جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی''۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 124

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ تَوَلّٰى جس نے منہ پھیرا۔ فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے اعمال کا پاسبان بنا کر نہیں بھیجا، آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ قتبی نے کہا: حَفِیْظًا کا معنی ہے محاسبًا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو آیۃ السیف سے منسوخ کر دیا اور اس سے جنگ کرنے کا حکم دیا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے۔

وَ یَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ٘ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَیَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَیْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝

"اور کہتے ہیں: ہم نے حکم مان لیا اور جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ان میں سے اس کے برعکس جو آپ نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ راتوں کو سوچا کرتے ہیں پس رخ (انور) موڑ لیجئے ان سے اور بھروسہ کیجئے اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز۔ تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ٘ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَیَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَیْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ یعنی أمرنا طاعةٌ اور طاعة پر نصب بھی جائز ہے یعنی نطیع طاعةً۔ یہ نصر بن عاصم، حسن اور جحدری کی قرأت ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی وہ جب آپ کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہمارا معاملہ اطاعت ہے یا ہم پوری طرح اطاعت کرتے ہیں اور ان کا یہ قول نفع بخش نہیں، کیونکہ جو اطاعت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو حقیقۃً مطیع نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس اطاعت کو ثابت نہیں کیا جو انہوں نے ظاہر کی تھی اگر بغیر اعتقاد طاعت اگر ہوتی تو ان کے لیے اس کا حکم کیا جاتا، پس ثابت ہوا کہ اعتقاد کے ساتھ اطاعت کا ثبوت ہے۔ فَاِذَا بَرَزُوْا جب وہ نکلتے ہیں۔

مِنْ عِنْدِكَ بَیَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ طائفہ کا ذکر فرمایا، کیونکہ وہ رجال کے معنی میں ہے۔ کوفیوں نے تا کو طا میں ادغام کیا، کیونکہ دونوں ایک مخرج سے ہیں۔ کسائی نے فعل میں اس کو قبیح سمجھا ہے جب کہ بصریوں کے نزدیک یہ قبیح نہیں ہے اور بیت کا معنی ملمع سازی کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تبدیلی کرنا اور بدلنا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو انہوں نے بدلا جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا اور جس کا انہیں حکم دیا تھا۔ التبییت کا معنی تبدیل کرنا ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

أتَوْنِی فلم أرْضَ ما بَیَّتُوا　　وكانوا أتَوْنِی بأمْرٍ نُكُرْ (1)

لِأُنْكِحَ أیِّمَهم مُنْذِراً　　وهل یُنْكِحُ العبدَ حرٌّ لحُرْ

ایک اور شاعر نے کہا:

بیّتَ قولِیَ عبدُ الملیـ　　ـكِ قاتلهُ اللهُ عبداً كفوراً

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 83، دار الکتب العلمیہ بیروت

ان اشعار میں بیت کا معنی تبدیل کرنا ہے۔

وبیّت الرجل الامر جب کوئی رات کے وقت پھر جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ۔ اور عرب کہتے ہیں: أمر بیت بلیل جب کوئی امر پختہ کیا جائے۔ رات کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ فارغ وقت ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

أجمعوا أمرهم بليل فلما أصبحوا أصبحت لهم ضَوضَاء

اس سے ہے بیّت الصیام و البیوت: الماء یبیت لیلاً والبیُوت: الامر یُبَیّت علیه صاحبه مُهتَماً به۔

ہذلی نے کہا:

وأجعلُ فِقْرتها عُدّةً إذا خِفْتُ بيُوتَ أمْرٍ عُضالِ

والتَّبیِتُ والبیات دشمن کا رات کے وقت آنا۔ بات یفعل کذا جب کوئی رات بھر کام کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ظل بالنہار، وبیّت الشيء یعنی کسی چیز کا اندازہ لگایا۔ اگر کہا جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ ابتدا میں تمام کا ذکر کیا پھر بَیَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ فرمایا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کی حالت سے تعبیر فرمایا جس کے متعلق اسے علم ہے کہ وہ کفر اور نفاق پر باقی رہا اور اس سے درگزر فرمایا جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے واپس آجائے۔ بعض نے فرمایا: اس کی حالت کو بیان کیا جو حاضر ہوا اور اپنے معاملہ میں حیران ہوا اور جس نے سنا اور خاموش رہا تو اس کا ذکر نہ کیا۔

وَاللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ یعنی وہ ان کے اعمال کے صحیفوں میں ان کی سازش کو لکھ رہا ہے تاکہ انہیں اس پر سزا دیجائے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے وہ تجھ پر کتاب میں نازل کرے گا(1)۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ صرف قول کچھ مفید نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: طَاعَةٌ اور صرف یہ لفظ کہا اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کو ثابت نہیں فرمایا اور ان کی اطاعت کی صحت کا حکم نہ لگایا، کیونکہ وہ اس کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مطیع، اطاعت شعار نہیں ہوگا مگر اطاعت کے اعتقاد کے ساتھ جب کہ اطاعت ساتھ ساتھ بالفعل پائی بھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ یعنی ان کے اسماء کی خبر نہ دو(2)۔ ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے انہیں سزا نہ دو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور دشمن پر مدد میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنے کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے: یہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ (توبہ:73) کے ارشاد سے منسوخ ہے، پھر منافقین پر عیب لگایا کہ وہ قرآن میں غور و فکر سے اعراض کرتے ہیں اور اس کے معانی میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ تدبرت الشئی۔ کسی چیز کے انجام میں غور و فکر کرنا۔ حدیث میں ہے لا تدابروا(3)۔ یعنی ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ واد بر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 83، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً

3۔ شعب الایمان، باب حفظ اللسان، جلد 4، صفحہ 199، حدیث نمبر 4783

القوم یعنی اس کا امر آخر تک پہنچا۔ والتدبیر انسان کا اپنے معاملہ میں غور وفکر کرنا گویا وہ اس کی عاقبت وانجام کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ آیت اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ (محمد) قرآن میں غور وفکر کرنے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے تاکہ اس کے معنی کو جان لیا جائے۔ یہ ان علماء کے قول کے فساد پر رد ہے جو کہتے ہیں: تفسیر سے کچھ نہیں لیا جائے گا مگر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور لغت عرب کی بنا پر جو سمجھ آئے اس کی تاویل سے منع کیا۔ اس میں غور وفکر اور استدلال کرنے کی دلیل ہے اور تقلید کے ابطال کی دلیل ہے، نیز اس میں قیاس کے اثبات پر دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا یعنی اگر یہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں وہ بہت زیادہ تفاوت اور تناقض پاتے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ابن زید سے مروی ہے۔ اس اختلاف میں قرأت کے الفاظ اور امثال، دلالات کے الفاظ اور سور اور آیات کی مقادیر داخل نہیں بلکہ تناقض وتفاوت کا اختلاف مراد لیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم جس کے متعلق خبر دیتے ہو کہ یہ غیر اللہ سے ہے اگر ایسا ہوتا تو اس میں اختلاف ہوتا۔ بعض نے فرمایا: جو متکلم زیادہ کلام کرتا ہے اس کی کلام میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے یا تو وصف اور لفظ کے اعتبار سے یا جودت معنی کے اعتبار سے یا تناقض کے اعتبار سے یا جھوٹ کے اعتبار سے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور لوگوں کو اس میں غور وفکر کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ اس میں نہ تو وصف کے اعتبار سے اختلاف پائیں گے، نہ معنی کے اعتبار سے رد پائیں گے نہ تناقض پائیں گے اور جو غیوب کی خبریں انہیں دی گئی ہیں، جو راز کی باتیں انہیں بتائی گئی ہیں ان میں اختلاف نہیں پائیں گے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا۝

"اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا خوف کی تو چرچا کرنے لگتے ہیں اس کا اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور با اقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں بات کا ان میں سے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور (نہ ہوتی) اس کی رحمت تو ضرور تم اتباع کرنے لگتے شیطان کا سوائے چند آدمیوں کے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ، اِذَا میں شرط کا معنی ہے اور اس کی جزا نہیں لگائی جاتی اگرچہ اس پر ما زائدہ کیا گیا ہو اور یہ بہت قلیل الاستعمال ہے۔ سیبویہ نے کہا: اور عمدہ ہے جو کعب بن زہیر نے کہا۔

واذا ما تشاء تبعث منها مغربَ الشمسِ ناشطًا مذعوراً

یعنی عمدہ یہ ہے کہ اذا ما کے ساتھ جزم نہ دی جائے جس طرح اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں یہ گزر چکا ہے مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا امر سنتے ہیں جس میں امن ہوتا ہے جیسے مسلمانوں کی کامیابی اور ان کے دشمن کا قتل

(اَوِالْخَوْفِ) یا اس کی ضد (اَذَاعُوْا بِہٖ) تو اس کا خوب چرچا کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کمزور مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ حسن سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو افشا کرتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ان پر اس میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ضحاک اور ابن زید نے کہا: یہ منافقین کے بارے میں ہے پس انہیں اس سے منع کیا گیا، کیونکہ اس سے انہیں جھوٹی افواہ پھیلانا لازم آتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ یعنی اس پر گفتگو نہ کرتے اور اس کا چرچا نہ کرتے حتی کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بیان کرتے اور اس کا اظہار کرتے۔ اُولِی الْاَمْرِ سے مراد اہل علم و فقہ ہیں۔ یہ حسن اور قتادہ وغیرہما سے مروی ہے۔ سدی اور ابن زید نے کہا: اس سے مراد والی ہیں (1)۔ بعض نے فرمایا: لشکروں کے امراء ہیں۔ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ یعنی وہ اسے نکالتے یعنی وہ جان لیتے جس کا افشاء کرنا مناسب تھا اور جس کا چھپانا مناسب تھا۔ الاستنباط یہ استنبطت الماء سے مشتق ہے جب پانی کو کوئی نکالے۔ النبط وہ پانی جو کنواں کھودتے وقت ابتدا میں نکلتا ہے اسے الماء المستنبط کہتے ہیں۔ نبطیوں کو نبط اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ زمین میں جو کچھ تھا اسے نکالتے تھے۔ لغت میں الاستنباط کا معنی الاستخراج (نکالنا) ہے۔ یہ اجتہاد کی دلیل ہے جب کسی معاملہ میں نص اور اجماع نہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ سیبویہ کے نزدیک فضل پر رفع مبتدا کی وجہ سے ہے اور اس کی خبر کا ظاہر کرنا جائز نہیں۔ اور کوفی کہتے ہیں: لولا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا اس آیت میں تین اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کا چرچا کیا مگر ان میں سے تھوڑے لوگوں نے یہ چرچا نہ کیا اور افشا نہ کیا۔ یہ نحویوں کی ایک جماعت کا قول ہے۔ کسائی، اخفش، ابو عبید، ابو حاتم اور طبری وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس کو جان لیا، ان لوگوں نے جنہوں نے ان میں سے استنباط کیا مگر ان میں سے تھوڑے لوگوں نے۔ یہ حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ زجاج کا مختار قول بھی یہی ہے۔ اس نے کہا: استنباط کو زیادہ لوگ جانتے تھے، کیونکہ اس کا مطلب ہے خبر کا علم حاصل کرنا۔ پہلے قول کو فراء نے اختیار کیا۔ اس نے کہا: سرایا کو مان لیا جب اس کا مستنبط علم غالب ہوا۔ الاذاعة (افشا) بعض میں ہوتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ کلبی نے فراء سے روایت کیا ہے اسی وجہ سے میں اذاعت سے استثنا کو اچھا سمجھتا ہوں۔ نحاس نے کہا: یہ دونوں قول مجاز پر ہیں مراد یہ ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور تیسرا قول بغیر مجاز کے ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، یہ کہ اس نے تم میں اپنا (ذی شان) رسول بھیجا جس نے تم میں حجت قائم کی، تو تم کفر کرتے اور شرک کرتے مگر تھوڑے تم میں سے وحدانیت کا اظہار کرتے۔ اس میں چوتھا قول بھی ہے۔ ضحاک نے کہا: اس کا معنی ہے تم شیطان کی اتباع کرتے مگر تھوڑے۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خود شیطان کے امر کو بیان کرتے مگر تھوڑے (2)، یعنی جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ خالص فرما دیا۔ اس قول کی بنا پر اِلَّا قَلِیْلًا کا استثناء لَا تَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ کے قول سے ہوگا۔ مہدوی نے کہا: اس قول کا اکثر علماء نے انکار کیا ہے جب تم پر اللہ کا فضل اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 85، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 218

اس کی رحمت نہ ہوتی تو تمام لوگ شیطان کی پیروی کرتے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

''تو (اے محبوب!) جہاد کرو اللہ کی راہ میں نہ تکلیف دی جائے گی آپ کو سوائے اپنی ذات کے اور ابھاریں آپ ایمان والوں کو (جہاد پر) عجب نہیں کہ اللہ روک دے زور ان لوگوں کا جو کفر کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے نیز وہ سزا دینے میں بہت سخت ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ فا، وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ سے متعلق ہے یعنی اس وجہ سے جہاد کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے قول سے متعلق ہے گویا یہ معنی ہے دشمن سے جہاد کو نہ چھوڑ اور مومنین میں سے جو کمزور ہیں اس کی مدد کرنے کو ترک نہ کر اگرچہ تو تنہا بھی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تیری مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا اگرچہ وہ تنہا بھی جہاد کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت کی ضمانت دی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ لفظ کا ظاہر ہے (1)، مگر کسی خبر میں ایسا نہیں آیا کہ جہاد کسی مدت کے لیے آپ پر فرض کیا ہو اور امت پر فرض نہ ہو۔ معنی یہ ہے کہ لفظاً خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یہ مثال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: یہ ہر ایک کے لیے خاص ہے۔ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت میں سے ہر شخص کو یہ حکم ہے۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ۔ یہ ہر مومن کے لیے مناسب ہے کہ وہ جہاد کرے اگرچہ تنہا بھی ہو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: واللہ لاقاتلنھم حتی تنفرد سالفتی (2)۔ اللہ کی قسم میں ان سے جہاد کروں گا حتیٰ کہ میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔ حضرت ابو بکر نے لوگوں کے ارتداد کے وقت کہا تھا: ولو خالفتنی یمینی لجاھدتھا بشمالی اگر میرا دایاں ہاتھ میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں بائیں ہاتھ سے جہاد کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت بدر الصغریٰ کے موسم میں نازل ہوئی۔ ابو سفیان جب جنگ احد سے واپس گیا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر الصغریٰ کے موسم کا وعدہ لیا۔ جب وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ستر شہسواروں کے ساتھ اس کی طرف نکلے لیکن ابو سفیان نہ آیا اور جنگ نہ ہوئی۔ یہ مجاہد کے قول کے معنی کے اعتبار سے ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ اس کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہے کہ منافقین کا وصف بیان کیا گیا کہ وہ معاملے کو خلط ملط کرتے ہیں اور جھوٹی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اعراض کرنے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا اگرچہ اس پر کوئی بھی مددگار نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ تکلف مرفوع ہے، کیونکہ مستقبل کا صیغہ ہے اس کو جزم نہیں دی گئی، کیونکہ یہ پہلے کی علت نہیں ہے۔ اخفش نے کہا کہ اس کو جزم بھی جائز ہے اور اِلَّا نَفْسَكَ۔ مجہول کی خبر ہے معنی یہ ہے کہ کسی دوسرے کا فعل تم پر لازم نہیں ہوگا اور تم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

1۔ المحرر الوجیز جلد 2، صفحہ 86
2۔ مسند احمد بن حنبل، مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 329

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال پر مومنین کو برانگیختہ کیا۔ کہا جاتا ہے: حرضت فلانا علی کذا۔ جب تو کسی کو کسی کا حکم دے۔ حارض فلان علی الامر واکب وواظب، سب کا ایک معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، عَسَى امید کے لیے ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے وجوب کے معنی میں ہوتا ہے، کیونکہ طمع (امید) کلام عرب میں وجوب کے معنی میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (الشعراء)

ابن مقبل نے کہا:

ظنّي بهم كعسى وهم بتنوفة يتنازعون جوائز الأمثال

اس میں عسیٰ یقین کے معنی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا یعنی اللہ تعالیٰ کی صولت، سلطنت بہت زیادہ ہے اور گرفت کرنے پر زیادہ قادر ہے جس کا ارادہ کرتا ہے۔ وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ حسن وغیرہ کا قول ہے۔ ابن درید نے کہا: رماہ اللہ بنکلة یعنی رماہ بما ینکلہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر اسی چیز کو پھینکا جس کے ساتھ اس نے اسے سزا دی۔ نکلت بالرجل تنکیلاً یہ النکال سے مشتق ہے۔ المنکل وہ چیز جو انسان کو سزا دیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

ارمر علی اقفائهم بمنكل

یعنی ان کی گردنوں پر عبرت ناک سزا دو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار شدت اور تکلیف میں ہیں اور تم نے کہا تھا کہ عَسَى بمعنی یقین ہے تو پھر یہ وعدہ کیسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے یہ وعدہ پایا گیا، اس کا وجود استمرار اور دوام کے ساتھ لازم نہیں، جب ایک دفعہ یہ پایا گیا اگرچہ یک لحظہ کے لیے ہو تو وعدہ سچا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بدر الصغریٰ میں مشرکین سے ان کی تکلیف کو روک لیا اور جو انہوں نے جنگ اور قتال کا عہد کیا تھا اس سے وہ پیچھے رہ گئے۔ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (الاحزاب: 25) مومنین سے اللہ تعالیٰ نے قتال کو روک لیا اور حدیبیہ میں جب انہوں نے عذر کیا اور فرصت کو غنیمت جانا تو مسلمان ان کو سمجھ گئے۔ پس وہ نکلے اور انہوں نے انہیں قیدی بنا لیا یہ سفیر تھے جو صلح کرانے کے لیے چلے تھے۔ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (الفتح: 24) سے یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ نے ان گروہوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا وہ بغیر قتل وقتال کے واپس لوٹ گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ اور یہودی اپنے گھروں کو مومنین سے لڑے بغیر چھوڑ کر چلے گئے یہ سب باس ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنین سے روک لی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہود ونصاریٰ اور بہت سے دشمن رسوائی کے ساتھ جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اور ذلیل وخوار ہو کر جنگ کا راستہ ترک کر دیا پس اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی شدت روک لی۔ والحمد للہ رب

العالمین۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

''جو کرے گا سفارش اچھی، ہوگا اس کا حصہ اس میں سے اور جو کرے گا سفارش بری، تو ہوگا اس کے لیے بوجھ اس سے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّشْفَعْ، الشفاعۃ اور الشفعۃ وغیرہ الشفع سے مشتق ہیں اور اس کا معنی جفت عدد ہے۔ اسی سے الشفیع (شفعہ کرنے والا)، کیونکہ وہ صاحب حاجت کے ساتھ شفع (جفت) ہو جاتا ہے۔ اس سے ناقۃ شفوع ہے جب ایسی اونٹنی جو ایک بچہ جنم دینے کے بعد پھر حاملہ ہو جائے۔ الشفع، ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا۔ الشفعۃ شریک کی ملکیت کو اپنی ملکیت کے ساتھ ملانا۔ الشفاعۃ کسی دوسرے کو اپنی جاہ اور وسیلہ کے ساتھ ملانا۔ یہ حقیقۃ شفیع کی قدرومنزلت کا مشفع کے پاس اظہار کرنا ہے اور جس کے لیے سفارش کی گئی ہے اس کو نفع پہنچانا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کی تاویل میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ مجاہد، حسن، ابن زید وغیرہم نے کہا: یہ لوگوں کا اپنی ضروریات کے لیے آپس میں سفارش کرنا ہے پس جو اس لیے سفارش کرے گا تا کہ وہ کسی کو نفع پہنچائے تو اس کے لیے حصہ ہوگا اور جو کسی کو ضرر اور نقصان پہنچانے کے لیے سفارش کرے گا اس کے لیے بوجھ ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: شفاعت حسنہ وہ ہے جو نیکی اور اطاعت میں ہو اور سیئہ سفارش وہ ہے جو معاصی (گناہوں) میں ہو (1)۔ جو اچھی سفارش کرے گا تا کہ دو آدمیوں کے درمیان صلح کرائے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا اور جو چغلی اور غیبت کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ یہ پہلی کے قریب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: شفاعت حسنہ سے مراد مسلمانوں کے لیے دعا کرنا ہے اور سیئہ سے مراد مسلمانوں کے لیے بددعا کرنا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جس نے کسی کی غیر موجودگی میں اس کے لیے دعا کی تو اس لیے دعا قبول کی جاتی ہے اور فرشتہ کہتا ہے آمین اور تیرے لیے اس کی مثل ہے'' (2)۔ یہ ہے وہ حصہ جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو کسی کے لیے برائی کی دعا کرتا ہے تو اس کی نحوست اس کی اپنی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ یہود مسلمانوں کے لیے بددعا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو جہاد میں اپنے ساتھی کے ساتھ ملے گا اس کے لیے اجر میں سے حصہ ہوگا اور جو باطل میں اپنے ساتھی سے ملے گا اس کے لیے گناہ کا بوجھ ہوگا۔ حسن سے بھی مروی ہے الحسنۃ جو دین میں جائز ہو اور السیئۃ جو دین میں جائز نہ ہو۔ گویا یہ جامع قول ہے۔ الکفل کا مطلب بوجھ اور گناہ ہے۔ حسن، قتادہ، سدی اور ابن زید سے مروی ہے کہ اس سے مراد نصیب (حصہ) ہے۔ یہ کفل البعیر سے مشتق ہے وہ کپڑا جو سوار اونٹ کی کوہان کے اردگرد لپیٹتا ہے تا کہ وہ گر نہ جائے۔ کہا جاتا ہے: اکتفلت البعیر۔ جب کوئی اونٹ کی کوہان کے اردگرد کپڑا لپیٹے اور اس پر سوار ہو اس کو کہا جاتا ہے اکتفل کیونکہ اس نے ساری پیٹھ کو استعمال نہیں کیا بلکہ پیٹھ کا ایک حصہ استعمال کیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 86، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر، جلد 2، صفحہ 352

یہ خیر وشر کے حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (الحدید: 28)
سفارش کرنے والے کو اجر مل جاتا ہے جب وہ جائز کام کی سفارش کرتا ہے اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ بھی کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ یَّشْفَعْ (جو سفارش کرے گا) مَنْ یُّشَفَّعْ (جس کی سفارش قبول کی جائے گی) نہیں فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے "سفارش کرو تمہیں اجر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ جو چاہے گا اپنے نبی کی زبان پر فیصلہ فرمائے گا" (1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ۝، مُّقِیْتًا کا معنی ہے قدرت والا۔ اسی سے زبیر بن عبد المطلب کا شعر ہے:

وذی ضِغْنٍ كففتُ النفسَ عنه　　وكنتُ علی مَساءته مُقِیتًا (2)

اس میں شاعر نے مقیتاً کو قدیراً کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو روزی دینے والا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کفی بالمرء اثماً ان یُضیّع من یقیت (3)۔ انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے عیال وغیرہ کو ضائع کردے یعنی جن کو وہ خوراک دیتا ہے جو اس کی قدرت میں ہیں اور قبضہ میں ہیں۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے۔ اسی سے وہ کہتا ہے: قُتُّه أقوته قوتاً و أَقَتُّه أُقِیتُه أقاتةً فأنا قائت و مُقیت۔ ان تمام کا معنی روزی دینا اور رزق دینا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے: أقات، یقیت۔ شاعر کا قول ہے۔

إنّی علی الحساب مُقِیتُ (4)

"میں حساب سے خوراک دینے والا ہوں"۔

طبری نے اس کے بارے کہا: یہ مذکورہ معنی سے نہیں ہے بلکہ یہ موقوف کے معنی میں ہے (5)۔ ابوعبیدہ نے کہا: المقیت کا معنی الحافظ (حفاظت کرنے والا) ہے۔ کسائی نے کہا: المقیت کا معنی المقتدر ہے۔ نحاس نے کہا: ابوعبیدہ کا قول اولیٰ ہے، کیونکہ یہ القوت سے مشتق ہے اور القوت کا معنی ہے وہ مقدار جو انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ الفراء نے کہا المقیت وہ ہوتا ہے جو ہر شخص کو رزق اور خوراک دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: کفی بالمرء اثماً ان یضیع من یقوت (6) انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کردے جن کو وہ خوراک دیتا ہے۔ ثعلبی نے ذکر کیا ہے: ابن الفارس نے "المجمل" میں حکایت کیا ہے: المقیت المقتدر، المقیت الحافظ و الشاهد، و ما عنده قِیتُ لیلة و قوت لیلة۔ یعنی المقیت کا معنی قدرت والا ہے اور اس کا معنی حافظ و شاہد بھی ہے اور وہ بھی جس کے پاس رات کی خوراک ہو۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ۝

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الآداب، جلد 2، صفحہ 330
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 86
3۔ سنن ابی داود، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 238
4۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 223
5۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 87
6۔ سنن ابی داود، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 238

''جب سلام دیا جائے تمہیں کسی لفظ دعا سے تو سلام دو تم ایسے لفظ سے جو بہتر ہو اس سے یا (کم از کم) دوہرا دو وہی لفظ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے''۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ، التحیة یہ حییت کا مصدر ہے۔ اصل میں تحییة تھا جیسے ترضیة اور تسمیة ہے یا کو یا میں ادغام کیا گیا۔ التحیة کا معنی سلام ہے۔ التحیة کی اصل زندگی کی درازی کی دعا کرنا ہے۔ التحیات للہ یعنی آفات سے سلامتی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ملک بھی ہے۔ عبداللہ بن صالح العجلی نے کہا: میں نے کسائی سے التحیات للہ کے متعلق پوچھا کہ اس کا معنی کیا ہے؟ انہوں نے کہا: التحیات، برکات کی مثل ہے۔ میں نے کہا: برکات کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا میں نے اس کے متعلق محمد بن حسن سے پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ ایسی چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکلف کیا ہے پھر میں کوفہ میں آیا تو میں نے عبداللہ بن ادریس سے پوچھا۔ میں نے کہا: میں نے کسائی اور امام احمد سے التحیات للہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مجھے ایسا ایسا کہا۔ عبداللہ بن ادریس نے کہا: ان دونوں کو اشعار اور ان اشیاء کا علم نہیں؟

التحیة کا معنی الملک ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

أَؤُمُّ بها أباقابوس حتى أُنِيخَ على تحيته بجُنْدِي

ابن خویز منداد نے کہا:

أَسِيرُ به الى النعمان حتى أُنِيخَ على تحيته بجُنْدِي

تحیة سے مراد ان اشعار میں ملک ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ولَكُلُّ ما نال الفتى قد نِلْتهُ إلا التَّحِيّة

قتبی نے کہا: التحیات للہ جمع کا صیغہ ذکر فرمایا، کیونکہ زمین میں بہت سے بادشاہ ہیں جو مختلف ملکیتیں رکھتے ہیں، پس بعض کو کہا گیا ابیت اللعن، اور بعض کو کہا گیا: اسلم وانعم بعض کو کہا گیا: عش الف سنة۔ اور ہمیں کہا گیا: تم کہو التحیات للہ۔ یعنی وہ الفاظ جو ملک پر دلالت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے ملکیت سے کنایہ ہیں۔ اس آیت کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہے کہ فرمایا: جب تم جہاد کے لیے نکلو جیسا کہ اس کا امر پہلے ہو چکا ہے تو تم پر سلام کے ساتھ سلام کیا جائے تو تم سلام کرنے والے کو یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے بلکہ تم سلام کا جواب لوٹاؤ، کیونکہ اسلام کے احکام ان پر جاری ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا آیت کے معنی اور تفسیر میں اختلاف ہے۔ ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت چھینک مارنے والے کا جواب دینے اور جواب دینے والے کے جواب کے بارے میں ہے۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ کلام میں اس پر کوئی دلالت نہیں ہے اور چھینک کا جواب دینے والے پر جواب لوٹانا قیاساً سلام لوٹانے کے معنی میں داخل ہے۔ اگر یہ قول امام مالک سے صحیح ہے تو امام مالک کا میلان اس طرف اس بنا پر ہوگا۔ اور ابن خویز منداد نے

کہا: اس آیت کو ہبہ پر محمول کرنا بھی جائز ہے جب وہ لوٹانے کے لیے ہو جس کو لوٹانے کے لیے ہبہ کیا گیا اسے اختیار ہے چاہے تو واپس کر دے، چاہے تو اسے قبول کر لے اور اس پر اس کی قیمت لوٹا دے۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا: التحیۃ یہاں ہدیہ کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ رُدُّوْهَا۔ بعینہ سلام لوٹانا تو ممکن ہی نہیں ہے اور ظاہر کلام بعینہ تحیۃ ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ ہدیہ ہے اگر قبول کرے تو اسے عوض دینے کا حکم ہے یا بعینہ وہ ہدیہ لوٹا دے۔ یہ سلام میں تو ممکن ہی نہیں۔ لوٹانے کے لیے ہبہ اور ہدیہ کا حکم سورۂ روم میں: وَمَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا کے تحت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صحیح یہ ہے کہ یہاں التحیۃ سلام کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَیَّوْكَ بِمَا لَمْ یُحَیِّكَ بِهِ اللّٰهُ (المجادلہ: 8)

نابغہ ذبیانی نے کہا:

تُحَیِّیهم بیض الولائدِ بینهم وأکسیةُ الإضریج فوق المشاجبِ

یہاں انہیں سلام کرنے کا شاعر نے ارادہ کیا ہے۔

اس مفہوم پر مفسرین کی ایک جماعت ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو آیت کی فقہ یہ ہو گی کہ کہا جائے کہ علماء کا اجماع ہے کہ سلام سے ابتدا کرنا مرغوب سنت ہے اور اس کا لوٹانا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک سلام کا جواب دے دے تو کافی ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ یہ ہے کہ کافی ہے جو سلام کرنے والا ہے اس پر اس کی مثل قول لوٹایا جائے گا۔ کوفیوں نے کہا: سلام کا لوٹانا فروض متعینہ میں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں: سلام کرنا، اس کا حکم سلام لوٹانے کے برعکس ہے، کیونکہ سلام کرنا تطوع اور نفل ہے اور اس کا لوٹانا فرض ہے اگر جن پر سلام کیا گیا ہے ان کے علاوہ کسی نے سلام کا جواب دیا تو ان سے فرض ساقط نہ ہو گا۔ پس یہ دلیل ہے کہ سلام کا لوٹانا ہر انسان پر لازم ہے حتیٰ کہ قتادہ اور حسن نے کہا: نمازی کو جب سلام کیا جائے تو بھی کلام کے ساتھ سلام کا جواب دے اور اس سے اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ اس نے وہ فعل کیا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے، جب کہ لوگوں کا عمل اس کے خلاف ہے۔ پہلے علماء نے ابوداؤد کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ایک جماعت گزرے تو ان میں سے ایک کا سلام کرنا کافی ہے اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک کا ان کے سلام کا جواب دینا کافی ہے''(1)۔ یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ ابوعمر نے کہا: یہ حدیث حسن ہے، اس کا کوئی معارض نہیں، اس کی سند میں سعید بن خالد ہے۔ یہ سعید بن خالد خزاعی مدنی ہے۔ بعض کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض نے اس کو ضعیف کہا ہے، ان میں ابوزرعہ، ابوحاتم اور یعقوب بن شیبہ ہیں ان محدثین نے اس کی حدیث کو منکر بنایا ہے، کیونکہ اس سند کے ساتھ اس میں وہ منفرد ہے، کیونکہ عبداللہ بن فضل نے عبید اللہ بن ابی رافع سے نہیں سنا ہے، ان کے درمیان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 352

اس حدیث کے علاوہ احادیث میں اعرج ہے۔ واللہ اعلم۔ نیز اس ارشاد گرامی سے حجت پکڑی ہے: یسلم القلیل علی الکثیر (1) تھوڑے زیادہ پر سلام کریں۔ جب اس بات پر اجماع ہے کہ ایک شخص پوری جماعت کو سلام کر سکتا ہے تو تکرار کی ضرورت نہیں اسی طرح ایک شخص جماعت کی طرف سے لوٹا دے وہ دوسروں کے قائم مقام ہو جائے گا جیسے فرض کفایہ ہوتے ہیں۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوار، پیدل چلنے والے پر سلام کرے اور جب قوم میں سے ایک سلام کرے تو تمام کی طرف سے کافی ہوگا'' (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ دلیل ہے کہ ایک کا جواب دینا کافی ہے اور ایک شخص کے جواب دینے کے جواز میں اس کو حجت بنایا ہے۔ اس میں قلق ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا** بہتر لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زائد الفاظ کہے۔ وہ کہے: وعلیك السلام ورحمۃ اللہ۔ یہ اس کے جواب میں کہے جس نے سلام علیك کہا اگر وہ کہے: سلام علیك ورحمۃ اللہ تو تم وبرکاتہ جواب میں زائد کرو۔ یہ انتہا ہے اس پر مزید کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے البیت الکریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ اگر اس کا سلام غایت پر ختم ہو تو اس کے لوٹانے میں ابتدا میں واؤ کا اضافہ کر دے اور تو کہے وعلیك السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اور بالمثل لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ جو تجھے کہے: السلام علیك تو اس کے جواب میں علیك السلام کہہ دے مگر مناسب یہ ہے کہ سلام جمع کے صیغہ کے ساتھ کیا جائے اگرچہ جس کو سلام کیا گیا ہے وہ ایک ہی ہو۔ اعمش نے ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب تو ایک شخص کو سلام کرے تو السلام علیکم کہہ، کیونکہ اس کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں اسی طرح جواب بھی جمع کے صیغہ کے ساتھ ہو۔ ابن ابی زید نے کہا: سلام کرنے والا السلام علیکم کہے اور جواب دینے والا وعلیکم السلام کہے یا کہے السلام علیکم جیسا اسے کہا گیا ہے۔ **اَوْ رُدُّوْهَا** کا معنی ہے کہ تم اس کے جواب میں سلام علیك نہ کہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ سلام کرنے میں بہتر اور ادب یہ ہے کہ مخلوق کے اسم پر اللہ تعالیٰ کے اسم کو مقدم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ** ۝ (الصافات) حضرت ابراہیم کے قصہ میں فرمایا: **رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ** (ہود: 73) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا (سلام علیك)۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے ہے (3) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا، ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا پھر جب انہیں تخلیق فرمایا: تو فرمایا تم جاؤ اور ان لوگوں پر سلام کرو، وہ فرشتوں کا گروہ تھا جو بیٹھا ہوا تھا، پھر جو تجھے وہ جواب دیں وہ تیرا اور تیری اولاد کا سلام ہوگا''۔ فرمایا۔ ''حضرت آدم علیہ السلام چلے گئے اور کہا: السلام علیکم تو جواب میں فرشتوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ''۔ فرمایا: ''انہوں نے ورحمۃ اللہ زیادہ کہا''۔ فرمایا: ''ہر وہ شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوگا اس کا قد لمبائی میں ستر ہاتھ ہوگا حضرت آدم علیہ السلام کے بعد مخلوق

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 212
2۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، صفحہ 724
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلہا، جلد 2، صفحہ 380

کم ہوتی رہی حتیٰ کہ اب تک کم ہوتی رہی"۔
میں کہتا ہوں: یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ فوائد کی جامع ہے۔
(۱) آدم کی تخلیق کی صفت کے متعلق خبر دینا (۲) ہم اللہ کے فضل سے اس صفت پر جنت میں داخل ہوں گے (۳) تھوڑے لوگوں کا زیادہ لوگوں پر سلام کرنا (۴) اللہ تعالیٰ کے اسم کو مقدم کرنا (۵) سلام بالمثل لوٹانا کیونکہ فرشتوں کو آپ نے کہا: السلام علیکم (۶) لوٹانے میں زیادتی کرنا (۷) تمام لوگوں کا جواب دینا جیسا کہ کوفیوں کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کوئی سلام کا جواب دے اور جو سلام کرنے والے کے اسم کو مقدم کر دے تو یہ حرام اور مکروہ نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے جس شخص نے اچھی طرح نماز نہیں پڑھی تھی اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: وعلیك السلام ارجع فصل فانك لم تصل (1) تم پر سلام ہو تو لوٹ جاؤ اور پھر نماز پڑھ کیونکہ تو نے صحیح نماز نہیں پڑھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ جب انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ جبریل انہیں سلام کہہ رہا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ کی حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو سلام بھیجے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے سلام کا اسی طرح جواب دے جس طرح سامنے والے شخص کو سلام کا جواب دیتا ہے۔ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میرا والد آپ کو سلام عرض کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیك وابيك السلام (2)۔ تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام۔

نسائی اور ابو داؤد نے حضرت جابر بن سلیم کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا میں نے کہا: علیک السلام یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیک السلام نہ کہو، کیونکہ علیک السلام تو میت کا سلام ہے۔ بلکہ تم کہو: السلام علیک (3)۔ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ مگر عربوں کی عادت ہے کہ وہ جس کے خلاف دعا کرتے ہیں اس کا اسم پہلے ذکر کرتے ہیں مثلاً علیہ لعنۃ اللہ وغضب اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (ص)
شعراء کی مردوں کو سلام کرنے کی یہی عادت ہے جیسے

علیك سلام الله قیس بن عاصم ورحمتہ ماشاء ان یترحما

شماخ نے کہا:

علیك سلام من امیر و بارکت یَدُ اللہ فی ذاك الادیم الممزق

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس سے منع فرمایا اس لیے نہیں کہ وہ مردوں کے حق میں مشروع لفظ ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 170
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 351۔ ایضاً، حدیث نمبر 4554، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 287۔ ایضاً سنن ابی داؤد، حدیث 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے ثابت ہے کہ مردوں پر اس طرح سلام کیا جس طرح آپ نے زندوں کو سلام کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: السلام علیکم دار قوم مومنین وانا ان شاء الله بکم لاحقون (1)۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیف أقول اذا دخلت المقابر؟ میں جب قبور میں داخل ہوں تو کیسے کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قولی السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین (2)۔ مزید ان شاء اللہ سورۃ الهاکم میں تفصیل آئے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ کی حدیث تمام اہل قبور پر سلام کرنے میں ہو جب کوئی ان میں داخل ہو اور ان کے پاس جائے۔ اور حضرت جابر بن سلیم کی حدیث اس گزرنے کے ساتھ خاص ہو جس سے زیارت مقصود ہو۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ سنت ہے کہ سوار، پیدل چلنے والے کو سلام کرے، کھڑا شخص بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، تھوڑے زیادہ کو سلام کریں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سوار سلام کرے'' (3)۔ پہلے سوار کا ذکر کیا اس کے علو مرتبہ کی وجہ سے نیز کیونکہ وہ اس سے تکبر کو دور کرے گا۔ اسی طرح پیدل چلنے والے کے بارے میں کہا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب بیٹھنے والا، وقار، سکون اور ثبوت کی حالت پر ہے تو اس کو چلنے والے پر فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اس کا حال اس کے برعکس ہے۔ تھوڑے لوگوں کا زیادہ لوگوں کو سلام کرنا مسلمانوں کی جمعیت اور اکثریت کے شرف کی رعایت رکھی گئی ہے۔ بخاری نے اس حدیث میں ویسلم الصغیر علی الکبیر (4) (چھوٹا بڑے کو سلام کرے) کا اضافہ کیا ہے۔ رہا بڑے کا چھوٹے کو سلام کرنا تو وہ اشعث نے حسن سے روایت کیا ہے وہ بچوں پر سلام کرنے کا نظریہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا: سلام کا جواب دینا فرض ہے اور بچے پر سلام کا جواب دینا لازم نہیں پس ان کو سلام کرنا مناسب نہیں۔ ابن سیرین سے مروی ہے کہ وہ بچوں کو سلام کرتے تھے لیکن ان کا سلام سنتے نہیں تھے۔ اکثر علماء نے کہا بچوں کو سلام کرنا ان کو ترک کرنے سے افضل ہے۔ صحیحین میں حضرت سیار سے مروی ہے فرمایا: میں ثابت کے ساتھ چلتا تھا وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں سلام کرتے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ وہ حضرت انس کے ساتھ چلتے تھے وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں سلام کرتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلتے تھے آپ بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں سلام کرتے (5)۔ یہ مسلم کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے خلق عظیم میں سے ہے۔ اس میں چھوٹے بچے کے لیے تہذیب وتدریب ہے اور سنن کی تعلیم پر انہیں ابھارنا ہے اور اس میں شریعت کے آداب پر ان کی ریاضت ہے، پس اس کی تقلید کرو۔ رہا عورتوں کو سلام کرنا تو یہ جائز ہے مگر نوجوان عورتیں جن سے بات کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو شیطان، وسوسہ یا آنکھ کی خیانت کی وجہ سے ان سے بات کرنے میں فتنہ کا خوف ہو تو انہیں سلام نہیں کرنا چاہیے۔ رہی بوڑھی عورتیں تو ان کا سلام کرنا اچھا ہے، کیونکہ وہاں امن ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ عطا اور قتادہ

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 287۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث 3562، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الادب، صفحہ 399

3۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 212

4۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، جلد 2، صفحہ 921

5۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 214

کا قول ہے۔ امام مالک اور علماء کا ایک گروہ یہی نظریہ رکھتا ہے، کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے جب ان میں ذوات محرم نہ ہوں۔ یہ علماء کہتے ہیں: جب عورتوں سے اذان، اقامت، جہری قرأت نماز میں ساقط ہے تو ان سے سلام کا جواب دینا بھی ساقط ہوگا پس انہیں سلام کیا ہی نہیں جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ہم جمعہ کے دن خوش ہوتے تھے۔ میں نے کہا: کیوں (خوش ہوتے تھے)؟ انہوں نے کہا: ہماری ایک بوڑھی عورت تھی وہ بضاعہ کی طرف جاتی تھی ابن مسلمہ نے کہا: مدینہ میں بضاعہ کھجور کا ایک باغ ہے۔ وہ وہاں سے چقندر کی جڑیں لیتی تھی انہیں ہانڈی میں ڈالتی تھی اور پھر جو کے دانے پیس کر ان پر ڈالتی تھی جب ہم جمعہ پڑھتے تھے اور واپس آتے تھے تو اسے سلام کرتے تھے، وہ ہمیں کھانا پیش کرتی تھی، تو اس وجہ سے ہم خوش ہوتے تھے اور ہم نہ قیلولہ کرتے تھے نہ کھانا کھاتے تھے مگر جمعہ کے بعد (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ سلام اور جواب میں سنت بلند آواز سے کرنا اور جواب دینا ہے انگلیوں اور ہتھیلی سے اشارہ کرنا امام شافعی کے نزدیک کافی نہیں اور ہمارے نزدیک کافی ہے جب وہ دوری پر ہو۔ ابن وہب نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرمایا: السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین پر رکھا ہے پس تم اسے آپس میں پھیلاؤ۔ انسان جب کسی قوم پر سلام کرتا ہے اور وہ اسے جواب دیتے ہیں تو اس شخص کو ان پر فضیلت ہوتی ہے، کیونکہ اس نے انہیں یاد دلایا۔ اگر وہ اسے سلام کا جواب نہ دیں تو اس کو وہ جواب دیتا ہے جو ان سے بہتر ہے اور پاکیزہ ہے۔ اعمش نے عمرو بن مرۃ سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: جب کوئی شخص کسی قوم پر سلام کرتا ہے تو اسے فضیلت ہوتی ہے، اگر وہ اسے جواب نہ دیں تو فرشتے اسے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جواب نہ دینے والوں پر لعنت کرتے ہیں۔ جس کو سلام کیا جائے وہ سلام کا جواب سنا کر دے، کیونکہ جب وہ سلام نہیں سنائے گا تو وہ اس کا جواب شمار نہ ہوگا کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا؟ جب کوئی شخص سلام کرے اور جس کو سلام کیا ہے وہ اسے نہ سنے تو اس کی طرف سے وہ سلام شمار نہ ہوگا۔ اسی طرح جو اس طرح جواب دے جو سنا نہ جائے تو وہ جواب شمار نہ ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم سلام کرو تو سناؤ اور جب تم جواب دو تو سناؤ اور جب تم بیٹھو تو امانت کے ساتھ بیٹھو اور تم میں سے کوئی کسی کی بات کو نہ اٹھائے''۔ ابن وہب نے کہا: مجھے اسامہ بن زید نے نافع سے روایت کر کے بتایا کہ میں شام کے ایک فقیہ کے ساتھ چل رہا تھا جس کو عبداللہ بن زکریا کہا جاتا تھا میری سواری پیشاب کرنے لگی تو اس نے مجھے روک لیا پھر میں اسے ملا اور میں نے اسے سلام نہ کیا، انہوں نے پوچھا: تم نے سلام کیوں نہیں کیا؟ میں نے کہا: میں ابھی تمہارے ساتھ تھا۔ انہوں نے فرمایا: اگر صحیح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ چلتے تھے پھر درمیان میں درخت آجاتا تھا پھر جب ملتے تھے تو ایک دوسرے پر سلام کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 8۔ کافر کو سلام کا جواب دینے کا حکم یہ ہے کہ اسے ''وعلیکم'' کہا جائے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے اور آیت وَ اِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ سے مراد یہ ہے مومن کی طرف سے جب سلام ہو فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡہَاۤ تو اس سے بہتر جواب

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، جلد 2، صفحہ 923

دو۔ اور اگر کافر کی طرف سے ہو تو اس طرح لوٹاؤ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں "وعلیکم" (1) کہا جائے۔ عطا نے کہا: یہ آیت مومنین کے ساتھ خاص ہے اور جو غیر مسلم سلام کرے تو اسے "وعلیک" کہا جائے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں واؤ کا اثبات اور اسقاط آیا ہے۔ "علیک" (2) بغیر واؤ کے یہ روایت بالکل واضح ہے۔ رہا واؤ کا اثبات تو انہیں اشکال ہے، کیونکہ واؤ عاطفہ تشریک کا تقاضا کرتی ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ ان کے ساتھ وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ ہمارے لیے موت کی دعا کی یا ہمارے دین کی موت کی دعا کی۔ اس کے متعلق علماء کے کئی اقوال ہیں (۱) واؤ اپنے باب پر عطف سے ہے، مگر ہماری دعا ان کے خلاف قبول ہوگی، ان کی بددعا ہمارے حق میں قبول نہیں ہوگی جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ زائدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ استیناف کے لیے ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔ واؤ کے حذف کی روایت معنی کے اعتبار سے احسن ہے اور اس کا اثبات روایت کے اعتبار سے اصح و اشہر ہے۔ یہی اکثر علماء کا نظریہ ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ذمیوں کو سلام کا جواب دینے میں اختلاف ہے۔ کیا وہ مسلمانوں کے جواب کی طرح واجب ہے؟ حضرت ابن عباس، شعبی اور قتادہ نے آیت کے عموم اور حدیث صحیح میں ان پر سلام لوٹانے کے امر سے استدلال کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ جواب دینا واجب ہے، جب کہ اشہب اور ابن وہب کی روایت کے مطابق امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ واجب نہیں اگر تو جواب دے تو کہہ: علیک۔ ابن طاؤس نے یہ پسند کیا ہے کہ انہیں جواب میں علاك السلام کہا جائے۔ یعنی تجھ سے سلام اوپر ہو۔ بعض علماء نے السلام (سین کے کسرہ کے ساتھ) کہنا پسند کیا ہے یعنی اس کے ساتھ پتھر ہو۔ امام مالک وغیرہ کا قول اس سلسلہ میں کافی وشافی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

سورۂ مریم میں سَلٰمٌ عَلَيْكَ (مریم: 47) کے تحت ابتداءً کرتے ہوئے انہیں سلام کرنے کے متعلق گفتگو آئے گی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تم جنت میں داخل نہ ہو گے حتیٰ کہ تم ایمان لاؤ اور تم ایمان نہیں لاؤ گے حتیٰ کہ تم آپس میں محبت کرو۔ کیا میں تمہاری ایک عمل پر راہنمائی نہ کروں جس کو تم کرو تو تم آپس میں محبت کرنے لگو، اپنے درمیان سلام پھیلاؤ" (3)۔ یہ حدیث مسلمانوں میں سلام پھیلانے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ مشرکین میں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ نمازی پر سلام نہیں کیا جائے گا، اگر اسے سلام کیا جائے تو اختیار ہے اگر چاہے تو انگلی کے اشارے سے جواب دے، اگر چاہے تو جواب نہ دے حتیٰ کہ نماز سے فارغ ہو جائے تو سلام کا جواب دے اور جو قضاء حاجت میں ہو اسے سلام نہیں کرنا چاہیے اگر اسے سلام کیا جائے تو اس پر جواب دینا واجب نہیں۔ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس ایسی حالت میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تو مجھے اس حالت میں پائے تو مجھ پر سلام نہ کر اگر تو مجھ پر سلام کرے گا تو میں تجھے جواب نہیں دوں گا" (4)۔ اور جو قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اسے سلام نہ دیا جائے ورنہ وہ اس کی قرأت کو قطع کرے گا،

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، جلد 2، صفحہ 213　　2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 54　　4۔ سنن ابن ماجہ، باب الرجل یسلم وھو یبول، صفحہ 30

قرآن پڑھنے والے کو اختیار ہے اگر چاہے تو جواب دے، چاہے تو جواب نہ دے حتیٰ کہ تلاوت سے فارغ ہو جائے تو جواب دے۔ اور جو حمام میں ہو اسے سلام نہ دیا جائے جب کہ وہ شرم گاہ کھولے ہوئے ہو یا ایسے عمل میں مشغول ہو جس کے لیے وہ حمام میں داخل ہوا۔ اس کے علاوہ پر سلام کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾ اس کا معنی حفاظت کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: کفایت کرنے والا۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے احسبنی کذا۔ یعنی اس نے میری کفایت کی اور اس کی مثل حسبک اللہ ہے۔ قتادہ نے کہا: محاسباً، جیسے کہا جاتا ہے: اکیل بمعنی مواکل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ حساب سے فعیل ہے یہاں یہ صفت اچھی ہے، کیونکہ آیت کا معنی انسان کی زیادتی یا کمی یا پوری مقدار کے بارے میں ہے۔ نسائی نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے ایک شخص آیا اس نے سلام کیا اس نے السلام علیکم کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور فرمایا: ''بیس (نیکیاں حاصل کیں)'' پھر وہ بیٹھ گیا اور ایک دوسرا شخص آیا اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب دیا اور فرمایا: تیس (نیکیاں حاصل کیں) (1) یہ خبر تفسیر کے ساتھ بھی آئی ہے وہ اس طرح کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی سے کہا: سلام علیکم تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اگر کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اگر کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تو اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح جو جواب میں اس طرح کہے اس کے لیے اجر ہے۔ واللہ اعلم۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾

''اللہ نہیں کوئی معبود بغیر اس کے وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن ذرا شک نہیں اس (کے آنے) میں اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کہنے میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور لَیَجْمَعَنَّكُمْ میں لام قسم ہے یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے قیامت کے روز دوبارہ اٹھنے کے بارے میں شک کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قسم اٹھائی۔ ہر وہ لام جس کے بعد نون مشددہ ہو وہ لام قسم ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ موت میں اور زمین کے نیچے تمہیں ضرور جمع کرے گا۔ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں الی صلہ ہے اس کا معنی ہے لیجمعنکم یوم القیمۃ۔ قیامت کو قیامت اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۴﴾ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ﴿۵﴾ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ﴿۶﴾ (مطففین)

بعض نے فرمایا: یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ لوگ اس کی طرف اپنی قبور سے کھڑے ہوں گے، اللہ تعالیٰ

1۔ سنن ابی داود، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 350، حدیث 4521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا (المعارج: 43) قیامۃ کی اصل واو سے ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ۝ بیان کی بنا پر حَدِیْثًا کو نصب ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ومن ازدق زا کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل صدق ہے لیکن مخرج کے قرب کی وجہ سے اس کی جگہ زا پڑھی گئی ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۝

''سو کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ منافقوں کے بارے میں (تم) دو گروہ بن گئے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا ہے انہیں بوجہ ان کرتوں کے جو انہوں نے کیے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسے راہ دکھاؤ جسے گمراہ کر دیا اللہ نے اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے (ہدایت کا) راستہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ یعنی تم دو مختلف گروہ کیوں بن گئے۔ مسلم نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احد کی طرف نکلے تو کچھ لوگ واپس آ گئے جو آپ کے ساتھ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ان کے معاملہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض نے کہا: ہم انہیں قتل کریں گے۔ بعض نے کہا: نہیں۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ۔ (1) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ زائد فرمایا ہے کہ (مدینہ) طیبہ ہے اور فرمایا یہ خبیث کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح آگ لوہے کے خبث کو دور کرتی ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (2)۔ امام بخاری نے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں ''مدینہ طیبہ ہے یہ خبث کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح آگ چاندی کے کھوٹ کو دور کرتی ہے'' (3)۔ یہاں منافقین سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا اور جنگ کی طرف نکلنے کے بعد واپس آ گئے جس طرح کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو مکہ میں ایمان لائے تھے اور ہجرت نہیں کی تھی (4)۔ ضحاک نے کہا: انہوں نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم غالب آ جائیں گے تو ہم جان لیں گے اگر ہماری قوم غالب آ جائے گی تو وہ ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے صحابہ ان سے دوستی رکھتے تھے اور کچھ ان سے برأت کا اظہار کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ یہ ایک ایسی قوم کے متعلق نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ میں آئے، اسلام کا اظہار کیا اور انہیں مدینہ طیبہ کی وبا اور بخار نے آ لیا تو وہ واپس چلے گئے اور مدینہ سے نکل گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ انہیں راستہ میں ملے تو پوچھا: تم کیوں واپس آ گئے؟ وہ کہنے لگے: ہمیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامہم، جلد 2، صفحہ 369

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 127، حدیث نمبر 2954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 660

4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 88

مدینہ کی وبا نے آلیا ہے اور ہمیں مدینہ کی ہوا راس نہ آئی۔ صحابہ کرام نے کہا: کیا تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں نمونہ نہیں؟ بعض صحابہ نے کہا: یہ منافق ہیں۔ بعض نے کہا: منافق نہیں، یہ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ الایۃ۔ حتیٰ کہ وہ مدینہ طیبہ آئے تھے تو وہ کہتے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں پھر وہ اس کے بعد مرتد ہو گئے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ کی طرف جانے کی اجازت طلب کی تا کہ وہ اپنے سامان کے پاس آئیں اور اس میں تجارت کریں۔ پس مومنوں نے اس کے بارے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا: یہ منافق ہیں۔ بعض نے کہا: مومن ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کو بیان فرمادیا یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیا۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں اقوال کی آیت کے آخر کا سیاق تائید کرتا ہے ارشاد ہے: حَتّٰى يُهَاجِرُوْا اور پہلا قول نقل کے اعتبار سے اصح ہے۔ وہ بخاری، مسلم اور ترمذی کا مختار ہے۔ فئتین کو حال کی بنا پر نصب دی گئی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: مالك قائما۔ اخفش سے یہ مروی ہے۔ اور کوفی علماء نے کہا: یہ مالکم کی خبر ہے جس طرح کان اور ظننت کی خبر ہوتی ہے انہوں نے الف، لام کا اس میں داخل کرنا جائز قرار دیا۔ فراء نے کہا: ارکسهم اور رکسهم دونوں کا معنی ہے کفر کی طرف انہیں لوٹا دیا اور انہیں اوندھا کر دیا۔ یہ نضر بن شمیل اور کسائی کا قول ہے۔ الرکس اور النکس کا معنی ہے کسی کو سر کے بل اوندھا گرا دینا یا اول کو آخر پر لوٹا دینا۔ المرکوس کا معنی ہے المنکوس اوندھا گرایا گیا۔ حضرت عبداللہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہما کی قرأت میں واللہ رکسهم تھا(1)۔ ابن رواحہ نے کہا:

أُرْكِسوا فی فِتْنَةٍ مُظْلِمَةٍ كَسَوَادِ الليل يَتْلُوها فِتَنٌ

یعنی وہ تاریک فتنہ میں اوندھے کیے گئے۔ ارتکس فلان فی امر کان نجامنه۔ یعنی آدمی اس کام میں اوندھا ہو گیا جس سے پہلے نکل چکا تھا۔ الرکوسیۃ ایک قوم ہے جو نصاریٰ اور صابئین کے درمیان ہے۔ الواکس اس بیل کو کہتے ہیں جو کھلیان کے وسط میں ہوتا ہے اور دوسرے بیل گاہنے کے وقت اس کے ارد گرد رہتے ہیں۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ یعنی تم اس کی ثواب کی طرف راہنمائی کرو گے کہ وہ ان کے لیے مومنین کا حکم لگائے۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ یعنی رشد و ہدایت اور حجت طلب کرنے کا راستہ۔ اس میں قدریہ کا رد ہے جو اپنی ہدایت کی تخلیق کے قائل ہیں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ

1۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 227

شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

''وہ دوست رکھتے ہیں اگر تم بھی کفر کرنے لگو جیسے انہوں نے کفر کیا تا کہ تم سب یکساں ہو جاؤ پس نہ بناؤ تم ان سے اپنے دوست یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں گے اللہ کی راہ میں پس اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑیں تو پکڑو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں کہیں پاؤ ان کو اور نہ بناؤ ان سے (کسی کو) اپنا دوست اور نہ مددگار۔ مگر ان کو (قتل نہ کرو) جو تعلق رکھتے ہیں اس قوم سے کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ ہے یا آ گئے ہوں تمہارے پاس اس حال میں کہ تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے کہ جنگ کریں تم سے یا جنگ کریں اپنی قوم سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو مسلط کر دیتا انہیں تم پر تو وہ ضرور لڑتے تم سے پھر اگر وہ کنارہ کر لیں تم سے اور نہ جنگ کریں تمہارے ساتھ اور بھیجیں تمہاری طرف صلح کا پیغام تو نہیں بنائی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر (زیادتی کرنے کی) راہ''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ یعنی وہ خواہش کرتے ہیں کہ تم ہو ان کی طرح کفر و نفاق میں۔ شرع برابر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان سے برأت کرنے کا حکم دیا ہے فرمایا: فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (الانفال: 72) نہیں تمہارے لیے ان کی وراثت سے کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔ ہجرت کی کئی قسمیں ہیں (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنا اور یہ ابتدائے اسلام میں واجب تھی حتیٰ کہ فرمایا: لا هجرة بعد الفتح(1) (فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقین کا غزوات میں ہجرت کرنا اور اس شخص کا ہجرت کرنا جو دارالحرب میں اسلام لایا۔ یہ ہجرت واجب ہے۔ مسلمان کا ان کاموں سے ہجرت کرنا جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو چھوڑ دے''(2)۔ یہ دونوں ہجرتیں اب بھی ثابت ہیں اور مجرموں کی تادیب کے لیے ان سے نہ کلام کرنا اور نہ مخاطب ہونا حتیٰ کہ وہ گناہوں سے توبہ کر لیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کیا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ یعنی اگر وہ توحید اور ہجرت سے اعراض کریں تو انہیں قیدی بنا لو اور انہیں قتل کرو۔ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یہ حکم عام ہے حل و حرم کی جگہوں میں۔ واللہ اعلم۔ پھر استثنا فرمائی۔

مسئلہ نمبر 2۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ جو ان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اندر داخل ہوئے جوار اور حلف کے اعتبار سے۔ معنی یہ ہے کہ تم اس قوم کو قتل نہ کرو جن کے ساتھ تمہارا عہد تھا وہ عہد پر ہیں پھر عہود منسوخ ہوئے تو یہ بھی منسوخ ہو گیا۔ یہ مجاہد اور ابن زید وغیرہم کا قول ہے۔ جو اس آیت کے متعلق کیا گیا ہے اس میں سے یہ اصح قول ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: يَصِلُوْنَ کا معنی ہے جو منسوب ہیں۔ اس سے اعشی کا قول ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 131　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6، مفہوم

إِذَا اتَّصَلَتْ قالت لبكرِ بن وائلِ   وَبَكْرٌ سَبَتْهَا والأنوفُ رواغِمُ (1)

یہاں اتصلت بمعنی انتسبت ہے۔

مہدوی نے کہا: علماء نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ نسبت اور تعلق کفار کے قتال اور ان کے قتل سے مانع نہیں۔ نحاس نے کہا: یہ عظیم غلطی ہے، کیونکہ معاملہ تو اللہ تعالیٰ پر جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کوئی شخص اسے قتل کرے مسلمانوں میں سے جس کے ساتھ اس کا نسب ہے۔ مشرکین اور سابقین اولین کے درمیان انساب تھے۔ اور اس سے بھی سخت یہ جہالت ہے کہ یہ پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا، کیونکہ علماء تفسیر کا اجماع ہے کہ اس کا ناسخ (برأت) ہے، برأت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور جنگوں کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ یہ معنی طبری نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں بعض علماء نے ینتسبون کا معنی الامان پر محمول کیا ہے یعنی اہل امان کی طرف جو منسوب ہے وہ امن والا ہے جب تمام لوگوں نے امان دی ہو یہ نسب بمعنی قرابت کے مفہوم پر محمول نہیں۔ علماء کا اختلاف ہے کہ جن لوگوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عہد تھا وہ کون تھے؟ بعض نے فرمایا: وہ بنو مدلج تھے۔ حسن سے مروی ہے کہ بنو مدلج کا اور قریش کا عہد تھا اور قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد تھا۔

عکرمہ نے کہا: یہ ہلال بن عویمر، سراقۃ بن جعشم اور خزیمۃ بن عامر بن عبد مناف کے حق میں نازل ہوئی، ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد تھا، اور بعض علماء نے فرمایا: وہ خزاعۃ قبیلہ تھا۔ ضحاک نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس سے مراد وہ قوم ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ تھا یعنی بنی بکر بن زید بن مناۃ یہ صلح اور امن کا معاہدہ کیے ہوئے تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اہل حرب اور اہل اسلام کے درمیان صلح کے اثبات کی دلیل ہے جب کہ صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو۔ جیسا کہ سورۂ انفال اور براۃ میں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ یعنی تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے۔ لبید نے کہا:

أسهلت وانتصبت كجذعِ مُنيفةٍ   جَرداءَ يَحْصَرُ دونها جُرّامُها

یعنی اس نخلہ کے طول سے ان کے سینے تنگ ہوئے۔ اسی سے الحصر فی القول ہے۔ متکلم پر کلام کا تنگ ہونا۔ الحصر کا معنی ہے راز کو چھپانا۔ جریر نے کہا:

ولقد تَسَقَّطَنِي الوُشاة فصادفوا   حَصِراً بِسِرِّكِ يا أُمَيمُ ضَنِينا

حصرت کا معنی قد حصرت فاضمرت ہے۔ فراء نے کہا: یہ جاء وکم میں ضمیر مرفوع سے حال ہے جیسے تو کہتا ہے: جاء فلان ذهب عقله یعنی قد ذهب عقله۔ بعض نے فرمایا: یہ خبر کے بعد خبر ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے، یعنی جَآءُوْكُمْ وہ تمہارے پاس آئے (2) پھر خبر دی اور کہا: حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ۔ اس صورت میں حصرت، جاء وکم سے بدل ہے۔ بعض نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 90   2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 233

فرمایا: حصرت قوم کی صفت کی بنا پر محل جر میں ہے اور حضرت ابی کی قرأت میں الا الذین یصلون الی قوم بینکم و بینهم میثاق حصرت صدورهم۔ اس میں اَوْ جَآءُوْكُمْ نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے: او جاء وکم رجالا او قوما حصرت صدورهم۔ یہ موصوف کی صفت ہے حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن نے اس طرح پڑھا ہے: او جاء وکم حصرة صدورهم۔ حال کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور اس کو مبتدا اور خبر کے اعتبار سے رفع جائز ہے اور جاء وکم حصرات صدورهم حکایت کیا گیا ہے اور رفع جائز ہے۔ محمد بن یزید نے فرمایا: حصرت صدورهم یہ ان کے خلاف دعا ہے جیسے تم کہتے ہو: لعن الله الکافر۔ یہ مبرد کا قول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کو کمزور قرار دیا ہے۔ فرمایا: یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے قتال نہ کریں۔ یہ فاسد ہے، کیونکہ وہ کفار ہیں اور ان کی قوم کفار ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ معنی صحیح ہے مسلمانوں کے حق میں قتال نہ ہونا ان کو عاجز کرنے کے لیے ہے اور ان کی قوم کے حق میں ان کی تحقیر کے لیے ہے بعض نے فرمایا: او بمعنی واؤ ہے گویا فرمایا: الی قوم بینکم و بینهم میثاق وجاء وکم ضیقة صدورهم عن قتالکم والقتال معکم فکرهوا قتال الفریقین یعنی جس قوم کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے وہ تمہارے پاس آئے اس حال میں کہ ان کے دل تنگ تھے تم سے لڑنے سے اور تمہارے ساتھ مل کر لڑنے سے پس انہوں نے دونوں فریقوں سے لڑنے کو ناپسند کیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس پر ان سے معاہدہ کیا گیا ہو یہ عہد کی ایک قسم ہے یا فرمایا: ہم اسلام لاتے ہیں اور جہاد نہیں کرتے۔ یہ احتمال ہے کہ ابتدائے اسلام میں ان سے یہ بات قبول کی گئی ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل تقویٰ کے لیے کھول دیئے اور اسلام کے لیے منشرح کر دیئے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

اَوْ يُقَاتِلُوْا۔ یہ محل نصب میں ہے یعنی عن ان یقاتلوکم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ۔ اللہ تعالیٰ مشرکوں کو مومنین پر مسلط فرما دے گا وہ مشرکوں کو ان پر قادر کر دے گا اور انہیں تقویت دے گا۔ یہ یا تو بطور سزا ہوگا یا برائی اور معاصی کے ظہور کے وقت بطور انتقام ہوگا یا یہ بطور ابتلا و اختیار ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ۝ (محمد) اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم جان لیں جہاد کرنے والوں کو تم میں سے اور صبر کرنے والوں کو اور ہم آزما لیں تمہاری خبریں۔ یا یہ گناہوں کو مٹانے کے لیے ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (آل عمران: 141) اور اللہ کی شان کے لائق ہے جو چاہے کرے اور جس کو جس پر چاہے مسلط کر دے اور جب چاہے مسلط کر دے۔ ماقبل کلام سے اس کا تعلق یہ ہے کہ منافقین سے قتال کرو جن کے بارے میں تمہارا اختلاف ہوا مگر یہ کہ وہ ہجرت کریں مگر یہ کہ جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو پس وہ داخل ہوں گے اس میں جس میں داخل ہوئے تھے، ان کے لیے ان کا حکم ہوگا مگر جو لوگ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے تنگ ہوں اس سے کہ وہ تم سے لڑیں یا وہ اپنی قوم سے لڑیں، پس وہ تم میں داخل ہوئے پس تم ان سے قتال نہ کرو۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

''تم پاؤ گے چند اور لوگ جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور امن میں رہیں اپنی قوم سے (لیکن) جب کبھی پھیرے جاتے ہیں فتنہ کی طرف تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں اس میں سو اگر نہ کنارہ کریں تم سے یا نہ بھیجیں تمہاری طرف صلح کا پیغام اور نہ روک لیں اپنے ہاتھ تو پکڑ لو انہیں اور قتل کر دو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں اور یہی لوگ ہیں کر دیا ہے ہم نے تمہیں ان پر کھلا اختیار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔ اس کا معنی پہلی آیت کے معنی کی طرح ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ تہامہ سے ایک قوم کے بارے نازل ہوئی تھی جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے امان طلب کی تھی تاکہ وہ آپ کے پاس اور اپنی قوم کے پاس امن پائیں۔ مجاہد نے کہا: یہ اہل مکہ سے ایک قوم تھی۔ سدی نے کہا: یہ نعیم بن مسعود کے بارے نازل ہوئی وہ مسلمانوں اور مشرکوں کو امن دیتا تھا۔ حسن نے کہا: یہ منافقین کی ایک قوم تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ اسد اور غطفان کے بارے میں نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ میں آئے تھے اور اسلام قبول کیا تھا پھر اپنے گھروں کو لوٹ کر گئے اور کفر کا اظہار کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے ردوا کو را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل رددوا ہے ادغام کیا گیا اور را پر کسرہ کو لوٹایا گیا۔ اِلَى الْفِتْنَةِ سے مراد الی الکفر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسے لوگ پاؤ گے جو تمہارے لیے صلح ظاہر کریں گے تاکہ وہ تمہیں امن دیں۔ جب ان کے لیے کوئی فتنہ ظاہر ہوتا ہے اس فتنہ کا اثر ان کے ساتھ ساتھ تم پر بھی ہوتا ہے۔ اُرْكِسُوْا فِيْهَا۔ یعنی اس عہد سے پھر جاتے ہیں جو انہوں نے کیا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یعنی جب انہیں شرک کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ؗ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

''اور نہیں (جائز) کسی مومن کے لیے کہ قتل کرے کسی مومن کو مگر غلطی سے اور جس نے قتل کیا کسی مومن کو غلطی سے تو (اس کی سزا یہ ہے کہ) آزاد کرے مسلمان غلام اور خون بہا ادا کرے مقتول کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ خود

ہی (خون بہا) معاف کر دیں پھر اگر ہو (مقتول) اس قوم سے جو دشمن ہے تمہاری لیکن وہ (مقتول) خود مومن ہو تو (قاتل) آزاد کرے ایک مسلمان غلام اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ ہو چکا ہے تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ تو (قاتل) خون بہا دے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کردے ایک مسلمان غلام تو جو شخص غلام نہ پا سکے تو روزے رکھے دو ماہ لگا تار (اس گناہ کی) توبہ اللہ کی طرف سے (یہی مقرر ہے) اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا"۔

اس آیت میں بیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا۔ یہ اہم احکامات کے متعلق ہے اس کا معنی یہ ہے کہ مومن کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر خطاسے۔ وَ مَا كَانَ یہ نفی کے معنی پر نہیں بلکہ یہ تحریم اور نہی کے معنی میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) اگر یہ نفی کی بنا پر ہوتا تو کبھی کوئی مومن نہ پایا جاتا جو کسی مومن کو قتل کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کی نفی کردے اس کا وجود جائز نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: 60) بندے کبھی بھی درخت کے اگانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے عہد میں اس کے لیے یہ نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: گزشتہ زمانہ میں اس کے لیے یہ جائز نہیں تھا جس طرح اب کسی وجہ سے جائز نہیں پھر استثنیٰ منقطع فرمائی یہ پہلے میں سے نہیں ہے یہاں الا بمعنی لکن ہے تقدیر یوں ہوگی کبھی بھی اس کے لیے مومن کو قتل کرنا جائز نہیں مگر اسے خطاً قتل کردے تو اس پر یہ یہ ہوگا۔ یہ سیبویہ اور زجاج کا قول ہے۔ اور استثنا منقطع میں سے یہ ہے مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ انہیں اس کی کچھ خبر نہیں مگر گمان کی پیروی۔

نابغہ نے کہا:

وَقَفْتُ فیها أُصَیلَاناً أسائلها عَیَّتْ جوابا وما بالرَّبع من أحَد

إلَّا الأَوَارِيَّ لَأيًا ما أُبَیِّنُها والنُّؤيُ کالحوضِ بالمظلومةِ الجَلَدِ

جب الأواری حقیقتاً احد کی جنس سے تھیں تو اس کے لفظ میں داخل نہیں۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

أمسى سُقَامُ خلاءً لا أنیس به إلا السباعَ و مر الریح بالغُرَفِ (1)

ایک اور شاعر نے کہا:

وبلدةٍ لیس بها انیس إلا الیعافیرُ وإلا العیس

ایک اور شاعر نے کہا:

وبعضُ الرجال نخلةٌ لا جَنَی لها ولا ظِلَّ إلا ان تُعَدّ من النخل

سیبویہ نے یہ شعر اسی مثال کے لیے دیا ہے کہ مستثنیٰ منقطع بھی ہوتا ہے جو مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہوتا۔ اس کی بہت سی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 92، دار الکتب العلمیہ بیروت

مثالیں ہیں۔ جریر کا قول کتنا انوکھا ہے:

مِن البِيضِ لم تَظْعن بعيداً ولم تطأ علی الأرض إلّا ذَيْلَ مِرْطٍ مُرَحَّلِ (1)

گویا یوں کہا: لم تطأ علی الأرض الا ان تطأ ذیل البُرْد۔ یہ آیات کریمہ عیاش بن ابی ربیعہ کے حارث بن یزید کو قتل کرنے کے سبب نازل ہوئیں ان دونوں کے درمیان کینہ اور بغض تھا جب حضرت حارث نے مسلمان ہو کر ہجرت کی تو حضرت عیاش اسے ملا اور اس نے اسے قتل کر دیا اسے حضرت حارث کے اسلام لانے کا علم نہیں تھا۔ جب اسے بتایا گیا کہ حضرت حارث تو مسلمان تھا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! میرا اور حارث کا یہ معاملہ ہوا مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا مجھے اس کے اسلام کا علم نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے اسے قتل کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ استثنا متصل ہے یعنی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر وہ قتل خطاء ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا لیکن ایسی ایسی صورت میں دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں کان بمعنی استقر اور وجد مقرر کیا جائے۔ گویا فرمایا: مومن کا مومن کو قتل کرنا جائز نہیں مگر جو خطاء ہو۔ کیونکہ کبھی وہ اس میں مغلوب ہوتا ہے۔ ان دونوں تاویلوں پر استثنا غیر منقطع ہوگا۔ یہ آیت اپنے ضمن میں قتل عمد کی بڑائی اور اس کی برائی کو لیے ہوئے ہے جیسے تو کہتا ہے: اے فلاں تجھے یہ کلام کرنی جائز نہیں مگر یہ کہ بھول کر۔

یعنی عمداً تو ایسی کلام بہت بڑا گناہ ہے اور یقینی طور پر ایسی کلام کرنا ممنوع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ولا خطأ یعنی خطاء بھی یہ جائز نہیں۔ نحاس نے کہا: الا بمعنی واؤ ہونا جائز نہیں۔ یہ کلام عرب میں معروف نہیں اور معنی میں یہ صحیح نہیں کیونکہ خطا ممنوع نہیں۔ دلیل خطاب سے کافر کے مسلمان کو قتل کرنے کا جواز نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ مسلمان کا خون محترم ہے مومن کا ذکر خاص طور پر تاکیداً کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے محبت، بھائی چارہ، شفقت اور عقیدت ہوتی ہے۔ اعمش نے خطاء کو تینوں جگہ ممدود پڑھا ہے۔ خطاء کی بہت سی صورتیں ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا سب میں قدر مشترک قصد کا نہ ہونا ہے مثلاً کسی نے مشرکین کی صفوں پر تیر پھینکا تو کسی مسلمان کو جا لگا اسی طرح جو کسی زانی یا محارب یا مرتد کو قتل کرنے کی سعی کر رہا تھا اسے طلب کیا تاکہ اسے قتل کرے کوئی دوسرا اسے ملا اس نے اسے وہی سمجھا اور اسے قتل کیا تو یہ بھی خطاء ہے، اسی طرح کسی نے کسی شکار پر نشانہ لگایا وہ کسی انسان یا کسی اور چیز کو لگ گیا تو یہ بھی خطاء ہے۔ ان تمام صورتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ الخطأ، الخطأ، خطأ و اخطأ سے اسم ہے جب کہ جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو۔ الخطأ، الخطأ کے قائم مقام ہے۔ اخطأ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے کہ جو کسی کام کا ارادہ کرتا ہے پھر وہ دوسرا کام کر بیٹھے۔ اور جو غیر درست کام کرے اس کے لیے اخطأ بولا جاتا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ۔ جو خطاء کسی کو قتل کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق دیت کا حکم دیا ہے۔ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت ثابت ہے، اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 92، دار الکتب العلمیہ بیروت

مسئلہ نمبر 2۔ داؤد کا نظریہ ہے کہ نفس کے ضیاع میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص ہوگا اور ہر اس عضو میں قصاص ہوگا جس کا قصاص لیا جاسکتا ہے اور انہوں نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ: 45) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت پکڑی ہے المسلمون تتکافأ دماءهم (1)۔ مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ یہ ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: آزاد اور غلام کے درمیان قصاص نہیں مگر نفس کے ضیاع میں، پس آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح آزاد کے بدلے غلام کو قتل کیا جائے گا۔ ورزخموں اور اعضاء میں سے کسی چیز میں ان کے درمیان قصاص نہ ہوگا۔ علماء کا اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا کے متعلق اجماع ہے کہ اس میں غلام داخل نہیں اس سے آزاد مراد ہیں غلام مراد نہیں، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد المسلمون تتکافأ دماءهم (2) سے مراد بھی آزاد ہیں۔ جمہور علماء کا یہی نظریہ ہے جب غلاموں اور آزاد لوگوں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص نہیں تو نفس اس کا زیادہ حق دار ہے۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی اس پر غلام کا آزاد کرنا ہے۔ یہ وہ کفارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفارہ قتل اور کفارہ ظہار میں واجب فرمایا ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ کون سا غلام کافی ہے۔ حضرت ابن عباس، حسن، شعبی، نخعی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: وہ رقبہ (غلام) مومنہ ہے، یہ وہ ہے جس نے نماز پڑھی ہو اور ایمان کو سمجھا ہو۔ اس میں چھوٹا غلام کافی نہیں اس باب میں یہی صحیح ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا: مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والا چھوٹا بچہ بھی کافی ہے (3)۔ ایک جماعت نے کہا: ان میں سے امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں، ہر وہ غلام جائز ہے جس کی نماز جنازہ پڑھنے اور اسے دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا وہ میرے نزدیک محبوب ہے (4)۔ اور تمام علماء کے نزدیک اندھا، اپاہج جس کے ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے ہوں یا جس کے ہاتھ، پاؤں شل ہوں ایسا غلام جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک لنگڑا اور کانا جائز ہے مالک نے کہا: مگر بہت زیادہ لنگڑا ہو جائز نہیں۔ اور امام مالک، امام شافعی اور اکثر علماء کے نزدیک جس کا ایک ہاتھ یا ایک پاؤں کٹا ہوا ہو جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ جائز ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک دائمی مجنون جائز نہیں۔ امام مالک کے نزدیک وہ غلام جائز نہیں جس کو جنون لاحق ہوتا ہے اور پھر ٹھیک ہو جاتا ہو۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالک کے نزدیک ایسا غلام جائز نہیں جو دو سال تک آزاد کیا جائے گا۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے مدبر غلام امام مالک، اوزاعی اور اصحاب الرائے کے نزدیک جائز نہیں۔ امام شافعی اور ابوثور کے قول میں جائز ہے۔ ابن المنذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے کہا: وہ صحیح نہیں جس کا بعض آزاد ہو چکا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اور جس کا بعض آزاد ہو چکا ہو اس کے آزاد کرنے والے کو یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الدیات، صفحہ 197
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2674، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93
4۔ ایضاً

رقبہ (غلام) آزاد کیا بلکہ کہا جاتا ہے: غلام کا بعض آزاد کیا۔ اس کے معنی میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: گناہ سے پاک کرنے اور قاتل کے گناہ کی طہارت کے لیے یہ کفارہ واجب کیا گیا ہے اور اس کا گناہ احتیاط کا ترک اور تحفظ کا ترک ہے حتی کہ اس کے ہاتھوں ایک ایسا شخص ہلاک ہوا جس کا خون محفوظ تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: مقتول میں جو اللہ تعالیٰ کا حق تھا اس کو معطل کرنے کی وجہ سے بطور بدل یہ کفارہ واجب کیا ہے اس کے لیے اس کے حق میں ایک حق تھا اور وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا تھا اور حلال کرنا چیزوں میں تصرف ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس میں حق تھا وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اس کے لیے عبودیت کا اسم ثابت تھا، خواہ وہ بڑا تھا یا چھوٹا تھا، آزاد تھا یا غلام تھا، مسلمان تھا یا ذمی تھا، جس کے ذریعے وہ جانوروں اور بہائم سے ممتاز ہوتا تھا اور اس کے ساتھ اس سے امید تھی کہ اس کی نسل سے کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اطاعت کرے گا۔ اور قاتل اس سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے اس سے وہ اسم (نام) فوت کیا جس کا ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے۔ اور وہ معنی جس کو ہم نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کفارہ کا وہ ضامن ہے یعنی ان دونوں معانی میں سے ایک معنی ہو۔ پس اس میں بیان ہے کہ نص اگرچہ خطاءً قاتل پر واقع ہے اور عمداً قتل کرنے والا بھی اس کی مثل ہے بلکہ اس نفس کے قتل کی وجہ سے اس پر کفارہ کا وجوب اولیٰ ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ دیت اس مال کو کہا جاتا ہے جو مقتول کے ولی کو مقتول کے خون کے عوض دیا جاتا ہے۔ مُّسَلَّمَةٌ جو دیا گیا ہو، ادا کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دیت کے طور پر جو مال دیا جائے گا اس کی تعیین نہیں فرمائی آیت میں مطلقاً دیت کے وجوب کا ذکر ہے؛ اس میں دیت کے عاقلہ پر ہونے یا قاتل پر ہونے کا ذکر نہیں فرمایا یہ حدیث پاک سے لیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مواسات کا ایجاب عاقلہ، غرامات (جرمانہ) اور تلف شدہ چیزوں کے اصول کے خلاف ہے اور جو عاقلہ پر واجب ہے وہ تغلیظاً واجب نہیں اور نہ قاتل کا بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے بلکہ یہ محض ہمدردی اور مواسات ہے۔ امام ابو حنیفہ کا نظریہ ہے کہ یہ نصرت کے اعتبار سے ہے، پس انہوں نے اہل دیوان (وہ محکمہ والے جس میں وہ کام کرتا ہے) پر اس کو واجب کیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے کہ دیت سو اونٹ ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سہل کی دیت، جو خیبر میں قتل کیے گئے تھے حویصہ، محیصہ اور عبدالرحمٰن کو، سو اونٹ عطا فرمائی۔ یہ کتاب کے مجمل کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بیان ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ اونٹوں والوں پر سو اونٹ ہیں اور جو اونٹوں والے نہیں ہیں ان کی دیت میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: سونے والوں پر ہزار دینار ہیں اور وہ اہل شام اور اہل مصر اور اہل مغرب ہیں۔ یہی قول امام مالک، امام احمد، اسحاق، اصحاب الرائے کا ہے اور یہی امام شافعی کا پہلا قول ہے اور یہ حضرت عمر، حضرت عروہ بن زبیر اور قتادہ سے مروی ہے اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں۔ یہ اہل عراق، فارس اور خراسان کا قول ہے یہی امام مالک کا مذہب ہے اس بنا پر کہ حضرت عمر سے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے اہل القریٰ (شہریوں) پر دیت کی قیمت لگائی جو سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: چاندی کی دیت دس ہزار دراہم ہے۔ اور شعبی نے عبیدہ سے اور انہوں نے

حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سونے والوں پر ہزار دینار دیت مقرر فرمائی اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر فرمائے اور گائیوں والوں پر دوسو گائیں اور بکریوں والوں پر ہزار بکریاں اور اونٹوں والوں پر سو اونٹ مقرر فرمائے اور کپڑوں والوں پر دوسو جوڑے مقرر فرمائے۔ ابو عمر نے کہا: اس حدیث میں دلیل ہے کہ دنانیر اور دراہم، دیت کی اصناف میں ایک صنف ہے، بطور بدل اور قیمت نہیں ہیں یہی حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے ظاہر ہے۔ امام ابوحنیفہ نے حضرت عمر سے مروی گائیوں اور بکریوں اور کپڑوں کے جوڑوں میں اختلاف کیا ہے اور یہی قول عطا، طاؤس اور تابعین کی ایک جماعت کا ہے اور یہی قول مدینہ طیبہ کے ساتوں فقہاء کا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ایک طائفہ نے کہا: آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے علاوہ کوئی دیت نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائی ہے۔ یہی قول امام شافعی کا ہے اور یہی قول طاؤس کا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: آزاد مسلمان کی دیت ہر زمانہ میں سو اونٹ ہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائی اور حضرت عمر سے دراہم کی تعداد کے بارے میں روایات مختلف ہیں اور ان روایات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام مراسیل ہیں۔ میں نے تجھے امام شافعی کا مذہب بتایا اور ہم اس کے مطابق کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ فقہاء کا دیت کے اونٹوں کی عمروں میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی دیت کا فیصلہ سو اونٹ فرمایا جو خطاءً قتل کیا گیا ہو۔ تیس بنت مخاض، تیس بنت لبون، تیس حقے اور دس ابن لبون۔ خطابی نے کہا: میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کے مطابق قول کیا ہو۔ اکثر علماء نے فرمایا: قتل خطا کی دیت کے پانچ حصے ہیں۔ اسی طرح اصحاب الرائے اور ثوری نے کہا ہے۔ اسی طرح امام مالک، ابن سیرین اور امام احمد بن حنبل نے کہا ہے، مگر انہوں نے اصناف میں اختلاف کیا ہے۔ اصحاب الرائے اور امام احمد نے کہا: پانچواں حصہ ابن مخاض، پانچواں حصہ بنت مخاض۔ پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ حقے، پانچواں حصہ جذعے، پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ بنت مخاض۔ پانچواں حصہ ابن لبون۔ یہ قول حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: پانچواں حصہ حقاق، پانچواں حصہ جذاع، پانچواں حصہ بنت لبون، پانچواں حصہ بنات مخاض اور پانچواں حصہ بنو لبون۔ یہ قول عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن یسار، زہری، ربیعہ اور لیث بن سعد کا ہے۔ خطابی نے کہا: اصحاب الرائے کے لیے اثر ہے مگر اس کا راوی عبداللہ بن خشف بن مالک ہے جو مجہول ہے اس حدیث کے علاوہ وہ معروف نہیں ہیں۔ امام شافعی نے اپنے قول سے عدول کیا اس کی وجہ راوی کی علت ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، کیونکہ اس میں بنی مخاض کا ذکر ہے اور صدقات کے اونٹوں کی عمروں میں بنی مخاض کا کوئی دخل نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قسامت کے واقعہ میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قتیل کی دیت صدقہ کے اونٹوں میں سے اونٹ دیئے اور صدقہ کے اونٹوں میں ابن مخاض نہیں ہوتا۔ ابو عمر نے کہا: زید بن جبیر نے خشف بن مالک عن عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل خطا میں دیت پانچ قسم کی بیان فرمائی۔ مگر اس حدیث کو مرفوع کسی نے روایت نہیں کیا سوائے خشف بن مالک کوفی طائی کے یہ مجہول ہے، کیونکہ ان سے روایت نہیں کیا مگر زید بن جبیر بن حرمل طائی جشمی جو بنی جشم بن معاویہ، کوفی

ثقات میں سے ایک تھا۔

میں کہتا ہوں: دار قطنی نے اپنی سنن میں خشف بن مالک کی حدیث کو ذکر کیا ہے حجاج بن ارطاۃ عن زید بن جبیر عن خشف بن مالك عن عبد الله بن مسعود کی روایت سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل خطا کی دیت میں سو اونٹ کا فیصلہ فرمایا، ان میں سے بیس حقے تھے، بیس جذعے تھے، بیس بنت لبون تھے، بیس بنت مخاض تھے، بیس بنو مخاض تھے۔ دار قطنی نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اور علماء فن حدیث کے نزدیک کئی وجوہ سے ثابت نہیں ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ روایت اس روایت کے مخالف ہے جو ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود نے اپنے باپ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے، جس میں کوئی طعن نہیں ہے، نہ اس کی کوئی تاویل ہے۔ ابو عبیدہ اپنے باپ کی حدیث، ان کے مذہب اور فتویٰ کو خشف بن مالک اور ان جیسے دوسرے لوگوں سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والے تھے اور اپنے دین پر زیادہ حریص تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کریں کہ آپ نے ایسا فیصلہ فرمایا اور پھر وہ اس کے خلاف فتویٰ دیں یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود پر تصور نہیں کیا جا سکتا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس کے متعلق انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات نہ سنی ہوتی تھی اور نہ انہیں اس کے متعلق کوئی قول پہنچا ہوتا تو وہ کہتے: میں اس کے متعلق اپنی رائے دیتا ہوں اگر تو وہ درست ہے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے ہے، پھر اس کے بعد انہیں یہ بات پہنچتی کہ ان کا فتویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے موافق ہے تو آپ کے ساتھی آپ کو بہت خوش دیکھتے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق ان کا فتویٰ نکلا ہے۔ جس شخص کی یہ صفت ہو اور یہ حالت ہو اس سے کیسے یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز روایت کریں اور پھر اس کی مخالفت کریں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خبر مرفوع جس میں بنی مخاض کا ذکر ہے وہ ہم خشف بن مالك عن ابن مسعود کے سلسلہ سے جانتے ہیں اور خشف مجہول شخص ہے ان سے صرف زید بن جبیر بن حرمل الجشمی نے روایت کیا ہے۔ اور علماء حدیث ایک غیر معروف شخص کی منفرد روایت سے حجت نہیں پکڑتے۔ ان کے نزدیک اس خبر سے ثابت ہوتا ہے جب اس کا راوی عادل مشہور ہو یا ایسا شخص ہو جس سے جہالت کا اسم زائل ہو اور اسم جہالت کا زائل ہونا اس طرح ہے کہ اس سے دو یا دو سے زیادہ آدمی روایت کریں، جب یہ صفت ہو تو اس سے جہالت کا اسم زائل ہو جائے گا اور اس وقت وہ معروف ہو جائے گا اور جس سے صرف ایک شخص روایت کرے اور خبر کے ساتھ منفرد ہو تو اس کی خبر پر توقف واجب ہے حتیٰ کہ کوئی اور اس کی موافقت کرے۔ واللہ اعلم۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خشف بن مالک کی حدیث کو زید بن جبیر سے حجاج بن ارطاۃ نے روایت کیا ہے اور وہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہے یعنی وہ اس سے حدیث بیان کرتا ہے جس سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی اور جس سے سنا نہیں ہوتا، اس سے سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید القطان اور عیسیٰ بن یونس نے روایت کو ترک کیا، حالانکہ وہ اس کے پاس بیٹھتے تھے اور اسے جانتے تھے۔ پس کسی شخص کے متعلق ان کا علم تمہارے لیے کافی ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا: حجاج بن ارطاۃ کی حدیث سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ عبد اللہ بن ادریس نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آدمی فضیلت حاصل نہیں کرتا حتیٰ

کہ جماعت سے نماز چھوڑ دے۔ عیسیٰ بن یونس نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے سنا کہ میں نماز کی طرف نکلتا ہوں، مجھے بوجھ اٹھانے والے، سبزیاں بیچنے والے روک لیتے ہیں، جریر نے کہا: میں نے حجاج کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے مال اور شرف کی محبت نے ہلاک کر دیا۔

اس کے مخالف بھی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ثقات کی ایک جماعت نے یہ حدیث حجاج بن ارطاۃ سے روایت کی ہے، پس اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ بھی وجوہ ہیں جن کا ذکر بہت طویل ہو جائے گا جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ دیت کے بارے میں کوفیوں کے مذہب کے ضعف پر دلالت کرتا ہے اگرچہ ابن المنذر نے اپنی جلالت کے ساتھ اس کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا۔ حماد بن سلمہ نے روایت کیا ہے، ہمیں سلیمان تیمی نے بیان کیا انہوں نے ابومجلز سے روایت کیا، انہوں نے ابوعبیدہ سے روایت کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: خطا کی دیت میں پانچ قسم کے اونٹ ہیں، بیس حقے، بیس جذعے، بیس بنات مخاض، بیس بنات لبون اور بیس بنی لبون۔ دارقطنی نے کہا: یہ سند حسن ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں علقمہ عن عبداللہ سے اسی طرح مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک اور امام شافعی کا مذہب ہے کہ دیت میں پانچ قسم کے اونٹ ہوں گے۔ خطابی نے کہا: بہت سے علماء سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: خطا کی دیت میں چار قسم کے اونٹ ہیں۔ یہ امام شعبی، نخعی اور حسن بصری ہیں اور اسی کی طرف اسحاق بن راہویہ کا خیال گیا ہے مگر یہ کہتے ہیں پچیس جذعے، پچیس حقے، پچیس بنات لبون اور پچیس بنات مخاض۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے (1)۔ ابوعمر نے کہا: امام مالک اور امام شافعی کا قول سلیمان بن یسار سے مروی ہے اس کے متعلق کسی صحابی سے کچھ مروی نہیں ہے لیکن اس پر اہل مدینہ کا عمل ہے۔ اسی طرح ابن جریج نے ابن شہاب سے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے حضرت ابن مسعود سے ایسی بات روایت کی ہے جو امام مالک اور امام شافعی کے قول کے موافق ہے۔ ابوعمر نے کہا: دیات میں اونٹوں کی عمریں نہ قیاساً لی گئی ہیں نہ نظراً بلکہ یہ اتباعاً اور تسلیماً لی گئی ہیں اور یہ اثر کی جہت سے نہیں لی گئیں اور اس میں نظر کا کوئی دخل نہیں۔ پس ہر مجتہد نے یہی کہا جو اس کے نزدیک سلف صالحین سے صحیح مروی تھا۔

میں کہتا ہوں: خطابی نے جو کہا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کسی نے عمرو بن شعیب کی حدیث کے مطابق قول کیا ہو۔ ابن المنذر نے طاؤس اور مجاہد سے یہ قول حکایت کیا ہے مگر مجاہد نے بنت مخاض کی جگہ تیس جذعوں کا ذکر کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں ان کی مراد حضرت عبداللہ اور اصحاب الرائے کا قول ہے جس کو دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی مرفوع حدیث اس قول کے موافق ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن المنذر کے لیے تعجب ہے، حالانکہ بڑا مجتہد اور نقاد ہے اس نے ایسی حدیث کے ساتھ قول کیسے لیا اہل نقد جس کی صحت پر اس کی موافقت ہی نہیں کرتے؟ لیکن ذہول اور نسیان، انسان کو لاحق ہوتا ہے کمال تو فقط اللہ تعالیٰ کی ذات

1۔ ابوداؤد، کتاب الدیات، باب فی دیۃ خطا، حدیث نمبر 3944، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو ہے جو عزت والا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ نبی مختار حضرت محمد ﷺ سے مروی اخبار سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قتل خطا کی دیت کا فیصلہ عاقلہ پر فرمایا اور اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ عاقلہ کی دیت میں علماء کے اجماع میں دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابو رمثہ سے جو کہا تھا، جب وہ اور اس کا بیٹا آئے تھے: ''نہ تجھ پر زیادتی کی جائے گی اور نہ اس پر زیادتی کی جائے گی (1)''۔ اس سے قتل عمد مراد ہے نہ کہ قتل خطا۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ جو دیت کے ثلث سے زائد ہو گا وہ عاقلہ پر ہو گا اور ثلث (1/3) میں اختلاف ہے اور جو علماء جمہور کا نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ عاقلہ پر نہ عمد کی صورت میں، نہ اعتراف کی صورت میں اور نہ صلح کی صورت میں دیت ہو گی اور خطا کی دیت بھی نہ ہو گی مگر جو ثلث (1/3) سے تجاوز کر جائے اور جو ثلث سے کم ہو گی وہ مجرم کے مال سے ہو گی۔ ایک طائفہ نے کہا: خطا کی دیت مجرم کی عاقلہ پر ہو گی خواہ جنایت تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، کیونکہ زیادہ چٹی سے تھوڑی چٹی ہے جس طرح کہ قتل عمد کی دیت مجرم کے مال سے ہوتی ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ دیت کا حکم یہ ہے کہ یہ عاقلہ (خاندان) پر قسط وار ہو گی، عاقلہ سے مراد عصبی رشتہ دار ہیں۔ عورت کی اولاد اس میں شامل نہیں جب کہ وہ عاقلہ کے عصبہ سے نہ ہو اور ماں کی طرف سے بھائی بھی اس میں شامل نہیں کیوں کہ ماں اور باپ کی طرف سے بھائیوں کے وہ عصبہ نہیں ان سے دیت وصول نہیں کی جائے گی اس طرح اہل حجاز کے جمہور علماء کے قول میں دفتر والوں کو عاقلہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ کوفیوں نے کہا: اگر وہ کسی دفتر میں کام کرتا ہو گا تو وہ دفتر والے اس کے عاقلہ ہوں گے۔ دیت کو تین سالوں میں تقسیم کیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمر اور حضرت علی نے فیصلہ فرمایا تھا، کیونکہ اونٹ کبھی حاملہ ہوتے ہیں پس وہ اسے نقصان دیں گے نبی کریم ﷺ نے چند اغراض کے لیے ایک ہی مرتبہ دیت دی تھی۔ کبھی آپ بطور صلح اور تسدید دیتے تھے، کبھی تالیف قلب کے لیے جلدی عطا فرما دیتے تھے۔ جب اسلام کا علم بلند ہو گیا تو صحابہ کرام نے اس نظام پر اس کو مقدر کیا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: علماء قدیم و جدید کا اجماع ہے کہ دیت عاقلہ پر ہو گی اور یہ تین سال میں ہو گی اس سے کم میں نہ ہو گی اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ مردوں میں سے بالغوں پر ہو گی، سیرت نگاروں اور اہل علم کا اجماع ہے کہ دیت زمانہ جاہلیت میں بھی عاقلہ ادا کرتے تھے، اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے اس کو برقرار رکھا اور وہ مدد کے لیے دیتے تھے پھر اسلام آیا تو معاملہ اس پر جاری رہا حتیٰ کہ حضرت عمر نے دفتر والوں پر دیت کو مقرر کیا۔ فقہاء نے اس کی روایت پر اتفاق کیا اور اس قول پر اتفاق کیا۔ علماء کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دفتر (ملازم جن کے نام کا اندراج ہوتا) پر دیت نہ تھی، حضرت عمر نے دیوان (دفتر) کو متعین کیا اور لوگوں کو اس پر جمع کیا اور ہر طرف والوں کو مددگار بنایا اور ان پر دشمنوں سے لڑنے کو متعین فرمایا۔

مسئلہ نمبر 8۔ میں کہتا ہوں: ان مسائل میں سے جو اس باب کی لڑی میں گر جاتا ہے اور جو اس نظام میں داخل ہوتا ہے وہ ماں کے بطن میں بچے کا قتل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماں کے پیٹ پر ضرب لگائی جائے پھر وہ زندہ بچہ گرا دے، پھر وہ بچہ مر

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 250۔ سنن ابی داؤد، باب فی القصاص، حدیث نمبر 3675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے۔ تمام علماء نے فرمایا: قتل خطا میں پوری دیت ہے اور قسامت کے بعد قتل عمد میں بھی پوری دیت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بغیر قسامت کے ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس سے زندگی جانی جائے گی، علماء کا اتفاق ہے کہ جو بچہ چیخا یا دودھ پیا یا آہستہ سے سانس لیا تو وہ زندہ ہے، اس میں پوری دیت ہے۔ اگر بچے نے حرکت کی تو امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا: حرکت اس کی زندگی پر دلالت کرتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: حرکت کرنا زندگی کی دلیل نہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ دیر رہے۔ تمام علماء کے نزدیک حکم میں مذکر اور مونث برابر ہیں۔ اگر عورت نے مردہ بچہ گرا دیا تو اس میں غرہ ہے یعنی غلام یا لونڈی ہے۔ اگر اس نے بچہ نہ گرایا اور مرگئی اور وہ بچہ اس کے پیٹ میں تھا اور نکلا نہیں تھا تو اس میں کچھ نہیں ہوگا اس پر اجماع ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیث بن سعد اور داؤد سے مروی ہے انہوں نے عورت کے بارے میں کہا: جب وہ پیٹ پر ضرب کی وجہ سے مر جائے پھر اس کے مرنے کے بعد مردہ بچہ نکلے تو اس میں غرہ ہے خواہ اس نے وہ مرنے سے پہلے یا مرنے کے بعد گرایا ہو، ضرب لگنے کے وقت ماں کی زندگی کا اعتبار ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ تمام فقہاء نے کہا: اس میں کوئی چیز نہیں جب وہ ماں کے مرنے کے بعد زندہ نکلے۔ امام طحاوی نے فقہاء کی جماعت کے لیے حجت پیش کرتے ہوئے کہا: علماء کا اجماع ہے اور لیث بھی اس بات میں ان کے ساتھ ہے کہ اگر اس کے پیٹ پر مارا گیا جب کہ وہ زندہ تھی پھر وہ مرگئی جب کہ جنین (بچہ) اس کے پیٹ میں تھا اور وہ نہیں گرا تو اس میں کچھ نہیں اسی طرح جب ماں کے مرنے کے بعد گرے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور غرہ سفید ہوگا، ابوعمرو بن علاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: فی الجنین غرۃ عبد او امۃ (1) کے بارے میں کہا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرہ کا معنی مراد نہ لیا ہوتا تو آپ فرماتے: جنین میں غلام یا لونڈی ہے، لیکن آپ نے سفیدی کا ارادہ فرمایا۔ پس دیت میں سفید غلام یا سفید لونڈی قبول کی جائے گی، کالا غلام اور کالی لونڈی قبول نہیں کی جائے گی۔ علماء کا غرۃ کی قیمت میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کی قیمت پچاس دینار ہو یا چھ ہزار دراہم ہو آزاد مسلمان کی دیت کا بیسواں حصہ ہو اور اس کی آزاد ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہو یہی قول ابن شہاب، ربیعہ اور تمام اہل مدینہ کا ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اس کی قیمت پانچ سو دراہم ہو۔ امام شافعی نے کہا: غرۃ کی عمر سات سال یا آٹھ سال ہو اور اس پر واجب نہیں کہ وہ عیب دار غرہ قبول کرے۔ امام مالک کے مذہب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسے اختیار ہے کہ وہ غرۃ دے یا ماں کی دیت کا دسواں حصہ دے سونے میں سے دس دینار اگر وہ سونے والے ہوں اور چاندی میں سے چھ سو دراہم اگر وہ چاندی والے ہوں یا پانچ اونٹ دے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: یہ مجرم کے مال سے دیت ہوگی۔ یہی قول حسن بن حی کا ہے، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا: یہ دیت عاقلہ پر ہوگی اور یہی اصح ہے، کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبۃ کی حدیث ہے کہ دو عورتیں تھیں جو دو انصاری مردوں کی بیویاں تھیں ایک روایت میں ہے ان دونوں عورتوں کا جھگڑا ہوا تو ایک عورت نے دوسری کو لوہے کے ڈنڈے کے ساتھ مارا اور اسے قتل کر دیا، ان کے خاوند یہ مسئلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے اور عرض کی: ہم اس کی دیت دیں جو نہ چیخا، نہ اس نے کھایا، نہ پیا، نہ آواز دی اس قسم کا شخص تو رائیگاں ہوتا

1۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 348

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا بدوؤں کی سجع کی طرح سجع ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کے بارے میں غرہ کا فیصلہ فرمایا اور مارنے والی عورت کے عاقلہ پر اسے مقرر فرمایا (1)۔ یہ حدیث صحیح ثابت ہے، اختلاف کی جگہ میں نص ہے، حکم کو ثابت کرتی ہے۔ جب اس عورت کی دیت جس کو ضرب لگائی ہے عاقلہ پر ہے تو گرنے والے بچے کی بھی قیاس ونظر میں دیت عاقلہ پر ہوگی۔ ہمارے علماء نے اس کے قول سے حجت پکڑی ہے جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا تھا وہ معین ہے اور وہ مجرم ہے اگر گرنے والے کی دیت کا فیصلہ عاقلہ پر ہوتا ہے تو کلام اس طرح ہوتی کہ فقال الذی قضیٰ علیھم اور قیاس اس بات کا تقاضا کرتا ہے ہر مجرم پر اس کی جنایت کا وبال ہوتا ہے مگر وہ مسئلہ جس کے خلاف دلیل قائم ہو جس کا کوئی معارض نہ ہو اجماع ہو جس کا خلاف جائز نہ ہو یا کوئی نص سنت سے موجود ہو جس کے ناقل عادل ہوں اور اس کا کوئی معارض نہ ہو تو اس کے ساتھ حکم ثابت ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) اور نہیں کمائے گا کوئی نفس مگر وہ اس کے ذمہ ہوگا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

مسئلہ نمبر 10۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ گرنے والا بچہ جب زندہ نکلے تو اس میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی ہے اور جب مردہ نکلے تو کفارہ میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: اس میں غرہ اور کفارہ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے کہا: اس میں غرۃ ہے کفارہ نہیں ہے۔ جنین (گرنے والا بچہ) کی طرف سے جو غرۃ دیا جائے گا اس کی میراث کے بارے اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے کہا: جنین کی طرف سے غرہ میراث میں تقسیم ہوگا جیسا کتاب اللہ کا حکم ہے، کیونکہ وہ دیت ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: غرہ صرف ماں کو ملے گا، کیونکہ وہ جنایت ہے جو عورت پر کی گئی ہے اس کے کسی عضو کو کاٹنے کے ساتھ اور یہ دیت نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس میں مذکر اور مونث کا اعتبار نہیں جس طرح کہ دیات میں لازم ہوتا ہے پس یہ دلیل ہے کہ وہ عضو کی طرح ہے۔ ابن ہرمز کہتے ہیں کہ اس کی دیت خاص اس کے والدین کے لیے ہے۔ 2/3 والد کے لیے اور 1/3 والدہ کے لیے ہے، والدین میں سے جو زندہ ہوگا وہ اس کے لیے ہوگا اگر ان میں سے ایک مر چکا ہو تو وہ دوسرے کے لیے ہوگا خواہ وہ باپ ہو یا ماں ہو۔ بھائی کسی چیز کے وارث نہ ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا اس کی اصل ان یتصدقوا ہے تا کو صاد میں مدغم کیا گیا ہے۔ التصدق کا معنی عطا کرنا ہے یعنی مگر یہ کہ اولیاء، قاتلین کے ورثاء کو معاف کر دیں وہ جو اللہ نے ان کے لیے، ان پر دیت واجب کی ہے۔ یہ پہلے سے استثنا نہیں۔ ابوعبدالرحمن اور نبیح نے الا ان تصدقوا صاد اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (2)، اسی طرح ابوعمرو نے پڑھا ہے مگر انہوں نے صاد کو شد کے ساتھ پڑھا ہے، اس قرأت پر دوسری تا کا حذف جائز ہے اور یا کی قرأت پر اس کا حذف جائز نہیں اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں الا ان یتصدقوا ہے۔ اور وہ کفارہ جو اللہ کے لیے ہے وہ ورثاء کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتا، کیونکہ اس نے ایک شخص کو تلف کیا جو اللہ کی عبادت میں تھا پس اس پر واجب ہے کہ ایک دوسرا شخص اپنے رب کی عبادت کے لیے خاص کرے۔ اور دیت ساقط ہو جاتی ہے وہ ان کا حق

1۔ صحیح مسلم، باب القسامۃ، جلد 2، صفحہ 62
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93، دار الکتب العلمیہ بیروت

ہے اور مجرم کے مال میں کفارہ واجب ہے وہ نہیں اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ۔ یہ اس مومن کا مسئلہ ہے جو کفار کے شہروں میں قتل ہو جاتا ہے یا ان کی جنگوں میں قتل ہو جاتا ہے، اس بنا پر کہ وہ کفار سے ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، سدی، عکرمہ، مجاہد اور نخعی کے نزدیک معنی یہ ہے کہ اگر یہ مقتول مومن ہو ایمان لایا ہو اور اپنی کافر قوم میں باقی رہا ہو جو تمہاری دشمن ہے تو اس میں دیت نہیں ہے اور اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے(1)۔ امام مالک کا مشہور قول یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ دیت دو وجوہ سے ساقط ہوتی ہے (۱) مقتول کے اولیاء کفار ہیں پس انہیں دیت دینا صحیح نہیں، کیونکہ وہ اس سے قوت حاصل کریں گے (۲) جو شخص ایمان لائے اور ہجرت نہ کرے تو اس کی حرمت کم ہے پس اس کی دیت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَايَتِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی يُهَاجِرُوۡا (الانفال:72) اور وہ جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی نہیں ہے ان کی میراث سے کچھ بھی حتیٰ کہ وہ ہجرت کریں۔

علماء کی ایک جماعت نے کہا: دیت کے سقوط کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء فقط کفار ہیں برابر ہے کہ قتل خطا مسلمانوں کے درمیان ہو یا اس کی قوم کے درمیان ہو، ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو پھر وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ آیا ہو تو اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے اور اس میں دیت نہیں ہے، کیونکہ کفار کو دیت دینا صحیح نہیں (2)۔ اگر دیت واجب ہوتی تو بیت المال کے لیے بیت المال پر واجب ہوتی، اس جگہ میں دیت واجب نہیں اگرچہ بلاد اسلام میں قتل جاری ہو۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اوزاعی، ثوری اور ابوثور کا یہی قول ہے۔ پہلے قول کے مطابق اگر مومن مسلمانوں کے شہروں میں قتل کیا گیا اور اس کی قوم مسلمانوں سے جنگ کرتی تھی، تو اس کی دیت بیت المال کے لیے ہوگی اور کفارہ بھی ہوگا(3)۔

میں کہتا ہوں: اس باب سے وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت اسامہ سے مروی ہے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگی مہم پر بھیجا تو ہم نے جہینہ کے حرقات (جگہ کا نام) پر صبح حملہ کیا، میں ایک شخص پر غالب آ گیا تو اس نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں نے اسے نیزہ مارا، پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے، میں نے یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تھا اور تو نے اسے قتل کر دیا۔ حضرت اسامہ نے کہا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے یہ ہتھیار کے خوف کی وجہ سے کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو نے اس کا دل چیرا تا کہ تو جان لیتا کیا اس نے صحیح کلمہ پڑھا ہے یا نہیں؟'' (4)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس کے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور نہ دیت کا۔ حضرت اسامہ سے مروی ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد میرے لیے تین مرتبہ استغفار فرمایا: اور فرمایا غلام آزاد کرو اور آپ نے قصاص و دیت کا فیصلہ نہ فرمایا۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قصاص کا سقوط واضح ہے، کیونکہ قتل دشمنی کی بنا پر نہ تھا اور رہا دیت کا سقوط تو اس کی تین وجوہ ہیں (۱) اسے اصل قتال میں اجازت دی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93 3۔ ایضاً

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 68۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 3935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گئی تھی پس اس سے محترم نفس کا اتلاف غلطی سے ہوا ہے جیسے ختنہ کرنے والے یا طبیب سے غلطی ہو جاتی ہے (۲) کیونکہ وہ دشمن قوم سے تھا اور مسلمانوں میں سے کوئی ولی نہیں تھا جس کو دیت دی جاتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ۔ جیسا کہ پہلے ہم نے ذکر کیا ہے۔ (۳) حضرت اسامہ نے قتل کا اعتراف کیا تھا اور اس کے لیے بینہ (گواہی) قائم نہیں ہوئی تھی۔ اور عاقلہ سے دیت اعتراف کی صورت میں نہیں لی جاتی، شاید حضرت اسامہ کے لیے مال ہی نہ ہو جس میں دیت جاری کی جاتی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ یہ ذمی اور معاہد کے بارے میں ہے جو خطاءً قتل ہو جائے تو دیت اور کفارہ واجب ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، شعبی، نخعی اور امام شافعی کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا ہے اور وھو مومن نہیں فرمایا جس طرح کہ مومنین اور اہل حرب میں سے مقتول کے بارے میں فرمایا۔ اس سے پہلے جو تھا مقید تھا پھر اس کا مطلق ذکر کرنا دلیل ہے کہ یہ اس کے خلاف ہے۔ حسن، جابر بن زید اور ابراہیم نے بھی یہی کہا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شخص جو خطا قتل کیا گیا ہے وہ مومن ہے اور تمہاری معاہد قوم میں سے ہے تو ان کا عہد ثابت کرے گا کہ وہ اپنے ساتھی کی دیت کے زیادہ حق دار ہیں پس اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا اور دیت ادا کرنا ہے حسن نے اس کو اس طرح پڑھا ہے: وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وھو مومنٌ(1)۔ اور حسن نے کہا: جب مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو اس پر کفارہ نہیں۔ ابو عمر نے کہا: اہل حجاز کے نزدیک آیت کا معنی اس آیت پر لوٹایا گیا ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ اس سے مراد مومن ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک جملہ محمول ہے جس طرح مطلق، مقید پر محمول ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی وہ ہے جو حسن نے کہا ہے اور ابو عمر نے یہ معنی اہل حجاز سے نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ دیت نکرہ ہے جو معین دیت ہونے کا تقاضا نہیں کرتا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ مشرکین عرب کے بارے میں ہے ان کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان عہد تھا کہ وہ اسلام قبول کریں یا ان سے اعلان جنگ کیا جائے گا یہ ایک مدت تک تھا۔ پس جو ان میں سے قتل کیا جاتا اس میں دیت اور کفارہ واجب ہوتا تھا پھر یہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (توبہ) کے ارشاد سے منسوخ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 14۔ علماء کا اجماع ہے کہ عورت کی دیت، مرد کی دیت سے نصف ہے، ابو عمر نے کہا: اس کی دیت نصف اس لیے رکھی گئی، کیونکہ اس کے لیے میراث بھی نصف ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ یہ قتل خطا کی دیت میں ہے رہا قتل عمد تو اس میں مردوں اور عورتوں کے درمیان قصاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ:45) اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ (بقرہ:178) جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ دار قطنی نے موسیٰ بن علی بن رباح لخمی کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 93

والد کو یہ کہتے سنا کہ ایک اندھا حضرت عمر بن خطاب کے دور خلافت میں یہ شعر پڑھ رہا تھا:

یا ایُّها النَّاسُ لقیتُ منکراً هل یَعْقِلُ الأعمیٰ الصحیحَ المبصرا

خَرَّا معاً کلاهما تکسّرا

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک اندھے کی قیادت ایک بینا شخص کر رہا تھا تو وہ دونوں کنوئیں میں گر گئے اندھا، بینا شخص کے اوپر گرا تو بینا شخص مر گیا حضرت عمر نے بینا شخص کی دیت کا فیصلہ نابینے شخص پر کیا۔ علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو دوسرے کے اوپر گرا پھر ان میں سے ایک مر گیا، حضرت ابن زبیر سے مروی ہے کہ اوپر والا نیچے والے کا ضامن ہوگا، نیچے والا اوپر والے کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ شریح نخعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام مالک نے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں کہا: جن میں سے ایک نے دوسرے کو کھینچا حتیٰ کہ دونوں گرے اور دونوں مر گئے تو دیت اس کے عاقلہ پر ہوگی جس نے کھینچا تھا۔ ابو عمر نے کہا: میں اس میں کوئی خلاف گمان نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔ مگر ہمارے بعض متاخرین اور اصحاب شافعی نے کہا کہ کھینچنے والے کے عاقلہ نصف دیت کے ضامن ہوں گے، کیونکہ وہ اپنے فعل سے اور اوپر گرنے والے کی وجہ سے مرا۔ حکم اور ابن شبرمہ نے کہا: اگر کوئی شخص کسی کے اوپر، مکان کے اوپر سے گرے پھر ایک مر جائے تو ان میں سے جو زندہ ہوگا وہ دوسرے کا ضامن ہوگا۔ امام شافعی نے کہا: وہ دو شخص جو آپس میں ٹکرائے اور دونوں مر گئے تو جس سے ٹکرایا گیا اس کی دیت ٹکرانے والے کے عاقلہ پر ہوگی اور ٹکرانے والے کی دیت رائیگاں جائے گی اور دو شہسواروں کے بارے فرمایا: جب وہ ٹکرائے اور دونوں مر گئے تو ان میں سے ایک پر دوسرے کی نصف دیت ہوگی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے فعل اور اپنے ساتھی کے فعل سے مرا ہے۔ یہ عثمان البتی اور امام زفر کا قول ہے۔ امام مالک، اوزاعی، حسن بن حیی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے شہسواروں کے بارے کہا: جو ٹکرا کر مر گئے ہر ایک کی دیت دوسرے کے عاقلہ پر ہوگی۔ ابن خویز منداد نے کہا: اسی طرح ہمارے نزدیک دو ٹکرانے والی کشتیوں کا حکم ہے جو ٹکرا جائیں جب کہ ملاح کشتی کو پھیرنے والا نہ ہو اور نہ سوار گھوڑے کو پھیرنے والا ہو۔ امام مالک سے دو کشتیوں اور سواروں کے بارے مروی ہے کہ ہر ایک اپنے ساتھی کی تلف شدہ چیز کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

مسئلہ نمبر 16۔ علماء کا اہل کتاب کی دیت کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا: یہ مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔ اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے اور ان کی عورتوں کی دیت اس سے نصف ہے۔ یہ قول عمر بن عبد العزیز، عروہ بن زبیر اور عمرو بن شعیب سے مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی یہی فرمایا ہے۔ یہ مفہوم سلیمان بن ہلال عن عبد الرحمٰن بن الحارث بن عیاش بن ابی ربیعہ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی اور نصرانی کی دیت، مسلمان کی دیت سے نصف مقرر فرمائی (1)۔ اور اسے عبد الرحمٰن سے

1۔ ابن ماجہ، باب دیۃ الکافر، حدیث نمبر 2633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ثوری نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس، شعبی اور نخعی نے فرمایا: معاہدین میں خطاً مقتول خواہ وہ مومن ہو یا کافر ہو اپنی قوم کے عہد پر ہوگا اس کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہوگی (1) یہ امام ابوحنیفہ، ثوری، عثمان، بتی اور حسن بن حی کا قول ہے انہوں نے تمام دینوں کو برابر بنایا ہے مسلمان ہو یا یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی ہو معاہد ہو اور ذمی ہو سب برابر ہیں یہ عطا، زہری اور سعید بن مسیب کا قول ہے ان کی حجت یہ ارشاد ہے: فَدِيَةٌ یہ مسلمان کی دیت کی طرح کامل دیت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور انہوں نے اپنی بات کو اس روایت سے تائید دی ہے جسے محمد بن اسحاق نے داؤد بن حصین سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے بنی قریظہ اور نضیر کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دیت برابر کامل مقرر فرمائی۔ ابو عمر نے کہا اس حدیث میں کمزوری ہے اس جیسی حدیث میں حجت نہیں ہوتی۔ امام شافعی نے فرمایا: یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمان کی دیت کا تہائی ہے (2)، اور مجوسی کی دیت آٹھ سو دراہم ہیں ان کی حجت یہ ہے کہ یہ کم از کم مقدار ہے جو اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ذمہ سے برأت یقین یا حجت سے ہوتی ہے۔ یہ قول عمر اور عثمان سے مروی ہے۔ یہی قول ابن مسیب، عطا، حسن، عکرمہ، عمرو بن دینار، ابو ثور اور اسحاق کا ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ یعنی جو غلام نہ پائے اور نہ غلام خریدنے کی اس کے مال میں وسعت ہو تو فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ تو اس پر دو ماہ کے متواتر روزے ہیں، حتیٰ کہ اگر ایک دن بھی افطار کر دیا تو نئے سرے سے شروع کرنے ہوں گے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ کسی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ دو ماہ کے روزے دیت اور غلام آزاد کرنے کی طرف کفایت کرتے ہیں اس شخص کے لیے جو غلام نہ پائے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول وہم ہے، کیونکہ دیت عاقلہ پر ہوتی ہے قاتل پر نہیں ہوتی۔ طبری نے یہ قول مسروق سے حکایت کیا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 18۔ حیض، تتابع کے مانع نہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں، حیض سے عورت جب پاک ہو اور تاخیر نہ کرے پچھلے روزوں کے ساتھ روزوں کو ملا لے۔ اس پر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ فجر کی نماز سے پہلے پاک ہوئی اس دن کا روزہ ترک کر دیا جب کہ اسے اپنی طہارت کا علم تھا۔ اگر وہ ایسا کرے تو علماء کی جماعت کے نزدیک نئے سرے سے روزے رکھے۔ یہ ابو عمر نے کہا ہے۔ اس مریض میں اختلاف ہے جس نے دو ماہ میں سے بعض روزے متواتر رکھے۔ اس میں دو قول ہیں۔ امام مالک نے کہا: کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ جس پر کتاب اللہ میں متواتر روزے واجب کیے گئے ہوں پھر وہ افطار کرے مگر عذر یا مرض یا حیض کی صورت میں افطار کرنا جائز ہے۔ اس کے لیے سفر کرنا اور پھر افطار کرنا درست نہیں۔ مرض میں جنہوں نے بنا کرنے کا کہا ہے ان میں سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، حسن، شعبی، عطا، مجاہد، قتادہ اور طاؤس ہیں۔ سعید بن جبیر، نخعی، حکم بن عیینہ اور عطا خراسانی نے کہا: مرض میں نئے سرے سے روزے شروع کرے۔ یہ امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب حسن بن حی اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کہ وہ بنا کر سکتا ہے۔ ابن شبرمہ نے کہا: اگر اسے غالب عذر ہو تو ایک دن کی قضا کرے جس طرح رمضان کے روزے کی قضا کی جاتی ہے۔ ابو عمر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

نے کہا: جن علماء نے بنا کا کہا ہے ان کی حجت یہ ہے کہ وہ مرض کی وجہ سے تتابع (متواتر) کو توڑنے میں معذور ہے وہ عمداً ایسا نہیں کر رہا اور اللہ تعالیٰ نے بغیر ارادہ کے کوئی کام کرنے والے سے تجاوز فرمایا ہے۔ اور جنہوں نے نئے سرے سے روزے رکھنے کو کہا ہے ان کی حجت یہ ہے کہ تتابع فرض ہے عذر کی وجہ سے ساقط نہ ہوگا، گناہ کو عذر ساقط کرتا ہے جس طرح نماز ہے اس کی رکعات متواتر ہوتی ہیں جب اسے عذر قطع کر دے تب بھی نئے سرے سے شروع کرنی ہوتی ہے بنا نہیں کی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ** نصب مصدر کی بنا پر ہے۔ اس کا معنی رجوع کرنا ہے (1)۔ خطا کرنے والے کو توبہ کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ وہ گناہ سے بچا نہیں اور اس کے حق میں سے تھا کہ وہ اپنی حفاظت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ وہ روزے رکھے یہ اللہ کی طرف سے تخفیف ہے کہ اس نے غلام کے عوض روزے کو قبول فرمالیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ** (بقرہ: 187) یعنی اس نے تخفیف کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ** (المزمل: 20)

مسئلہ نمبر 20۔ **وَ كَانَ اللّٰهُ** یعنی وہ ہمیشہ سے تھا **عَلِيْمًا** تمام معلومات کو جاننے والا ہے۔ **حَكِيْمًا** اس کے ہر کام میں پختگی اور حکمت ہے۔

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

"اور جو شخص قتل کرے کسی مومن کو جان بوجھ کر تو اس کی سزا جہنم ہے، ہمیشہ رہے گا اس میں اور غضب ناک ہوگا اللہ تعالیٰ اس پر اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اسے اور تیار کر رکھا ہے اس نے اس کے لیے عذاب عظیم"۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ مَنْ يَّقْتُلْ**، **مَنْ** شرطیہ ہے اور اس کا جواب **فَجَزَآؤُهٗ** ہے۔ جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی صفت کے بارے میں اختلاف ہے۔ عطا اور نخعی وغیرہما نے کہا: جس نے لوہے کے ساتھ قتل کیا جیسے تلوار، خنجر، نیزے کی انی اور اس قسم کی دوسری کوئی تیز چیز جو کاٹنے کے لیے تیار کی گئی ہو یا ایسی چیز جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کے استعمال میں موت ہے جیسے بھاری پتھر وغیرہ۔ ایک جماعت نے کہا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا وہ ہے جس نے لوہے کے ساتھ قتل یا پتھر کے ساتھ قتل کیا یا ڈنڈے کے ساتھ قتل کیا یا اس کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ قتل کیا۔ یہ جمہور کا قول ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر فرمایا اور شبہ العمد کا ذکر نہیں فرمایا۔ علماء کا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن المنذر نے کہا: امام مالک نے اس کا انکار کیا، انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں صرف عمد اور خطا کا ذکر ہے۔ خطابی نے بھی امام مالک سے یہ ذکر کیا اور یہ زائد ذکر کیا رہا شبہ عمد تو ہم اس کو نہیں جانتے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور لیث بن سعد نے شبہ العمد کا انکار کیا پس جوان کے نزدیک ایسی چیز سے قتل کیا گیا جس کے ساتھ عام طور پر قتل نہیں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 94

کیا جاتا مثلاً دانتوں سے کاٹا، طمانچہ مارا، کوڑا مارا، چھڑی ماری وغیرہ تو یہ عمد ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ ابوعمر نے کہا: ان دونوں کے قول کے موافق صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ جمہور فقہائے امصار کا یہ نظریہ ہے کہ یہ تمام صورتیں شبہ عمد کی نہیں۔ امام مالک سے یہ ذکر کیا گیا ہے اور یہ ابن وہب اور صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہمارے نزدیک شبہ عمد پر عمل کیا جائے گا۔ جن علماء نے شبہ عمد کو ثابت کیا ہے ان میں شعبی، حکم، حماد، نخعی، قتادہ، سفیان ثوری، اہل عراق اور امام شافعی ہیں۔ ہم نے یہ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے، خون کے سلسلہ میں احتیاط کرنی ضروری ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ خون کی جلد میں حفاظت کی جائے، پس خون بہانا مباح نہیں مگر ایسی صورت میں جو بالکل واضح ہو جس میں کسی قسم کا اشکال نہ ہو اور اس صورت میں اشکال ہے، کیونکہ جب حکم عمد اور خطا میں متردد تھا تو اس کے لیے شبہ عمد کا حکم لگایا گیا، ضرب (مارنا) مقصود تھا۔ قتل مقصود نہیں تھا قتل بغیر ارادہ کے ہوا تھا، پس قصاص ساقط ہوگا اور دیت بھاری ہوگی۔ اسی کی مثال احادیث میں آئی ہے ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار خطا کی دیت، شبہ عمد جو کوڑے اور لاٹھی سے ہو سو اونٹ ہیں جن میں چالیس ایسی اونٹنیاں ہوں جن کے بطنوں میں بچے ہوں'' (1)۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قتل عمد میں قصاص ہے اور قتل خطا میں دیت ہے۔ اس میں قصاص نہیں ہے اور جو نا معلوم پتھر یا ڈنڈے یا کوڑے سے قتل کیا گیا ہو تو وہ اونٹوں کی دیت مغلظہ ہے'' (2)۔ سلیمان بن موسیٰ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شبہ عمد کی دیت قتل عمد کی طرح مغلظ ہے، شبہ عمد والے کو قتل نہیں کیا جائے گا'' (3)۔ یہ نص ہے۔ طاؤس نے اس شخص کے بارے میں کہا جو جنگ میں ڈنڈے، کوڑے یا پتھر کے ساتھ مارا گیا ہو تو اس کی دیت دی جائے گی اور اس کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ معلوم نہیں اس کا قاتل کون ہے؟ امام احمد بن حنبل نے کہا: العمیا وہ امر جس کا معاملہ پوشیدہ ہو اس کی وجہ معلوم نہ ہو۔ اسحاق نے کہا: یہ قوم میں تحارج (☆) اور بعض کو بعض کے قتل کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی اصل التعمیۃ (☆☆) سے ہے جس کا معنی تلبیس ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ۔ شبہ عمد کو تسلیم کرنے والوں کا دیت مغلظہ میں اختلاف ہے۔ عطا اور امام شافعی نے کہا: یہ تیس حقے، تیس جذعے اور چالیس خلفہ ہیں۔ یہ قول حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کا ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے جب وہ شبہ عمد کا قول کرتے ہیں۔ اور امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا مگر مدلجی نے اپنے بیٹے کے ساتھ جو کچھ کیا اس جیسے مسئلے میں شبہ عمد کا قول کرتے ہیں جب اس نے اپنے بیٹے کو تلوار سے مارا۔ بعض علماء نے کہا: یہ چار قسم کے اونٹ ہوں گے چوتھائی بنات لبون، چوتھائی حقاق، چوتھائی جذاع اور چوتھائی بنات مخاض۔ یہ نعمان اور یعقوب کا قول ہے۔ ابوداؤد نے یہ سفیان عن ابی اسحاق عن عاصم بن ضمرہ عن علی کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ پانچ قسم کے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 269

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود والدیات، جلد 3، صفحہ 94، حدیث نمبر 47

3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 95، حدیث نمبر 53

☆ شرکاء کا جائیداد کو آپس میں تقسیم کرنا

☆☆ پوشیدہ رکھنا

اونٹ ہوں گے، بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس ابن لبون، بیس حقے اور بیس جذعے۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: چالیس جذعے بازل (☆) عام تک، تیس حقے، تیس بنت لبون۔ یہ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔ اور یہی حسن بصری، طاؤس اور زہری کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: چونتیس خلفۃ بازل عام تک تینتیس حقے، تینتیس جذعے۔ اور یہی شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ یہ ابوداؤد نے ابوالاحوص عن ابی اسحاق عن عاصم بن ضمرہ عن علی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ان میں اختلاف ہے جن میں شبہ عمد کی دیت لازم ہوتی ہے۔ حارث عکلی، ابن ابی لیلی، ابن شبرمہ، قتادہ اور ابوثور نے کہا: قتل کرنے والے پر اس کے مال میں ہوگی۔ شعبی، نخعی، حکم، امام شافعی، ثوری، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے نے کہا: وہ عاقلہ پر ہوگی۔ ابن المنذر نے کہا: شعبی کا قول اصح ہے، کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنین کی دیت مارنے والی کے عاقلہ پر جاری کی تھی۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کا اجماع ہے کہ قتل عمد کی دیت عاقلہ پر نہ ہوگی بلکہ وہ مجرم کے مال میں ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ قتل خطا کرنے والے پر کفارہ ہے اور قتل عمد میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ یہ ہے کہ قتل عمد والے پر اسی طرح کفارہ ہے جس طرح قتل خطا میں کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قتل خطا میں جب کفارہ واجب ہے تو قتل عمد میں بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔ اور فرمایا: جب سہو میں سجدہ مشروع ہے تو عمد میں بدرجہ اولیٰ مشروع ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ نے قتل عمد میں ذکر فرمایا وہ قتل خطا میں جو واجب ہے اس کو ساقط کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والے پر کفارہ واجب ہوگا جب اسے معاف کیا جائے اور اسے قتل نہ کیا جائے مگر جب اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا تو اس پر کفارہ نہ ہوگا جو اس کے مال سے لیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: کفارہ واجب ہوگا جس نے خودکشی کی اس پر کفارہ اس کے مال سے ہوگا۔ ثوری، ابوثور اور اصحاب الرائے نے کہا: کفارہ واجب نہ ہوگا مگر وہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے کفارہ واجب کیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا: ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں، کیونکہ کفارات عبادات ہیں اور تمثیل جائز نہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی فرض اللہ کے بندوں پر لازم کردے مگر کتاب اللہ یا سنت یا اجماع سے اور جنہوں نے عمداً قتل کرنے والے پر کفارہ لازم کیا ان کے پاس حجت نہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس جماعت کے بارے اختلاف ہے جنہوں نے خطاءً ایک شخص کو قتل کردیا۔ ایک جماعت نے کہا: ہر ایک پر کفارہ ہوگا۔ حسن، عکرمہ، نخعی، حارث، عکلی، امام مالک، ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور اور اصحاب الرائے نے بھی یہی کہا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: ان تمام پر ایک کفارہ ہوگا۔ ابوثور نے یہی کہا ہے، اوزاعی سے یہی حکایت کیا گیا ہے۔ زہری نے غلام آزاد کرنے اور روزہ رکھنے میں فرق کیا ہے۔ ایک جماعت کے بارے میں فرمایا: جو منجنیق پھینکتے ہیں اور ایک شخص کو قتل کردیتے ہیں، تمام پر ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر وہ غلام نہ پائیں تو ہر ایک پر دو ماہ کے متواتر روزے ہوں گے۔

☆ بازل اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کی عمر آٹھ سال ہو چکی ہو اور نویں سال میں شروع ہو چکا ہو اس وقت اس کی طاقت مکمل ہو جاتی ہے اس کے بعد اسے بازل عام اور بازل عامین کہا جاتا ہے۔ نہایہ

مسئلہ نمبر 6۔ نسائی نے روایت کیا ہے ہمیں حسن بن اسحاق المروزی نے بتایا وہ ثقہ ہے فرمایا مجھے خالد بن خداش نے بتایا، انہوں نے فرمایا ہمیں حاتم بن اسماعیل نے بتایا، انہوں نے بشیر بن مہاجر سے روایت کیا، انہوں نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک زوال دنیا سے بھی بڑا ہے''۔ حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے پہلے جس کا بندے سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے اور سب سے پہلے بندوں کے درمیان جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خونوں کے متعلق ہو گا'' (1)۔ اسماعیل بن اسحاق نے نافع بن جبیر بن مطعم سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک سائل نے ان سے کہا: اے ابو العباس! کیا قاتل کے لیے توبہ ہے؟ حضرت ابن عباس نے اسے مسئلہ پر تعجب کرنے والے کی طرح کہا: تو کیا کہتا ہے؟ دو یا تین مرتبہ یہ کہا، پھر حضرت ابن عباس نے فرمایا: تجھ پر افسوس اس کے لیے توبہ کہاں! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''مقتول آئے گا جب کہ اس کا سر اس کے ایک ہاتھ میں لٹکا ہوا ہو گا وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنے قاتل کو بلا رہا ہو گا، اس کی رگیں خون آلود ہوں گی حتیٰ کہ دونوں رو کے جا میں گے، مقتول اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گا: اے رب! اس نے مجھے قتل کیا اللہ تعالیٰ قاتل کو فرمائے گا: تو نیست و نابود ہو جائے پھر اسے آگ کی طرف لے جایا جائے گا''۔ حسن سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے کسی چیز کے بارے اتنا سوال نہیں کیا جتنا کہ میں نے مومن کے قتل کے بارے میں کیا تو مجھے جواب نہ ملا''۔

مسئلہ نمبر 7۔ جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کیا اس کے لیے توبہ ہے؟ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: اس میں اہل کوفہ نے اختلاف کیا پھر میں حضرت ابن عباس کے پاس گیا ان سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ۔ یہ سب سے آخر میں نازل ہوا اور اسے کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔ نسائی نے حضرت ابن جبیر سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا: کیا اس شخص کے لیے توبہ ہے جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں میں نے ان پر سورۂ فرقان کی آیت 68 پڑھی: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت مکی ہے، اسے مدنی آیت: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ نے منسوخ کیا ہے۔

زید بن ثابت سے اسی طرح روایت ہے اور سورۂ نساء کی آیت، سورۂ فرقان کی آیت سے چھ ماہ بعد نازل ہوئی اور ایک روایت میں آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی۔ نسائی نے ان دونوں روایات کو حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔ حضرت زید اور حضرت ابن عباس سے مروی روایات کو دیکھ کر معتزلہ نے آیت کے عموم کا نظریہ قائم کیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ کے عموم کا مخصص ہے۔ انہوں نے کہا کہ وعید ہر قاتل پر نافذ ہو گی انہوں نے دونوں

1۔ صحیح بخاری، باب القصاص، حدیث نمبر 6052، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جامع ترمذی، باب ما جاء ان اول ما یحاسب بہ العبد الخ، حدیث نمبر 378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیتوں کو جمع کیا ہے کہ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ یغفر مادون ذالك لمن یشاء الا من قتل عمداً۔ علماء کی ایک جماعت جن میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہیں۔ حضرت زید اور حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قاتل کے لیے توبہ ہے۔ یزید بن ہارون نے کہا: ہمیں ابو مالک اشجعی نے بتایا انہوں نے سعد بن عبیدہ سے روایت کیا انہوں نے فرمایا: ایک شخص حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور کہا: کیا جان بوجھ کر مومن کو قتل کرنے والے کے لیے توبہ ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں مگر آگ۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت ابن عباس سے ساتھیوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اس طرح فتویٰ دیتے تھے ہمیں تو آپ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ قاتل کی توبہ قبول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں اسے گمان کرتا تھا کہ یہ بہت غصہ میں ہے کسی مومن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ فرمایا: لوگ اس شخص کے پیچھے گئے تو انہوں نے اسے ویسا ہی پایا۔ یہ اہل السنت کا مذہب ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور یہ آیت مخصوصہ ہے اور تخصیص کی دلیل آیات اور اخبار ہیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت مقیس بن ضبابہ کے بارے میں نازل ہوئی ان کا واقعہ اس طرح ہے کہ وہ اور ان کا بھائی ہشام بن ضبابہ مسلمان ہوئے۔ پھر مقیس نے اپنے بھائی ہشام کو بنی نجار میں مقتول پایا۔ اس واقعہ کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ نے بنی نجار کو لکھا کہ "اس کے بھائی کا قاتل اس کے حوالے کردو" اور آپ نے مقیس کے ساتھ ایک شخص کو بھیجا جس کا تعلق بنی فہر سے تھا۔ بنو النجار نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس کا قاتل نہیں جانتے لیکن ہم دیت دیں گے، پس انہوں نے سو اونٹ دیت دیئے پھر وہ دونوں مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ آئے، راستہ میں مقیس نے فہری شخص پر حملہ کر کے اسے اپنے بھائی کے بدلے قتل کر دیا۔ اونٹ لے لیے اور مرتد ہو کر مکہ چلا گیا۔ اور وہ شعر پڑھتا تھا:

قتلت به فِهرا و حمّلت عقلَه سَراة بنی النجار أرباب فارِعِ (1)

حَلَلْتُ به وترِی وأدرکت ثورتی وکنت إلی الأوثان أوّلَ رَاجِعِ

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں اسے حل و حرم میں امن نہیں دیتا" (2)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے قتل کا حکم دیا جب کہ وہ کعبہ کے ساتھ متعلق تھا۔ جب اہل تفسیر اور علماء دین کی نقل سے یہ ثابت ہے تو اسے مسلمانوں پر محمول کرنا مناسب نہیں پھر اس آیت کے ظاہر کو اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: 114) اور وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (الشوریٰ: 25) اور وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ کے ظاہر کو لینے سے اولیٰ نہیں ہے۔ ان دونوں آیات کے ظاہر کو لینے میں تناقض ہے، پس تخصیص ضروری ہے پھر سورۂ فرقان کی آیت اور اس آیت کو جمع کرنا ممکن ہے، نہ نسخ ہے اور نہ تعارض ہے۔ سورۂ نساء کی مطلق آیت کو سورۂ فرقان کی مقید آیت پر محمول کیا جائے گا معنی یہ ہوگا کہ اس کی جزا یہ ہے کہ مگر جو توبہ کر لے۔ خصوصاً جب کہ موجب یعنی قتل اور موجب یعنی عقاب کی دھمکی متحد ہیں۔ رہی اخبار تو وہ بہت سی ہیں جیسے حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جس میں فرمایا: "تم میری بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے اور نہ زنا کرو گے اور نہ چوری کرو گے اور اس نفس کو قتل نہیں کرو گے جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ جو تم میں سے ان احکام کو پورا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 95، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 257

کرے گا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان باتوں میں سے کسی کا ارتکاب کرے گا اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا، اگر چاہے گا تو اسے عذاب دے گا'' (1)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے مروی ہے جس نے سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں، ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے (2)۔ اس کے علاوہ بھی اخبار ثابت ہیں پھر ہمارے ساتھ ان کا اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جس کے خلاف قتل کی گواہی دی گئی اور وہ اقرار کرتا ہو کہ اس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ پھر اس کے اولیاء سلطان کے پاس آئیں اور اس پر حد قائم کی جائے اور قصاصاً قتل کیا جائے تو آخرت میں اس کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عبادہ کی حدیث کے مقتضیٰ پر بالا جماع اس پر وعید نافذ نہ ہو گی، تو انہوں نے وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا کے عموم سے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ ان پر ٹوٹ گئی اور جو ہم نے ذکر کیا اس کے ساتھ تخصیص داخل ہو گئی۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو معلوم ہوا کہ یہ آیت مخصوص ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا یا یہ اس قول پر محمول ہو گی جو حضرت ابن عباس سے حکایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مُّتَعَمِّدًا کا معنی ہے جو اس کے قتل کو حلال سمجھنے والا ہے۔ یہ بالا جماع کفر کی طرف لوٹتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: قاتل کا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہے خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ۔ یہ اس کے کفر پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ غضب نہیں فرماتا مگر کافر پر جو ایمان سے خارج ہوتا ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے یہ وعید ہے اور وعید میں خلف کرم ہے جس طرح کہ شاعر نے کہا:

وانّی متی اوعدته او وعدته لَمُخْلِفُ اِيعادی وَ مُنْجِزُ مَوْعِدِی

یہ پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ اسے یہ جزا دے یعنی وہ اپنے بڑے گناہ کی وجہ سے اس گناہ کا مستحق اور سزاوار ہے۔ ابو مجلز لاحق بن حمید اور ابو صالح وغیر ہما نے اس پر نص قائم کی ہے۔ حضرت انس بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ بندے کے لیے ثواب کا وعدہ فرماتا ہے تو وہ اسے پورا کرتا ہے اور اگر اس کے لیے عقوبت مقرر فرماتا ہے تو اس کے لیے مشیت ہے اگر چاہے گا تو اسے عتاب دے گا اور اگر چاہے گا تو اسے معاف کر دے گا''۔ ان دونوں تاویلوں میں نظر ہے۔ رہی پہلی تاویل، قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کا کلام خلف کو قبول نہیں کرتا مگر یہ کہ اس سے عام کی تخصیص مراد لی جائے اور یہ کلام میں جائز ہے اور رہی دوسری تاویل۔ اگرچہ روایت کیا گیا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔ نحاس نے کہا: اس میں غلطی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا (کہف: 106) کسی نے یہ نہیں کہا: ان جازاھم (اگر وہ انہیں جزا دے گا) یہ عربی جاننے میں خطا ہے، کیونکہ اس کے بعد غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ ہے وہ جازاہ کے معنی پر محمول ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس کی جزا جہنم ہے اگر وہ توبہ نہ کرے اور گناہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 73۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 17، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ، باب ھل لقاتل المومن توبۃ، حدیث نمبر 2611، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر اصرار کرے حتیٰ کہ وہ اپنے رب سے معاصی کی نحوست کے ساتھ کفر پر ملاقات کرے۔ ہبۃ اللہ نے اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ہے اور فرمایا: اس پر لوگوں کا اجماع ہے مگر حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر نے کہا یہ آیت محکمۃ ہے۔ ہبۃ اللہ کے قول میں نظر ہے، کیونکہ یہ عموم اور تخصیص کا مقام ہے، نہ کہ نسخ کا مقام۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حسن ہے، کیونکہ نسخ اخبار میں نہیں ہوتا معنی یہ ہے کہ وہ اسے جزا دے گا۔ نحاس نے ''معانی القرآن'' میں کہا: علماء اہل نظر کے نزدیک یہ حکم محکم ہے وہ اسے جزا دے گا جب وہ توبہ نہیں کرے گا۔ اگر وہ توبہ کرے گا تو اس کا حکم بیان کر دیا۔ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) پس قاتل اس سے خارج نہیں ہے اور الخلود، دوام پر دلالت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (الانبیاء: 34)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ۔ (الہمزہ: 3)

زہیر نے کہا:

ولا خالد إلا الجبال الرواسیا

یہ تمام شواہد دلالت کرتے ہیں کہ خلد کا لفظ تابید کے معنی کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے، کیونکہ پہاڑ بھی اور مال بھی دنیا کے زوال کے ساتھ زائل ہو جائیں گے اسی طرح عرب کہتے ہیں: لأخلدنّ فلاناً فی السجن (میں فلاں کو ہمیشہ قید خانہ میں رکھوں گا) السجن ختم ہو جائے گی اور فنا ہو جائے گی اسی طرح مسجون بھی۔ اس کی مثل دعا میں ہے: خلد اللہ ملکہ وأبّد ایامہ۔ یہ لفظاً اور معنی تمام گزر چکے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۞

''اے اہل ایمان جب تم سفر پر نکلو اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) تو خوب تحقیق کر لو اور نہ کہو اسے جو بھیجتا ہے تم پر سلام کہ تم مومن نہیں ہو، تم تلاش کرتے ہو سامان دنیوی زندگی کا، پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں (وہ تمہیں غنی کر دے گا) ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے اس سے پہلے پھر احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے ہو خبردار ہے''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا۔ یہ جہاد اور قتل کے

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ الضرب کا معنی زمین پر چلنا ہے، عرب کہتے ہیں: ضربت فی الارض جب کوئی تجارت یا جنگ یا کسی اور غرض سے سفر کرے۔ یہ "فی" کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور بغیر "فی" کے بھی۔ مثلاً ضربت الارض جب آدمی قضاء حاجت (1) کا قصد کرے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: لا یخرج الرجلان یضربان الغائط یتحدثان کاشفین عن فرجیھما فان اللہ یمقت علی ذالك (2)۔ کوئی دو شخص قضاء حاجت کے لیے نکلیں تو وہ اپنی شرمگاہیں کھولے ہوئے باتیں نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ یہ آیت کریمہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی وہ اپنے سفر میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کے پاس اونٹ اور بکریاں تھیں جنہیں وہ بیچنا چاہتا تھا اس نے مسلمانوں پر سلام کیا اور کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ ایک مسلمان نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا گیا تو آپ پر بہت ناگوار گزرا، پھر یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ بخاری نے عطاء عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایک شخص اپنی بکریوں میں تھا اسے مسلمان ملے، اس نے کہا: السلام علیکم۔ مسلمانوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی بکریاں پکڑ لیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا تک نازل فرمائی۔ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا سے مراد یہ غنیمت ہے۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے السلام پڑھا ہے یہ بخاری کے علاوہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اہل کو دیت اور بکریاں بھی لوٹا دیں۔ اس واقعہ میں قاتل اور مقتول کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا جو قول ہے وہ وہ ہے جو ابن اسحاق کی سیرت میں مصنف ابو داؤد میں اور الاستیعاب لابن البر میں ہے کہ یہ قاتل محلم بن جثامہ تھا اور مقتول عامر بن اضبط تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محلم کے خلاف دعا کی تو وہ بعد میں صرف سات دن زندہ رہا پھر وہ دفن کیا گیا تو زمین نے اسے قبول نہ کیا پھر دفن کیا گیا تو پھر بھی زمین نے قبول نہ کیا پھر تیسری مرتبہ دفن کیا گیا تو زمین نے قبول نہ کیا جب لوگوں نے دیکھا کہ زمین اسے قبول نہیں کر رہی تو لوگوں نے اسے گھاٹیوں میں پھینک دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زمین تو اسے بھی قبول کر لیتی ہے، جو اس سے بھی بدتر ہوتا ہے" (4)۔ حسن نے کہا: اس بدترین شخص کو زمین لے لیتی ہے، لیکن قوم کو یہ نصیحت کی گئی کہ وہ اس کام کی طرف نہ لوٹیں۔ سنن ابن ماجہ نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا ایک لشکر مشرکین کی طرف بھیجا تو انہوں نے سخت جنگ کی اور انہوں نے انہیں کندھے دیے پھر میرے ایک قریبی شخص نے مشرکین کے ایک شخص پر نیزے سے حملہ کر دیا جب وہ اس پر غالب آیا تو پھر اس نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں مسلمان ہوں۔ مسلمان نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ پھر وہ مسلمان شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تو نے کیا کیا ہے؟ آپ نے ایک یا دو مرتبہ پوچھا۔ اس نے اپنا واقعہ عرض کیا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو نے اس کا پیٹ کیوں نہ چاک کیا تاکہ تو اس کی کیفیت جان لیتا"۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اگر میں اس کا پیٹ چاک کرتا تو کیا میں اس کے دل کی کیفیت جان لیتا؟

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 3، صفحہ 36۔ ایضاً، ابو داؤد، حدیث نمبر 14، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96
4۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، صفحہ 290

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں تو نے نہ اس کی بات کو قبول کیا اور نہ تو اس کے دل کی کیفیت جانتا“۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خاموش ہو گئے تھوڑی دیر گزری حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا پس ہم نے اسے دفن کیا، صبح وہ زمین پر باہر پڑا تھا۔ ہم نے کہا: شاید دشمن نے اس کی قبر کو کھودا ہو، پھر ہم نے دفن کیا پھر ہم نے اپنے نوجوانوں کو حفاظت کرنے کا حکم دیا، پھر بھی وہ صبح زمین پر پڑا تھا۔ ہم نے کہا: شاید نوجوان سو گئے ہوں۔ پھر ہم نے اسے دفن کیا، پھر ہم نے خود نگرانی کی لیکن صبح پھر وہ زمین کے اوپر تھا، پھر ہم نے اسے گھاٹیوں میں پھینک دیا (1)۔ بعض علماء نے کہا: قاتل اسامہ بن زید تھا اور مقتول مرداس بن نہیک غطفانی ثم الفزاری من بنی مرۃ من اہل فدک تھا۔ یہ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے مرداس نے رات کو اسلام قبول کیا اور اس کے متعلق اپنے گھر والوں کو بتایا۔ جب اسامہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کی سختی کا ذکر فرمایا تو اسامہ نے قسم اٹھائی کہ وہ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرے گا جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے گا اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قاتل ابوقتادہ تھا۔ بعض نے فرمایا: ابو درداء تھا۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زمین نے جس کو پھینک دیا تھا وہ محلم تھا جو ہم نے ذکر کیا ہے شاید یہ تمام واقعات قریب قریب واقع ہوئے تو تمام کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان کو بکریاں اور اونٹ واپس کر دیا اور اس کے تلف ہونے کی وجہ سے دیت بھی دی۔ واللہ اعلم۔ ثعلبی نے ذکر کیا ہے اس لشکر کا امیر ایک شخص تھا جس کو غالب بن فضالہ لیثی کہا جاتا تھا بعض نے کہا: مقداد نام تھا۔ یہ سہیلی نے حکایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَتَبَيَّنُوْا** یعنی غور کرو۔ تبینوا جماعت کی قرأت ہے اور یہ ابو عبیدہ اور ابو حاتم کا مختار ہے ان دونوں حضرات نے کہا: جو خوب غور و فکر اور تثبت سے کام کرے تو کہا جاتا ہے: تبینت الامر و تبین الامر بنفسہ۔ یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ حمزہ نے فتثبتوا یعنی ثا کے ساتھ اور اس کے بعد با کے ساتھ پڑھا ہے۔ تبینوا میں زیادہ تاکید ہے، کیونکہ انسان کبھی کسی کام کو مضبوط تو کرتا ہے، لیکن اس میں غور نہیں کرتا۔ اذا میں شرط کا معنی ہے اسی وجہ سے **فَتَبَيَّنُوْا** پر فا داخل ہوئی ہے، جزا پر فا لگائی جاتی ہے جیسے شاعر نے کہا:

وإذا تُصِبْكَ خصاصةٌ فتجمّل

اور بہتر یہ ہے کہ فا نہ لگائی جائے جیسا کہ شاعر نے کہا:

والنفس راغبةٌ إذا رغّبتها وإذا تُرَدّ إلى قليل تقنعُ

سفر و حضر میں قتل سے پہلے غور و غوض ضروری ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں سفر کو خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ وہ حادثہ سفر میں واقع ہوا تھا جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا**۔ السَّلَم، السِّلم اور السلام تینوں کا ایک معنی ہے۔ یہ بخاری کا قول ہے تینوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام نے السلام کو اختیار کیا اور اہل نظر نے اس کی مخالفت کی انہوں نے کہا: السلم بہتر ہے، کیونکہ اس کا معنی پیروی کرنا اور تسلیم کرنا ہے جیسا کہ اللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 290۔ ایضاً، حدیث نمبر 3919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (النحل: 28)

السَّلَمَ کا معنی تسلیم کرنا ہے یعنی تم اسے نہ کہو جس نے اپنے ہاتھ ڈال دیے اور سر تسلیم خم کر دیا اور تمہاری دعوت کو ظاہر کیا ہے کہ تو مومن نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: السلم سے مراد السلام علیکم کا قول ہے یہ پہلے مفہوم کی طرف راجع ہے۔ اسلام کے سلام کے ساتھ سلام کرنا اطاعت اور انقیاد کی دلیل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی انحیاز اور ترک ہو۔ اخفش نے کہا: فلان سلام جب کوئی کسی سے خلط ملط ہوتا ہے (1)۔ السِّلم سین کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو اس کا معنی صلح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابو جعفر سے مروی ہے کہ انہوں نے لَسْتَ مُؤْمَنًا دوسری میم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آمنتہ سے مشتق ہوگا جب تو اسے پناہ دے۔ فھو مؤمن وہ پناہ دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ مسلمان جب کافر سے ملے جس کا کوئی عہد نہیں ہے تو مسلمان کے لیے اس کو قتل کرنا جائز ہے اگر وہ کہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو پھر اس کا قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اسلام کے ساتھ وہ محفوظ ہو گیا جو اسلام اس کے خون، مال اور اہل کی حفاظت کرے۔ اگر وہ اس کے بعد اس کو قتل کر دے گا تو بدلے میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ اور مذکورہ واقعات میں جو صحابہ کرام سے قتل ساقط ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے ابتدائی دور میں تھے انہوں نے سمجھا کہ یہ اس نے ہتھیار کے خوف سے اور قتل سے بچنے کے لیے کہا ہے، اس کو بچانے والا اس کا قول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو بچانے والا ہوگا اس نے جیسا بھی کہا ہو۔ اسی وجہ سے اسامہ کو فرمایا: ''کیا تو نے اس کے دل کو نہیں چیرا تھا تا کہ تو جان لیتا کہ کیا اس نے یہ کیا ہے یا نہیں'' (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یعنی غور و فکر کیا جائے گا کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا ہے اور یہ ممکن نہیں۔ اور صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے بیان کرے۔ اس میں بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ احکام کا دارومدار ظن غالب پر ہوتا ہے نہ کہ قطعیت پر اور باطن کے رازوں پر آگاہی کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 6۔ اگر کوئی کہہ دے: سلام علیکم۔ تو اسے قتل کرنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس کے پیچھے جو کچھ ہے وہ جان لے، کیونکہ یہ اشکال کی جگہ ہے۔ امام مالک نے کافر کے بارے فرمایا: جو پایا گیا تو اس نے کہا: میں امن طلب کرتے ہوئے آیا ہوں، میں امان طلب کرتا ہوں۔ یہ مشکل امور ہیں۔ میرا خیال ہے اس کو اس کی پناہ کی طرف لوٹایا جائے گا اور اس پر اسلام کا حکم نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے کفر تو ثابت ہے۔ پس اسے وہ چیز ظاہر کرنی ضروری ہے جو اس کے قول پر دلالت کرے، صرف یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں اور میں مومن ہوں کافی نہیں ہے نہ نماز پڑھنا کافی ہے حتیٰ کہ وہ ایسا کلمہ کہے جس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو معلق کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (3) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں حتیٰ کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر نماز پڑھے یا کوئی ایسا فعل کرے جو اسلام کے خصائص میں سے ہے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے خیال میں اس سے وہ مسلمان نہ ہوگا مگر اس سے پوچھا جائے گا اس نماز کے پیچھے کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 68　3۔ ایضاً، صفحہ 37

ہے اگر وہ کہے: مسلمان کی نماز تو اسے کہا جائے گا تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ، اگر وہ یہ کہے تو اس کا صدق ظاہر ہو جائے گا اگر وہ انکار کرے گا تو ہم جان لیں گے کہ وہ مزاح کر رہا ہے اور جو اس کا یہ فعل اسلام خیال کرتا تھا اس کے نزدیک یہ انکار ردت ہو گیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ کفر اصلی ہے ردت نہیں ہے۔ یہی حکم ہے جس نے سلام علیکم کہا، اسے کلمہ پڑھنے کا مکلف کیا جائے گا اگر وہ کلمہ پڑھ لے تو اس کی ہدایت ثابت ہو جائے گی اگر وہ انکار کرتا ہے تو اس کا عناد ظاہر ہو جائے گا اور اسے قتل کیا جائے گا۔ فَتَبَيَّنُوْا کے قول کا یہی معنی ہے یعنی مشکل امر میں خوب غور و خوض کر لو۔ او تثبتوا یعنی جلد نہ کرو۔ دونوں کا معنی برابر ہے اگر کسی نے اسے قتل کر دیا تو وہ ایک ممنوع کام کا ارتکاب کرنے والا ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محلم پر سختی کرنا اور قبر سے اس کا باہر آ جانا اس کا مخرج کیسا ہے؟ ہم کہیں گے: کیونکہ اس کی نیت سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اسلام کی کوئی پرواہ نہیں کرتا پس اس نے اسے زمانہ جاہلیت کے بغض و دشمنی کی وجہ سے جان بوجھ کر قتل کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی جو مال لینا چاہتے ہیں۔ دنیا کے سامان کو عرض کیا جاتا ہے کیونکہ وہ عارضی ہے، زائل ہونے والا ہے اور ثابت نہیں ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: دنیا کے تمام سامان کو عرض (را کے فتحہ کے ساتھ) کہا جاتا ہے۔ اسی سے ہے: الدنیا عرض حاضر یاکل منها البر والفاجر(1)۔ دنیا موجود سامان ہے جس سے نیک اور فاجر کھاتا ہے۔ اور العرض (را کے سکون کے ساتھ) دنانیر اور دراہم کے سوا چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ ہر عرْض، عرَض ہے لیکن ہر عرَض، عرْض نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ”غنا کثرت عرض (سامان، دولت) سے نہیں ہوتی بلکہ غنا حقیقۃً نفس کا غنا ہے“(2)۔ بعض علماء نے اس معنی کو نظم میں بیان کیا ہے۔

تقنع بما يكفيك واستعمل الرضا　　فإنك لا تدري أتصبح أم تمسي

فليس الغنى عن كثرة المال إنما　　يكون الغنى والفقر من قبل النفس

یہ ابو عبیدہ کے قول کی تصحیح کرتا ہے کہ مال ہر اس چیز کو شامل ہے جو متمول ہونے کا باعث ہو۔ ”کتاب العین“ میں ہے العرض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو دنیا سے پائی گئی ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (الانفال: 67) تم دنیا کے سامان کا ارادہ کرتے ہو۔ عرض کی جمع عروض ہے۔ ابن الفارس کی ”المجمل“ میں ہے العرَض وہ مرض وغیرہ جو انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ عرض الدنیا جو دنیا کے مال سے تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ اور العرض سے مراد وہ سامان ہے جو نقدی کے علاوہ ہے۔ اعرض الشئ کا مطلب ہے جب ظاہر اور ممکن ہو۔ العرض جو طول کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ جو شخص احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے آئے گا اور ممنوع چیزوں کا ارتکاب نہیں کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سی غنیمتیں تیار کر رکھی ہیں پس تم ان نعمتوں کو گراؤ نہیں(3)۔ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یعنی تم بھی اپنے ایمان کو اپنی قوم کے خوف سے چھپاتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 415، حدیث نمبر 3151

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 336۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5965، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 96

عزت دینے اور دین کو غالب کرنے کے ساتھ تم پر احسان فرمایا۔ اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنی قوم میں تمہارے ساتھ نماز پڑھنے کے انتظار میں ہے پس یہ درست نہیں کہ جب وہ تمہارے پاس پہنچے تو تم اسے قتل کر دو حتیٰ کہ معاملہ بالکل واضح ہو جائے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے اسی طرح تم کافر تھے۔ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ۔ تم پر اللہ نے احسان فرمایا کہ تم اسلام لے آئے پس تم انکار نہ کرو کہ وہ اس طرح ہو پھر وہ اسلام کا اظہار کرے جب وہ تم سے ملے پس تم اس کے معاملہ میں خوب تحقیق کر لو(1)۔

مسئلہ نمبر 10۔ اس آیت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام زبان سے اقرار کا نام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا یہ علماء فرماتے ہیں: جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والے کو ''مومن نہیں ہے'' کہنے سے منع کیا گیا ہے، تو صرف اس قول سے اسے قتل کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اگر ایمان صرف زبان سے اقرار نہ ہوتا تو ان کے قول پر عیب نہ لگاتے۔ ہم نے کہا: قوم نے اس حالت میں شک کیا کہ یہ قول ان سے بچنے کے لیے کہا ہو پس انہوں نے اسے قتل کر دیا اللہ تعالیٰ نے ظاہر شریعت کے علاوہ بندوں کے لیے کوئی حکم نہیں بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أمرت ان أقاتل الناس حتی یقولوا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔(2) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں حتیٰ کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیں۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کہ ایمان فقط اقرار کا نام ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ منافقین یہ قول کہتے تھے، حالانکہ وہ مومن نہیں تھے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے اس کی مزید وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان نے کر دی۔ أفلا شققت عن قلبه(3)۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان صرف اقرار نہیں۔ ایمان کی حقیقت تصدیق بالقلب، دل سے تصدیق کرنا ہے اور بندے کے لیے اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مگر جو کچھ اس سے سنے۔ اس سے انہوں نے بھی استدلال کیا جنہوں نے کہا: زندیق کی توبہ قبول کی جائے گی جب وہ اسلام کو ظاہر کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زندیق اور دوسرے کافروں میں کوئی فرق نہیں کیا جب وہ اسلام کو ظاہر کرے۔ اس پر گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس آیت میں قدریہ کا رد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس نے مومنین پر تمام مخلوق کے درمیان سے احسان فرمایا انہیں توفیق کے ساتھ خاص فرمایا۔ اور قدریہ کہتے ہیں: اس نے تمام مخلوق کو ایمان کے لیے تخلیق کیا۔ اگر معاملہ اس طرح ہوتا جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے تو مومنین کو احسان کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَبَيَّنُوْا تاکید کے لیے، پھر غور و خوض کے امر کو ذکر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ یہ احکام الٰہیہ کی مخالفت سے ڈرانا ہے۔ یعنی اپنے آپ کی حفاظت کرو اور اپنے نفسوں کو ایسی لغزشوں سے بچاؤ جو تمہیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 97　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 37　3۔ احکام القرآن للطبری، جلد 5، صفحہ 264

دَرَجَةً ۭ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''نہیں برابر ہو سکتے (گھروں میں) بیٹھنے والے مسلمان سوائے معذوروں کے اور جہاد کرنے والے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، بزرگی دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا لیکن فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے۔ (ان کے لیے) بلند درجے ہیں اللہ (کی جناب) سے اور (نوید) بخشش اور رحمت ہے اور ہے اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا بدر سے پیچھے رہنے والے اور بدر کی طرف نکلنے والے برابر نہیں (1)، پھر فرمایا: غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ، الضَّرَرِ سے مراد اپاہج ہونا ہے۔ ائمہ حدیث سے مروی ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں تھا آپ پر سکینت چھا گئی۔ رسول اللہ ﷺ کی ران میری ران پر تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ کی ران سے زیادہ بھاری بوجھ کبھی کسی چیز کو نہیں پایا۔ پھر جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا: ''لکھو'' میں نے شانے کی ہڈی پر لکھا لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ ...... الایۃ۔ ابن ام مکتوم کھڑے تھے وہ نابینا آدمی تھے جب انہوں نے مجاہدین کی فضیلت سنی تو عرض کی: یا رسول اللہ! جو مومنین میں سے جہاد کر ہی نہیں سکتا وہ کیسے جہاد کرے؟ جب کلام مکمل ہوئی تو پھر رسول اللہ ﷺ پر سکینت چھا گئی آپ کی ران میری ران پر تھی میں نے دوبارہ بوجھ محسوس کیا جس طرح پہلے محسوس کیا تھا پھر رسول اللہ ﷺ سے وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا: ''اے زید پڑھو''، میں نے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ پڑھا تو رسول اللہ نے فرمایا: غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ...... الایۃ (2) ''پڑھو''۔ حضرت زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تنہا نازل فرمایا پھر میں نے اس کو لاحق کیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! گویا میں اب اس کے ملحق کو دیکھ رہا ہوں جب کندھے کی ہڈی میں دراڑ پیدا ہوئی تھی (3)۔

بخاری میں مقسم مولیٰ عبداللہ بن حارث سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ کا ارشاد بدر کی جنگ میں پیچھے رہنے والوں اور بدر کی طرف نکلنے والوں کے متعلق ہے۔ علماء نے فرمایا: اہل الضرر سے مراد معذور لوگ ہیں، کیونکہ ان کے عذروں نے انہیں نقصان پہنچایا حتیٰ کہ جہاد سے انہیں روک دیا۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کہ آپ کسی غزوہ سے واپس آ رہے تھے ''مدینہ میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 269　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 339۔ ایضاً، حدیث نمبر 2146، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 553

کچھ لوگ ہیں تم نے جو وادی طے کی اور تم جس جگہ چلے وہ تمہارے ساتھ تھے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عذر نے روک لیا تھا"۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صاحب العذر کو غازی کا اجر ملتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ احتمال ہے کہ اس کا اجر برابر ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل میں وسعت ہے اور اس کا ثواب اس کا فضل ہے نہ کہ استحقاق ہے۔ سچی نیت پر وہ ثابت ہوتا ہے جو فعل پر ثابت نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: معذور کو بغیر تضعیف کے اجر ملے گا جب کہ غازی کو تضعیف کے ساتھ اجر ملے گا، کیونکہ اس نے خود بالفعل شرکت کی۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ۔ کیونکہ اس کے لیے صحیح حدیث موجود ہے کہ "مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ ہیں" اور ابو کبشہ کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "دنیا چار لوگوں کے لیے ہے"۔ یہ حدیث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے اس معنی سے مراد وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے "جب بندہ مریض ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لیے وہ لکھو جو یہ صحت میں کرتا تھا حتیٰ کہ ٹھیک ہو جائے یا میں اس کی جان قبض کرلوں" (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے اہل دیوان، اجر میں نوافل پڑھنے والوں سے زیادہ ہیں، کیونکہ اہل دیوان، عطا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور تکالیف میں مال کو خرچ کرتے ہیں اور لشکروں اور اوامر کو خوش کرتے ہیں پس وہ نوافل پڑھنے والوں سے عظیم ہوتے ہیں، کیونکہ بڑی بڑی جنگوں میں ان کے دل سکون میں ہوتے ہیں اور دل خوش ہوتے ہیں۔ ابن محیریز نے کہا: عطیہ دینے والے نفل پڑھنے والوں سے افضل ہوتے ہیں، کیونکہ وہ خوف دور کرتے ہیں۔ مکحول نے کہا: لشکروں کا خوف، قیامت کے خوف کو دور کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس سے اس شخص نے بھی دلیل پکڑی ہے جو کہتا ہے کہ غنا فقر سے افضل ہے (2)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کا ذکر فرمایا جس کے ذریعے نیک اعمال تک پہنچا جاتا ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے جب کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ فقر کی وجہ سے زیادہ محتاج بن جانا مکروہ ہے اور غنا کی وجہ سے اکڑنا مذموم ہے۔ ایک قوم نے غنا کو فضیلت دی ہے، کیونکہ غنی قادر ہوتا ہے اور فقیر عاجز ہوتا ہے اور قدرت، عجز سے افضل ہوتی ہے۔ ماوردی نے کہا: یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جن پر شہرت غالب تھی۔ دوسرے علماء فقر کو فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ فقیر تارک ہوتا ہے غنی ملابس ہوتا ہے اور دنیا کا ترک اس کی ملابست سے افضل ہے۔ ماوردی نے کہا: یہ ان کا مذہب ہے جس پر سلامتی کی محبت غالب ہے۔ بعض دوسرے دونوں امر میں توسط کو فضیلت دیتے ہیں کہ حد فقر سے غنا کے ادنیٰ مراتب کی طرف نکلے تاکہ دو امروں کی فضیلت کو پائے اور دونوں حالتوں کی مذمت سے سلامت ہو جائے۔ ماوردی نے کہا: یہ اس کا مذہب ہے جو اعتدال کو فضیلت دیتے ہیں۔ خیر الامور اوسطها بہتر امر متوسط ہے۔ شاعر نے کتنا خوبصورت کہا:

الا عائذا باللہ من عدم الغنی　　ومن رغبۃ یومًا الی غیر مرغب

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ یہ اہل کوفہ اور ابو عمرو کی قرأت غیرُ (رفع کے ساتھ) ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 1، صفحہ 420۔ ایضاً، حدیث نمبر 2774، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 98

اخفش نے کہا: یہ قاعدین کی صفت ہے، کیونکہ اس سے کسی متعین قوم کا ارادہ نہیں کیا گیا پس یہ نکرہ کی طرح ہو گئے ان کا غیر سے وصف بیان کرنا جائز ہے معنی یہ ہے کہ لا یستوی القاعدون غیر اولی الضرر یعنی لا یستوی القاعدون الذین ھم غیر اولی الضرر اور یہ معنی ہے لا یستوی القاعدون الاصحاء۔ یعنی صحیح بیٹھ رہنے والے برابر نہیں۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔ ابوحیوہ نے غیرِ پڑھا ہے اور مومنین کی صفت بنایا ہے یعنی من المومنین الذین ھم غیر اولی الضرر من المومنین الاصحاء۔ اہل الحرمین نے غیر کو القاعدین یا المومنین سے استثنا کی بنا پر منصوب پڑھا ہے یعنی الا اولی الضرر۔ پس وہ مجاہدین کے ساتھ برابر نہیں اگر تو چاہے تو القاعدین سے حال کی بنا پر منصوب پڑھے یعنی لا یستوی القاعدون من الاصحاء یعنی فی حال صحتھم۔ یعنی حالت صحت میں بیٹھنے والے برابر نہیں اور القاعدون سے اس کا حال ہونا جائز ہے، کیونکہ ہم کا لفظ معرفہ کا لفظ ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: جاءنی زید غیر مریض اور جو ہم نے نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ بھی نصب کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً۔ اس کے بعد فرمایا: دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً پہلے درجہ کے ساتھ فضیلت دینا پھر درجات کے ساتھ فضیلت دینا یہ مبالغہ، بیان اور تاکید ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو معذور لوگوں میں سے بیٹھنے والوں پر ایک درجہ فضیلت دی اور بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والوں پر کئی درجات فضیلت دی۔ یہ ابن جریج اور سدی وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: درجۃ کا معنی علو (بلندی) ہے یعنی ان کا ذکر بلند کیا اور ثنا، مدح اور تعریف کے ساتھ ان کو رفعت عطا فرمائی۔ یہ درجہ اور درجات کا معنی ہے یعنی جنت میں ان کو مدح و تعریف کے ساتھ شان رفیع عطا فرمائے گا۔ ابن محیریز نے کہا: ستر درجات ہیں اور ہر دو درجات کے درمیان ستر سال عمدہ گھوڑے کے دوڑنے کی بلندی ہے (1)۔ درجات، اجر سے بدل ہے اور اس کی تفسیر ہے، ظرف کی تقدیر پر اس کو نصب دینا بھی جائز ہے یعنی فضلھم بدرجات اور اس کا اَجْرًا عَظِيْمًا کی تاکید ہونا بھی جائز ہے، کیونکہ اجر عظیم ہی درجات، مغفرت اور رحمت ہے اور اس پر رفع بھی جائز ہے یعنی ذالک درجات، اجراً کو نصب فضل کی وجہ سے ہے اگر تو چاہے تو مصدر بنا دے اور یہ احسن ہے پھر اسے فضل کی وجہ سے نصب نہ ہوگی، کیونکہ وہ اپنے دو مفعول پورے کر چکا ہے اور وہ المجاہدین اور علی القاعدین ہیں۔ اور اسی طرح درجۃ کا حکم ہے۔ الدرجات سے مراد منازل ہیں جو ایک دوسرے سے بلند ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح میں مروی ہے کہ "جنت میں سو درجات اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے تیار فرمائے ہیں ہر دو درجات کے درمیان آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے" (2)۔

وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، كُلًّا کو نصب وعد کی وجہ سے ہے اور الْحُسْنٰى سے مراد جنت ہے یعنی وعد اللہ کلا الحسنی اللہ تعالیٰ نے سب سے جنت کا وعدہ فرمایا، پھر بعض علماء نے فرمایا: کلا سے مراد خاص مجاہدین ہیں۔ بعض نے فرمایا: مجاہدین اور معذور لوگ ہیں۔ واللہ اعلم۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 2، صفحہ 64

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 1، صفحہ 391۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 2581، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

”بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا: تم کس شغل میں تھے؟ (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا: ہم تو بے بس تھے زمین میں۔ فرشتوں نے کہا: کیا نہیں تھی اللہ کی زمین کشادہ تاکہ تم ہجرت کرتے اس میں؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے مگر واقعی کمزور و بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو نہیں کر سکتے تھے (ہجرت کی) کوئی تدبیر اور نہیں جانتے تھے (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ، تو یہ لوگ ہیں جن کے بارے امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا ان سے اور اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا، بہت بخشنے والا ہے“۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل مکہ سے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ظاہر کیا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو وہ اپنی قوم کے ساتھ ٹھہرے رہے اور ان میں سے ایک جماعت فتنہ میں مبتلا کی گئی تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے جب جنگ بدر کا موقع آیا تو ان میں کچھ لوگ کفار کے ساتھ نکلے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے جب مسلمانوں کی تعداد کو حقیر سمجھا تو ان کے دین میں شک داخل ہوا پس وہ مرتد ہو گئے اور ردت پر ہی قتل کیے گئے۔ مسلمانوں نے کہا: یہ ہمارے مسلمان ساتھی تھے انہیں خروج پر مجبور کیا گیا تھا پس انہوں نے ان کے لیے مغفرت طلب کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلا قول اصح ہے۔ امام بخاری نے محمد بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے فرمایا: اہل مدینہ سے ایک لشکر تیار کیا گیا میرا نام بھی اس میں لکھا گیا پھر میں حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ سے ملا، میں نے یہ ذکر کیا تو انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا پھر فرمایا: مجھے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ تھے جو مشرکوں کے ساتھ تھے اور عہد رسالت میں وہ مشرکین کی جمعیت میں زیادتی کرتے تھے۔ کوئی تیر آتا جو پھینکا جاتا تھا ان میں سے کسی کو لگتا اور اسے قتل کر دیتا یا اسے مارا جاتا اور وہ قتل ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یہ احتمال ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو۔ علامت تانیث کے ساتھ اس کی نسبت ذکر نہیں کی گئی، کیونکہ ملائکہ کے لفظ کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ فعل مستقبل ہو تتوفاھم کے معنی پر۔ پھر ایک تا حذف کی گئی۔ ابن فورک نے حسن سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے فرشتے انہیں ہانک کر آگ کی طرف لے جائیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 661۔ ایضاً، حدیث نمبر 4230، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے(2)۔ یہ قول اظہر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الملائکۃ سے مراد ملک الموت ہے(3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدۃ: 11)

اور ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی فی حال ظلمھم انفسھم مراد ظالمین اَنْفُسِهِمْ ہے نون کو استخفافاً حذف کیا گیا اور مضاف کیا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ: 95) (ہدی جو کعبہ تک پہنچنے والی ہو) اور فرشتوں کا قول فِيْمَ كُنْتُمْ یہ زجر و توبیخ کے لیے سوال ہے یعنی کیا تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں تھے یا مشرکین میں تھے اور ان کا قول كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ، الْاَرْضِ سے مراد مکہ ہے یہ غیر صحیح عذر پیش کرتا ہے، کیونکہ حیلوں کی طاقت رکھتے تھے اور راستہ حاصل کر سکتے تھے پھر فرشتوں نے انہیں اپنے دین پر ہی سمجھا، کیونکہ فرشتوں نے انہیں اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً یہ سوال و جواب اس بات کو مفید ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے تھے جبکہ وہ اپنی جانوں پر ہجرت ترک کرنے کی وجہ سے ظلم کرنے والے تھے ورنہ اگر وہ کافر ہو کر مرتے تو انہیں یہ نہ کہا جاتا۔ ان کے اپنے عمل کی وجہ سے ان کا صحابہ میں ذکر نہیں کیا اور ایمان کے عدم تعین اور ردت کے احتمال کی وجہ سے صحابہ میں ذکر نہیں فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے مَاْوٰىهُمْ میں جو ضمیر تھی اس سے ان کی استثنا فرمائی جو مردوں میں حقیقۃً اپاہج تھے اور عورتوں اور بچوں میں سے کمزور و بے بس تھے جیسے عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام وغیرہم جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں اور میری والدہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارادہ فرمایا ہے(4)۔ اس وقت حضرت ابن عباس بچوں میں سے تھے اور ان کی والدہ ام الفضل بنت حارث تھی، اس کا نام لبابہ تھا یہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھی ان کی دوسری بہن لبابہ الصغریٰ تھی یہ نو بہنیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے فرمایا: الاخوات مومنات سب بہنیں مومنہ تھیں۔ ان میں سے سلمیٰ، عصماء اور حفیدہ تھیں۔ حفیدہ کو ام حفید کہا جاتا تھا۔ اس کا نام ہزیلۃ تھا۔ یہ چھ سگی بہنیں تھیں اور تین ماں کی طرف سے بہنیں تھیں وہ سلمیٰ اور سلامۃ اور اسماء بن عمیس خثعمیہ جو جعفر بن ابی طالب کی بیوی تھی پھر حضرت ابو بکر صدیق کی زوجہ بنیں پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ بنی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْمَ كُنْتُمْ یہ توبیخ کے لیے سوال ہے یہ پہلے گزر چکا ہے فیم اصل میں فیما تھا الف کو حذف کیا گیا ما استفہامیہ اور خبریہ میں فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور اس پر وقف کی صورت میں فیمہ ہو جائے گا تاکہ الف اور حرکت حذف نہ ہو۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً سے مراد مدینہ ہے یعنی کیا تم ہجرت کرنے پر اور جو تمہیں بے بس کرتے تھے ان سے دور ہونے پر قادر نہ تھے؟ اس آیت میں اس زمین کو چھوڑنے پر دلیل ہے جس میں گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا جب کسی جگہ گناہ ہوتے ہوں تو تو اس جگہ سے نکل جا۔ اور پھر یہ آیت تلاوت کی: اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اپنے دین کو بچانے کی خاطر زمین سے دوسری زمین کی طرف

1۔ تفسیر الحسن بصری، جلد 2، صفحہ 360
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 100
3۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 2، صفحہ 106
4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 277

نکلا اگرچہ ایک بالشت بھی ہو تو وہ جنت کا مستحق ہوگا اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق ہوگا"۔

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ہر مسلمان پر اس وقت ہجرت کرنا فرض تھا۔ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا﴿۹۷﴾ تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً حیلہ کا لفظ عام ہے خلاصی کے لیے تمام اسباب کو شامل ہے۔ السبیل سے مراد مدینہ طیبہ کا راستہ ہے۔ یہ مجاہد اور سدی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ تمام راستوں میں عام ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ یہ وہ ہیں جن کے لیے ہجرت کرنے کا کوئی سبب نہ تھا ان کے لیے کوئی گناہ نہیں حتیٰ کہ انہیں معاف کیا گیا۔ معنی یہ ہے کہ یہ متوہم تھا کہ ہجرت میں انتہائی مشقت برداشت کرنا واجب ہے حتیٰ کہ جو اس مشقت کو برداشت نہیں کرے گا اسے سزا ملے گی، تو اللہ تعالیٰ نے اس وہم کا بھی ازالہ فرما دیا، کیونکہ انتہائی مشقت اٹھانا واجب نہیں، بلکہ زاد راہ اور سواری کے نہ ہونے کی صورت میں بھی ہجرت کو ترک کرنا جائز تھا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر محاسبہ میں سختی نہیں کی جائے گی اسی وجہ سے فرمایا: وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴿۹۹﴾ اللہ تعالیٰ کے لیے ماضی، مستقبل برابر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴿۱۰۰﴾

"اور جو شخص ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں پائے گا زمین میں پناہ کے لیے بہت جگہ اور کشادہ روزی اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آلے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا، المراغم کی تاویل میں اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا: المراغم سے مراد بچنے کی جگہ ہے(1)۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور ربیع وغیرہم نے کہا: اس سے مراد گھومنے کی جگہ اور راستہ ہے(2)۔ ابن زید نے کہا: المراغم سے مراد ہجرت گاہ ہے(3)۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ نحاس نے کہا: یہ تمام اقوال ہم معنی ہیں۔ المراغم ہجرت کی حالت میں چلنا ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جس میں سفر کیا جاتا ہے۔ یہ الرغام سے مشتق ہے۔ رغم انف فلان یعنی اس کا ناک خاک آلود ہوا۔ راغمت فلاناً میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے دشمنی کی اور اس کی ناک خاک آلود ہونے کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہجرت گاہ کو مہاجر اور مراغم اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ جب آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ اپنی قوم سے دشمنی کرتا ہے اور انہیں چھوڑ دیتا ہے پس اس کے نکلنے کو

1۔ تفسیر مجاہد، جلد 1، صفحہ 57، دار الکتب العلمیہ　2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

مراغماً کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی طرف جانے کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ سدی نے کہا: المراغم وہ جگہ جہاں معیشت کو تلاش کیا گیا ہو(1)۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ المراغم کا معنی زمین میں چلنا ہے(2)۔ یہ تمام تفسیر بالمعنی ہے اور ایک دوسرے کے قریب قریب معانی ہیں اور لفظ کے اعتبار سے خاص مراغم، ناک کو خاک آلود کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ہر دو جھگڑنے والے اپنے مخالف کی ناک کو خاک آلود کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے اپنی مراد کے سلسلہ میں مغلوب کر دیتا ہے۔ کفار قریش گویا محبوسین کی ناکوں کو مکہ میں خاک آلود کیے ہوتے تھے پھر اگر ان میں سے کوئی ہجرت کرتا تو وہ قریش کی ناک کو خاک آلود کرتا، کیونکہ وہ ان سے محفوظ ہو جاتا تھا یہ منفعت و حفاظت مراغمۃ کی جگہ ہے۔

اسی سے نابغہ کا قول ہے:

كَطَوْدٍ يُلَاذُ بِأَرْكَانِهِ عَزِيزِ الْمُرَاغَمِ وَالْمَهْرَبِ (3)

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ سَعَةً یعنی رزق میں کشادگی۔ یہ حضرت ابن عباس، ربیع اور ضحاک کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: اس کا معنی گمراہی سے ہدایت کی طرف اور مفلسی سے غنا کی طرف جانے میں کشادگی ہے۔ امام مالک نے کہا: اس سے مراد شہروں کی وسعت ہے۔ یہ فصاحت عرب کے زیادہ مشابہ ہے۔ کیونکہ زمین کی وسعت اور کثرت سے پناہ گاہوں کی وجہ سے رزق میں وسعت ہوتی ہے اور سینہ رزق کے ارادہ اور فکر کے لیے کشادہ ہو جاتا ہے اس کے علاوہ کشادگی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی مفہوم میں شاعر کا قول ہے:

وَكُنْتُ إِذَا خَلِيلٌ رَامَ قَطْعِي وَجَدْتُ وَرَاءَ مُنْفَسَحًا عَرِيضًا (4)

ایک اور شاعر نے کہا:

لَكَانَ لِي مُضْطَرَبٌ وَاسِعٌ فِي الْأَرْضِ ذَاتِ الطُّولِ وَالْعَرْضِ (5)

مسئلہ نمبر 3۔ امام مالک نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ کسی کے لیے وہاں ٹھہرنا جائز نہیں جہاں سلف صالحین کو گالی دی جاتی ہوں اور ناجائز اعمال کیے جاتے ہوں۔ فرمایا: المراغم، زمین میں چلنا مراد ہے۔ السعۃ سے مراد شہروں کی وسعت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مجاہد جب جہاد کے لیے نکلے پھر قتال سے پہلے مر جائے تو اس کے لیے مال غنیمت میں حصہ ہوگا اگرچہ وہ جنگ میں شریک نہ بھی ہو۔ یہ ابن لہیعۃ نے یزید بن ابی حبیب سے اور انہوں نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے اور یہ ابن المبارک سے بھی مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ حضرت ابن عباس کے غلام عکرمہ نے کہا: میں نے اس ہجرت کرنے والے کا چودہ سال نام تلاش کیا حتیٰ کہ میں نے وہ پا لیا۔ عکرمہ کے اس قول میں اس علم کے شرف پر دلیل ہے اور اس کا اہتمام عمدہ ہے اور اس کی معرفت فضیلت ہے۔ اسی طرح کا قول حضرت ابن عباس کا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 483
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 522
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 101
5۔ ایضاً

ہے: میں کئی سال ٹھہرا رہا میں حضرت عمر سے ان دو عورتوں کے نام پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایکا کر لیا تھا اور مجھے پوچھنے سے مانع حضرت عمر کی ہیبت تھی۔ اور عکرمہ نے جس کا ذکر کیا ہے وہ ضمرہ بن عیص یا عیص بن ضمرہ بن زنباع ہے۔ طبری نے یہ سعید بن جبیر سے حکایت کیا ہے(1)۔ اسے ضمیرہ بھی کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے: جندع بن ضمیرہ بنی لیث سے تھا اور یہ مکہ میں بے بس لوگوں میں سے تھا اور یہ مریض تھا جب اس نے ہجرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنا تو کہا: مجھے نکالو۔ اس کے لیے بستر تیار کیا گیا پھر اس کو اس پر ڈالا گیا، اسے نکالا گیا تو وہ راستہ میں تنعیم کے مقام پر فوت ہو گیا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا۔ ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ اس کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ خالد بن حزام بن خویلد بن اخی خدیجہ تھا۔ اس نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی راستے میں اسے ایک سانپ نے ڈس لیا تھا تو وہ حبشہ پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: وہ حبیب بن ضمرہ تھا۔ بعض نے کہا: وہ ضمرہ بن جندب ضمری تھا۔ یہ سدی سے مروی ہے۔ عکرمہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ جندب بن ضمرہ جندعی تھا(2)۔ ابن جابر سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ ضمرہ بن بغیض تھا جو بنی لیث سے تھا۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ وہ ضمرہ بن ضمرہ بن نعیم تھا(3)۔ بعض نے فرمایا: ضمرہ بن خزاعہ تھا۔ واللہ اعلم۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کا ارشاد نازل ہوا تو مسلمانوں میں سے ایک مریض شخص نے کہا: اللہ کی قسم! میرے لیے کوئی عذر ہے؟ میں راستہ جاننے والا ہوں، میں خوشحال بھی ہوں مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔ پس لوگ اسے اٹھا کر چلے تو راستے میں اسے موت آ گئی(4)۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب نے کہا: اگر وہ ہم تک پہنچتا تو اس کو اجر مکمل ہوتا وہ تنعیم میں فوت ہو گیا تھا، اس کے بیٹے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے سارا واقعہ عرض کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ يَّخْرُجْ ...الخ اس کا نام ضمرہ بن جندب تھا، جندب بن ضمرہ بھی کہا جاتا ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا جو پہلے شرک کیا تھا اسے بخشنے والا ہے رَّحِيْمًا۝ توبہ قبول فرما کر رحمت کا مظاہرہ فرماتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن عربی نے کہا: علماء نے زمین میں سفر کرنے کی دو قسمیں بنائی ہیں (۱) بھاگ جانا (۲) طلب کرنا۔ پہلی قسم چھ قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

(۱) ہجرت یہ دار الحرب سے دار السلام کی طرف نکلنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں یہ فرض تھی۔ یہ ہجرت قیامت تک فرض باقی ہے اور جو ہجرت فتح مکہ کے ساتھ ختم ہو گئی وہ نبی کریم ﷺ کا قصد کرنا ہے۔ انسان جہاں بھی ہو اس کو دار الحرب سے دار السلام کی طرف ہجرت کرنا فرض ہے۔ اگر وہ دار الحرب میں باقی رہے گا تو گنہگار ہوگا۔ اس کی حالت مختلف ہوتی ہے۔

(۲) ایسی زمین سے نکلنا جہاں بدعات ہوتی ہوں۔ ابن القاسم نے کہا: میں نے امام مالک کو یہ فرماتے سنا کہ کسی کے لیے ایسی جگہ ٹھہرنا حلال نہیں جہاں سلف صالحین کو برا بھلا کہا جاتا ہو۔ ابن عربی نے کہا: یہ صحیح ہے۔ برائی کو بدلنے پر جب تو قادر نہ ہو تو

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 107
2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 281
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 101
4۔ تفسیر طبری، جلد 5 صفحہ 280

وہاں سے چلا جا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (الانعام) اور جب تو دیکھے انہیں جو بڑھیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے الخ۔

(۳) ایسی جگہ سے نکلنا جہاں حرام غالب ہو، کیونکہ حلال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(۴) ایسی جگہ سے نکلنا جہاں جسمانی اذیت ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے اس نے اس میں رخصت دی۔ جب اسے اپنے اوپر خوف ہو تو اللہ تعالیٰ نے وہاں سے نکلنے کی اجازت دی ہے اور اسے بھاگ جانے کی اجازت دی ہے کہ ممنوع سے اپنے آپ کو بچا لے۔ سب سے پہلے یہ فعل حضرت ابراہیم نے کیا تھا جب انہیں اپنی قوم سے اذیت دینے کا اندشہ ہوا آپ نے کہا تھا: اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ (العنکبوت:26) اور فرمایا: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ (الصافات)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ (القصص:21) تو وہ نکلا اس شہر سے ڈرتے ہوئے، انتظار کرتے ہوئے۔

(۵) مضر صحت ہوا والے شہروں میں مرض کا خوف ہو اور ان شہروں سے پر فضا مقام کی طرف جانا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کے لیے اجازت دی تھی جب انہیں مدینہ طیبہ کی ہوا راس نہ آئی تھی کہ وہ چراگاہ کی طرف جائیں اور ٹھیک ہونے تک وہاں رہیں۔ اس خروج سے طاعون کی وجہ سے نکلنے سے استثنا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے طاعون کی جگہ سے نکلنے منع فرمایا ہے حدیث صحیح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ اس کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے مگر ہمارے علماء فرماتے ہیں یہ مکروہ ہے۔

(۶) مال میں اذیت کے خوف سے فرار ہونا، کیونکہ مسلمان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے اور اہل کی حرمت اس کی مثل مزید مؤکد ہے، اور رہی طلب کی قسم تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ دین کی طلب اور دنیا کی طلب، دین کی طلب۔ اپنی انواع کے متعدد ہونے کی وجہ سے سات قسموں کی طرف منقسم ہوتی ہے (۱) عبرت حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (الروم:9) (کیا انہوں نے سفر نہیں کیا زمین میں کہ دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے) یہ بہت زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ذوالقرنین نے زمین کا چکر لگایا تھا تا کہ اس کے عجائبات کو دیکھے۔ بعض نے فرمایا: تا کہ اس میں حق کا نفاذ کرے۔

(۲) سفر حج۔ پہلی صورت مستحب تھی۔ یہ فرض ہے۔ (۳) جہاد کا سفر، اس کے لیے احکام ہیں (۴) معاش کے لیے سفر۔ کبھی انسان کے ایک جگہ ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے پس وہ اس کی طلب میں نکلے، اس پر زیادتی نہ کرے۔ خواہ وہ شکار کے لیے جائے یا لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے جائے یا گھاس کے لیے جائے یہ اس پر فرض ہے (۵) تجارت اور قوت سے زائد کمائی کے لیے نکلنا یہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ:198) نہیں ہے تم پر کوئی حرج کہ تم تلاش کرو فضل اپنے رب کا۔

یہ نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سفر حج میں احسان فرمایا۔ انفرادی طور پر کیسے جائز نہ ہوگی (جب حج میں جائز ہے (٦) علم کے طلب کرنے کے لیے سفر کرنا یہ مشہور ہے (٧) مخصوص مقامات شریفہ کا قصد کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد (1)۔ سفر نہ کیا جائے مگر تین مساجد کی طرف (٨) سرحدوں کی حفاظت کے لیے سفر کرنا (٩) رضاء الٰہی کے لیے بھائیوں کی زیارت کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی کسی شہر میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اس کے راستہ پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا۔ اس نے پوچھا: تو کہاں کا ارادہ کرتا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا اس شہر میں بھائی ہے میں اس کا ارادہ کرتا ہوں۔ فرشتے نے کہا: کیا تیرے لیے کوئی نعمت ہے جس کی تو لجپالی کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں مگر میں اس سے اللہ کی رضا کے لیے محبت کرتا ہوں۔ اس فرشتے نے کہا: میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ایسی ہی محبت فرمائی جیسی تو نے اپنے بھائی سے محبت کی'' (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝۱۰۱

''اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کچھ حرج اگر تم قصر کرو نماز میں اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں''۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ضَرَبْتُمْ تم سفر کرو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ سفر میں قصر کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت سے مروی ہے کہ قصر کرنا فرض ہے۔ یہ عمر بن عبدالعزیز، کوفی علماء، قاضی اسماعیل، حماد بن ابی سلیمان کا مسلک ہے انہوں نے حضرت عائشہ کی حدیث: فرضت الصلاة ركعتين ركعتين (3) (نماز دو دو رکعت فرض کی گئی) سے حجت پکڑی ہے۔ اس میں اس کے مخالف کے لیے حجت نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ خود سفر میں نماز مکمل پڑھتی تھیں ان کا یہ عمل اس حجت کو کمزور کر دیتا ہے۔ فقہاء امصار کا اس پر اجماع ہے کہ یہ ایسی اصل نہیں کہ مقیم کے پیچھے مسافر کی نماز کا اعتبار کیا جائے۔ حضرت عائشہ کے علاوہ صحابہ جیسے حضرت عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت جبیر بن مطعم نے روایت کیا ہے کہ ان الصلوٰة فرضت في الحضر اربعاً وفي السفر ركعتين وفي الخوف ركعة (4) (یعنی نماز حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت فرض کی گئی) اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ پھر حضرت عائشہ کی حدیث جسے ابن عجلان نے صالح بن کیسان سے انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز دو دو رکعت فرض کی۔ اوزاعی نے ابن شہاب سے، انہوں نے عروہ سے،

1۔ صحیح مسلم، فضل المساجد الثلاثة، جلد 1، صفحہ 447

2۔ صحیح مسلم، البر والصلة والأدب، جلد 2، صفحہ 317۔ صحیح بخاری، حدیث 1115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰة، جلد 1، صفحہ 148

4۔ صحیح مسلم، صلوٰة المسافرین وقصرها، جلد 1، صفحہ 241

انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو دو رکعت نماز فرض کی' (الحدیث) یہ اضطراب ہے۔ پھر حضرت عائشہ کا قول فرضت الصلوٰۃ اپنے ظاہر پر نہیں ہے اس سے نماز مغرب اور صبح خارج ہیں، کیونکہ مغرب میں کمی بیشی نہیں کی جاتی اسی طرح صبح میں بھی۔ یہ تمام اس حدیث کے متن کو ضعیف کرتا ہے نہ کہ اس کی سند کو۔ ابن الجہم نے حکایت کیا ہے کہ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ قصر کرنا فرض ہے۔ اور امام مالک کا مشہور مذہب اور ان کے عظیم ساتھیوں اور اکثر علماء خلف وسلف کا مذہب یہ ہے کہ قصر کرنا سنت ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور یہی صحیح ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مالکیوں میں سے عام بغدادی علماء کا مذہب یہ ہے کہ فرض اختیار ہے۔ یہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے پھر اختلاف ہے کہ کون سی صورت افضل ہے؟ بعض نے فرمایا: قصر کرنا افضل ہے۔ یہ ابہری وغیرہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: مکمل پڑھنا افضل ہے۔ یہ امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے۔ ابو سعید الفروی المالکی نے حکایت کیا ہے کہ امام مالک کے مذہب میں صحیح اتمام اور قصر میں مسافر کے لیے تخییر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی حکم اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر امام مالک کے نزدیک قصر کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح وقت کے اندر نماز کے اعادہ کا نظریہ رکھتے ہیں اگر مکمل پڑھ لی ہو۔ ابو مصعب نے اپنی 'مختصر' میں امام مالک اور اہل مدینہ سے حکایت کیا ہے فرمایا: سفر میں مردوں اور عورتوں کے لیے قصر کرنا سنت ہے۔ ابو عمر نے کہا: تیرے لیے مذہب مالک میں یہی کافی ہے اور اس میں ان کا قول مختلف نہیں کہ جو سفر میں مکمل نماز پڑھ لے تو جب تک وقت موجود ہے اس نماز کا اعادہ کرلے۔ سمجھداروں کے نزدیک یہ استحباب ہے، ایجاب نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: خوف کے علاوہ بھی قصر کرنا سنت ہے۔ رہا سفر کے ساتھ خوف میں تو قرآن وسنت میں قصر کرنا ثابت ہے جس نے چار رکعتیں پڑھ لیں اس پر کچھ نہیں ہے میں کسی کے لیے پسند نہیں کرتا کہ وہ سنت کو چھوڑ کر سفر میں مکمل نماز پڑھے۔ ابو بکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا: آدمی سفر میں چار رکعتیں پڑھ سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، مجھے یہ پسند نہیں، سنت دو رکعتیں ہیں۔ موطا امام مالک میں ابن شہاب سے، انہوں نے آل خالد بن اسید کے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا: اے ابا عبدالرحمٰن! ہم صلاۃ خوف اور صلاۃ حضر کا ذکر تو قرآن میں پاتے ہیں لیکن سفر کی نماز کا ذکر نہیں پاتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: اے میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جبکہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے، ہم اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم نے آپ کو کرتے دیکھا(1)۔ حدیث پاک میں بغیر خوف کے سفر میں نماز قصر کرنے کا ذکر ہے یہ سنت ہے؟ فرض نہیں ہے، کیونکہ اس کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ قرآن میں مذکور قصر کا ذکر اس صورت میں ہے جب وہ سفر میں ہو، خوف میں ہو دونوں صورتیں جمع ہوں۔ کتاب اللہ میں صرف ان دو شرطوں کے ساتھ قصر مباح ہے اور اس کی مثل قرآن میں ہے وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الآیۃ یہ پہلے گزر چکی

1۔ صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 4، صفحہ 301

ہے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ۔ یعنی جب تمہیں اطمینان حاصل ہو تو نماز کو مکمل کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے چار رکعتوں والی نماز سے دو رکعتیں ادا فرمائیں مگر مغرب کی نماز مکمل پڑھتے تھے۔ تمام اسفار میں آپ قصر کرتے تھے جب کہ آپ امن میں ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی مسنون سنت ہے اور یہ اللہ کے احکام میں زیادتی ہے جس طرح کہ آپ نے تمام وہ چیزیں جن میں سنت قائم فرمائی اور انہیں بیان فرمایا جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول کما رئیناہ یفعل (ہم نے آپ کو جیسے کرتے دیکھا) اور اس کے ساتھ حضرت عمر کی حدیث جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بغیر خوف کے سفر میں قصر کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تلک صدقۃ تصدق اللہ علیکم فاقبلوا صدقتہ (1)۔ یہ صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے تم اس کو قبول کرو۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ایک چیز کو شرط کے ساتھ مباح فرماتا ہے پھر اسی چیز کو اپنے نبی ﷺ کی زبان پر بغیر شرط کے مباح فرماتا ہے۔ حضرت حنظلہ بن عمر سے سفر کی نماز کے بارے پوچھا تو فرمایا: دو رکعتیں ہیں۔ میں نے کہا: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا میں تو خوف کا ذکر ہے، جب کہ ہم تو امن میں ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ حضرت ابن عمر نے اس پر سنت کا اطلاق کیا اسی طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ ان دونوں حضرات کا مذہب، مسلک کیا ہے؟ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے اس حدیث کی اسناد ذکر نہیں کی، کیونکہ انہوں نے اس شخص کا نام ذکر نہیں کیا جس نے حضرت عبداللہ بن عمر سے سوال کیا تھا، سند میں ایک شخص کو ساقط کر دیا اور وہ شخص جس کا ذکر نہیں کیا وہ امیۃ بن عبداللہ بن خالد بن اسید بن ابی العیص بن امیۃ بن عبدالشمس بن عبدالمناف تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ مسافت کی حد میں اختلاف ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ داؤد نے کہا: ہر سفر میں نماز قصر کی جائے گی خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر ہو اگرچہ وہ تین میل ہو جہاں سے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انہوں نے دلیل مسلم کی حدیث سے پکڑی جو انہوں نے یحییٰ بن یزید الہنائی سے روایت کی ہے، فرمایا میں نے حضرت انس بن مالک سے نماز کی قصر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کے سفر پر نکلتے تو دو رکعتیں نماز ادا فرماتے (2)۔ تین میل اور فرسخ میں شعبہ کو شک ہے۔ اس میں حجت نہیں، کیونکہ اس میں شک ہے ایک تقدیر پر شاید مسافت کی حد ہو جس سے قصر کا آغاز ہو اور سفر اس سے زائد طویل ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا: ایک قوم نے دین کے ساتھ استہزا کیا، انہوں نے کہا: جو شخص اپنے شہر سے باہر نکلے وہ قصر کرے اور افطار کرے۔ اس کا قائل ایک عجمی ہے جو عربوں کے نزدیک سفر کی جو تعریف ہے اسے جانتا ہی نہیں یا دین کی تحقیر کرنے والا ہے۔ اگر علماء نے یہ ذکر نہ کیا ہوتا تو میں راضی نہ ہوتا کہ میں اسے ایک نظر کو دیکھوں اور میں اپنے دل کے فضول کے ساتھ اس میں غور ہی نہ کرتا (3)۔ اس سفر کی حد جس سے قصر واقع ہوئی ہے اس کا ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ سنت میں ہے۔ معاملہ اس

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، جلد 1، صفحہ 241 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 242

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 488

طرح ہے، کیونکہ یہ لفظ عربی ہے اس کا علم ان عربوں کے نزدیک ثابت ہے جن کو اللہ نے قرآن کے ساتھ مخاطب فرمایا اور ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ جو کسی کام کے لیے شہر سے نکلتا ہے تو وہ نہ لغۃً مسافر ہوتا ہے اور نہ شرعاً۔ اگر وہ تین دن سفر کرے تو وہ قطعاً مسافر ہوتا ہے جس طرح کہ ہم حکم لگاتے ہیں کہ جو ایک دن اور رات سفر کرے تو وہ بھی مسافر ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے والی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ ایک دن کی مسافت کا سفر کرے مگر اپنے محرم کے ساتھ'' (1)۔ یہ صحیح ہے یہ دونوں حالتوں کے درمیان متوسط حالت ہے، امام مالک کا اعتماد اسی پر ہے لیکن یہ حدیث متفق علیہ نہیں ''کبھی ایک دن اور رات'' کو روایت کیا اور کبھی ''تین دن'' (2) کو روایت کیا۔

پھر وہ حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف آئے اور ان کے فعل پر اعتماد کیا، وہ مدینہ طیبہ کی رئم وادی تک نماز قصر کرتے تھے یہ چار برد کے فاصلہ پر ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت شدت سے اقتدا کرنے والے تھے۔ دوسرے علماء نے کہا: اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ قصر تخفیف کے لیے مشروع کی گئی ہے، لمبے سفر میں ہی غالباً مشقت لاحق ہوتی ہے۔ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، لیث، اوزاعی، فقہاء اصحاب حدیث، امام احمد مکمل ایک دن کا اعتبار کرتے ہیں۔ امام مالک کا قول یوما ولیلۃ پورے ایک دن کی طرف راجع ہے، کیونکہ انہوں نے مسیرۃ یوم ولیلۃ پورا دن اور پوری رات چلنا مراد نہیں لیا، انہوں نے ایسا سفر مراد لیا ہے جس میں وہ اپنے اہل سے دور ہے اور ان کی طرف لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ بخاری میں ہے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما چار برد کی مسافت میں افطار کرتے تھے اور قصر کرتے تھے۔ چار برد سے مراد سولہ فرسخ ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور طبری نے کہا: یہ چھیالیس میل ہے (3)۔ امام مالک سے عتبیۃ میں اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو اپنی زمین کی طرف پینتالیس میل کے فاصلہ پر نکلا تو وہ قصر کرے۔ یہ متقارب امر ہے۔ امام مالک سے کتب منثورہ میں مروی ہے کہ وہ چھتیس میل کی مسافت میں قصر کرے۔ یہ ایک دن اور ایک رات کے قریب ہے۔ یحییٰ بن عمر نے کہا: ہمیشہ اعادہ کرے۔ ابن الحکم نے کہا: وقت میں اعادہ کرے (اگر نماز مکمل پڑھ لی ہے) کوفیوں نے کہا: تین دن کی مسافت سے کم میں قصر نہ کرے۔ یہ حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود اور حضرت حذیفہ کا قول ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت تین دن سفر نہ کرے مگر اپنے محرم کے ساتھ'' (4)۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: تین دن کی مسافت اونٹ کی چال کے ساتھ یا پیدل چلنے کے ساتھ (قصر کا باعث ہے)۔ حسن اور زہری نے کہا: دو دن کی مسافت میں نماز قصر کرے۔ یہ قول امام مالک سے مروی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عورت دو دن کی مسافت کا سفر نہ کرے مگر اپنے خاوند کے ساتھ یا ذی محرم کے ساتھ''۔ حضرت ابن عمر نے تیس میل کی مسافت میں قصر کی۔ حضرت انس نے پندرہ میل میں قصر کی۔ اوزاعی نے کہا: عام علماء قصر میں ایک مکمل دن کا اعتبار کرتے ہیں، ہم بھی اسی قول کو لیتے ہیں۔ ابو عمر نے کہا: اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 433
2۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 147۔ ایضاً، حدیث 1026، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 142
4۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 147

باب میں مرفوع آثار میں اضطراب ہے جیسا کہ تو نے ان کے الفاظ میں ملاحظہ کیا۔ میرے نزدیک اس کا محمل یہ ہے کہ یہ مختلف سائلین کے جواب میں وارد ہوئے۔ پس جس صحابی نے جو سنا اسے بیان کیا گویا کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا عورت ایک دن بغیر محرم کے سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، پھر کبھی پوچھا گیا: کیا عورت بغیر محرم کے دو دنوں کا سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ پھر کسی نے پوچھا: تین دن کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے کر سکتی ہے؟ فرمایا: نہیں، اسی طرح رات اور برید کا مطلب ہے جو روایت کیا گیا ہے۔ ہر ایک نے وہ ادا کیا جو اس نے سنا۔ واللہ اعلم۔ اسی باب میں آثار کے معانی کو جمع کیا جا سکتا ہے اگرچہ ان کا ظاہر مختلف ہے۔ عورت کو بغیر محرم کے ایسا سفر کرنا ممنوع ہے جس میں فتنہ کا خوف ہو خواہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ سفر کی نوعیت میں اختلاف ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا جہاد حج، عمرہ اور ان کے مشابہ سفر مثلاً صلہ رحمی، احیاء نفس وغیرہ کے سفر میں قصر کرنے پر اجماع ہے۔ اس کے علاوہ سفر میں قصر کرنے پر اختلاف ہے۔ جمہور علماء مباح سفر میں قصر کے جواز کے قائل ہیں جیسے تجارت وغیرہ۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: سوائے حج یا جہاد کے نماز قصر نہ کرے (1)۔ عطا نے کہا: قصر نہ کرے مگر سفر طاعت میں اور کسی خیر کے راستہ میں۔ عطا سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر سفر مباح میں قصر کرے جس طرح کہ جمہور کا قول ہے۔ علماء سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر سفر مباح میں قصر کرے جس طرح کہ جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا: اگر شکار کے لیے نکلا معاش کے لیے نہیں بلکہ تنزہ کے طور پر یا کسی شہر کی سیر کے لیے نکلا تو قصر نہ کرے۔ جمہور علماء نے کہا: معصیت کے سفر میں قصر نہیں جیسے باغی، ڈاکو وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ اور اوزاعی سے ہر سفر میں قصر کرنا مباح مروی ہے (2)۔ یہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ امام احمد سے مختلف قول مروی ہیں کبھی تو انہوں نے جمہور کے قول کے مطابق کہا اور کبھی فرمایا: صرف حج یا عمرہ کے سفر میں قصر کرے۔ صحیح وہ ہے جو جمہور نے کہا، کیونکہ قصر مسافر سے ان مشقات کی تخفیف کے لیے مشروع کی گئی ہے جو انسان کو سفر میں لاحق ہوتی ہیں اور ان امور پر معاونت کے لیے جو اسے درپیش ہوتے ہیں جو امور جائز ہوتے ہیں اور اس میں ہر سفر برابر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ یعنی جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو۔ پس یہ عام ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں سے بہتر وہ ہیں جو جب سفر کرتے ہیں تو قصر کرتے ہیں اور افطار کرتے ہیں''۔

امام شعبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصت پر عمل کیا جائے جس طرح وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے عزائم (فرائض وواجبات) پر عمل کیا جائے۔ رہا سفر معصیت سو اس میں قصر جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی معصیت پر مدد ہوگی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۖ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (المائدہ:2) نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو اور گناہ اور عدوان پر معاونت نہ کرو۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 103، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 4۔ علما کا اختلاف ہے کہ کب قصر کرے؟ جمہور کا نظریہ ہے کہ مسافر قصر نہ کرے حتیٰ کہ اپنے دیہات و شہر کے گھروں سے نکل جائے، اس وقت وہ سفر کرنے والا ہوگا، ''المدونہ'' میں امام مالک کا قول یہی ذکر ہے(1)۔ امام مالک نے قرب میں کوئی حد بیان نہیں فرمائی۔ امام مالک سے مروی ہے جب شہر کے لوگ اکٹھے رہتے ہوں تو وہ اپنے گھر والوں کو نماز قصر نہ پڑھائے حتیٰ کہ اپنے شہر سے تین میل تجاوز کر جائے یہی حکم لوٹنے کا بھی ہے۔ اگر اس کے اہل اکٹھے نہ رہتے ہوں تو وہ قصر کریں جب اس شہر کے باغوں سے تجاوز کر جائیں۔ حارث بن ابی ربیعہ سے مروی ہے کہ جب وہ سفر کا ارادہ کرتے تو اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کو دو رکعتیں پڑھاتے۔ ان میں اسود بن یزید اور دوسرے حضرت ابن مسعود کے شاگرد بھی تھے۔ عطا بن ابی رباح اور سلیمان بن موسیٰ کا بھی یہی قول ہے(2)۔

میں کہتا ہوں: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ کا معنی اس بناء پر یہ ہوگا کہ جب تم زمین میں سفر کرنے کا ارادہ کرلو۔ واللہ اعلم۔ مجاہد سے مروی ہے فرمایا: پہلے دن رات تک نماز قصر نہ کرے۔ یہ شاذ قول ہے(3)۔ حضرت انس بن مالک کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور عصر کی ذی الحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں (4)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ ذی الحلیفہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان چھ یا سات میل کا فاصلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ مسافر پر لازم ہے کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت قصر کی نیت کرے۔ اگر قصر کی نیت سے نماز شروع کی پھر نماز کے درمیان قیام کا ارادہ کرلیا تو اپنی نماز کو نفل بنادے۔ اگر ایک رکعت پڑھنے کے بعد نیت بدل گئی تو دوسری رکعت ساتھ ملالے اور سلام پھیر دے پھر مقیم والی نماز ادا کرے۔ ابہری اور ابن الجلاب نے کہا: یہ مستحب ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر اس نے اپنی نماز پر بناء کرلی اور نماز کو مکمل پڑھ لیا تو نماز جائز ہو جائے گی۔ ابو عمر نے کہا: میرے نزدیک اسی طرح ہے جس طرح ابہری اور ابن الجلاب نے کہا: کیونکہ یہ ظہر کی نماز ہے خواہ سفری ہو یا حضری ہو۔ اسی طرح پانچوں نمازوں کا حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء کا اس مدت میں اختلاف ہے جس کی مسافر نیت کرے تو نماز کو مکمل پڑھے گا۔ امام مالک، شافعی، لیث بن سعد، طبری اور ابو ثور نے کہا: جب چار دن اقامت کی نیت کرلے تو نماز مکمل کرے۔ اور سعید بن مسیب سے یہی مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: جب پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو نماز مکمل پڑھے۔ اگر اس سے کم دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو قصر کرے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے صحابہ میں سے کوئی ان کا مخالف نہیں۔ سعید سے یہ بھی مروی ہے امام احمد نے کہا: جب مسافر نے اکیس نمازیں ایک جگہ پڑھنی ہوں تو قصر کرے۔ اگر اس سے زائد بنتی ہوں تو مکمل کرے۔ داؤد کا بھی یہی قول ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام مالک نے کہا: کیونکہ ابن حضرمی کی حدیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کے لیے مکہ میں حج، عمرہ ادا کرنے کے بعد تین دن ٹھہرنا جائز قرار دیا ہے، پھر وہ واپس آجائے اس حدیث کو امام طحاوی اور ابن ماجہ وغیرہما نے روایت کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 103، دار الکتب العلمیہ بیروت	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 209۔ ایضاً، حدیث نمبر 1446، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چونکہ حج فتح مکہ سے پہلے فرض تھا اور مکہ میں ٹھہرنا جائز نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کے لیے تین دن متعین فرمائے تاکہ وہ اپنی حوائج کو پورا کرے اور سفر کے اسباب تیار کرلے۔ آپ نے ٹھہرنے کا حکم بیان نہیں کیا اور نہ اقامت کی جگہ کا حکم لگایا اس پر اس میں مسافر کا حکم باقی رکھا اور چوتھے دن ٹھہرنے سے منع فرمایا اور اس کے لیے ٹھہرنے والے پر مقیم کا حکم لگایا یہ ایک اصل ہے جس پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہود کو جلا وطن کیا تھا ان کے لیے تین دن متعین فرمائے تاکہ اپنے امور سمیٹ لیں۔ ابن عربی نے کہا: میں نے بعض مالکی علماء کو سنا کہ تین دن اقامت کے حکم سے خارج ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن پر عذاب نازل کرنا تھا اور جن کا دنیا سے خروج یقینی تھا ان میں تین دن تاخیر فرمائی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ (ہود)

اس مسئلہ میں اور بھی کئی اقوال ہیں وہ یہ کہ مسافر ہمیشہ قصر کرتا رہے حتیٰ کہ اپنے وطن واپس آجائے اور اپنے شہر میں اتر جائے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ وہ دو سال نیشاپور میں ٹھہرے رہے اور نماز قصر کرتے رہے۔ یہ ابو مجلز نے کہا میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں مدینہ طیبہ آتا ہوں اور وہاں سات آٹھ مہینے اپنی حاجت طلب کرنے کے لیے قیام کرتا ہوں (میں نماز میں کیا کروں) حضرت ابن عمر نے فرمایا: دو رکعت نماز پڑھ۔ ابو اسحاق سبیعی نے کہا: ہم بجستان میں ٹھہرے ہمارے ساتھ حضرت ابن مسعود کے شاگرد بھی تھے ہم دو سال ٹھہرے رہے اور ہم دو رکعتیں پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عمر آذر بائیجان میں قیام کے وقت دو دو رکعتیں پڑھتے رہے، برف ان کی واپسی میں حائل ہوگئی تھی۔ ابو عمر نے کہا: ہمارے نزدیک ان احادیث کا محل یہ ہے کہ اس مدت میں ان مقیم لوگوں میں سے کسی کی قیام کی نیت نہیں تھی۔ وہ اس طرح کہتے تھے: آج چلا جاؤں گا، کل چلا جاؤں گا جب مسئلہ اس طرح ہو تو وہاں اقامت کی پختہ نیت نہیں ہوگی۔

مسئلہ نمبر 7۔ مسلم نے، عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نماز کو دو رکعت فرض کیا جب اس کو فرض کیا پھر حضر میں اسے مکمل فرمایا اور سفر کی نماز پہلے فریضہ پر قائم رکھی تھی (1)۔ زہری نے کہا: میں نے عروہ سے کہا: حضرت عائشہ سفر میں نماز مکمل کیوں پڑھتی تھیں؟ انہوں نے کہا: وہ وہی تاویل کرتی تھیں جو حضرت عثمان کرتے تھے۔ اور یہ جواب مکمل نہیں۔ حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کی نماز مکمل پڑھنے کی تاویل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان منیٰ میں چار رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ آپ نے حج کے بعد اقامت کی نیت کرلی تھی اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت عثمان نے چار رکعت نماز پڑھی، کیونکہ آپ نے اس جگہ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔

یونس نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے طائف میں مال لیا تھا اور وہاں قیام کا ارادہ کیا تھا اس لیے چار رکعت پڑھتے تھے پھر ان کے بعد ائمہ نے اس عمل کو اپنایا۔ ایوب نے زہری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے بدوؤں کی وجہ سے نماز کو مکمل فرمایا، کیونکہ اس سال ان کی کثرت تھی تو آپ نے چار رکعتیں پڑھائیں تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ نماز کی چار رکعتیں ہیں۔ ابو داؤد نے اپنی مصنف میں "کتاب المناسک" میں باب الصلوٰۃ بمنیٰ میں یہ تمام اقوال ذکر کیے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، جلد 1، صفحہ 241

ابو عمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیے ہیں۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عثمان نے منیٰ میں چار رکعتیں مکمل پڑھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اعرابی نے مسجد الخیف میں بلند آواز سے کہا: امیر المومنین! میں نے پہلے سال سے جب آپ کو دو رکعتیں پڑھتے دیکھا تو میں اس وقت سے دو رکعت نماز پڑھتا ہوں۔ حضرت عثمان کو اندیشہ ہوا کہ جاہل نماز کو دو رکعت گمان کریں گے۔ ابن جریج نے کہا: حضرت عثمان نے صرف منیٰ میں چار رکعتیں پڑھی تھیں۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عائشہ کے مکمل نماز پڑھنے کی تاویلات کے بارے کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو ان سے روایت کی گئی ہو۔ یہ سب ظنون اور تاویلات ہیں جن کے ساتھ کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور سب سے کمزور ترین بات یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تمام لوگ آپ کے بیٹے تھے اور ان کے مکانات آپ کے مکانات تھے۔ (یہ اس لیے درست نہیں) حضرت عائشہ مومنین کی ماں اس لیے بنی تھی کہ وہ نبی کریم کی زوجہ تھیں جو مومنین کے باپ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام سفروں میں، حج اور عمرہ میں اور غزوات میں قصر کی سنت قائم فرمائی۔

حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں اور ان کے مصحف میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وهواب لهم ہے۔ مجاہد نے هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (ہود: 78) کے تحت فرمایا: وہ آپ کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ وہ آپ کی امت کی بیٹیاں تھیں۔ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کو بیان فرمانے والے تھے۔ حضرت عائشہ ایسی نہیں تھیں پس ان دونوں کا حکم جدا ہوا۔ اور اس سے بھی کمزور ترین قول یہ ہے کہ جہاں آپ نے نماز مکمل کی تھی وہاں آپ کا سفر جائز نہ تھا۔ یہ قطعاً باطل ہے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بہت زیادہ خوف رکھتی تھیں اور بہت زیادہ پرہیز کرنے والی تھی ایسے سفر سے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھا۔ یہ تاویل شیعہ بدعتی گروہ کے جھوٹوں میں سے ہے اور ان کی تشنیعات میں سے ہے۔ سبحانك هذا بهتان عظیم۔

آپ اجتہاد کرتے ہوئے اور ثواب کی امید سے نکلی تھیں آپ فتنہ کی آگ کو بجھانا چاہتی تھیں، کیونکہ آپ زیادہ حق دار تھیں کہ آپ کا حیا کیا جائے اور امور ضبط کے ساتھ انجام پذیر ہوں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

بعض لوگوں نے کہا: آپ نے نماز مکمل کی، کیونکہ آپ صرف حج، عمرہ اور جنگ میں قصر کا نظریہ رکھتی تھیں۔ یہ بھی باطل ہے کیونکہ حضرت عائشہ سے یہ منقول نہیں ہے اور نہ آپ کے مسلک سے یہ جانا گیا ہے۔ پھر آپ نے اپنے سفر میں نماز کو مکمل فرمایا جب آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف چلی تھیں۔ سب سے بہتر قول جو آپ کی نماز کی تکمیل میں کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی رخصت کو لیا تا کہ لوگوں کو دکھائیں کہ نماز کو مکمل پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ قصر افضل ہے۔ عطا نے کہا: قصر سنت اور رخصت ہے۔ وہ حضرت عائشہ سے روایت کرنے والے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزہ بھی رکھا اور افطار بھی کیا، نماز مکمل بھی کی اور قصر بھی کی۔ اس حدیث کو حضرت طلحہ بن عمر نے روایت کیا اور ان سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کرتے تھے روزہ بھی رکھتے تھے اور افطار بھی کرتے تھے، نماز میں قصر بھی کرتے تھے اور مکمل بھی پڑھتے تھے۔ نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمرہ

کیا، حتی کہ جب مکہ پہنچیں تو عرض کی: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے نماز قصر کی اور میں نے مکمل کی، آپ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! تو نے اچھا کیا'' (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر کوئی اعتراض نہ کیا، اسی طرح قصرت، تا مفتوحہ کے ساتھ اور أتممت تا مضمومہ کے ساتھ مقید ہے۔

اسی طرح افطرت اور صمت میں ہے۔ دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر کرتے تھے اور نماز مکمل بھی پڑھتے تھے، افطار بھی کرتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ اس کی سند صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ اَنۡ محل نصب میں ہے یعنی بان تقصروا۔ ابو عبید نے کہا: اس میں تین لغات ہیں قَصَرتُ الصلوٰة، قصرتها و أقصرتها۔ علماء کا اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتیں قصر ہوں گی خوف میں اور اس کے علاوہ سفر میں بھی۔ کیونکہ حدیث حضرت یعلی بن امیہ سے یہی ثابت ہوتا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسرے علماء فرماتے ہیں: دو رکعتوں والی نماز میں ایک رکعت قصر ہوگی اور سفر میں دو رکعتیں مکمل نماز ہے جیسا کہ حضرت عمر نے کہا تھا۔ یہ تمام ہے قصر نہیں ہے اور اس کا قصر ایک رکعت ہوتا ہے۔ سدی نے کہا: جب تو سفر میں دو رکعت پڑھے تو وہ مکمل ہے اور قصر جائز نہیں مگر جب کہ تجھے خوف ہو۔ یہ آیت مباح کرنے والی ہے کہ ہر طائفہ ایک رکعت پڑھے اور اس پر زائد کچھ نہ پڑھے۔ اور امام کے لیے دو رکعتیں ہو جائیں گی (2)۔ حضرت ابن عمر اور حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت کعب سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت حذیفہ نے طبرستان میں ایسا ہی کیا تھا جب کہ امیر حضرت سعید بن العاص سے اس کے متعلق ان سے پوچھا تھا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذی قرد میں اسی طرح ہر طائفہ کو ایک رکعت پڑھائی تھی اور انہوں نے مکمل نہیں کی تھی (3)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محارب خصفہ اور بنی ثعلبہ سے جنگ کے دن اپنے اصحاب کو اسی طرح نماز پڑھائی تھی (4)۔ حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضجنان اور عسفان کے درمیان اسی طرح نماز پڑھائی تھی۔

میں کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے (5)۔ یہ قول اس کی تائید کرتا ہے۔ مگر قاضی ابو بکر بن عربی نے اپنی کتاب القبس میں ذکر کیا ہے کہ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث بالا جماع متروک ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عربی وغیرہ نے اختلاف اور نزاع کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے درست نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

ابو بکر رازی حنفی نے ''احکام القرآن'' میں حکایت کیا ہے کہ یہاں قصر سے مراد رکوع و سجود کو اشارہ کے ساتھ ادا کرنا ہے

1۔ تفسیر الکشاف، جلد 1، صفحہ 558
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 592
4۔ ایضاً
5۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 241

یعنی صفت نماز میں قصر ہے۔ اور قیام کو رکوع کے ساتھ ترک کرنا مراد ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ آیت کریمہ جنگ میں مشغول ہونے اور تلواروں کے چلنے کے وقت نماز کی حدود اور ہیئت میں قصر کو مباح کرتی ہے۔ اس حالت میں سر کے اشارہ کے ساتھ نماز پڑھنے کو مباح کیا گیا ہے اور جس طرف بھی منہ ہو ایک رکعت کو ایک تکبیر کی طرف کرنے کو مباح کیا گیا ہے (1) جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے کہا: اس کی تائید یہ ارشاد کرتا ہے: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ یعنی جب اطمینان ہو تو نماز کو اس کی حدود اور کامل ہیئت کے ساتھ ادا کرو۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام احوال قریب المعنی ہیں۔ یہ اس پر مبنی ہیں کہ مسافر کا فرض قصر ہے اور اس کے حق میں نماز صرف دو رکعتیں ہی نازل ہوئی ہیں پس قصر نہیں ہے نہ عزیمت میں کہا جائے گا کہ کوئی گناہ نہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: اس نے قصر کی جس پر مشروع ہی دو رکعتیں تھیں جس طرح صبح کی نماز میں اس طرح نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے قصر کا دو شرطوں کے ساتھ ذکر کیا اور جس میں یہ دونوں شرطیں معتبر ہیں وہ صلاۃ خوف ہے۔ اس کو ابوبکر رازی نے ''احکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے اور اس پر حدیث حضرت یعلی بن امیہ سے رد کیا گیا ہے۔ ابھی ان شاء اللہ قریب ہی وہ آ جائے گی۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ خِفْتُمْ یہ غالب اعتبار سے کلام ذکر کی گئی ہے، کیونکہ مسلمان پر سفروں میں عام طور پر خوف ہوتا ہے، اسی وجہ سے یعلی بن امیہ نے کہا: میں نے حضرت عمر کو کہا: ہم قصر کیوں کریں جب کہ ہم امن میں ہیں؟ حضرت عمر نے کہا: مجھے بھی اسی طرح تعجب ہوا تھا جس طرح تجھے ہوا ہے میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صدقہ ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر صدقہ کیا ہے پس تم اس کا صدقہ قبول کرو'' (2)۔

میں کہتا ہوں: اصحاب شافعی نے احناف کے خلاف حضرت یعلی بن امیہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، انہوں نے کہا: حضرت یعلی کا قول کہ ہم قصر کیوں کریں جب کہ ہم امن میں ہیں؟ یہ قطعی دلیل ہے کہ آیت کا مفہوم رکعات میں قصر ہے۔ الکیا طبری نے کہا: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اس پر کوئی ایسی تاویل پیش نہیں کی جو قابل ذکر ہو۔ پھر صلاۃ خوف میں دو شرطوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا، کیونکہ اگر ہم سفر نہ کریں اور سفر نہ پایا جائے، بلکہ ہمارے اوپر کفار حملہ آور ہو جائیں اور ہمارے شہروں میں آ کر لڑیں تو صلاۃ خوف جائز ہوگی اس میں دونوں شرطوں کا وجود معتبر نہیں جس طرح کہ انہوں نے کہا ہے۔ حضرت ابی کی قرأت میں ان تقصروا من الصلوة ان یفتنکم الذین کفروا ہے یعنی ان کی قرأت (3) میں اِنْ خِفْتُمْ کے الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی قرأت پر معنی یہ ہوگا ناپسند ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں اور حضرت عثمان کے مصحف میں اِنْ خِفْتُمْ کے الفاظ موجود ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ آیت سفر میں قصر کو مباح کرنے والی ہے ایسے شخص کے لیے جسے دشمن کا خوف ہو اور جو امن میں ہو اس کے لیے قصر نہیں۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ وہ سفر میں فرماتی تھیں ''اپنی نماز کو مکمل کرو''۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ تو قصر کرتے تھے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: آپ ﷺ جنگ اور خوف میں ہوتے تھے، کیا تم خوف میں ہو (4)؟ عطا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104　2۔ صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین و قصرھا، جلد 1، صفحہ 360
3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104　4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 287

نے کہا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے مکمل نماز پڑھنے والے حضرات یہ تھے (1) حضرت عائشہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عثمان نے بھی مکمل پڑھی تھی لیکن اس کی مخصوص وجوہ تھیں جو پہلے گزر چکی ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قصر کو مباح نہیں فرمایا مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ (۱) سفر (۲) خوف۔ اور خوف نہ ہونے کی صورت میں قصر سنت سے ثابت ہے۔ ان علماء میں سے امام شافعی ہیں ان کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِنْ خِفْتُمْ ماقبل کلام سے متصل نہیں۔ کلام مِنَ الصَّلٰوةِ پر مکمل ہو چکی ہے پھر اِنْ خِفْتُمْ سے کلام کا آغاز ہو رہا ہے۔ پس اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو نماز خوف پڑھاؤ اور اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا۝ کا قول جملہ معترضہ ہے۔ یہ جرجانی کا قول ہے۔ اور مہدوی وغیرہم نے یہی ذکر کیا ہے۔ قشیری اور قاضی ابوبکر بن عربی نے اس قول کا رد کیا ہے۔ قشیری ابو نصر نے کہا: اس حمل میں شدید تکلف ہے اور خواہ مخواہ کلام میں اطناب کیا ہے، انہوں نے جرجانی پر تنقید کی ہے کلام کو مقدر کرنے اور امثلہ بیان کرنے میں۔ ابن عربی نے کہا: ان تمام تاویلات کے حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور حضرت یعلی بن امیہ محتاج نہیں ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ جرجانی نے کہا ہے اس کے مطابق ایک حدیث آئی ہے جسے قاضی ابو الولید بن رشد نے مقدمات میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ایک تاجر گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے پوچھا: ہم زمین میں سفر کرتے ہیں تو ہم نماز کیسے پڑھیں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ پھر کلام ختم ہوئی۔ اس کے بعد جب ایک سال گزر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے جہاد کیا آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی تو مشرکین نے کہا: محمد اور آپ کے اصحاب نے تمہیں پیچھے سے حملہ کرنے کا موقع دیا ہے تم ان پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: ان کے پیچھے دوسرے لوگ موجود ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ نے دو نمازوں کے درمیان یہ ارشاد: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا نازل فرمایا (2)۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس میں بغیر خوف کے قصر پر قرآن سے دلیل موجود ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ سفر میں نماز کے بارے میں نازل ہوا پھر اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ایک سال بعد نماز خوف کے بارے نازل ہوا، اس بنا پر آیت اپنے ضمن میں دو قصے اور دو حکم رکھتی ہے۔ پس اِذَا ضَرَبْتُمْ سفر کے متعلق ہے یہاں پر کلام مکمل ہے پھر ایک دوسرے فریضہ کی ابتدا ہوئی اور شرط کو مقدم کیا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا واذا کنت فیهم فاقمت لهم الصلوٰة اور واؤ زائدہ ہے اور جواب فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ ہے اور اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا جملہ معترضہ ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ خوف کا ذکر سنت سے منسوخ ہے وہ حضرت عمر کی حدیث ہے جو اس کی ناسخ ہے، کیونکہ انہوں نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 104 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 288

انہیں فرمایا: ''یہ صدقہ ہے اس کے ساتھ تم پر اللہ تعالیٰ نے صدقہ کیا ہے تم اس کا صدقہ قبول کرو''۔

نحاس نے کہا: جس نے بغیر خوف کے نبی کریم ﷺ کا قصر کرنا تسلیم کیا اور آپ ﷺ کے فعل کو آیت کا ناسخ بنایا یہ غلط ہے، کیونکہ آیت میں امن کی حالت میں قصر سے منع نہیں ہے اس میں خوف کی حالت میں قصر کی اباحت ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ فراء نے کہا: اہل حجاز کہتے ہیں فتنت الرجل اور ربیعہ، قیس، اسد اور تمام نجدی کہتے ہیں افتنت الرجل۔ خلیل اور سیبویہ نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: فتنتہ کا مطلب ہے میں نے اس میں فتنہ ڈالا جیسے اکحلتہ ہے اور افتنتہ کا مطلب ہے میں نے اسے فتنہ والا بنایا۔ اصمعی نے کہا: وہ افتنتہ نہیں جانتے۔ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا یہاں عدو بمعنی اعداء ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً۝ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ۝ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا۝۱۰۲

''اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز تو چاہیے کہ کھڑا ہو ایک گروہ ان سے آپ کے ساتھ اور وہ پکڑ رکھیں اپنے ہتھیار پس جب سجدہ کر چکیں تو وہ ہو جائیں تمہارے پیچھے اور آ جائے دوسرا گروہ جس نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی پس (اب) وہ نماز پڑھیں آپ کے ساتھ اور لیے رہیں اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار، تمنا کرتے ہیں کافر اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے اسلحہ سے اور اپنے ساز و سامان سے تو وہ ٹوٹ پڑیں تم پر یک بارگی اور نہیں کوئی حرج تم پر اگر ہو تمہیں تکلیف بارش کی وجہ سے یا ہو تم بیمار تو اتار دو اپنے ہتھیار مگر (دشمن کی نقل و حرکت سے) ہوشیار رہو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ دار قطنی نے ابو عیاش زرقی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عسفان میں تھے، مشرکین سے ہمارا مقابلہ ہوا ان کے جرنیل خالد بن ولید تھے اور ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی مشرکین نے کہا: مسلمان اس حالت پر ہیں کہ ہم ان پر حملہ کریں۔ فرمایا: پھر کہا: ابھی مسلمانوں پر ایسی نماز کا وقت ہونے والا ہے جو انہیں اپنے بیٹوں اور

اپنے نفسوں سے زیادہ عزیز ہے۔ فرمایا: جبریل امین ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیت کریمہ لے کر آئے (1): وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ آگے حدیث پوری ذکر کی۔ مکمل حدیث ان شاءاللہ آگے آئے گی۔

یہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اسلام کا سبب تھا یہ آیت سابقہ جہاد کے ذکر سے متصل ہے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نماز سفر اور جہاد اور دشمن کے قتال کے عذر سے بھی ساقط نہیں ہوتی لیکن اس میں رخصت ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ اور اس سورت میں علماء کے اختلاف کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور قیامت تک بعد کے امراء کو شامل ہے اس کی مثل یہ ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ: 103) (ان کے اموال سے صدقہ لو) یہ تمام علماء کا قول ہے۔ امام ابو یوسف اور اسماعیل بن علیہ نے شاذ قول کیا ہے یہ دونوں حضرات کہتے ہیں: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صلاۃ خوف نہیں پڑھیں گے (2)، کیونکہ خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے کیونکہ فرمایا: وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ جب آپ ان میں نہ ہوں گے تو نماز خوف بھی ان کے لیے نہ ہوگی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ تمام لوگ پسند کرتے تھے کہ آپ کی اقتدا کریں اور آپ کے پیچھے نماز پڑھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کے لیے فضیلت میں اس مقام پر فائز ہونا ممکن نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد لوگوں کے احوال برابر اور متقارب ہیں، اسی وجہ سے امام ایک فریق کو نماز پڑھائے گا اور دوسرے فریق کے لیے کسی دوسرے کو نماز پڑھانے کا حکم دے گا۔ رہا یہ کہ تمام ایک امام کے پیچھے نمازیں پڑھیں یہ نہیں ہوگا۔

جمہور علماء نے کہا: ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیں دوسری آیت اور حدیث میں آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ (النور: 63) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صلوا کما رأیتمونی أصلی (3) تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع مطلقاً لازم ہے حتیٰ کہ خصوص پر کوئی واضح دلیل دلالت کرے اگر معاملہ اس طرح ہوتا جو انہوں نے خصوص کی دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے تو پھر خطابات کا ان کے ساتھ خاص ہونا لازم ہوتا جن کی طرف خطابات متوجہ تھے، اس وقت شریعت کا ان کے ساتھ منحصر ہونا لازم ہوگا جن سے خطاب کیا گیا۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نماز میں خصوص کے توہم کو ترک کیا اور انہوں نے غیر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی اس کو جائز قرار دیا جب کہ صحابہ کرام حرام اور حلال کو زیادہ جاننے والے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (الانعام: 68) اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جو پڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے اعراض کر لے حتیٰ کہ وہ کسی دوسری بات میں پڑیں۔

یہ خطاب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور آپ کی امت بھی اس میں داخل ہے، اس کی بہت سی مثالیں ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ: 103) یہ تمام ان احکام کو آپ کے ساتھ خاص کرنے کا موجب نہیں بلکہ بعد والے

1۔ المستدرک للحاکم، صلوٰۃ الخوف، جلد 1، صفحہ 486، حدیث نمبر 1252

2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 110

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 888

بھی آپ کے قائم مقام ہیں۔ اسی طرح وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ میں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا حضرت ابوبکر صدیق صحابہ کی جماعت میں تھے انہوں نے جنگ کی ان لوگوں سے جنہوں نے زکوٰۃ میں تاویل کی جس طرح صلاۃ خوف میں تم نے تاویل کی۔ ابوعمر نے کہا: زکوٰۃ لینے میں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد والے خلفاء برابر تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے والے اور دوسروں کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی نماز میں مشابہت نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ لینے کا فائدہ مساکین کو فائدہ پہنچانا ہے اس میں عطا کرنے والے کو اس طرح فضیلت نہیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے والے کو فضیلت ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ یعنی ایک گروہ آپ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو۔ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ یعنی جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دشمن کے مقابلہ میں ہیں وہ ہتھیار اٹھائیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر طائفہ کے لیے صرف ایک رکعت کا ذکر کیا ہے لیکن احادیث میں ہے کہ انہوں نے اس کے ساتھ دوسری رکعت ملائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔ فَلْتَقُمْ اور فَلْيَكُوْنُوْا کے قول سے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اخفش، فراء اور کسائی نے حکایت کیا ہے کہ لام امر، لام مجوذ کو فتحہ دیا جاتا ہے۔ سیبویہ علت موجبہ کی وجہ سے اس سے منع کرتے ہیں اور وہ علت لام جر اور لام تاکید کے درمیان فرق ہے اس امر سے مراد تقسیم ہونا ہے یعنی تمام کا دشمن کے سامنے ہونا ہے کہ ان کے حملہ سے بچا جائے۔

نماز خوف کی ہیئت میں روایات مختلف ہیں۔ روایات کے اختلاف کی وجہ سے علماء کے مذاہب میں بھی اختلاف ہے۔ ابن القصاء نے ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ مقامات پر صلاۃ خوف پڑھی۔ ابن عربی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوبیس مرتبہ صلاۃ خوف پڑھی (1)۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: جو اہل حدیث کے امام ہیں اور حدیث میں نقل کی علل کی معرفت میں متقدم ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ صلاۃ خوف میں کوئی حدیث مروی ہے مگر وہ حدیث ثابت ہے۔ یہ تمام احادیث صحیح ثابت ہیں جس حدیث کی بنا پر کوئی صلاۃ خوف پڑھے گا اس کے لیے جائز ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اسی طرح ابو جعفر طبری نے کہا: امام مالک اور ان کے تمام اصحاب، سوائے اشہب، کا نظریہ صلاۃ خوف میں سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کے مطابق ہے۔ وہ حدیث امام مالک نے موطا میں یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے قاسم بن محمد سے، انہوں نے صالح بن خوات انصاری سے روایت کی ہے کہ سہل بن ابی حثمہ نے انہیں بیان کیا کہ صلاۃ خوف میں امام کھڑا ہو اور اس کے ساتھ اس کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کھڑا ہو اور ایک گروہ دشمن کے سامنے ہو۔ امام اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائے اور سجدہ کرائے جو اس کے ساتھ ہیں پھر امام کھڑا ہو جب امام سیدھا کھڑا ہو جائے تو ٹھہر جائے اور باقی رکعت مقتدی خود مکمل کریں پھر وہ سلام پھیر دیں پھر وہ چلے جائیں اور امام کھڑا رہے، اب یہ گروہ جو نماز پڑھ چکا ہے دشمن کے سامنے چلا جائے پھر وہ آ جائیں جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ امام کے پیچھے تکبیر کہیں، امام انہیں ایک رکعت پڑھائے، سجدہ کرے پھر سلام پھیر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 491

دے، وہ کھڑے ہو جائیں اور دوسری رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں۔

ابن القاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں انہوں نے کہا: امام مالک کے نزدیک عمل قاسم بن محمد عن صالح بن خوات کی حدیث کے مطابق ہے۔ ابن القاسم نے کہا: وہ یزید بن رومان کی حدیث پر عمل کرتے تھے پھر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ ابو عمر نے کہا: قاسم کی حدیث اور یزید بن رومان کی حدیث دونوں صالح بن خوات سے مروی ہیں مگر ان کے درمیان سلام میں فرق ہے۔ قاسم کی حدیث میں ہے کہ امام دوسرے طائفہ کو سلام پھیرائے پھر وہ کھڑے ہوں اور خود اپنی رکعت کو قضا کریں اور یزید بن رومان کی حدیث میں ہے کہ وہ انتظار کرے اور انہیں سلام پھیرائے۔

امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا رجحان ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یزید بن رومان کی حدیث صالح بن خوات سے جو مروی ہے وہ صلاۃ خوف میں مروی احادیث میں سے کتاب اللہ کے ظاہر کے زیادہ مشابہ ہے اور میں بھی کہتا ہوں: امام مالک نے قاسم کی حدیث کو اختیار کرنے کی حجت تمام نمازوں پر قیاس کو بنایا ہے، کیونکہ تمام نمازوں میں امام کسی کا انتظار نہیں کرتا جو پہلے گزر چکا ہوتا ہے۔ اور سنت جس پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ مقتدی امام کے سلام کے بعد اپنی بقیہ نماز کی قضا کریں گے۔ ابو ثور کا قول اس مسئلہ میں امام مالک کے قول کی طرح ہے اور امام احمد نے امام شافعی کے قول کی طرح کہا جو ان کا مختار قول ہے وہ کسی پر عیب نہیں لگاتے تھے جو صلاۃ خوف کے متعلق کسی بھی طریقہ پر عمل کر لیتا تھا۔ اصحاب مالک میں سے اشہب کا اختیار حضرت ابن عمر کی حدیث ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور دوسرا طائفہ دشمن کے سامنے تھا پھر وہ واپس آئے وہ اپنے ساتھیوں کی جگہ دشمن کے سامنے آئے اور وہ لوگ آئے جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھائی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر دیا پھر ہر ایک گروہ نے اپنی اپنی رکعت خود ادا کی (1)۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جب خوف اس سے زیادہ ہو تو سوار ہو کر یا کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھیں۔ یہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک وغیرہم نے تخریج کیا ہے۔ اس طریقہ کو اوزاعی نے اختیار کیا۔ اس کو ابو عمر بن عبد البر نے پسند کیا ہے فرمایا: یہ سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور یہ اہل مدینہ کے نقل کے ساتھ وارد ہے اور ان کے مخالف پر حجت قائم ہے، کیونکہ اصول کے زیادہ مشابہ ہے، کیونکہ پہلا اور دوسرا گروہ انہوں نے اپنی رکعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد قضا کیا اور متفق علیہ سنت سے معروف ہے بقیہ تمام نمازوں میں۔ رہے کوئی علماء، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب سوائے امام ابو یوسف کے، ان کا نظریہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث کے مطابق ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز خوف پڑھائی صحابہ کرام نے دو صفیں بنائیں ایک صف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھی اور دوسری دشمن کے سامنے تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور پھر دوسرا گروہ آیا وہ پہلے ساتھیوں کی جگہ کھڑے ہوئے اور پہلا گروہ دشمن کے سامنے چلا گیا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت پڑھائی پھر سلام پھیر دیا پھر یہ لوگ کھڑے ہوئے اور ایک رکعت خود پڑھی پھر سلام پھیر دیا وہ چلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 592

گئے اور ان ساتھیوں کی جگہ کھڑے ہوئے جو دشمن کے سامنے تھے وہ پہلا گروہ ان کی جگہ آیا اور اپنی ایک رکعت پڑھی اور سلام پھیر دیا (1)۔ یہ طریقہ اور پہلا طریقہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے مگر ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ان کی قضا ایک حالت میں ظاہر ہوتی ہے اور امام اکیلا نگران کی طرح باقی رہتا ہے اور یہاں ان کی قضا ان کی نماز کی صفت پر متفرق ہے۔ بعض علماء نے حضرت ابن عمر کی حدیث کی حضرت ابن مسعود کی حدیث میں مروی طریقہ پر تاویل کی ہے حضرت ابن مسعود کی حدیث پر ثوری، اشہب بن عبدالعزیز کا مسلک قائم ہے جیسا کہ ابوالحسن لخمی نے ان سے روایت کیا ہے اور پہلا قول ابو عمر، ابن یونس اور ابن حبیب نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت حذیفہ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طائفہ کو ایک رکعت پڑھائی اور انہوں نے قضا نہیں کی (2)۔ یہ حضرت ابن عباس کی حدیث کا مقتضیٰ ہے کہ صلاۃ خوف میں ایک رکعت ہے یہ اسحاق کا قول ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے، نماز اس کے مطابق اولیٰ ہے جس میں احتیاط ہو اور حضرت ابن عباس کی حدیث سے حجت قائم نہیں ہوتی اور حدیث حذیفہ وغیرہ کی حدیث میں لم یقضوا اس پر محمول ہوگی کہ جن لوگوں نے روایت کیا ان کے علم میں ہے کہ انہوں نے بقیہ رکعت ادا نہیں کی، کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس نماز میں ایک رکعت بعد میں ادا کی اور جنہوں نے زیادتی کی شہادت دی وہ اولیٰ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ لم یقضوا سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے قضا نہ کی جب وہ امن میں ہوئے۔

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ خوف زدہ کو جب امن ہو جائے تو خوف کی نمازیں جو وہ پہلے ادا کر چکا ہے ان کی قضا نہیں کرے گا۔ یہ تمام اقوال ابو عمر نے ذکر کیے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر وہ پیچھے چلے گئے اور پھر دوسرے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار رکعتیں تھیں اور مقتدیوں کے لیے دو دو رکعتیں تھیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارقطنی نے حسن عن ابی بکرہ کی حدیث سے تخریج کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرا (3)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حسن عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا پھر دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا۔

ابوداؤد نے کہا: حضرت حسن اس کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ امام شافعی سے بھی یہ مروی ہے۔ اس سے ان علماء نے حجت پکڑی ہے جو نماز میں امام اور مقتدی کی نیت کے اختلاف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ امام شافعی، اوزاعی، ابن عطیہ، امام احمد بن حنبل اور داؤد کا مذہب ہے۔ انہوں نے حضرت جابر کی حدیث سے تائید حاصل کی ہے کہ حضرت معاذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم کے پاس آتے تھے اور اپنی قوم کی امامت کراتے تھے۔ (الحدیث) امام طحاوی نے فرمایا: یہ ابتداء اسلام میں تھا، کیونکہ ابتدائے اسلام میں ایک فریضہ دو مرتبہ ادا کرنا جائز تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ یہ صلاۃ خوف کے بارے علماء کے اقوال ہیں۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 176 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 177 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 3۔ یہ نماز ہے جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اس کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مسلمانوں کی قبلہ کی طرف پیٹھ ہو اور دشمن کا قبلہ کی طرف منہ ہو۔ ذات الرقاع میں ایسا اتفاق ہوا تھا۔ عسفان اور دوسری جگہوں پر مسلمانوں کا رخ قبلہ کی جانب تھا اور جو ہم نے خالد بن ولید کے قصہ میں نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ قوم کو دو حصوں میں تفریق کرنے کے مناسب نہیں، کیونکہ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ کے قول کے بعد حدیث میں فرمایا: نماز کا وقت ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے دو صفیں بنائیں، پھر آپ نے رکوع کیا تو ہم تمام نے رکوع کیا۔ فرمایا: پھر آپ نے سر اٹھایا تو ہم نے بھی سر اٹھایا۔ فرمایا: پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صفت کے ساتھ سجدہ کیا جو آپ سے متصل تھی اور دوسرے لوگ ان کی حفاظت کرتے ہوئے کھڑے رہے، جب انہوں نے سجدہ کیا اور کھڑے ہوئے تو دوسرے بیٹھے اور اپنی جگہ سجدہ کیا۔ فرمایا: پھر یہ ایک دوسرے کی جگہ چلے گئے۔ فرمایا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری رکعت کا رکوع کیا اور سب لوگوں نے رکوع کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا تو سب لوگوں نے سر اٹھایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور اس صف نے سجدہ کیا جو آپ کے ساتھ متصل تھی اور دوسرے نگرانی کرتے ہوئے کھڑے رہے، پھر وہ بیٹھے سجدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سلام کیا(1)۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ صلاۃ خوف پڑھی ایک مرتبہ عسفان میں اور ایک مرتبہ بنی سلیم کی زمین میں اس کو ابوداؤد نے ابوعیاش زرقی کی حدیث سے تخریج کیا ہے۔ یہ ثوری کا قول ہے اور زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔ ابوعیسیٰ نے ترمذی میں یہ طریقہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے اس حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا ہر گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور ہر طائفہ کے لیے ایک ایک رکعت تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو رکعتیں تھیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس، حضرت جابر، حضرت ابوعیاش زرقی، ان کا نام زید بن صامت ہے، حضرت ابن عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابوبکر اور حضرت سہل بن حثمہ سے بھی مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ان روایات کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اکٹھی نماز پڑھائی ہو جس طرح حضرت ابوعیاش کی حدیث میں ہے اور ان کو دوسری نماز پڑھائی ہو جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں آیا ہے اس میں اس شخص کے لیے حجت ہے جو کہتے ہیں نماز خوف ایک رکعت ہے۔ خطابی نے کہا: صلاۃ خوف کی کئی صورتیں ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ایام میں مختلف اشکال میں ادا فرمائی آپ نے ہر اس طریقہ کو اختیار فرمایا جس میں نماز کے لیے احتیاط بھی تھی اور حراست وحفاظت کے لیے بھی زیادہ بلیغ تھا۔

مسئلہ نمبر 4۔ مغرب کی نماز کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ دارقطنی نے حسن عن ابی بکرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو مغرب کی تین رکعتیں پڑھائیں، پھر وہ چلے گئے اور دوسرے لوگ آئے انہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی تین رکعتیں پڑھائیں، پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھ رکعت ہوئیں اور مقتدیوں کیلئے تین تین رکعتیں ہوئیں (2)۔

1۔ سنن ابی داود، کتاب الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 177

2۔ المستدرک للحاکم، صلوۃ الخوف، جلد 1، صفحہ 486، حدیث نمبر 1251

حسن کا یہی قول ہے۔ جمہور علماء صلاۃ مغرب میں اس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: وہ پہلے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائے اور دوسرے طائفہ کو ایک رکعت پڑھائے۔

پھر اس میں علماء کے اصول کے اختلاف کی بنا پر بقیہ نماز کب قضا کی جائے گی؟ کیا سلام سے پہلے یا سلام کے بعد؟ یہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا نظریہ ہے، کیونکہ اس میں نماز کی ہیئت کی زیادہ حفاظت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: پہلے گروہ کو ایک رکعت پڑھائے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین میں ایسا ہی کیا تھا (1)۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ سخت جنگ اور شدت قتال اور وقت کے خروج کے خوف میں نماز خوف ادا کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ثوری، اوزاعی، امام شافعی اور عام فقہاء فرماتے ہیں: جیسے ممکن ہو نماز ادا کرے، کیونکہ حضرت عمر کا قول ہے: اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو سوار ہو کر یا کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھے۔ موطا میں ہے خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو۔ سورۂ بقرہ میں ضحاک اور اسحاق کا قول گزر چکا ہے۔ اوزاعی نے کہا: اگر فتح تیار ہو اور وہ نماز پر قادر نہ ہوں تو ہر شخص خود اشارہ سے نماز پڑھے اور اگر اشارہ سے بھی ادا کرنے پر قادر نہ ہوں تو نماز کو موخر کر دیں حتیٰ کہ جنگ ختم ہو جائے اور امن میں ہو جائیں تو دو رکعتیں ادا کریں۔ اگر وہ قادر نہ ہوں تو ایک رکوع اور دو سجدے ادا کریں، اگر اس پر بھی قادر نہ ہوں تو ان کے لیے تکبیر کافی ہوگی وہ نماز کو موخر کریں حتیٰ کہ امن میں ہو جائیں۔ یہی مکحول کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ الکیا طبری نے ''احکام القرآن'' میں امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب سے حکایت کیا ہے۔ الکیا نے کہا: جب خوف اس سے زیادہ ہو اور جنگ اپنے عروج پر ہو تو مسلمان قبلہ یا غیر قبلہ کی طرف جیسا بھی ممکن ہو نماز پڑھیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب ثلاثہ اس پر متفق ہیں کہ وہ نماز نہ پڑھیں جب کہ یہ حالت ہو بلکہ نماز موخر کر دیں، اگر وہ نماز کے اندر جنگ لڑیں گے تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے طعن اور ضرب پے در پے لگائی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حضرت انس کے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: تستر قلعہ کی فتح فجر کی روشنی کے وقت ہوئی سخت جنگ ہوئی تو ہم نماز نہ پڑھ سکے مگر سورج بلند ہونے کے بعد ہم نے نماز پڑھی جب کہ حضرت ابو موسیٰ کے ساتھ تھے اور ہمیں فتح حاصل ہو چکی تھی۔ حضرت انس نے کہا: مجھے اس نماز کے عوض دنیا و مافیہا محبوب نہیں۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے۔ اس کی طرف ہمارے شیخ الاستاد ابو جعفر بن محمد بن محمد القیسی القرطبی المعروف بابی حجۃ کا میلان ہے۔ یہی ظاہراً امام بخاری کا مختار ہے، کیونکہ انہوں نے اس کے پیچھے حدیث جابر کو ذکر کیا ہے فرمایا: جنگ خندق کے دن حضرت عمر آئے وہ کفار قریش کو گالی دے رہے تھے اور عرض کر رہے تھے: یا رسول اللہ! میں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی حتیٰ کہ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ فرمایا: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطحان وادی میں اترے، وضو کیا اور سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر پڑھی پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی (2)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی جلد 1، صفحہ 494
2۔ صحیح بخاری، مواقیت الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 83

مسئلہ نمبر 6۔ حملہ آور اور جس کا پیچھا کیا گیا ہے اس کی نماز میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ دونوں برابر ہیں، ہر ایک اپنی سواری پر نماز پڑھے گا۔ اوزاعی، امام شافعی اور فقہاء اصحاب الحدیث اور ابن عبدالحکم نے کہا: پیچھا کرنے والا (حملہ آور) زمین پر نماز پڑھے یہ صحیح ہے، کیونکہ پیچھا کرنا نفل ہے اور فرض نماز کا زمین پر ادا کرنا فرض ہے جہاں ممکن ہو اور سوار سواری پر نماز نہ پڑھے مگر جب اسے شدید خوف ہو، جب کہ پیچھا کرنے والا ایسا نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ چھاونی میں لشکر موجود تھا انہوں نے ایک تاریکی دیکھی انہوں نے اسے دشمن گمان کیا انہوں نے صلاۃ خوف پڑھ لی پھر ظاہر ہوا کہ وہ کوئی دشمن نہیں ہے۔ ہمارے علماء کی ایسی صورت میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ دوسری یہ کہ ان پر اعادہ نہیں ہے یہ امام شافعی کا اظہر قول ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے خطا ظاہر ہوگئی ہے پس وہ درست عمل کی طرف لوٹیں جیسا کہ حاکم کا حکم ہوتا ہے۔ دوسرے قول کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا تو ان کے لیے یہ جائز تھا جیسا کہ اگر قبلہ کی سمت میں خطا کر بیٹھیں اور نماز پڑھ لیں تو ان پر اعادہ نہیں ہوتا۔ یہ اولیٰ ہے، کیونکہ انہوں نے وہی کچھ کیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کے اندر لوٹائیں اور اگر وقت نکل چکا ہو تو نہ لوٹائیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ اور فرمایا: وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ یہ احتیاط اور ہتھیار اٹھانے کی صفتیں ہیں تاکہ دشمن اپنی آرزو پوری نہ کرلے اور فرصت کو نہ پائے۔ السلاح اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان جنگ میں اپنا دفاع کرتا ہے۔ عنترہ نے کہا:

كَسَوْتُ الجَعْدَ جعدَ بني أَبانٍ سلاحِي بعد عُرْيٍ و أفتضاح

کہتا ہے: میں نے اسے اپنے ہتھیار دیئے تاکہ ان کے ساتھ وہ اپنی حفاظت کرے اس کے بعد کہ وہ ہتھیاروں سے خالی ہو چکا تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ یعنی وہ طائفہ ہتھیار اٹھائے جو دشمن کے سامنے ہے، کیونکہ نماز پڑھنے والا طائفہ جنگ نہیں کر رہا۔ حضرت ابن عباس کے علاوہ علماء نے کہا: نماز پڑھنے والا طائفہ ہتھیار اٹھائے۔ یعنی جو پہلے نماز پڑھنے والے ہیں وہ اپنے ہتھیار اٹھائیں۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے اس نے کہا: یہ احتمال ہے کہ وہ گروہ جس کو نماز میں ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور انہیں اپنے ہتھیار لینے چاہئیں، کیونکہ اسے دشمن کا زیادہ خوف ہے۔ نحاس نے کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم تمام کے لیے ہو، کیونکہ اس میں دشمن کے لیے ہیبت ہوگی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حکم صرف اس گروہ کو ہو جو دشمن کے سامنے ہے۔ ابو عمر نے کہا: اکثر اہل علم اس نماز کے لیے ہتھیار اٹھانا مستحب قرار دیتے ہیں جو خوف میں نماز پڑھ رہا ہو۔ اور وہ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ کے قول کو ندب پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر خوف نہ ہوتا تو اس کا اٹھانا واجب نہ ہوتا پس اس کا امر استحبابی ہے۔ اہل ظاہر نے کہا: نماز خوف میں ہتھیار اٹھانا واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے مگر جسے بارش وغیرہ کی وجہ سے اذیت ہو تو اس کے لیے

واجب نہیں۔ اگر بارش وغیرہ ہو تو اس کے لیے ہتھیار اتارنا جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا: جب وہ نماز پڑھیں تو خوف کے وقت اپنے ہتھیار اٹھائیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور یہ قرآن کی نص ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: وہ ہتھیار نہ اٹھائیں، کیونکہ اگر ان پر ہتھیار اٹھانا واجب ہوتا تو ہتھیار نہ اٹھانے کی صورت میں نماز باطل ہوتی۔ ہم کہتے ہیں: نماز کی وجہ سے ہتھیار اٹھانا واجب نہیں بلکہ ان پر قوت و نظر کی خاطر ہتھیار اٹھانا واجب ہے (1) (یعنی کفار کے سامنے قوت و طاقت کا مظاہرہ ہو)

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا سَجَدُوْا اس میں ضمیر اس گروہ کے لیے ہے جو نماز پڑھ رہا ہے پھر وہ لوٹ جائیں۔ یہ بعض مروی بینات پر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب وہ قضا رکعت کا سجدہ کرلیں اور یہ حضرت سہل بن ابی حثمہ کی ہیئت پر ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ نماز کو کبھی سجدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرح ہے اذا دخل احدکم المسجد فلیسجد سجدتین (2) یعنی جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھے۔ یہ سنت ہے اور فَلْيَكُوْنُوْا میں ضمیر احتمال رکھتی ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے سجدہ کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس طائفہ کے لیے ہو جو پہلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑا تھا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کافر خواہش کرتے ہیں کہ تم ہتھیار اٹھانے سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہتھیار اٹھانے کے امر میں حکمت بیان فرمائی اور دوسرے طائفہ میں احتیاط کا ذکر فرمایا جب کہ پہلے کے ساتھ یہ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ دوسرا ہوشیار رہنے اور احتیاط کرنے کا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ دشمن اپنا قصد اس وقت سے مؤخر نہیں کرے گا، کیونکہ یہ نماز کا آخر ہے۔ نیز دشمن کہے گا کہ ہتھیار ان پر بھاری ہوں گی اور وہ تھک چکے ہوں گے۔ اس آیت میں اسباب کو اختیار کرنے کی بہت واضح دلیل موجود ہے اور ہر اس چیز کو اختیار کرنے کی دلیل ہے جو صاحب عقل لوگوں کو نجات دینے والی ہے اور سلامتی تک پہنچانے والی ہے اور دار کرامت تک وصال بخشنے والی ہے۔ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً یعنی ایسا حملہ جو جڑ سے اکھیڑ دے اور اس کے ساتھ دوسرے حملہ کی ضرورت بھی نہ رہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ نماز میں ہتھیار اٹھانے کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے ہم نے پہلے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر واجب نہیں تو احتیاط کے لیے مستحب ہے پھر بارش میں ہتھیار رکھنے کی رخصت دی، کیونکہ اس طرح اندرونی ہتھیار گیلے اور بھاری ہو جائیں گے اور لوہے کو زنگ آلود کر دے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: نخلہ وادی کے بطن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے جب مشرکوں کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو مال غنیمت ملا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی، وہ بارش والا دن تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیار اتار کر قضا حاجت کے لیے باہر نکل گئے تھے، کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے جدا دیکھا تو غورث بن حارث نے آپ کا قصد کیا وہ اپنی تلوار کے ساتھ پہاڑ سے آپ کی طرف اترا اس نے آپ سے کہا: آج آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ'' دعا کی اللهم اكفني الغورث بما شئت۔ غورث نے اپنی تلوار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھکایا تاکہ آپ کو مارے تو وہ فوراً پھسل کر منہ کے بل گر پڑا (3)۔ واقدی نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 494 2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 63 3۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 168

ذکر کیا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے غورث کو سینے پر دھکا دیا جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آئے گا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ نبی کریم ﷺ نے تلوار اٹھائی اور فرمایا: اے غورث! تجھے اب مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: کوئی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو میرے لیے حق کی گواہی دے تو میں تجھے تیری تلوار دے دوں گا۔ غورث نے کہا: نہیں لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اس کے بعد آپ سے نہیں لڑوں گا اور نہ میں آپ کے خلاف کسی دشمن کی مدد کروں گا۔ آپ ﷺ نے اسے تلوار دے دی اس وقت بارش میں ہتھیار اٹھانے کی رخصت میں یہ نازل ہوئی۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف ایک زخم کی وجہ سے بیمار ہو گئے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ہتھیار ترک کرنے اور بارش کے عذر کی وجہ سے دشمن کے لیے تیاری چھوڑنے کی صحابہ کرام کو رخصت دی، پھر انہیں حکم دیا اور فرمایا: وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ یعنی ہوشیار رہو تم نے ہتھیار رکھ دیئے ہوں یا نہ رکھے ہوں۔ یہ تمام حالات میں دشمن سے ہوشیار رہنے اور تیاری کی تاکید پر دلیل ہے، کیونکہ لشکر کو ہمیشہ اسی صورت میں مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ ہوشیاری میں کوتاہی کرتے ہیں۔ ضحاک نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: خُذُوْا حِذْرَكُمْ کے تحت فرمایا: یعنی اپنی تلواریں لٹکاؤ، کیونکہ یہ جنگ کی ہیئت ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

''جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) پھر جب مطمئن ہو جاؤ (دشمن کی طرف سے) تو ادا کرو نماز (حسب دستور) بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر۔ اور نہ کمزوری دکھاؤ (دشمن) قوم کی تلاش میں اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے اور تم تو امید رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے اس (ثواب) کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، بڑا دانا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قَضَيْتُمُ اس کا معنی ہے تم نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ قضا کا لفظ اس فعل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو وقت کے اندر کیا جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (بقرہ:200) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز خوف کے بعد ہے(1)، یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو دل اور زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 107، دار الکتب العلمیہ بیروت

خواہ کسی حال میں ہو کھڑے ہو یا بیٹھے ہو یا پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہو۔ تکبیر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور فتح و نصرت کی دعا ہمیشہ کرتے رہو خصوصاً جنگ کی حالت میں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الانفال) جب تم ملو کسی گروہ سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ کا کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔

کہا جاتا ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ کا معنی ہے جب تم دار الحرب میں نماز پڑھو تو سواریوں پر نماز پڑھو یا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پہلو پر لیٹے ہوئے اگر تم قیام کی طاقت نہیں رکھتے، جب خوف ہو یا مرض ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (بقرہ:239)

اور ایک قوم نے کہا: اس آیت کی مثال آل عمران میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مسجد میں چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ شور کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فرمایا: اس سے مراد فرضی نماز ہے یعنی اگر وہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر نماز پڑھیں اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھو، مراد نفس صلاۃ ہے، کیونکہ نماز اللہ کا ذکر ہے۔ یہ اذکار مفروضہ اور اذکار مسنونہ پر مشتمل ہے۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ جب تم امن میں ہو۔ الطمانینۃ کا معنی ہے خوف سے نفس کا سکون حاصل کرنا۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ تو نماز کو اس کے ارکان کے ساتھ اور سفر میں اس کی کمال ہیئت کے ساتھ اور حضر میں کمال تعداد کے ساتھ ادا کرو۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ یعنی نماز مقررہ وقت پر فرض کی گئی ہے۔ زید بن اسلم نے کہا: موقوتاً کا معنی ہے تم اسے علیحدہ علیحدہ اپنے وقت میں ادا کرو(1)۔ اہل لغت کے نزدیک اس کا معنی ہے مخصوص وقت میں فرض کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقتہ فھو موقوتٌ ووقتہ، فھو مؤقت یہ بعینہ زید بن اسلم کا قول ہے یعنی وقت پر کسی کام کو کرنا اور فرمایا: كِتٰبًا مصدر مذکر ہے اسی وجہ سے فرمایا مَّوْقُوْتًا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَهِنُوْا یعنی تم کمزور نہ ہو۔ سورہ آل عمران میں یہ گزر چکا ہے۔ فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ دشمن قوم کی تلاش میں۔ بعض علماء نے کہا: یہ جنگ احد میں نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے مشرکین کا پیچھا کرنے کا حکم دیا، جب کہ مسلمانوں کو زخم لگ چکے تھے۔ یہ امر تھا کہ اس کے ساتھ نہ نکلے مگر جو جنگ میں تھا جیسا کہ سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے بعض نے فرمایا: یہ ہر جہاد کے بارے میں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ یعنی تم زخموں کی وجہ سے دکھ محسوس کرتے ہو تو وہ بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں ان زخموں سے جو انہیں پہنچے تھے، لیکن تمہیں فضیلت حاصل ہے تم اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہو وہ اس کی امید نہیں رکھتے، یہ اس لیے کہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی امید نہیں رکھتا اس آیت کی مثال یہ ہے: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (آل عمران:140) یہ آیت پہلے گزر چکی ہے۔ عبدالرحمٰن اعرج

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 526

نے اسے ان تکونوا یعنی ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی لان۔ منصور بن المعتمر نے ان تکونوا تسلمون پڑھا ہے یعنی تا کے کسرہ کے ساتھ۔ بصریوں کے نزدیک تا میں کسرہ کے ثقل کی وجہ سے کسرہ کو جائز قرار نہیں دیا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: الرجاء بمعنی خوف ہے کیونکہ جو کسی چیز کی امید رکھتا ہے اس کے حصول کا اسے یقین نہیں ہوتا، پس جس کی وہ امید رکھتا ہے اس کے فوت ہونے کے خوف سے خالی نہیں ہوتا۔ فراء اور زجاج نے کہا: الرجاء بمعنی خوف استعمال نہیں ہوتا(1) مگر نفی کے ساتھ جیسے، الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ (نوح) یعنی الله تعالیٰ کی عظمت سے خوف نہیں کرتے۔ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (الجاثیہ:14) یعنی وہ خوف نہیں کرتے۔ قشیری نے کہا: کلام میں نفی کے بغیر بھی خوف کا ذکر بعید نہیں ہوتا، لیکن ان دونوں نے دعویٰ کیا ہے۔ یہ نہیں پایا جاتا مگر نفی کے ساتھ۔ والله اعلم

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝

''بے شک ہم نے نازل کی ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ تاکہ فیصلہ کریں آپ لوگوں میں اس کے مطابق جو دکھادیا آپ کو الله نے اور نہ بنیے بددیانت، لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف، تکریم اور تعظیم کا ذکر ہے اور آپ کو احکام شریعت کے تفویض ہونے کا ذکر ہے اور حکم میں سیدھے راستہ پر چلنے کا حکم ہے اور بنی ابیرق کا معاملہ جو آپ کے پاس لایا گیا تھا اس پر تنبیہ کا ذکر ہے۔ بنی ابیرق یہ تین بھائی تھے بشر، بشیر اور مبشر اور اسیر بن عروہ ان کے چچا کا بیٹا تھا، انہوں نے رات کے وقت حضرت رفاعہ بن زید کے مکان کو نقب لگائی تھی اور اس کی زرہیں اور کھانے کا سامان چرالیا تھا، پس اس پر آگاہی ہوگئی تھی۔ بعض علماء نے کہا: چور صرف بشیر تھا اس کی کنیت ابوطعمہ تھی اس نے زرہ چوری کی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: زرہ ایک بوری میں تھی جس میں آٹا تھا، آٹا بوری کے سراخ سے گرتا گیا حتیٰ کہ اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ اس کے بھائی کا بیٹا رفاعہ آیا اس کا نام قتادہ بن نعمان تھا اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کی شکایت کی پھر حضرت اسیر بن عروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے ایک اچھے گھرانے کو بدنام کرنے کا قصد کیا ہے، حالانکہ وہ دین دار لوگ ہیں انہوں نے ان مسلمانوں پر بغیر دلیل کے چوری کا الزام لگایا ہے اور چوری میں ملوث کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے جھگڑنے لگے حتیٰ کہ قتادہ اور رفاعہ پر ناراض ہوئے الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔(2) الآیۃ۔ آپ ان کی طرف سے نہ جھگڑا کریں جنہوں نے اپنے آپ سے خیانت کی۔ اور یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا جو شخص کمائے کوئی خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو۔

وہ شخص جس پر چوری کی انہوں نے تہمت لگائی تھی وہ لبید بن سہل تھا۔ بعض نے کہا: زید بن سمین تھا۔ بعض نے کہا: ایک

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 112　　2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 128

انصاری شخص تھا(1)۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو ابن ابیرق جو چور تھا مکہ کی طرف بھاگ گیا وہ سلافہ بنت سعد بن شہید کے پاس ٹھہرا۔ حضرت حسان بن ثابت نے سلافۃ کے بارے ایک بیت کہا ہے جس میں وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وقد أنزلَتْه بنتُ سعد وأصبحتْ ينازعها جِلْدَ آستها وتنازعه

ظننتم بأن يَخْفَى الذى قد صنعتمو وفينا نبىٌ عنده الوَحْىُ واضعه

جب سلافۃ کو حضرت حسان کے یہ شعر پہنچے تو اس نے ابن ابیرق کو کہا: تو نے مجھے حسان کے شعر دیے ہیں اس نے اس کا سامان گھر سے باہر پھینک دیا پھر وہ خیبر کی طرف بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا۔ پھر اس نے ایک رات ایک گھر کو نقب لگائی تو اس کی دیوار اس پر گر پڑی اور وہ مرتد ہو کر مر گیا(☆)۔ اس حدیث کو کثیر الفاظ کے ساتھ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو مسند ذکر کیا ہو سوائے محمد بن سلمہ حرانی کے۔ لیث اور طبری نے مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کی موت کا واقعہ یحییٰ بن سلام نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح قشیری نے ذکر کیا ہے اور اس کی ردت کا ذکر کیا ہے۔ پھر بعض نے کہا: زید بن سمین اور لبید بن سہل یہودی تھے۔ بعض نے کہا: لبید مسلمان تھا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ ابو عمر نے اسے ''کتاب الصحابہ'' میں داخل کیا ہے۔ یہ چیز ابو عمر کے نزدیک اس کے اسلام پر دلالت کرتی ہے اور بشیر منافق شخص تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور دوسروں کے اشعار کو اپنی طرف منسوب کرتا تھا اور مسلمان کہتے تھے: اللہ کی قسم! یہ خبیث کا شعر ہے اس نے ایک شعر کہا جس میں وہ اسی چیز کا اظہار کرتا ہے:

أوَ كلما قال الرجالُ قصيدةً نُحلت وقالوا ابنُ الأبَيْرق قالها(2)

ضحاک نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا اور وہ تسلیم کر چکا تھا یہود ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آئے انہوں نے اسے پکڑا اور اسے بھگا کر لے گئے پس ان کے بارے میں نازل ہوا: ھٰٓاَنۡتُمۡ ھٰٓؤُلَآءِ۔ یعنی یہود۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اس کا معنی شرع کے قوانین پر یہ ہے کہ آپ کو اللہ نے دکھایا یا وحی اور نص کے ذریعے یا اس نظر سے جو وحی کے طریقوں پر جاری ہے۔ یہ قیاس میں اصل ہے یہ دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی رائے قائم فرمائیں تو وہ درست ہو گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ دکھائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی عصمت کا ضامن ہے، ہم میں سے جو کوئی کسی چیز کے بارے کوئی خیال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے گمان ہوتا ہے تو جو اس نے رائے قائم کی ہوتی ہے اس میں قطعیت نہیں ہوتی اور یہاں آنکھ سے دیکھنا مراد نہیں، کیونکہ حکم آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا اور اس کلام میں اضمار ہے یعنی بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اور اس میں دوسرا اضمار ہے اور آپ اس علم کے مطابق احکام جاری فرمائیں جو ہم نے آپ کو عطا کیا لوگوں کے استدلال سے دھوکا کھائے بغیر۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 310

☆ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾ اسم فاعل کے معنی میں ہے جیسے تیرا قول ہے جالستہ فانا جلیسہ یہاں فعیل بمعنی مفعول نہیں ہے اس پر دلیل وَلَا تُجَادِلْ ہے۔ الخصیم جھگڑا کرنے والا۔ خصیم کی جمع خصماء ہے۔ بعض نے فرمایا: خصیم مخاصما اسم فاعل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل تہمت کی مدد اور ان کا دفاع کرنے سے منع فرمایا جب کہ ان کے خصم حجت سے بات کر رہے ہیں۔ اس میں دلیل ہے کہ مبطل اور متہم کی طرف سے خصومت میں نیابت جائز نہیں اور کسی کے لیے کسی کی طرف سے جھگڑنا جائز نہیں مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ حق پر ہے۔ پہلے اسی سورت میں یتیموں اور لوگوں کے مال کی حفاظت کے متعلق کلام گزر چکی ہے، اس میں بیان فرمایا کہ کافر کا مال بھی مسلمان کے مال کی طرح محفوظ ہے مگر اس جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے مباح فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے فرمایا: جب مسلمانوں کے لیے کسی قوم کا نفاق ظاہر ہو جائے تو مسلمانوں میں سے کسی فریق کا اس منافق قوم کے لیے جھگڑنا مناسب نہیں تا کہ ان کی حمایت کریں اور ان کا دفاع کریں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں واقعہ پیش آیا تھا اور ان کے بارے میں یہ نازل ہوا: وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا اور یہ نازل فرمایا: لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں سے ایسا کرتے ہیں۔ آپ کی ذات مراد نہیں ہے اس کی دو وجوہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا جو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ذکر فرمایا: هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے درمیان فیصلہ فرمانے والے تھے اسی وجہ سے آپ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا جاتا تھا آپ کسی دوسرے کی طرف عذر پیش نہیں کرتے تھے۔ پس یہ دلیل ہے کہ کسی غیر کا قصد کیا گیا ہے۔

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾

''اور مغفرت طلب کیجئے اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

طبری اس معنی کی طرف گئے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس خیال سے استغفار کریں جو آپ نے بددیانت لوگوں کے لیے جھگڑنے کا کیا تھا (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا، کیونکہ آپ نے ان کا دفاع کرنے اور یہودی کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ان کا مذہب ہے جو انبیاء پر صغائر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ گناہ نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر پر دفاع کرنے والے تھے اور آپ ان کی برأت کا نظریہ رکھتے تھے اور معنی یہ ہے کہ آپ اپنی امت کے گنہگاروں کے لیے اور باطل کے لیے جھگڑنے والوں کے لیے استغفار کریں اس کا مقام لوگوں میں اس طرح ہے کہ آپ دعویٰ کرنے والوں کی بات سنیں اور جو دلائل سنیں ان کے مطابق فیصلہ کریں اور آپ گنہگار کے لیے استغفار کریں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تسبیح کے طریقہ پر استغفار کا حکم ہے جیسے کوئی شخص کہتا ہے: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ یہ بطور تسبیح ہوتا ہے اس میں گناہ سے توبہ کا ارادہ نہیں ہوتا۔ بعض

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 309 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 110

نے فرمایا: خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد بنو ابیرق ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب: 1) اور فرمایا: فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ (یونس: 94)

وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًاۙ۝

''اور مت جھگڑیں آپ ان کی طرف سے جو خیانت کرتے ہیں اپنے آپ سے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا اسے جو بڑا بددیانت (اور) بدکار ہے''۔

یعنی آپ ان کی طرف سے نہ جھگڑیں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں یہ اسیر بن عروہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ المجادلۃ کا معنی مخاصمہ (جھگڑنا) ہے۔ یہ جدل سے مشتق ہے اس کا معنی کسی چیز کو بٹنا ہے اسی سے مجدول الخلق مضبوط اور لطیف جسم والا ہے اسی سے ہے الاجدل شکرے کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالۃ سے مشتق ہے اور یہ زمین کی سطح ہے۔ جھگڑنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مخالف کو زمین کی سطح پر پھینکنا چاہتا ہے۔

قد أركب الحالة بعد الحاله وأترك العاجز بالجداله

مُنْعَفِراً ليست له محاله

الجدالہ سے مراد زمین ہے اس سے عربوں کا قول ہے ترکتہ مجدلا یعنی زمین پر ڈالا ہوا چھوڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ یعنی اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں فرماتا اور اس کا ذکر بلند نہیں کرتا۔ مَنْ كَانَ خَوَّانًا خود خیانت کرنے والا ہے خوانا مبالغہ کا وزن ذکر فرمایا ہے یہ صیغہ اس لیے ذکر فرمایا تا کہ اس خیانت کی بڑائی کا ذکر ہو۔

یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا۝

''وہ چھپا سکتے ہیں (اپنے ارادے) لوگوں سے لیکن نہیں چھپا سکتے اللہ تعالیٰ سے اور وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی باتوں کا جو پسند نہیں اللہ تعالیٰ کو اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے گھیرے ہوئے ہے۔ سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو کہ جھگڑتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں پس کون جھگڑے گا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی طرف سے قیامت کے دن یا کون ہوگا (اس روز) ان کا وکیل؟''۔

ضحاک نے کہا: جب اس نے چوری کی تو اس نے اپنے گھر میں ایک گڑھا کھودا اور زرہ کو پرنالے کے نیچے رکھ دیا تو یہ آیت نازل ہوئی یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ پر زرہ کی جگہ مخفی نہیں ہے۔ وَ هُوَ مَعَهُمْ یعنی وہ ان کو تاڑنے والا اور ان پر نگہبان ہے۔ بعض نے فرمایا: یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ کا معنی ہے وہ لوگوں سے چھپتے ہیں جیسا کہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ (الرعد:10) یعنی وہ چھپنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ لوگوں سے حیا کرتے ہیں یہ اس لیے، کیونکہ حیا کرنا چھپنے کا سبب ہے۔

وَ هُوَ مَعَهُمْ یعنی علم، رویت اور سمع کے اعتبار سے وہ ان کے ساتھ ہے۔ یہ اہل سنت کا قول ہے۔ جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، انہوں نے اس آیت سے اور اس کی مثل دوسری آیات سے استدلال کیا ہے، انہوں نے کہا: جب فرمایا: وَ هُوَ مَعَهُمْ تو ثابت ہوا کہ وہ ہر جگہ ہے، کیونکہ اس نے ان کے ساتھ ہونا ثابت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے، کیونکہ یہ اجسام کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔ کیا آپ نے بشر (بن غیاث) کے مناظرہ کو اللہ کے قول مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ:7) میں ملاحظہ نہیں کیا جب اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ ہے، تو اس کے مقابل نے اسے کہا: وہ تیری ٹوپی میں، تیری پوستین میں اور تیرے گدھے کے پیٹ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بلند و بالا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں۔ یہ وکیع نے حکایت کیا ہے۔ يُبَيِّتُوْنَ کا معنی یقولون ہے۔ یہ معنی کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ مَا لَا يَرْضٰى یعنی اللہ تعالیٰ جس کو اپنے اہل طاعت کے لیے پسند نہیں کرتا۔ مِنَ الْقَوْلِ رائے اور اعتقاد میں سے۔ جیسے تیرا قول ہے مذہب امام مالک و امام شافعی۔ بعض نے فرمایا: الْقَوْلِ بمعنی مقول ہے کیونکہ نفس قول کا تو، رات کو مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ اس سے بشیر چور کی قوم ہے جو اسے بھگا کر لے گئے تھے اور اس کی طرف سے جھگڑے تھے۔ زجاج نے کہا: هٰۤؤُلَآءِ بمعنی الذین ہے (1)۔ جٰدَلْتُمْ کا معنی ہے تم جھگڑے۔

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ استفہام ہے اس کا معنی انکار اور توبیخ ہے۔ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا وکیل وہ ہوتا ہے جو امور کی تدبیر کو قائم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تدبیر کو قائم کرنے والا ہے معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عذاب کے ساتھ گرفت میں لے لے گا اور انہیں دوزخ کی آگ میں داخل کر دے گا تو کوئی ان کے معاملہ کو قائم کرنے والا نہ ہوگا۔

وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم والا''۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی ابیرق پر اس آیت کے ساتھ توبہ پیش فرمائی وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا یعنی جو چوری کر بیٹھے اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ یا شرک کر بیٹھے۔ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے۔ زبان سے استغفار بغیر توبہ کے نفع مند نہیں۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ آل عمران میں بیان کر دیا ہے۔ ضحاک نے کہا: یہ آیت وحشی کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت حمزہ کا قاتل تھا اس نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا تھا اور حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 115

اور کہا: میں شرمندہ ہوں، کیا میرے لیے توبہ ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ الایہ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے مراد عموم ہے اور تمام مخلوق کو شامل ہے۔ سفیان نے ابواسحاق سے انہوں نے اسود اور علقمہ سے روایت کی ہے ان دونوں حضرات نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: جس نے سورۂ نساء کی یہ دو آیتیں پڑھیں پھر استغفار کیا تو اس کی بخشش کردی جائے گی۔ (1) وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○ (۲) وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ○۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کے ساتھ نفع دیتا تھا جتنا وہ چاہتا تھا اور جب میں کسی دوسرے سے کوئی بات سنتا تھا تو میں اس سے حلف لیتا تھا اور مجھے حضرت ابوبکر نے بیان کیا اور حضرت ابوبکر نے سچ کہا، انہوں نے فرمایا: جس شخص سے کوئی گناہ ہو جائے پھر وہ وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو اسے بخش دیا جائے گا پھر یہ آیت تلاوت کی (1)۔ وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا الخ۔

وَ مَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ○ وَ مَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ○

''اور جو کمائے گناہ کو تو وہ کماتا ہے اسے اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے۔ اور جو شخص کمائے کوئی خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو تو اس نے اٹھالیا (بوجھ) بہتان کا اور کھلے گناہ کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا یعنی جس نے گناہ کیا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ اس کا انجام اس کی طرف لوٹنے والا ہے۔ الکسب کا مطلب ہر وہ عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو نفع پہنچاتا ہے یا اس کے ذریعے کسی ضرر کو دور کرتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فعل کو کسب نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا۔ بعض علماء نے فرمایا: خَطِیْٓئَةً اور اِثْمًا دونوں کا ایک معنی ہے۔ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکیداً مکرر فرمایا۔ طبری نے کہا: الخطیئۃ اور الاثم کے درمیان فرق ہے۔ خطیئہ کبھی ارادۃ ہوتی ہے اور کبھی بغیر ارادہ کے ہوتی ہے اور اثم عمداً ہوتا ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: الخطیئۃ وہ ہوتی ہے جس میں ارادہ نہ ہو جیسے قتل خطا۔ بعض نے فرمایا: الخطیئۃ چھوٹا گناہ ہوتا ہے اور الاثم بڑا گناہ ہوتا ہے۔ اس آیت کا لفظ عام ہے اس کے تحت تمام لوگ شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓئًا البری کا اسم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بہ کی ضمیر الاثم یا الخطیئۃ کے لیے ہے، کیونکہ اس کا معنی بھی الاثم ہے یا دونوں کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الکسب کی طرف راجع ہے فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ○ یہ تشبیہ ہے، کیونکہ گناہ بوجھ اور ثقل ہوتے ہیں یہ محمولات کی طرح ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت:13)

1۔ سنن ابی داؤد، باب الاستغفار، حدیث نمبر 1300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1384، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 319

البھتان، البھت سے ہے، اس کا مطلب ہے تو اپنے بھائی پر کوئی تہمت لگائے جب کہ وہ اس سے بری ہو۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے''؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بھائی کا ایسی چیز کے ساتھ ذکر کرنا جو اسے ناپسند ہے''۔ کسی نے کہا: اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو پھر؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اس میں وہ بات ہے جو تو کہتا ہے تو یہ غیبت ہے اور اگر اس میں وہ بات نہ ہو اور تو اسے کہے تو وہ بہتان ہے''(1)۔ یہ نص ہے، بری کو تہمت لگانا یہ بہتان ہے۔ کہا جاتا ہے: بَهَتَه، بَهْتا و بُهْتانا جب کوئی کسی کے بارے میں ایسی بات بیان کرے جب کہ اس نے کی نہ ہو۔ وہ شخص بہات ہوگا اور جس کے لیے بات کی گئی وہ مبہوت ہے۔ کہا جاتا ہے: بھت الرجل جب کوئی حیران و ششدر ہو جائے۔ اور بہت (عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ) اس کی مثل ہے اور ان دونوں سے افصح بھت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (بقرہ: 258) کیونکہ کہا جاتا ہے: رجلٌ مبہوت، اور باھِت اور بَھِیت نہیں کہا جاتا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر اور اس کی رحمت تو تہیہ کر لیا تھا ایک گروہ نے ان سے کہ غلطی میں ڈال دیں آپ کو اور نہیں غلطی میں ڈال رہے مگر اپنے آپ کو اور نہیں ضرر پہنچا سکتے آپ کو کچھ بھی اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ، لَوْ لَا کے بعد سیبویہ کے نزدیک مبتدا مرفوع ہوتا ہے اور خبر محذوف ہوتی ہے ظاہر نہیں ہوتی معنی یہ ہے کہ اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی کہ ہم نے تجھے حق پر آگاہ کیا۔ بعض نے فرمایا: نبوت اور عصمت عطا کرے رحمت و فضل نہ کیا جاتا، تو ایک گروہ نے تجھے حق سے ہٹانے کا قصد کر لیا تھا، کیونکہ سوال کیا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ ابن ابیرق کو تہمت سے بری کر دیں اور وہ تہمت یہودی پر ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل فرمایا کہ انہیں اس واقعہ کی حقیقت پر آگاہ فرمایا اور اس کا علم عطا فرمایا۔ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ کیونکہ وہ گمراہوں جیسے اعمال کرتے تھے۔ ان کے اعمال کا وبال ان پر لوٹے گا۔ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ کیونکہ آپ معصوم ہیں۔ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ اس سے کلام کا آغاز ہو رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: واؤ حال کے لیے ہے جیسے تیرا قول ہے: جئتك والشمس طالعة میں تیرے پاس آیا جب کہ سورج طلوع ہو چکا تھا اسی سے امرء القیس کا قول ہے:

وقد أغتدي والطير في وكناتها

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، جلد 2، صفحہ 322

پس کلام متصل ہے یعنی وہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اس کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے۔ وَالْحِكْمَةَ وحی کے ذریعے فیصلہ۔ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ یعنی شرائع اور احکام اور تعلم محل نصب میں ہے، کیونکہ وہ کان کی خبر ہے اور جزم کی وجہ سے نون سے ضمہ حذف کیا گیا ہے اور واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

"نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا صلح کرانے کا لوگوں میں اور جو شخص کرے یہ کام اللہ کی رضامندیاں حاصل کرنے کے لیے تو ہم عطا فرمائیں گے اسے اجر عظیم"۔

اس سے مراد بنی ابیرق کی قوم ہے جس نے جو تدبیر کی تھی۔ اور انہوں نے وہ تدبیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تھی۔ النجویٰ دو آدمیوں کے درمیان سرگوشی کرنا ہے۔ تو کہتا ہے: ناجیت فلاناً مناجاۃ و نجاء وھم ینتجون و یَتَنَاجَوْن و نَجَوْتُ فلاناً اُنْجوہ نَجْواً اس کا معنی ہے سرگوشی کرنا۔ نجویٰ یہ نجوت الشی سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے خاص کیا، میں نے اسے علیحدہ کیا۔ النجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے اردگرد کی زمین سے بلند ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَمَنْ بِنَجْوتِه کمن بِعَقْوتِهِ والمُسْتَكِنّ کمن يَمْشِي بِقِرْواحِ(1)

پس نجویٰ کا معنی سرگوشی کرنا ہے۔ یہ مصدر ہے جماعت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: قوم عدل و رضاً۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ إِذْ هُمْ نَجْوَىٰ (الاسراء: 47) پہلی صورت میں غیر جنس سے استثنا ہوگی اور وہ استثنا منقطع ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ من محل رفع میں ہوگا یعنی إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔ لیکن جو صدقہ کا حکم دے یا نیکی کا حکم دے یا لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور نیکی کی طرف بلائے تو ایسی سرگوشی میں بھلائی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ من محل جر میں ہو تقدیر کلام اس طرح ہو: لا خیر فی کثیر من نجواھم إلا نجوی من أمر بصدقۃ پھر اس کو حذف کیا گیا۔ دوسری صورت میں یعنی جب نجویٰ علیحدہ جماعت کا اسم ہو تو من بدل کی حیثیت سے محل جر میں ہوگا۔ یعنی: لا خیر فی کثیر من نجواھم الا فیمن امر بصدقۃ۔ یا جس نے کہا: ما مررت باحد الازید اُس کے قول پر محل نصب میں ہوگا۔ بعض مفسرین نے کہا: ان میں سے زجاج بھی ہے۔ نجویٰ پوری جماعت کا کلام ہے یا دو آدمیوں کا کلام ہے خواہ وہ سرگوشی سے ہو یا جہراً ہو (2)۔ اس میں بعد ہے۔ واللہ اعلم۔ المعروف کا لفظ تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔ مقاتل نے کہا: المعروف سے یہاں مراد فرض ہے (3)۔ اور پہلا قول اصح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر نیکی صدقہ ہے اور یہ بھی نیکی میں سے ہے کہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملے"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "معروف اپنے اسم کی طرح ہے، سب سے پہلے قیامت کے روز جنت میں معروف (نیکی) اور معروف والے (نیکی کرنے والے) داخل ہوں گے"۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ناشکرے کی ناشکری تجھے نیکی سے دور نہ کرے، کبھی ناشکرے کے کئی گنا انکار کے باوجود شکر گزار شکر کرتا ہے۔ حطیئہ نے کہا:

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 119 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 120

من يفعل الخير لا يعدم جوازِيَه　　لا يذهبُ العُرفُ بين الله والناسِ

اور ریاشی نے یہ شعر کہا ہے:

يَدُ المعروفِ غَنَمٌ حيث كانت　　تحتلها كَفورٌ او شكورُ

ففي شكر الشكور لها جزاء　　وعند الله ما كفَر الكفوُر

ماوردی نے کہا: جو شخص نیکی کر سکتا ہے وہ نیکی کرنے میں جلدی کرے اور اس سے محروم ہونے سے بچے اور اس سے عجز کے خوف سے نیکی کرنے میں جلدی کرے اور اسے جاننا چاہیے کہ یہ اس کے زمانہ کی فرصتوں میں سے ہے اور اس کے امکان کی غنیمتوں سے ہے، کوئی قادر شخص نیکی میں سستی نہ کرے، کتنے ہی قدرت پر اعتماد کرنے والے لوگوں سے نیکی فوت ہوگئی اور پھر اس نے شرمندگی کا وارث بنایا، اس پر قدرت کے باوجود زائل ہوگئی اور خجالت کا وارث بنا دیا، جیسا کہ شاعر نے کہا:

ما زلت أسمع كم من واثق خجل　　حتى أبتليت فكنت الواثق الخجلا

اگر اپنے زمانہ کے مصائب کو بھانپ لیا جاتا اور اپنے امر کے عواقب سے محفوظ ہوا جاتا تو اس کی غنیمتیں ذخیرہ شدہ ہوتیں اور اس کے واجبات ضرور ادا کیے جاتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس پر نیکی کا دروازہ کھولا گیا تو وہ اس کو غنیمت جانے، کیونکہ اسے معلوم نہیں کب بند ہو جائے؟''(1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر چیز کا پھل ہوتا ہے اور نیکی کا پھل جلدی کرنا ہے''(2)۔ نوشیروان سے کہا گیا: تمہارے نزدیک بڑی سے بڑی مصیبت کیا ہے؟ اس نے کہا: تجھے نیکی پر قدرت ہو اور اسے نہ کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہو جائے۔ عبدالحمید نے کہا: جس نے فرصت کو اس کے وقت سے مؤخر کیا تو اسے اس کے فوت ہونے کا یقین ہونا چاہیے۔ بعض شعراء نے کہا:

اذا هبّتْ رياحُكَ فاغتَنِمها　　فإنّ لكل خافِقة سُكُون

ولا تغفل عن الإحسان فيها　　فما تدرى السكون متى يكون

جب تیری صحت وخوشحالی کی ہوائیں چل رہی ہوں تو اس کو غنیمت جان، کیونکہ ہر حرکت کرنے والی چیز کے لیے سکون ہے اور اسی حالت میں احسان سے غافل نہ ہو تجھے معلوم نہیں کہ سکون کب ہو جائے گا؟۔

بعض ذوی المحرمات نے ایک والی کو لکھا جس نے اپنی حرمت کی رعایت میں سستی کی تھی:

أعَلَى الصراط تريد رِعْية حرمتي　　أم في الحساب تمنّ بالانعام

للنفع في الدنيا أريدك فانتبه　　لحوائجي من رقدة النوام

کیا تو اپنی حرمت کی رعایت کا پل صراط پر ارادہ رکھتا ہے یا تو حساب کے دن انعام کے ساتھ احسان کرے گا۔ میں تجھ سے دنیا میں نفع لینے کا ارادہ کرتی ہوں تو میری حاجات کو پورا کرنے کے لیے نیند سے بیدار ہو۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نیکی مکمل نہ ہوگی مگر تین خصلتوں کے ساتھ: اس کو جلدی کرنا اور اس کو تھوڑا سمجھنا اور اس کو

1۔ ابن مبارک، الزہد، صفحہ 117　2۔ ماوردی ادب الدنیا والدین، صفحہ 186

پوشیدہ رکھنا۔ جب تو نیکی کو جلدی کرے گا تو تو اسے بہتر کرے گا، جب تو اسے چھوٹا سمجھے گا تو تو اسے عظیم کرے گا، جب تو اسے چھپائے گا تو تو اسے مکمل کرے گا۔ کسی شاعر نے کہا:

زاد معروفك عندی عظما إنه عندك مستور حقیر

تتناساه كأنْ لم تأته وهو عند الناس مشهور خطیر

میرے نزدیک تیری نیکی نے تیری عظمت کو زیادہ کیا، وہ تیرے نزدیک پوشیدہ اور حقیر ہے، تو اسے بھول جا گویا تو نے وہ نیکی کی ہی نہیں جب کہ وہ لوگوں کے نزدیک مشہور اور عظیم ہو۔

نیکی کی شرط میں یہ ہے کہ اس پر احسان نہ جتلایا جائے اور اپنے اچھے فعل پر تکبر نہ کیا جائے، کیونکہ ان دونوں صورتوں میں شکر کا اسقاط ہے اور اجر کا ضیاع ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یہ خونوں کے تنازعے ختم کرنے اور مال اور عزت کے جھگڑے سب کو شامل ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور فتنہ و فساد بھڑکانے کا باعث ہو اور ہر اس کلام کو شامل ہے جس سے مراد رضاالٰہی ہو۔

حدیث پاک میں ہے: ''ابن آدم کا سارا کلام اس کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف حجت ہے مگر جو نیکی کا حکم دینے، برائی سے منع کرنے اور اللہ کے ذکر کے لیے ہو'' (1)۔ جس نے ریاکاری اور سردار بننے کو طلب کیا وہ ثواب نہیں پائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا: جھگڑے والوں کو لوٹاؤ حتیٰ کہ وہ آپس میں صلح کر لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ ان کے درمیان کینہ پیدا کرتا ہے۔ مزید سورۂ مجادلہ میں مناجات کی حرام صورتوں کا ذکر آئے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جس نے دو شخصوں کے درمیان صلح کرائی اللہ تعالیٰ اسے ہر کلمہ کے عوض ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوایوب سے فرمایا: ''کیا میں تمہاری ایسے صدقہ پر راہنمائی نہ کروں جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں؟ (وہ یہ ہے) لوگوں کے درمیان صلح کرانا جب وہ ان میں فساد پیدا ہو جائے اور ان کے درمیان قرب پیدا کرنا جب وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں'' (2)۔ اوزاعی نے کہا: اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدم، اس قدم سے زیادہ محبوب نہیں جو جھگڑنے والوں کے درمیان صلح کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ اور جس نے دو آدمیوں کے درمیان صلح کرائی اللہ تعالیٰ اس کے لیے آگ سے برأت لکھ دے گا۔ محمد بن منکدر نے کہا: دو آدمی مسجد کے کونے میں جھگڑ رہے تھے، میں ان کی طرف مائل ہوا اور میں ان کے ساتھ صلح کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ انہوں نے صلح کر لی۔ حضرت ابوہریرہ نے کہا: جو کہ مجھے دیکھ رہے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ''جو دو شخصوں کے درمیان صلح کرانے کا وہ شہید کے ثواب کا مستحق ہوگا''۔ یہ تمام اخبار ابومطیع مکحول بن مفضل نسفی نے اپنی کتاب ''اللؤلؤیات'' میں ذکر کی ہیں۔ میں

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 64۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان فی اصلاح بین الناس، جلد 7، صفحہ 490، حدیث نمبر 11094

نے اس کو مصنف کے خط سے ایک ورقہ میں پایا انہوں نے ان کے اصل پر آگاہ نہیں کیا۔

ابْتِغَآءَ مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔

وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾

''اور جو شخص مخالفت کرے (اللہ کے) رسول کی اس کے بعد کہ روشن ہو گئی اس کے لیے ہدایت کی راہ اور چلے اس راہ پر جو الگ ہے مسلمانوں کی راہ سے تو ہم پھرنے دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے اور ڈال دیں گے اسے جہنم میں اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا جتنے جرائم ہوں جس کے لیے چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہرائے (کسی کو) اللہ کے ساتھ وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے فرمایا: یہ دونوں آیات ابن ابیرق چور کے سبب سے نازل ہوئیں جب نبی کریم ﷺ نے اس پر ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا اور وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا تھا اور مرتد ہو گیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب وہ مکہ میں گیا تو مکہ میں ایک گھر کو نقب لگائی اسے مشرکین نے پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾

ضحاک نے کہا: قریش کے چند لوگ مدینہ طیبہ آئے اور اسلام قبول کیا، پھر مرتد ہو کر مکہ کی طرف لوٹ گئے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ۔ المشاقۃ کا معنی دشمنی کرنا ہے۔ یہ آیت اگرچہ زرہ چوری کرنے والے یا اس کے علاوہ کے بارے میں نازل ہوئی لیکن یہ ہر اس شخص کو شامل ہے جو مسلمانوں کے طریق کی مخالفت کرتا ہے۔ الْهُدٰى سے مراد رشد اور بیان ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کہا جاتا ہے کہ یہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو مرتد ہوا تھا۔ اس کا معنی ہے ہم اسے اور جس کی وہ عبادت کرتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ مجاہد سے مروی ہے کہ ہم اسے ان بتوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو نہ نفع دیتے ہیں، نہ نقصان دیتے ہیں۔ اور یہ مقاتل کا قول ہے۔ کلبی نے کہا: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کا ارشاد ابن ابیرق کے بارے میں نازل ہوا۔ جب اس کا حال اور اس کی چوری ظاہر ہو گئی تو وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا، اس نے مکہ میں ایک شخص کی دیوار میں نقب لگائی جسے حجاج بن علاط کہا جاتا تھا، پس اس پر دیوار گر گئی اور وہ نقب میں موجود تھا حتیٰ کہ وہ اسی حال میں پایا گیا، لوگوں نے اسے مکہ سے نکالا وہ شام کی طرف چلا گیا۔ اس نے قافلہ کے اموال چوری کیے انہوں نے اسے پتھر مار مار کر قتل کر دیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۱۱۵﴾

عاصم، حمزہ اور ابو عمرو نے نُوَلِّهٖ وَ نُصْلِهٖ کو ھا کے جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ کے ارشاد میں علماء نے فرمایا: اجماع کے قول کی صحت پر دلیل ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ میں خوارج کا رد ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس مفہوم پر کلام گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: قرآن میں کوئی آیت مجھے اس آیت سے زیادہ محبوب نہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ ابن فورک نے کہا: ہمارے اصحاب کا اجماع ہے کہ دوزخ میں ہمیشہ رہنا صرف کافر کے لیے ہے اور اہل قبلہ میں سے فاسق جب بغیر توبہ کے مرجائے گا تو اسے آگ کا عذاب دیا جائے گا، پھر وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے یا ابتداءً اللہ کی رحمت سے آگ سے نکل جائے گا۔ ضحاک نے کہا: ایک بوڑھا بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں بوڑھا ہوں گناہوں اور خطاؤں میں غرق ہوں لیکن میں نے جب سے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کیا اور اس پر ایمان لایا میں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ میرا اللہ کی بارگاہ میں کیا حال ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (1)

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾

''نہیں عبادت کرتے یہ مشرک اللہ کے سوا مگر دیویوں کی اور نہیں عبادت کرتے مگر شیطان سرکش کی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ یعنی من دون اللہ، اِلَّاۤ اِنٰثًا یہ اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان نافیہ بمعنی ما ہے۔ اِنٰثًا سے مراد بت ہیں یعنی لات، عزیٰ اور مناۃ۔ ہر قبیلہ کا ایک بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے اور کہتے تھے: انثی بنی فلاں یہ حسن اور حضرت ابن عباس کا قول ہے (2)، ہر بت کے ساتھ اس کا شیطان ہوتا تھا وہ بتوں کے مجاوروں اور کاہنوں کو نظر آتا اور ان سے کلام کرتا۔ یہ کلام بطور تعجب ذکر کی گئی ہے، کیونکہ ہر جنس سے مونث کمزور اور گھٹیا ہوتی ہے۔ پس یہ ان لوگوں کی جہالت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پتھروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کا نام مونث رکھتے ہیں یا اس کے بارے عقیدہ مونث کا رکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّاۤ اِنٰثًا سے مراد موات (مردے) ہیں، کیونکہ مردوں میں روح نہیں ہوتی (3)، جس طرح لکڑی اور پتھر ہوتا ہے۔ موات کے متعلق اسی طرح خبر دی جاتی ہے جس طرح مونث کے متعلق خبر دی جاتی ہے، کیونکہ قدر و منزلت میں یہ برابر ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: الاحجار تعجبنی اور اسی طرح تو کہتا ہے: المراۃ تعجبنی۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلَّاۤ اِنٰثًا سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ مشرکوں نے کہا: ملائکہ (نعوذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں ہیں یہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارشی ہیں۔ یہ ضحاک سے مروی ہے (4)۔ حضرت

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 121
2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 365
3۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 529

ابن عباس کی قرأت الا وثنا واؤ اور ثا کے فتحہ کے ساتھ اسم جنس کے افراد کی بنا پر ہے۔ وثناً واؤ اور ثا کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے یہ وَثَنٌ کی جمع ہے اور اوثان بھی وثن کی جمع ہے جیسے اسد اور آساد ہے۔ نحاس نے کہا: میری معلومات کے مطابق اس کے ساتھ نہیں پڑھا گیا۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے ذکر فرمایا، ہمیں میرے باپ نے بتایا، انہوں نے کہا ہمیں نصر بن داؤد نے بتایا، انہوں نے کہا ہمیں ابوعبید نے بتایا اور انہوں نے کہا ہمیں حجاج نے بتایا، انہوں نے جریج سے روایت کیا، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے وہ اس طرح پڑھتی تھیں: اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا۔ (1) حضرت ابن عباس نے اسے الا أُثُنًا پڑھا ہے گویا وثن کی جمع وثان بنائی گئی جیسے تو کہتا ہے: حمل و حمال پھر وثن کی جمع وثان بنائی گئی جیسے تو کہتا ہے: مثال اور مُثُل۔ پھر واؤ کو ہمزہ سے بدلا گیا جب اسے ضمہ دیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ (المرسلات) یہ الوقت سے ہے پس اثن جمع الجمع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الا أُنُثًا جمع أَنِيث پڑھا ہے جیسے غَدِير و غُدُر۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ یہ اناث کی جمع ہے جیسے ثمار کی جمع ثُمُر ہے (2)۔ یہ قرأت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوعمرو الدانی نے حکایت کی ہے اور فرمایا: حضرت ابن عباس، حسن اور ابوحیوہ نے اس کے ساتھ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ اس سے مراد ابلیس ہے، کیونکہ انہوں نے اس کی اطاعت کی جو اس نے انہیں مزین کر کے دیا پس انہوں نے گویا اس کی عبادت کی۔ اس کی مثال معنی میں یہ ہے: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: 31) یعنی جو انہوں نے انہیں حکم دیا اس کی انہوں نے اطاعت کی یہ مطلب نہیں کہ بلاواسطہ ان کی عبادت کی۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

شیطان کے لفظ کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ المرید سے مراد سرکش اور نافرمان ہے۔ یہ فعیل کا وزن ہے یہ مَرَدَ سے مشتق ہے جس کا معنی نافرمانی کرنا ہے۔ المرید اطاعت سے نکلنے والا۔ مرد الرجل یمرد مرودا جب کوئی نافرمانی کرے اور اطاعت سے نکل جائے، فهو مارد، مرید و متمرد۔ ابن عرفہ نے کہا: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا شر ظاہر ہو۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شجرة مرداء وہ درخت جس کے پتے جھڑ جائیں اور اس کی لکڑیاں ظاہر ہو جائیں اور اسی سے رجل امرد کہا جاتا ہے جس کے رخساروں سے بالوں کی جگہ ظاہر ہو۔

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

”لعنت کی ہے اس پر اللہ نے اور اس نے کہا تھا کہ میں ضرور لوں گا تیرے بندوں سے (اپنا) حصہ مقرر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَّعَنَهُ اللّٰهُ، اللعن کا اصل معنی دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور عرف میں ایسا دور کرنا ہے جو ناراضگی اور غضب کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ ابلیس پر تعیین کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے اسی طرح وہ کفار جو مر چکے ہیں مثلاً فرعون، ہامان اور ابوجہل ان پر تعیین کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے اور رہے زندہ لوگ تو ان کے بارے میں کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 121 2۔ تفسیر طبری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا یہ شیطان نے کہا تھا یعنی میں اپنی گمراہ کن چالوں کے ساتھ ان کو تیری اطاعت سے نکالوں گا اور اپنی گمراہی کے ساتھ انہیں گمراہ کروں گا۔ یہ کفار اور نافرمان لوگ ہیں۔ خبر میں ہے ''ہر ہزار میں سے ایک اللہ کے لیے ہوگا باقی شیطان کے لیے ہوں گے'' (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے۔ اس کی تائید کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا قیامت کے روز حضرت آدم کو یہ کہنا کہ ''آگ کا حصہ نکالو''۔ حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے، آگ کا حصہ کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے'' (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ بعث النار وہ شیطان کا حصہ ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد لوگوں کا بہت سی اشیاء میں شیطان کی اطاعت کرنا ہے مثلاً بچے کی ولادت کے وقت وہ ایک کیل لگاتے تھے اور ساتویں دن اسے گھماتے تھے اور کہتے تھے: یہ اس لیے ہے تاکہ گھروں میں رہنے والے جن اسے جان لیں۔

وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝

''میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور میں ضرور انہیں جھوٹی امیدوں میں رکھوں گا اور میں ضرور حکم دوں گا انہیں پس وہ ضرور چیریں گے جانوروں کے کان اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ بدل ڈالیں گے اللہ کی مخلوق کو اور جو شخص بنا لے شیطان کو (اپنا) دوست اللہ کو چھوڑ کر تو نقصان اٹھایا اس نے کھلا نقصان''۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ یعنی میں انہیں ہدایت کے راستہ سے پھیروں گا۔ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ یعنی ان کے لیے جھوٹی امیدیں مزین کروں گا۔ یہ کسی ایک تمنا پر منحصر نہیں، کیونکہ ہر ایک اپنی رغبت اور قرائن حال کے اعتبار سے خواہش و تمنا کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میں انہیں لمبی زندگی کی امید دلاؤں گا کہ خیر تو بہ اور معرفت حاصل کرنے کا بڑا وقت باقی ہے نیز انہیں گناہوں پر اصرار کی امید دلاؤں گا۔ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ، البتك کا معنی کاٹنا ہے اسی سے ہے سیف باتك کاٹنے والی تلوار۔ یعنی شیطان نے کہا: میں انہیں بحیرہ، سائبہ اونٹنیوں کے کان کاٹنے پر برانگیختہ کروں گا جیسے بتکہ و بتّکہ۔ مخففاً و مشدداً وفی یدہ بِتْكَة یعنی اس کے ہاتھ میں ٹکڑا ہے، اس کی جمع بِتَك ہے۔ زہیر نے کہا:

طارت وفی کفہ من ریشها بِتَكٌ

وہ اڑی جب کہ اس کی ہتھیلی میں اس کے پروں کے ٹکڑے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ یہ تمام لام قسم کے لیے ہیں۔ علماء کا اختلاف ہے کہ یہ تبدیلی اور تغیر کس طرف راجع ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس سے مراد خصی کرنا، آنکھ پھوڑنا اور کان کاٹنا ہے۔ یہ معنی

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 159

2۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، جلد 2، صفحہ 967۔ حدیث نمبر 3099، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس، حضرت انس، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو صالح نے بیان کیا ہے (1)۔ ان تمام صورتوں میں حیوان کو تکلیف دینا ہے اور سرکشی کے ساتھ حلال کرنا اور حرام کرنا ہے اور یہ قول بغیر حجت اور دلیل کے ہے۔ جانوروں میں کان باعث جمال اور منفعت ہیں، اسی طرح دوسرے اعضاء ہیں۔ اسی وجہ سے شیطان نے دیکھا کہ وہ اس کے ذریعے اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرے۔ عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے "میں نے اپنے بندوں کو حق کی پیروی کرنے والا پیدا کیا پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہیں اپنے دین سے دور کر دیا، میں نے جن چیزوں کو ان کے لیے حلال کیا تھا اسے انہوں نے حرام کر دیا اور شیاطین نے انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرائیں جس کے متعلق میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور شیاطین نے انہیں حکم دیا کہ وہ تخلیق کو بدل دیں" (2)۔ اس حدیث کو قاضی اسماعیل نے اور مسلم نے تخریج کیا ہے۔ اور اسماعیل نے روایت کیا کہ ہمیں ابو الولید اور سلیمان بن حرب نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے بیان کیا، انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا، انہوں نے ابو الاحوص سے روایت کیا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جب کہ میری ہیئت بڑی خراب تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تیرے پاس مال ہے؟" اس نے کہا: میں نے عرض کی: میرے پاس مال تو ہے۔ آپ نے کہا: "کون سا مال ہے"؟ میں نے کہا: گھوڑے، اونٹ، غلام ہر قسم کا مال ہے۔ ابو الولید نے کہا: اس نے بکریوں کا بھی ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے تجھے مال عطا کیا ہے تو تجھ پر اس کا اثر دکھائی دینا چاہیے"۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تیری قوم کی اونٹنیاں صحیح کانوں والے بچے جنم دیتی ہیں پھر تو نشتر کا قصد کرتا ہے اور اس سے ان کے کان کاٹ دیتا ہے اور تو کہتا ہے: یہ بحر ہے۔ اور تو ان کی کھالوں کو چیرتا ہے اور تو کہتا ہے: صرم ہے۔ یہ اس لیے کرتا ہے تاکہ تو انہیں اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر حرام کردے"؟ اس نے کہا: ہاں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جو تجھے عطا فرمایا وہ حلال ہے اور اللہ تعالیٰ کا نشتر تیرے نشتر سے زیادہ تیز ہے اور اللہ تعالیٰ کی کلائی تیری کلائی سے زیادہ سخت ہے"۔ اس نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ بتائیے ایک شخص کے پاس میں جاتا ہوں، وہ میری مہمان نوازی نہیں کرتا، پھر وہ میرے پاس آتا ہے کیا میں اس کی مہمان نوازی کروں یا میں بھی اس جیسا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "(نہیں) بلکہ تو اس کی مہمان نوازی کر" (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب یہ شیطان کے فعل اور اس کے اثر سے تھا تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ "ہم جانور کی آنکھوں اور کانوں کو خصوصی طور پر دیکھیں اور ہم کانا جانور قربانی کے لیے نہ دیں اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان کی طرف کٹی ہوئی ہو اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان کا آخری حصہ کٹا ہوا ہو۔ اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کانوں کو نشان لگانے والے آلے نے کاٹا ہو اور ایسا بھی نہ ہو جس کے کان چیرے گئے ہوں" (4)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 530
2۔ صحیح مسلم، الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا، جلد 2، صفحہ 385
3۔ المستدرک للحاکم، کتاب اللباس، جلد 4، صفحہ 201، حدیث نمبر 64
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، جلد 2، صفحہ 32

کانوں میں عیب کا علماء کے نزدیک اعتبار ہے۔ امام مالک اور لیث نے کہا: اگر ایسا جانور ہو جس کے کان کٹے ہوئے ہوں یا زیادہ کٹے ہوئے ہوں تو اس کی قربانی جائز نہیں اور نشان لگانے والے آلے سے جو تھوڑا سا چیرا گیا ہو وہ جائز ہے۔ یہ امام شافعی اور فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اگر ایسا جانور ہو جس کے پیدائشی کان نہ ہوں تو امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اس کی قربانی جائز نہیں اگر چھوٹے چھوٹے کان ہوں تو جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جانوروں کو خصی کرنا اس کی اہل علم میں سے ایک جماعت نے اجازت دی ہے جب کہ اس سے منفعت کا قصد کیا گیا ہو خواہ وہ موٹاپے کی غرض سے ہو یا کوئی اور غرض ہو۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ خصی کی قربانی دینے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے جب کہ وہ دوسرے جانوروں سے زیادہ موٹا ہو(1)۔ اور گھوڑوں کو خصی کرنے کی رخصت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دی تھی حضرت عروہ بن زبیر نے اپنے خچر کو خصی کیا تھا۔

امام مالک نے بکرے کو خصی کرنے کی رخصت دی ہے۔ یہ جائز ہے، کیونکہ اس سے حیوان کو ایسے بت کے دین کے ساتھ معلق کرنے کا قصد نہیں کیا جاتا جس کی عبادت کی جاتی ہے اور نہ اس میں ایسے رب کے دین کی وجہ سے معلق کرنے کا قصد کیا جاتا ہے جس کی توحید بیان کی جاتی ہے اس میں تو صرف عمدہ گوشت حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے اور مذکر کو تقویت دینے کا قصد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس سے مونث کی اس کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ بعض علماء نے خصی کرنے کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''خصی وہ لوگ کرتے ہیں جو بے علم ہیں'' (2)۔ ابن المنذر نے اس کو پسند کیا ہے اس نے کہا: کیونکہ یہ ارشاد حضرت ابن عمر سے ثابت ہے وہ فرماتے ہیں: یہ اللہ کی تخلیق میں سے ہے۔ عبدالملک بن مروان نے اس کو ناپسند کیا ہے۔

اوزاعی نے کہا: لوگ ہر اس چیز کو خصی کرنا مکروہ جانتے تھے جس کی نسل چلتی ہے۔ ابن المنذر نے کہا: اس میں دو حدیثیں ہیں: ایک حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکرے، بیل اور گھوڑے کو خصی کرنے سے منع فرمایا(3)، اور دوسری حدیث حضرت ابن عباس کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ چیز کو باندھ کر اس پر تیر اندازی کرنے اور جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرمایا(4)۔ مؤطا میں اس باب سے وہ ہے جو امام مالک نے نافع عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے کہ وہ خصی کرنے کو ناپسند کرتے تھے فرماتے تھے: اس میں تخلق کی تکمیل ہے۔ ابو عمر نے کہا: خصی نہ کرنے میں تخلیق کا تمام ہے اور تخلیق کا بڑھنا بھی روایت ہے(5)۔

میں کہتا ہوں: ابو محمد نے عمر بن اسماعیل عن نافع عن ابن عمر سے مسند روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''ان جانوروں کو خصی نہ کرو جو اللہ کی تخلیق کو بڑھاتے ہیں'' (6)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے اپنے شیخ سے روایت کیا ہے فرمایا ہمیں ابو عبداللہ معدل نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں عباس بن محمد نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں ابو مالک نخعی نے بیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 114 — 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 314

3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب کراھیۃ خصاء الغنم والبھام، جلد 10، صفحہ 24 — 4۔ ایضاً

5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 502 — 6۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کراھیۃ خصاء الغنم والبھام، جلد 10، صفحہ 24

کیا، انہوں نے عمر بن اسماعیل سے روایت کیا پھر یہ حدیث ذکر کی۔ دارقطنی نے کہا: اس کو عبدالصمد بن نعمان نے ابو مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ آدمی کو خصی کرنا مصیبت ہے، کیونکہ جب اسے خصی کیا جائے گا تو اس کا دل اور اس کی قوت ختم ہو جائے گی جب کہ حیوان کا حکم اس کے برعکس ہے اور انسان کی نسل ختم ہو جائے گی جس کا نبی کریم ﷺ کے قول میں حکم دیا گیا ہے: تناکحوا تناسلوا فانی مکاثربکم الامم۔ نکاح کرو، نسل بڑھاؤ میں تمہارے ذریعے دوسری امتوں پر کثرت کو بیان کرنے والا ہوں گا۔

پھر اس میں سخت تکلیف بھی ہے بعض اوقات انسان ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں مال کا ضیاع اور نفس کا ہلاک کرنا ہوتا ہے اور ان تمام چیزوں سے منع کیا گیا ہے پھر یہ مثلۃ ہے اور نبی کریم ﷺ نے مثلہ سے منع کیا ہے (1) اور یہ صحیح ہے۔ حجازی اور کوفی فقہاء کی ایک جماعت نے صقالیہ وغیرہم سے خصی غلام خریدنا ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اگر وہ ان سے خریدے نہیں جائیں گے تو ان کو خصی نہیں کیا جائے گا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ انسان کا خصی کرنا حلال اور جائز نہیں، کیونکہ یہ مثلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی ہے۔ اسی طرح تمام اعضاء کا بغیر حد اور قصاص کے کاٹنے کا حکم ہے یہ ابو عمر کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ ثابت ہو گیا تو تو جان لے کہ نشان لگانا اور شعار کرنا اس نہی سے مستثنیٰ ہے جو شیطان کے شریطہ کے متعلق ہے اور یہ آگ کے ساتھ حیوان کو عذاب دینے کی نہی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ الوسم کا معنی آگ سے داغ لگانا ہے اس کا اصل معنی علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: وسم الشئ یسمہ جب کوئی ایسی علامت لگائے جس سے وہ چیز پہچانی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم (الفتح:29) السیما علامت کو کہتے ہیں۔ المیسم داغ لگانے کا آلہ۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے ثابت ہے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں نشان لگانے کا آلہ دیکھا آپ صدقہ اور فئی وغیرہ کے اونٹوں کو نشان لگا رہے تھے تاکہ ہر مال پہچانا جائے اور اس کے حق میں ادا کیا جائے اور کسی دوسرے مال کی طرف تجاوز نہ ہو (2)۔

مسئلہ نمبر 7۔ چہرے کے علاوہ تمام اعضاء میں نشان لگانا، داغنا جائز ہے، کیونکہ حضرت جابر نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرے پر مارنے اور چہرے پر داغ لگانے سے منع فرمایا ہے (3)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ چہرے کو باقی تمام اعضاء پر شرف حاصل ہے، کیونکہ وہ حسن و جمال کا مقر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ حیوان کا قوام ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے وہ اپنے غلام کو مار رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: چہرے پر مارنے سے اجتناب کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی تخلیق اپنی صورت پر کی ہے" (4)۔ یعنی مضروب کی صورت پر، یعنی اس مضروب کا چہرہ حضرت آدم کے چہرہ کے مشابہ ہے، پس اس کی مشابہت کی وجہ سے اس کا احترام لازم

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 336
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 203
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 202
4۔ ایضاً، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 327

ہے۔ یہ سب سے بہتر ہے جو کچھ اس کی تاویل میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ایک جماعت نے کہا: یہ وشم اور جو حسن کے لیے تصنع کیا جاتا ہے اس تبدیلی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حسن کا قول ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے جو حضرت عبد اللہ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جسم پر نشان بنانے والیاں اور نشان بنوانے والیاں، چہرے سے بال نوچنے والیاں اور نوچوانے والیاں اور حسن کی خاطر دانت کھلے کرانے والیاں اللہ کی تخلیق کو بدلنے والیاں (ان سب پر) اللہ کی لعنت ہے''(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، مکمل بیان سورۃ الحشر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

الوشم ہاتھوں میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی ہتھیلی کی پیٹھ اور اس کی کلائی کو سوئی کے ساتھ کریدا جاتا ہے پھر اس میں سرمہ یا کوئلے کا دھواں بھر دیا جاتا ہے پھر وہ سبز ہو جاتا ہے۔ قد وشمت وشماً فھی واشمۃ یعنی نشان بنانا اور المستوشمہ۔ ایسی نشان بنوانے والی۔ یہ ہروی کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: صقلی اور افریقی لوگ ایسا کرتے ہیں (2) تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی جوانی میں اپنی طاقت پر دلالت کرے۔ قاضی عیاض نے کہا: ہروی کی روایت میں جو مسلم کے رواۃ میں سے ہے۔ الواشیۃ والموشیہ کی جگہ والوشیۃ والمستوشیۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی میم کی جگہ یا ہے۔ یہ الوشی سے مشتق ہوگا جس کا معنی مزین ہونا ہے اور الوشی کی اصل دو رنگوں پر کپڑے کو بننا ہے ثور موشی ایسا بیل جس کے چہرے اور پیروں میں سیاہی ہو۔ یعنی عورت بال نوچ کر، دانت کھلے کر کے، دانت باریک کر کے زینت حاصل کرتی ہے۔ المتنمصات یہ متنمصۃ کی جمع ہے اس سے مراد وہ عورت ہے جس کے چہرے سے بال اکھیڑنے والے آلہ سے بال اکھیڑے گئے ہوں۔ ابن عربی نے کہا: مصری لوگ زیر ناف بال اکھیڑتے ہیں وہ اسی سے ہے، کیونکہ سنت زیر ناف بالوں کا حلق کرنا ہے اور بغلوں کے بال نوچنا ہے اور فرج کے بال نوچنا یہ اسے ڈھیلا کر دیتا ہے اور تکلیف دیتا ہے اور بہت ساری منفعت کو ضائع کر دیتا ہے (3)۔ المُتَفَلِّجات یہ متفلجۃ کی جمع ہے، وہ عورت جو اپنے دانتوں کو کھلا کرتی ہے یعنی خلقۃً اس کے دانت ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنے عمل سے انہیں کھلا کرتی ہے۔ مسلم کی کتاب کے علاوہ میں ہے۔ الواشرات یہ واشرۃ کی جمع ہے جو اپنے دانتوں کو تیز کرتی ہے یعنی وہ شگاف جو جوان عورتوں کے دانتوں میں ہوتا ہے، بڑی عمر کی عورت نوجوان لڑکی سے مشابہت کے لیے ایسا کرتی ہے۔ یہ تمام امور احادیث کی رو سے گناہ کبیرہ ہیں۔ اس معنی میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے یہ نہی کی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ تدلیس کے باب میں ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی تخلیق کی تغییر کے باب سے ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: یہ اصح ہے یہ پہلے معنی کو بھی متضمن ہے۔

پھر بعض نے فرمایا: یہ منع اب بھی باقی ہے، کیونکہ یہ اللہ کی تخلیق کی تبدیلی کے باب سے ہے اور جو تزئین باقی رہنے والی نہ ہو جیسے سرمہ لگانا یا میک اپ کرنا، عورتوں کے لیے علماء نے جائز قرار دیا ہے لیکن مردوں کے لیے امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ امام مالک نے عورت کے لیے ہاتھوں پر مہندی لگانا جائز قرار دیا ہے۔ حضرت عمر سے اس کا انکار بھی مروی ہے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 205 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 501 3۔ ایضاً

یا تو اپنے دونوں ہاتھوں کو مہندی لگائے یا ترک کر دے۔ امام مالک نے حضرت عمر سے مروی روایت کا انکار کیا ہے کہ عورت مہندی سے خضاب لگانا ترک نہ کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو دیکھا جس نے مہندی نہیں لگائی ہوئی تھی آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم (عورتوں) میں سے کوئی اپنے ہاتھ کو اس طرح نہ چھوڑے کہ وہ مرد کا ہاتھ معلوم ہو''۔ وہ عورت پھر ہمیشہ مہندی لگاتی رہی حتیٰ کہ اس کی عمر نوے سال سے بڑھ گئی تھی اور پھر وہ فوت ہوگئی۔

قاضی عیاض نے کہا: کالی مہندی کے متعلق منع کرنے کی حدیث مروی ہے۔ صاحب المصابیح نے اس کا ذکر کیا ہے اور عورت بغیر زیور کے نہ ہو اس کی گردن میں موتیوں کا ہار ہو۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے کہا: ''بغیر ہار کے ہونا تیرے لیے مناسب نہیں خواہ وہ دھاگے کا ہو یا چمڑے کا ہو''۔ حضرت انس نے کہا: عورت کے لیے مستحب ہے کہ وہ نماز میں اپنے ہار کو اپنی گردن سے لپیٹ دے اگر وہ چمڑے کا ہو۔

ابوجعفر طبری نے کہا: حضرت ابن مسعود کی حدیث میں دلیل ہے کہ خاوند یا کسی اور کے لیے جس کی خاطر کمی یا زیادتی کے ساتھ اللہ کی تخلیق کو بدلنا جائز نہیں ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے خواہ وہ دانتوں کو کھلا کرے یا دانتوں کو تیز کرے یا اس کا دانت لمبا ہو تو وہ اسے اکھیڑ دے یا بہت سے لمبے دانت ہوں تو اس کی اطراف کو کاٹ دے۔ اسی طرح داڑھی یا مونچھوں کا حلق کرنا یا نیچے والے ہونٹ کے بالوں کا حلق کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ تمام صورتیں اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کرنا ہے۔ عیاض نے کہا: جس کی زائد انگلی ہو یا کوئی عضو زائد ہو تو اس کا کاٹنا اور اس کا اکھیڑنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اللہ کی تخلیق کی تبدیلی سے ہے مگر یہ زائد عضو تکلیف دیتا ہو تو ابوجعفر وغیرہ کے نزدیک اس کو اکھیڑنے میں حرج نہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ میں کہتا ہوں: اس باب سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ والمستوشمۃ (1)، بال جوڑنے والی اور بال جڑوانے والی، نشان بنانے والی اور نشان بنوانے والی پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے تخریج کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو اپنے بالوں میں دوسرے بال جوڑنے سے منع فرمایا تاکہ بال زیادہ نظر آئیں، واصلۃ وہ عورت جو ایسا کرتی ہے اور المستوصلہ جو بال لگواتی ہے۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عورت کو اپنے بالوں میں کوئی چیز ملانے سے زجر و توبیخ فرمائی (2)۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے فرمایا: ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: یارسول اللہ! میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے اسے بیماری لگ گئی ہے جس کی وجہ سے اس کے بال جھڑ گئے ہیں، کیا میں اس کو دوسرے بال لگوا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بال لگانے والی اور بال لگوانے والی پر لعنت کی ہے'' (3)۔ یہ بال جوڑنے کی تحریم میں نص ہے۔

امام مالک اور عطا کی جماعت نے یہی کہا ہے: انہوں نے ہر قسم کے بال خواہ وہ اون سے ہوں یا کپڑے سے ہوں سب سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں بھی بال جوڑنے کا معنی پایا جاتا ہے۔ لیث بن سعد نے شاذ قول کیا ہے اس نے اون اور کپڑے

1۔ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، جلد 2، صفحہ 204۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 205 3۔ ایضاً

اور ایسی چیز جو بال نہیں، کے ملانے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ اہل ظاہر کے مذہب کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور دوسرے علماء نے سر پر بال رکھنے کو مباح قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: نہی صرف ملانے کے متعلق ہے۔ یہ محض ظاہر ہے اور معنی سے اعراض ہے۔ ایک قوم نے شاذ قول کیا ہے: انہوں نے مطلقاً وصل (بال لگانے) کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ قطعاً باطل قول ہے، احادیث اس کا رد کرتی ہیں۔ حضرت عائشہ سے وہ مروی ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن سیرین سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا: میری والدہ عورتوں کو کنگھی کرتی ہے، کیا میں اس کے مال سے کھا سکتا ہوں؟ ابن سیرین نے کہا: اگر وہ بال لگاتی ہے تو نہیں اور نہی میں وہ داخل نہیں جو زینت اور خوبصورتی کے لیے رنگ برنگ ریشم کے دھاگوں سے باندھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ایک گروہ نے کہا: اللہ کی تخلیق کی تغییر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند، پتھروں اور آگ وغیرہ کو اس لیے پیدا فرمایا تا کہ ان سے نفع حاصل کیا جائے، کفار نے ان کو معبود بنا دیا۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو پیدا فرمایا تا کہ ان پر سواری کی جائے اور ان کا گوشت کھایا جائے لیکن کفار نے ان کو اپنے اوپر حرام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور پتھروں کو لوگوں کے لیے مسخر کیا لیکن لوگوں نے انہیں معبود بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ پس انہوں نے اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالا۔ مفسرین کی ایک جماعت مجاہد، ضحاک، سعید بن جبیر اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ سے مراد اللہ کے دین کو بدلنا (1)۔ یہ نخعی کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اگر یہ معنی ہو تو وہ تمام صورتیں اس میں داخل ہوں گی جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے مثلاً خصی ہونا، جسم پر سوئی سے بیل بوٹے بنانا اور دوسرے گناہ، کیونکہ شیطان ان تمام گناہوں کی طرف بلاتا ہے یعنی وہ بدل دیں گے اسے جو اللہ نے اپنے دین میں حکم فرمایا۔ مجاہد نے بھی یہ کہا ہے: فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ یعنی وہ اللہ کی اس فطرت کو بدل دیں گے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا فرمایا یعنی وہ اسلام پر پیدا کیے گئے تھے شیطان نے انہیں اس کو تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہی معنی ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ (2) ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس خلق کا معنی اس طرف لوٹے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے چیونٹیوں کی شکل میں حضرت آدم کی پیٹھ سے انہیں نکالا اور ان میں ایمان پیدا فرمایا جس کا ذکر: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى (الاعراف: 172) میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: طاؤس سے مروی ہے کہ وہ کالی عورت کا سفید مرد سے نکاح ہوتا یا سفید عورت کا کالے مرد سے نکاح ہوتا تو وہ اس میں حاضر نہ ہوتے تھے۔ وہ کہتے: یہ بھی فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ سے ہے۔ قاضی نے کہا: اگرچہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے مگر یہ مخصوص ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام زید کا نکاح جو سفید رنگت والے تھے، اپنی دایہ برکہ حبشیہ سے کر دیا جو حضرت اسامہ کی والدہ تھی اور حضرت اسامہ سفید سے کالے پیدا ہوئے تھے۔ طاؤس کے علم کے باوجود یہ مسئلہ ان سے مخفی رہا (3)۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 123
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 185۔ ایضاً، حدیث نمبر 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 502

میں کہتا ہوں: پھر حضرت اسامہ نے فاطمہ بنت قیس سے نکاح کیا تھا وہ عورت سفید تھی اور قریشی تھی اور حضرت بلال کے نکاح میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی بہن زہریہ تھی۔ یہ خاص ہے اور طاؤوس پر یہ معاملہ مخفی رہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی جو شیطان کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کے حکم کو چھوڑتا ہے۔ فَقَدْ خَسِرَ اس نے اپنے اجر میں کمی کی اور اپنا ہی نقصان کیا، کیونکہ اس نے اللہ کا حق شیطان کو دیا اور شیطان کے لیے اللہ کا حق چھوڑ دیا۔

یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؗ وَ لَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِیْصًا ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۝

''شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر فریب کا۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور نہ پائیں گے اس سے بچ نکلنے کی جگہ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، داخل کریں گے ہم انہیں ان باغوں میں، رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کرنے میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَعِدُهُمْ یعنی وہ جھوٹے وعدے کرتا ہے، مال وجاہ اور ریاست کے سبز باغ دکھاتا ہے اور انہیں کہتا ہے، نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ کوئی سزا ہے، وہ انہیں فقر وغربت سے ڈراتا ہے تاکہ وہ بھلائی میں مال خرچ نہ کریں۔ وَ یُمَنِّیْهِمْ اس کا بھی یہی مفہوم ہے وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ یعنی دھوکا۔ ابن عرفہ نے کہا: الغرور ہر وہ چیز جس کے ظاہر کو تو دیکھے تو تو اس سے محبت کرے جب کہ اس کا باطن مکروہ ہو یا مجہول ہو۔ شیطان کو غرور کہا جاتا ہے، کیونکہ نفس کی محبت کی جگہوں پر ابھارتا ہے جب کہ اس کے پیچھے تکلیف دہ چیزیں ہوتی ہیں۔ اُولٰٓىِٕكَ یہ مبتدا ہے مَاْوٰىهُمْ دوسرا مبتدا ہے جَهَنَّمُ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور پھر جملہ پہلے مبتدا کی خبر ہے۔ مَحِیْصًا ۝، ملجا۔ اس سے فعل خاص یحیص آتا ہے۔ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۝ مبتدا خبر ہیں۔ قِیْلًا، قال قیلاً و قولاً و قالاً تمام کا ایک معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی سچا نہیں۔ جو معانی اس آیت کے ضمن میں ہیں ان پر کلام گزر چکی ہے۔

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (نجات کا انحصار) نہ تمہاری جھوٹی امیدوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی جھوٹی امیدوں پر (بلکہ) جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی اس کی اور نہ پائے گا اپنے لیے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور نہ مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ابو جعفر مدنی نے: لَيْسَ بِاَمَانِيْكُمْ وَلَآ اَمَانِيْ اَهْلِ الْكِتَابِ یعنی دونوں جگہ یا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا۔ اس کے نزول کے بارے میں بہتر قول وہ ہے جو حکم بن ابان نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: یہود و نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو ہم میں سے ہوگا۔ قریش نے کہا: ہم دوبارہ زندہ نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ قتادہ اور سدی نے کہا: مومنین اور اہل کتاب نے باہم فخر کیا، اہل کتاب نے کہا: ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے تھے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے کی ہے اور ہم اللہ کے تم سے زیادہ حق دار ہیں، مومنوں نے کہا: ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب تمام کتب پر غالب ہے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ یہاں سوء سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا: یہ آیت کافر کے بارے میں ہے اور انہوں نے هَلْ يُجَازٰٓى اِلَّا الْكَفُوْرُ پڑھا ہے۔ اور ان سے یہ بھی مروی ہے مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ فرمایا: یہ اس کے لیے ہے جس کی رسوائی کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کی عزت و اکرام کا ارادہ فرمایا اس کے لیے رسوائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا ذکر کیا (2) اور فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝ (الاحقاف) یہی وہ (خوش نصیب) ہیں قبول کرتے ہیں ہم جن کے بہترین اعمال کو اور درگزر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے، یہ جنتیوں میں سے ہوں گے یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اہل ایمان سے) کیا گیا ہے۔

ضحاک نے کہا: اس سے مراد یہود، نصاریٰ، مجوس اور کفار عرب ہیں (3)۔ جمہور علماء نے کہا: آیت کا لفظ عام ہے کافر، مومن ہر ایک کو اس کے برے عمل کی جزا ملے گی۔ کافر کی جزا آگ ہے، کیونکہ اس کا کفر اسے ہلاک کرتا ہے اور مومن کو اس کی جزا دنیا کی تکالیف کی صورت میں دی جاتی ہے (4)، جس طرح کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم صحت کے قریب قریب اعمال کرو اور درست عمل کرو۔ ہر تکلیف جو مسلمان کو پہنچتی ہے وہ اس کے لیے کفارہ ہوتی ہے حتی کہ چھوٹی سی مصیبت جو اسے پہنچتی ہے اور کانٹا جو اسے چبھتا ہے" (5) (یہ سب چیزیں کفارہ ہوتی ہیں) حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں فصل نمبر 95 میں تخریج کیا ہے کہ ہمیں ابراہیم بن مستر البذلی نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں عبد الرحمن بن سلیم بن حیان ابو زید نے بیان کیا فرمایا: میں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے سنا انہوں نے فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف چلا، تو حضرت عمر نے حضرت نافع سے کہا: تو مجھے مصلوب (جس کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا)

1۔ اسباب النزول، جلد 1، صفحہ 199، قدیمی کتب خانہ کراچی
2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 370-369
3۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 340
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 114
5۔ صحیح مسلم، البر والصلۃ والآداب، جلد 2، صفحہ 319

یعنی ابن زبیر کے پاس سے نہ گزار یا فرمایا: اچانک آدھی رات کے وقت سولی کی لکڑی حضرت عبداللہ بن عمر کے محل سے لگی، تو وہ بیٹھ گئے اپنی آنکھوں کو ملا پھر کہا: اے ابوخبیب! اللہ تجھ پر رحم کرے تو تھا، تو تھا! میں نے تیرے باپ زبیر کو یہ کہتے سنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ فی الدنیا او فی الاخرۃ (جو برائی کرے گا اسے اس کی جزا دنیا میں ملے گی یا آخرت میں ملے گی) اگر تو یہ تیرا قتل تیرے اس فعل کے بدلے میں ہے تو یہ اس کی جزا ہے (1)۔

ابوعبداللہ ترمذی نے کہا: جو قرآن میں ہے وہ مجمل ہے فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا الخ۔ اس سے نیک، فاجر، دشمن، دوست اور مومن، کافر سب داخل ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو جگہوں کے درمیان فرق کیا فرمایا: یجزبہ فی الدنیا او فی الاخرۃ یعنی اس پر دونوں جگہ جزا جمع نہیں ہوگی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ حضرت ابن عمر نے کہا: اگر یہ تیرا قتل، تیرے فعل کے بدلے میں ہے تو یہ جزا ہے، یعنی اس نے حرم میں قتال کیا۔ اس میں ایک عظیم واقعہ صادر کیا حتیٰ کہ بیت اللہ کو جلا دیا گیا اور منجنیق کے ذریعے حجر اسود کو مارا گیا حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تھا پھر چاندی کے ساتھ اس کو جوڑا گیا تھا، وہ ابھی تک اسی حالت میں ہے عبداللہ نے بیت اللہ کے رونے کی آواز سنی تھی آہ آہ۔ جب حضرت ابن عمر نے عبداللہ کا فعل دیکھا پھر اسے سولی پر مقتول دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ذکر کیا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: اگر یہ قتل اس فعل کے بدلے ہے تو گویا اس فعل کی جزا یہ قتل اور پھانسی دی گئی ہے اللہ تعالیٰ ابن زبیر پر رحم فرمائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کے درمیان دوسری حدیث میں تفریق کی ہے۔ ہمیں میرے باپ نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابونعیم نے بتایا فرمایا ہمیں محمد بن مسلم نے بتایا انہوں نے یزید بن عبداللہ بن اسامۃ بن الہاد لیثی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تو ہم میں سے کسی کو باقی چھوڑنے والی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! مومن کو اس کی جزا دنیا میں دی جائے گی اور کافر کو اس کی جزا قیامت کے روز دی جائے گی۔ ہمیں جارود نے بتایا فرمایا ہمیں وکیع، ابومعاویہ اور عبدہ نے بتایا انہوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے انہوں نے ابوبکر بن ابی زبیر ثقفی سے روایت کیا فرمایا: جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اس کے ہوتے ہوئے صلاح کیسے ہوگی ہر کام جو ہم نے کیا ہمیں اس کی جزا ملے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ نے تجھے معاف کر دیا ہے، کیا تو تھکتا نہیں ہے؟ کیا تو غمگین نہیں ہوتا ہے؟ کیا تجھے محنت و مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ حضرت ابوبکر نے عرض کی: کیوں نہیں۔ فرمایا: اس کے ذریعے تمہیں جزا دی جاتی ہے۔ قرآن میں مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ میں اجمال تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان کر دی۔

ترمذی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے فرمایا: ''اے ابوبکر! تجھے اور مومنین کو برائی کی جزا دنیا میں دے دی جاتی ہے حتیٰ کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے ملو گے تو تمہارا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ رہے دوسرے لوگ (کافر) ان کے لیے وہ جزا کو جمع کرے گا حتیٰ کہ وہ قیامت کے روز اس کی جزا دیے

1۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 132، فصل نمبر 95

جائیں گے'' (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اور اس کی سند میں مقال ہے۔ موسیٰ بن عبیدہ کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان اور امام احمد بن حنبل نے ضعیف قرار دیا ہے اور موسیٰ بن سباع مجہول ہے۔ یہ حدیث ایک اور طریق سے حضرت ابوبکر سے مروی ہے لیکن اس کی صحیح سند نہیں ہے اور یہ حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کو اسماعیل بن اسحاق قاضی نے نقل کیا ہے فرمایا ہمیں سلیمان بن حرب نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں حماد بن سلمہ نے بیان کیا، انہوں نے علی بن زید سے روایت کیا، انہوں نے اپنی ماں سے روایت کیا کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کے بارے پوچھا: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ (بقرہ: 284) اور اس آیت کے متعلق پوچھا: مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ تو حضرت عائشہ نے کہا: جب سے میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہے مجھ سے کسی نے اس کے متعلق نہیں پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! انسان کو جو تکلیف پہنچتی ہے مثلاً بخار، مصیبت، کانٹا چبھتا ہے حتیٰ کہ وہ سامان جو انسان اپنی آستین میں رکھتا ہے پھر وہ اسے تلاش کرتے ہوئے پریشان ہوتا ہے پھر وہ اسے اپنے صندوق میں پالیتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو بدل دیتا ہے حتیٰ کہ مومن گناہوں سے اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح سونے کی پتری بھٹی سے صاف وشفاف نکلتی ہے'' (2)۔ لیس کا اسم ان تمام اقوال میں مضمر ہے تقدیر اس طرح ہے لیس الکائن من امورکم ماتتمنونہ بل من یعمل سوءً یجزبہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ثواب تمہاری امیدوں کے ساتھ نہیں ہے، کیونکہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۲۳﴾ یعنی مشرکین۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ (غافر) بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی) دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو برائی کرے گا اسے جزا ملے گی مگر یہ کہ وہ توبہ کرلے۔ ایک جماعت کی قرأت وَلَا یَجِدْ لَهٗ ہے۔ یجز پر عطف کی بنا پر جزم دی گئی ہے۔

ابن بکار نے ابن عامر سے روایت کیا ہے وَلَا یَجِدُ رفع کے ساتھ نئے کلام کے اعتبار سے ہے۔ اگر آیت کو کافر پر محمول کیا جائے تو کل اس کے لیے ولی ونصیر نہ ہوگا۔ اگر مومن پر محمول کی جائے تو اللہ کے علاوہ اس کا کوئی مددگار ونصیر نہ ہوگا۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ﴿۱۲۴﴾

''اور جس نے نیک عمل کیے اچھے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو سو وہی لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور نہ ظلم کیے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129

2۔ تفسیر درمنثور، جلد 2، صفحہ 402۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائیں گے تل بھر"۔

ایمان کو شرط قرار دیا، کیونکہ مشرکین کعبہ کی خدمت، حاجیوں کو کھانا کھلانے اور مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے پر اتراتے تھے اور اہل کتاب اپنی سبقت اور اپنے قول نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) کے ساتھ ڈینگیں مارتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ بغیر ایمان کے اچھے اعمال قبول نہیں۔ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ کو ابو عمرو اور ابن کثیر نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے باقی لوگوں نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے یعنی وہ اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔ نقیر کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اس سے مراد وہ نکتہ ہے جو گٹھلی کی پیٹھ میں ہوتا ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ۞

"اور کون بہتر ہے دینی لحاظ سے اس شخص سے جس نے جھکا دیا ہو اپنا چہرہ اللہ کے لیے اور وہ احسان کرنے والا ہو اور پیروی کی ملت ابراہیم کی اس حال میں کہ وہ ہر باطل سے منہ موڑے ہوئے ہو اور بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل"۔

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو تمام ادیان پر فضیلت دی ہے۔ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اس کا معنی ہے اس نے اپنے دین کو اللہ کے لیے خاص کیا اور عبادت کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جھکے اور متوجہ ہوئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں دینا کو نصب بیان کے اعتبار سے ہے۔ وَ هُوَ مُحْسِنٌ مبتدا خبر ہیں اور حال ہے یعنی وہ موحد ہو۔ اس میں اہل کتاب داخل نہیں، کیونکہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کو ترک کیا۔ الملۃ سے مراد دین ہے۔ الحنیف سے مراد مسلم ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ۞ ثعلب نے کہا: خلیل کو خلیل اس لیے کہا جاتا ہے، کیونکہ محبوب کی محبت اس کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی خلل نہیں چھوتی مگر اسے بھر دیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

تخللتَ مسلك الروح منّي وبه سُمِّيَ الخليلُ خليلاً

اے محبوب! ہاں جہاں جہاں میری روح کا گزر ہے وہاں تیرا عشق سمایا ہوا ہے اس وجہ سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔

خلیل فعیل کا وزن ہے بمعنی فاعل ہے جیسے علیم بمعنی عالم ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ معنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے تھے اور اللہ کے محبوب بھی تھے۔ بعض نے فرمایا: الخلیل اختصاص کے معنی سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس نے ابراہیم کو ان کے دور میں رسالت کے لیے خاص فرمایا۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا اور فرمایا: اس پر دلیل نبی کریم ﷺ کا قول ہے وقد اتخذ الله صاحبكم خليلاً(1) یعنی اللہ

1۔ صحیح مسلم، الفضائل الصحابہ، جلد 2، صفحہ 273

تعالیٰ نے تمہارے ساتھی کو خلیل بنایا۔ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو کنت متخذا خلیلاً لاتخذت ابابکر خلیلاً۔ (1) یعنی اگر میں کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرتا تو ابو بکر کو کرتا۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو دین کی کسی چیز کے ساتھ خاص فرمایا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: الخلیل کا معنی محتاج ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کا معنی ہوگا وہ اللہ کی بارگاہ کے محتاج اور فقیر ہیں گویا وہ جس کو حاجت ہو۔ زہیر نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا:

وان أتاه خليل يوم مسغبة   يقول لا غائب مالي ولا حرم

یعنی اگر بھوک کے دن کوئی محتاج اس کے پاس آتا ہے تو وہ کہتا ہے: نہ میرا مال غائب ہے اور نہ کوئی ممانعت ہے۔

زجاج نے کہا: خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت میں خلل نہ ہو۔ یہ جائز ہے کہ ان کو اللہ کا خلیل کہا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے محبت کی تھی اور اسے چن لیا تھا اور اس سے مکمل محبت کی تھی۔ اور اس اعتبار سے خلیل اللہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ اللہ کے فقیر تھے، کیونکہ انہوں نے فقر و فاقہ اختیار نہیں کیا تھا مگر اللہ کے لیے، وہ اس میں مخلص تھے۔ الاختلال کا معنی فقر ہے روایت ہے کہ جب انہیں منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا اور وہ ہوا میں تھے تو جبریل امین ان کے پاس آئے اور کہا کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟ ابراہیم نے کہا: تجھ سے تو نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی حضرت ابراہیم کے لیے خلت، اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیم کی مدد کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خلیل کو خلیل اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے دوست سے ملنے گئے تھے جو مصر میں تھا۔ بعض نے کہا: وہ موصل میں تھا آپ اس لیے اس کے پاس گئے تھے تاکہ اس کے پاس سے کھانا لے آئیں آپ نے اپنے ساتھی کو نہ پایا، آپ نے اپنی زنبیل میں ریت بھر لی اور گھر کی طرف چل پڑے، آپ نے وہ زنبیل رکھ دی اور خود سو گئے، گھر والوں نے اسے کھولا تو انہوں نے اس میں آٹا پایا اس نے اس سے روٹی حضرت ابراہیم کے لیے تیار کی۔ جب کھانا پیش کیا تو آپ نے پوچھا: یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے۔ گھر والوں نے کہا: یہ وہی ہے جو تم اپنے مصری دوست سے لائے ہو۔ آپ نے فرمایا: یہ میرے خلیل یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو خلیل اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض نے فرمایا: آپ نے کفار کے روساء کی مہمان نوازی کی اور انہیں تحائف دیئے اور ان سے حسن سلوک کیا، روساء نے پوچھا: تمہاری کیا حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: میری حاجت یہ ہے کہ تم سجدہ کرو، انہوں نے سجدہ کیا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے اللہ! میرے لیے جو ممکن تھا وہ میں نے کر دیا اب تو وہ کر جو تیری شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق دی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔ کہا جاتا ہے: جب ملائکہ حضرت ابراہیم کے پاس انسانوں کی شکل میں آئے اور آپ ان کے لیے بھونا ہوا موٹا بچھڑا لائے تو انہوں نے اسے نہ کھایا اور کہا: ہم بغیر قیمت کے کوئی چیز نہیں کھاتے، آپ نے انہیں فرمایا: اس کی قیمت دو اور کھاؤ۔ انہوں نے پوچھا: اس کی قیمت کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی ابتدا میں تم بسم اللہ کہو اور اس کے آخر میں الحمد للہ کہو۔ فرشتوں نے آپس میں کہا: اللہ تعالیٰ کو اس کو اپنا

1۔ صحیح مسلم، فضائل صحابہ، فضائل ابی بکر الصدیق، جلد 2، صفحہ 273۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 3381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خلیل بنانا چاہیے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنا دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا، کیونکہ وہ کھانا کھلاتے تھے اور سلام پھیلاتے تھے اور رات کو نماز پڑھتے تھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے تھے"۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے جبریل! اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل کیوں بنایا؟ اے پیارے محمد! (ﷺ) کھانا کھلانے کی وجہ سے (1)۔

بعض نے فرمایا: خلیل وہ ہوتا ہے جو اللہ کے لیے دوستی رکھتا ہے اور اللہ کے لیے دشمنی رکھتا ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان خلت کا مطلب دوستی ہے یہ تخلل الاسرار بین المتخالین سے مشتق ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الخلۃ سے ہے دونوں دوستوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی حاجت پوری کرتا ہے۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الرجل علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من یخالل (2)۔ انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

من لم تکن فی اللہ خُلَّتُہُ فخلیلۃ منہ علی خطرِ

جس کی دوستی اللہ کی رضا کے لیے نہیں اس کا دوست اس سے خطرے میں ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

إذا ما کنت متخذاً خلیلاً فلا تَثِقَنْ بکلِّ أخی إخاءِ

فإن خیرت بینھم فألصِق بأھل العقل منھم والحَیاءِ

فإن العقل لیس لہ اذاما تفاضلَت الفضائلُ من کِفاءِ

جب تو کسی کو خلیل بنانے والا ہو تو ہر بھائی چارہ رکھنے والے پر وثوق نہ کر، جب تو ان میں سے چناؤ کرے تو ان میں اہل عقل اور حیا داروں کا چناؤ کر، کیونکہ عقل کا کوئی ہم پلہ نہیں جب فضائل کا مقابلہ ہوتا ہے۔

حضرت حسان نے کہا تھا:

أخِلّاء الرجل ھُم کثیرٌ ولکن فی البلاء ھُمُ قلیلُ

فلا تغررْک خُلّۃُ من تواخی فمالک عند نائبۃٍ خلیل

وکل أخٍ یقول أنا وفی ولکن لیس یفعل ما یقول

سوی خلٍ لہ حسبٌ و دینٌ فذاک لما یقول ھو الفَعُول

مردوں کے دوست بہت ہوتے ہیں لیکن مصیبت میں وہ کم ہوتے ہیں۔ جس کو تو بھائی بنائے ہوئے ہے اس کی دوستی تجھے دھوکے میں نہ ڈالے۔ تیرا مال مصیبت کے وقت خلیل ہوتا ہے۔ ہر بھائی کہتا ہے کہ میں وفادار ہوں لیکن جو وہ کہتا ہے کرتا

1۔ شعب الایمان، باب اکرام الضیف، جلد 7، صفحہ 98

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 308

نہیں ہے، سوائے اس دوست کے جو حسب والا اور دین دار ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اسے کرنے والا ہوتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

''اور اللہ کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے میں لینے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ملک اور ایجاد کے اعتبار سے سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا اس کے حسن طاعت کی وجہ سے، نہ اسے اس کی دوستی کی حاجت تھی، نہ کثرت کے لیے اور نہ مدد کے لیے۔ اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہے جب زمین و آسمانوں کا سب کچھ اس کا ہے اس نے تو حضرت ابراہیم کو اس کے امتثال امر پر عزت و شرف بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کا اپنے علم سے احاطہ کیا ہوا ہے۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

''اور فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے عورتوں کے بارے میں۔ آپ فرمایئے: اللہ فتویٰ دیتا ہے تمہیں ان کے بارے میں اور وہ آیتیں جو پڑھی جاتی ہیں تم پر اس کتاب (قرآن) میں (ان میں احکام ہیں) ان یتیم بچیوں کے متعلق جنہیں تم نہیں دیتے ہو جو (حق) مقرر کیا گیا ہے ان کے لیے اور خواہش کرتے ہو کہ خود نکاح کرلو ان کے ساتھ (ان کا مال دبوچنے کے لیے) اور (قرآن میں احکام ہیں) کمزور بچوں کے متعلق اور (وہ یہ) کہ قائم رہو یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر اور جو کرو گے بھلائی (کے کاموں) سے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے''۔

یہ آیت کریمہ صحابہ کرام کے عورتوں کے متعلق سوال اور میراث میں ان کے احکام وغیرہ کے سبب سے نازل ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے یعنی جس کے متعلق تم نے پوچھا اس کا تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ یہ آیت ان احکام کی طرف راجع ہے جو اس سورت کے آغاز میں عورتوں کے امر کے متعلق گزر چکے ہیں اور ان کے لیے کچھ احکام باقی تھے جن کو ابھی تک لوگوں نے سمجھا نہیں تھا تو انہوں نے سوال کیا، انہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا جاتا تھا تو آپ جواب نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وحی نازل ہوتی تھی۔ اور وہ کتاب اللہ میں ہے: وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ...... وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ...... يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ...... وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ۔(1)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 503

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ، ما محل رفع میں ہے اس کا عطف اسم جلالت پر ہے معنی یہ ہے کہ قرآن تمہیں ان کے بارے فتویٰ دیتا ہے اور وہ یہ ہے فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ ارشاد ہے: وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ یعنی وہ ان سے نکاح کرنے کی رغبت نہیں رکھتے پھر عَنْ کو حذف کیا گیا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے یرغبون فی ان تنکحوھن یعنی وہ ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے تھے۔ پھر فی کو حذف کیا گیا۔ سعید بن جبیر اور مجاہد نے کہا: اس یتیم بچی سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتے تھے جب ان کا مال زیادہ ہوتا تھا (1)۔

حضرت عائشہ کی حدیث میں ہے: وترغبون ان تنکحوھن رغبۃ احدکم عن یتیمۃ التی تکون فی حجرۃ حتی تکون قلیلۃ المال والجمال (2)۔ یعنی جس کا مال اور جمال کم ہوتا تو اس سے نکاح میں رغبت نہیں رکھتے تھے۔ سورۃ کے آغاز میں یہ گزر چکا ہے۔

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾

''اور اگر کوئی عورت خوف کرے اپنے خاوند سے (اس کی) زیادتی یا روگردانی کی وجہ سے تو نہیں کوئی حرج ان دونوں پر کہ صلح کر لیں آپس میں اور صلح ہی (دونوں کے لیے) بہتر ہے اور موجود رکھا گیا ہے نفسوں میں بخل اور اگر تم احسان کرو اور متقی بنو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنِ امْرَأَةٌ فعل مضمر کی وجہ سے مرفوع ہے، مابعد فعل اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ خافت بمعنی توقعت یعنی اسے توقع ہو اور جنہوں نے خافت بمعنی تیقنت کہا ہے وہ غلط ہے۔ زجاج نے کہا: وان امراۃ خافت من بعلھا دوام النشوز۔ یعنی عورت کو اگر اپنے خاوند سے ہمیشہ زیادتی کا خوف ہو۔ نحاس نے کہا: نشوز اور اعراض کے درمیان فرق نہیں ہے۔ یہ نشوز کا مطلب دور ہونا ہے اور اعراض کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بات نہ کرے اور نہ اس سے محبت کرے۔ یہ آیت حضرت سودہ بنت زمعہ کے سبب نازل ہوئی۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت سودہ کو اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اسے طلاق دے دیں گے تو حضرت سودہ نے عرض کی (حضور!) آپ مجھے طلاق نہ دیں اور مجھے اپنے پاس رکھیں اور میری باری آپ عائشہ کے لیے کر دیں تو آپ ﷺ نے ایسا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ جس پر صلح کر لیں وہ جائز ہے۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن عیینہ نے زہیر سے انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت رافع بن خدیج کی بیوی خولہ بنت محمد بن

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 348 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 129

مسلمہ تھی حضرت رافع نے اسے ناپسند کیا۔ اس کے بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے تو اس نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو خولہ نے کہا: تو مجھے طلاق نہ دے اور میرے لیے جو چاہے باری مقرر کر۔ پس اس کے ساتھ سنت جاری ہوئی اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَ اِنِ امْرَاَةٌ الخ۔

بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا کے متعلق آپ نے فرمایا: ایک شخص کے پاس ایک عورت ہوتی تھی جس سے وہ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا وہ اسے جدا کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو وہ اسے کہتی: جو تو میرے متعلق فیصلہ کرے وہ مجھے منظور ہے (1)، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عام قراء کی قرأت: ان یصالحا ہے۔ اکثر کوفیوں نے ان یُصلحا پڑھا ہے۔ جحدری اور عثمان البتی نے ان یَصّلحا پڑھا ہے اس کا معنی یصطلحا ہے طا کو ص میں ادغام کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے ان جہلاء کا رد بھی سمجھ آتا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مرد جب عورت کی جوانی سے لطف اٹھالے اور وہ بوڑھی ہو جائے تو اسے اس کے بدلے دوسری عورت تبدیل کرنا مناسب نہیں۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: حضرت سودہ بنت زمعہ جب بوڑھی ہو گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند کیا، اس نے آپ سے عرض کی: آپ مجھے اپنے پاس رکھیں اور میری باری عائشہ کو دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ان کا وصال ہوا تو آپ کی ازواج میں سے تھیں (2)۔

میں کہتا ہوں: محمد بن مسلمہ کی بیٹی نے بھی ایسا ہی کیا۔ امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے حضرت رافع بن خدیج سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے محمد بن مسلمہ کی بیٹی سے نکاح کیا وہ ان کے پاس رہی حتیٰ کہ بوڑھی ہو گئی تو انہوں نے اس پر نوجوان لڑکی سے نکاح کر لیا اور نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی اور محمد بن مسلمہ کی بیٹی نے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس نے اسے ایک طلاق دے دی پھر اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ جب وہ حیض سے پاک ہوئی تو اس سے رجوع کر لیا پھر نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی، پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تو پھر ایک طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا، پھر نوجوان لڑکی کو اس پر ترجیح دی پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔ حضرت رافع نے کہا: اب تیری ایک طلاق باقی ہے اگر تو چاہے تو اس ترجیح کے باوجود ٹھہری رہے اگر تو چاہے تو میں تجھے جدا کر دوں۔ اس عورت نے کہا: میں اس ترجیح کے باوجود ٹھہری رہوں گی۔ پس حضرت رافع نے اسے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ حضرت رافع نے اپنے اوپر کوئی گناہ نہ دیکھا جب وہ اس ترجیح کے باوجود ان کے پاس ٹھہری رہی۔ اس کو معمر نے زہری سے ان الفاظ اور معانی کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ زائد ذکر کیا ہے کہ جو ہم تک خبر پہنچی ہے یہ وہ صلح ہے جس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا: فاثر الشابة علیها (رافع نے نوجوان لڑکی کو اس بوڑھی پر ترجیح دی) اس سے مراد نوجوان عورت کی طرف نفس کا میلان اور اس کے لیے نشاط ہے یہ مراد نہیں کہ حضرت رافع نے کھانے، پینے اور رات گزارنے میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 331 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 504

اس پر ترجیح دی تھی، کیونکہ حضرت رافع جیسے عظیم صحابی کے متعلق ایسا گمان نہیں کیا جاتا۔ ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے فرمایا ہمیں ابو الاحوص نے بتایا، انہوں نے سماک بن حرب سے روایت کیا ہے، انہوں نے خالد بن عرعرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس آیت کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا: یہ وہ عورت تھی جو کسی مرد کے نکاح میں ہوتی پھر وہ اس کی بدصورتی یا فقر یا کبر یا بد خلق ہونے کی وجہ سے اس سے آنکھیں پھیر لیتا اور وہ عورت اس سے جدائی کو پسند نہ کرتی، پھر اگر وہ اپنے مہر میں سے کچھ اس کے لیے معاف کر دیتی تو اس کے لیے وہ مال لینا حلال ہوتا اور اگر وہ اپنے ایام میں سے کچھ اس کے لیے کر دیتی تو کوئی حرج نہ ہوتا(1)۔ ضحاک نے کہا: وہ اپنے حق سے کچھ کم کر دے تو کوئی حرج نہیں جب وہ کسی نوجوان اور خوبصورت عورت سے نکاح کرے۔ مقاتل بن حیان نے کہا: وہ مرد جس کی بیوی بڑی عمر کی ہوتی پھر وہ اس پر ایک نوجوان عورت سے نکاح کر لیتا تو وہ اپنی بڑی بیوی کو کہتا: میں تجھے اپنے مال میں سے دوں گا اس شرط پر کہ میں اس نوجوان لڑکی کے لیے تیری نسبت زیادہ دن مقرر کروں گا وہ اس صلح پر راضی ہو جاتی، اگر وہ انکار کرتی اور راضی نہ ہوتی تو باری میں عدل کرنا مرد پر لازم ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ایسے حالات میں صلح کی تمام صورتیں جائز ہیں مثلاً مرد عورت کو کچھ مال دے اس شرط پر کہ وہ صبر سے رہے یا عورت کچھ دے اس شرط پر کہ خاوند کے اس پر ترجیح دینے کے باوجود وہ اس کے پاس ٹھہری رہے یا وہ ترجیح دے اور عصمت کے ساتھ اسے روکے رکھے یا صبر پر یا ترجیح پر بغیر کچھ عطا کیے صلح واقع ہو جائے، یہ سب صورتیں مباح ہیں(3)۔ اور یہ بھی جائز ہے کوئی عورت اپنی سوکن سے کسی چیز کے بدلے اپنی باری کے متعلق صلح کر لے جو وہ اسے عطا کرے گی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے کیا تھا۔

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ پر ناراض ہوئے تو اس نے حضرت عائشہ سے کہا: میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صلح کرا میں نے اپنی باری تجھے ہبہ کر دی۔ یہ ابن خویز منداد نے احکام میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ پر ناراض ہوئے تو مجھے صفیہ نے کہا: کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرے اور میری باری تیرے لیے ہو؟ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے زعفران سے رنگا ہوا دوپٹہ اوڑھا جو میرے پاس تھا اور میں نے اس پر مزید زعفران چھڑکا پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ کے قریب بیٹھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھ سے دور ہو جا یہ تیرا دن نہیں ہے“۔ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، پھر میں نے سارا واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ سے راضی ہو گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے درمیان مساوات کو ترک کرنا اور بعض کو بعض پر ترجیح دینا جائز نہیں مگر یہ کہ مفضولہ کی اجازت اور رضا سے ترجیح جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ کوفیوں نے یُصْلِحَا پڑھا ہے اور باقی قراء نے ان یَصَّالَحَا پڑھا ہے۔ جحدری نے یَصْلِحَا پڑھا ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 355 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 167-166 3۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 119

جنہوں نے یصالحا پڑھا ہے اس کی وجہ یہ کہ عرب کی کلام میں معروف ہے کہ جب کسی قوم کے درمیان جھگڑا ہوتو کہا جاتا ہے: تصالح لقوم یہ نہیں کہا جاتا: اصلح القوم۔ اگر اصلح ہوتا تو اس کا مصدر اصلاحا ہوتا اور جنہوں نے یصلحا پڑھا ہے اس نے جھگڑے اور تنازع میں اس کی مثل استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فاصلح بینھم اور صلحاً کو نصب اس قرأت کی بنا پر مفعول کی حیثیت سے ہے اور عطا کی مثل اسم ہے جیسے وہ اعطیت سے اسم ہے اصلحت صلحاً، اصلحت امرأ کی مثل ہے اسی طرح یصلحا پڑھنے والے کی قرأت پر بھی مفعول ہوگا، کیونکہ باب تفاعل کبھی متعدی آتا ہے اور یہ مصدر ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے اس کے زوائد کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے یصلحا پڑھا تو اس کی اصل یصتلحا ہے پھر یصطلحا بن گیا پھر طاء کو صاد سے بدلا گیا پھر صاد کو صاد میں بدلا گیا صاد کو طا سے نہیں بدلا، کیونکہ اس میں آواز لمبی ہو جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یہ لفظ عام مطلق ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ حقیقی صلح جس سے نفوس کو سکون ملے اور اس سے اختلاف زائل ہو، وہ طلاق سے بہتر ہے۔ اور اس معنی میں داخل ہیں وہ تمام صورتیں جس پر مرد اور عورت کے درمیان صلح قائم ہو، مال میں ہو یا وطی میں ہو یا کسی اور اعتبار سے ہو۔ خَيْرٌ یعنی جدائی سے بہتر ہے، اختلاف، کینہ، ناراضگی پر قائم رہنا شر کے قواعد میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنی کے بارے فرمایا: انها الحالقة (1) یعنی یہ دین کو ختم کرنے والی ہے نہ کہ بالوں کو مونڈنے والی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ یہ خبر دی گئی ہے کہ بخل ہر نفس میں رکھا گیا ہے، انسان اپنی جبلت اور خلقت کی وجہ سے بخل کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بخل اسے ناپسندیدہ چیزوں سے نفرت کرنے پر ابھارتا ہے۔ کہا جاتا ہے: شح یشح۔ ابن جبیر نے کہا: یہ عورت کا اپنے خاوند سے نفقہ کے بارے بخل کرنا اور اپنی باری کے ایام کے بارے بخل کرنا ہے۔ ابن زید نے کہا: بخل سے یہاں مراد مرد اور عورت کا بخل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ بہتر ہے، کیونکہ غالب طور پر عورت اپنے خاوند سے اپنے حصہ کے لیے بخل کرتی ہے اور خاوند غالب طور پر نوجوان عورت سے اپنے حصہ پر بخل کرتا ہے۔ الشح کا مطلب ہے اپنے نظریات وعقائد پر اور ارادہ پر ضبط کرنا۔ ہم اور اموال میں ضبط کرنا وغیرہ۔ یہ دین کے معاملہ میں ہو تو محمود ہے اس کے علاوہ ہو تو مذموم ہے اس کے متعلق اللہ نے فرمایا: وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۞ (الحشر) اور وہ جو حقوق شرعیہ کی ادائیگی سے مانع ہو یا ایسی چیز کے کرنے سے جس کا مروت تقاضا کرتی ہو وہ بخل رزیل ہے (2)۔ جب بخل ان اخلاق مذمومہ اور خصائل لئیمہ کی طرف راجع ہو تو اس کے ساتھ امید افزا خیر اور کوئی نیک صلاح باقی نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں: روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو کہا: "تمہارا سردار کون ہے"۔ انہوں نے کہا: جد بن قیس، اس بخل کے باوجود جو اس میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أي داء أدوى من البخل کون سی بیماری بخل سے بڑی ہے؟ انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! یہ کیسے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک قوم سمندر کے ساحل پر اتری انہوں نے اپنے بخل کی وجہ سے مہمانوں کے پاس آنا ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا: ہم میں سے مرد عورتوں سے جدا ہو جائیں تا کہ مرد، مہمانوں سے

1۔ المستدرک للحاکم، معرفۃ الصحابہ، جلد 3، صفحہ 242 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 120

عورتوں کی دوری کا عذر پیش کریں اور عورتیں مردوں سے دوری کا عذر پیش کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، ان پر زمانہ لمبا ہو گیا تو ان کے مرد، مردوں اور عورتیں عورتوں سے مشغول ہو گئیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کو ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یہ شرط ہے اور فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ جواب ہے۔ یہ مردوں کو خطاب ہے اس حیثیت سے کہ خاوند کے لیے بخل کرتا ہے اور یہ اچھا نہیں ہے یعنی اگر تم عورتوں سے حسن سلوک کرو گے اس طرح کہ ان کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کے ساتھ رہو گے اور ان پر ظلم نہیں کرو گے تو یہ تمہارے لیے افضل ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

''اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی بیویوں کے درمیان اگرچہ تم اس کے بڑے خواہش مند بھی ہو تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ (ایک بیوی کی طرف) بالکل اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ (درمیان میں) لٹک رہی ہو اور اگر تم درست کر لو (اپنا رویہ) اور پرہیز گار بن جاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ تم عورتوں کے درمیان عدل و مساوات کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ طبعی محبت جماع اور قلبی لگاؤ کے اعتبار سے ہے پس اللہ تعالیٰ نے بشری حالت کو بیان فرمایا اور یہاں فرمایا کہ خلقت کے اعتبار سے وہ کسی ایک کی طرف میلان قلب پر قابو نہیں رکھتے اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی تھی: اللهم ان هذه قسمتی فیما املك فلا تلمنی فیما تملك ولا املك (1)۔ اے اللہ یہ میری تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں اور مجھے اس میں ملامت نہ کرنا جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں۔ پھر نہی فرمائی اور فرمایا: فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ۔ مجاہد نے کہا: تم برائی کا ارادہ نہ کرو بلکہ باری مقرر کرنے میں اور خرچہ میں برابری کو لازم پکڑو، کیونکہ اس کی انسان کو طاقت ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۂ احزاب میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قتادہ نے نضر بن انس سے انہوں نے بشیر بن نہیک سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کی دو بیویاں ہوں گی اور وہ ان کے درمیان عدل نہیں کرے گا تو وہ قیامت کے دن آئے گا جب کہ اس کی ایک طرف جھکی ہوئی ہو گی'' (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ یعنی وہ نہ مطلقہ ہو، نہ خاوند والی ہو (3)۔ یہ حسن کا قول ہے۔ یہ کسی معلق چیز سے تشبیہ ہے، کیونکہ وہ چیز نہ زمین پر قرار پذیر ہوتی ہے اور نہ اس پر ہوتی ہے جس سے لٹکائی گئی ہوتی ہے۔ یہ قول ان کی ضرب المثال میں عام ہے: ارض من المركب بالتعليق اور نحویوں کے عرف میں یہ فعل کی تعلیق سے ہے۔ اسی سے ام زرع کی حدیث میں عورت کا قول ہے زوجی العشنق میرا خاوند لمبا تڑنگا ہے اگر میں بولوں تو مجھے طلاق دی جائے اور اگر میں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 290 2۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 168 3۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 373

خاموش رہوں تو میں معلق رہوں گی (1)۔

قتادہ نے کہا: وہ قیدی عورت کی طرح ہے (2)۔ حضرت ابی نے فَتَذَرُوْهَا كَالْمَسْجُوْنَةِ (3) پڑھا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فَتَذَرُوْهَا كَاَنَّهَا معلقة پڑھا ہے اور فتذروھا کا محل نصب ہے کیونکہ نہی کا جواب ہے اور کالمعلقة میں کاف بھی محل نصب میں ہے۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

"اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے۔ اور اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بے شک ہم نے حکم دیا ان لوگوں کو جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور (حکم دیا) تمہیں بھی کہ ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور اگر کفر کرو تو بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ یعنی اگر صلح نہ کریں بلکہ جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے متعلق اچھا گمان کریں، اللہ تعالیٰ مرد کو ایسی بیوی دے گا جس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور عورت کو ایسا مرد عطا فرمائے گا جو اس پر کشادگی کرے گا۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے غربت کی شکایت کی تو انہوں نے اسے نکاح کرنے کا حکم دیا، وہ شخص گیا اس نے نکاح کر لیا پھر وہ آیا اور غربت کی شکایت کی، انہوں نے اسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا پھر ان سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے اسے نکاح کا حکم دیا کہ شاید وہ اس آیت والوں سے ہو: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: 32) جب وہ اس آیت کے مصداق لوگوں سے نہیں تھا تو میں نے اس کو طلاق کا حکم دیا میں نے کہا: شاید یہ اس آیت کے مصداق لوگوں سے ہو: وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی تقویٰ کا حکم تمام امتوں میں عام تھا، تقویٰ کے متعلق قول گزر چکا ہے وَ اِيَّاكُمْ کا عطف الذین پر ہے۔ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ محل نصب میں ہے الاخفش نے کہا یعنی بان اتقوا اللہ۔ بعض عارفین نے کہا۔ یہ آیت قرآن کی آیات کا مدار ہے کیونکہ تمام قرآن اس پر گھومتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، یعنی تقویٰ کا حکم یہ تمام امتوں کو عام ہے اور تقویٰ

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 779 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 367 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 168

کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَ اِيَّاكُمْ الَّذِيْنَ پر اس کا عطف ہے۔ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ محل نصب میں ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی بأن اتقوا اللہ اور بعض عارفین نے کہا: یہ آیت قرآن کریم کی چکی ہے کیونکہ سارا قرآن اس پر گھومتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟ تو اس کے دو جواب ہیں۔

(۱) تاکید کے لیے تکرار فرمایا تاکہ بندے متنبہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی ملک و ملکوت میں جو کچھ ہے اس میں غور و فکر کریں وہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ تکرار کے کئی فوائد ہیں پہلے میں یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے غنی کر دے گا، کیونکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے پھر فرمایا: ہم نے تمہیں اور اہل کتاب کو تقویٰ کا حکم دیا اگر تم انکار کرو گے تو وہ تم سے بے نیاز ہے، کیونکہ اسی کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ پھر تیسری مرتبہ ذکر کرنے میں اپنی تخلیق کی حفاظت اور ان کی تدبیر کے متعلق آگاہ کیا فرمایا: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا یعنی اللہ تعالیٰ کارساز کافی ہے، کیونکہ اسی کا ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ فرمایا: مَا فِي السَّمٰوٰتِ اور من فی السماوات نہیں فرمایا، کیونکہ جنس کا اعتبار کیا گیا اور آسمانوں اور زمینوں میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں ہیں۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝

''اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر چاہے تو لے جائے تمہیں موت کے ساتھ اَيُّهَا النَّاسُ یہ خطاب مشرکین و منافقین کو ہے۔ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ اور تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کو لے آئے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان فارسی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ہم قوم هذا وہ اس کی قوم ہے۔ بعض نے فرمایا: آیت عام ہے یعنی اگر تم انکار کرو گے تو وہ تمہیں لے جائے گا اور ایسی مخلوق لے آئے گا جو تم سے زیادہ اللہ کی اطاعت گزار ہو گی۔ یہ اس طرح ہے جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ (محمد) اس آیت میں ہر اس شخص کو تنبیہ کی گئی ہے اور ڈرایا گیا ہے جس کو کوئی ولایت، امارت اور ریاست حاصل ہے اور وہ اپنی رعیت سے انصاف نہیں کرتا یا وہ عالم ہے اور اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا اور لوگوں کو نصیحت نہیں کرتا وہ اسے لے جائے اور کوئی دوسرا لے آئے۔

وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ قدرت اللہ تعالیٰ کی ازلی صفت ہے اس کی مقدورات لامتناہی ہیں جس طرح اس کی معلومات لامتناہی ہیں، اس کی صفات میں ماضی اور مستقبل ایک جیسا ہے۔ ذکر میں ماضی کو خاص کیا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ وہ اپنی ذات اور صفات میں حادث ہے۔ قدرت سے مراد وہ قدرت ہے جس کے ساتھ فعل ہوتا ہے اس کے ہوتے ہوئے عجز کا وجود جائز نہیں ہوتا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا

بَصِیۡرًا ﴿۱۳۴﴾

"جو شخص ارادہ کرتا ہو صرف ثواب دنیا کا (تو یہ اس کی اپنی کم نظری ہے) اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے"۔

یعنی جو آخرت کی طلب کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرائض پر عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں اس کا ثواب عطا فرمائے گا اور جو دنیا طلب کرنے کے لیے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے وہ عطا فرمائے گا جو اس نے دنیا میں اس کے لیے کیا ہے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی ثواب نہ ہوگا، کیونکہ اس نے غیر اللہ کے لیے عمل کیا جیسا کہ اللہ نے فرمایا: وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (الشوریٰ) اور نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ (ہود: 16) یہ وہ لوگ ہیں نہیں ان کے لیے آخرت میں بجز آگ کے۔

اس مفہوم کی بناء پر سابقہ آیت سے مراد منافقین و کفار نہ ہوں گے۔ یہ طبری کا اختیار ہے۔ روایت ہے کہ مشرکین قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے تا کہ دنیا میں وہ ان پر وسعت فرمائے اور ان سے مصائب کو دور کرے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ یعنی جو وہ کہتے ہیں اسے وہ سنتا ہے اور جو وہ پوشیدہ کرتے ہیں اسے دیکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

"اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر، گواہی دینے والے محض اللہ کے لیے چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف (جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے) وہ دولت مند ہو یا فقیر۔ پس اللہ زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا۔ تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے"۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ۔ مبالغہ کا صیغہ ذکر فرمایا یعنی تمہاری طرف سے عدل کا قیام بار بار ہو اور وہ تمہاری شہادت میں عدل ہے خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہو۔ اور انسان کا اپنے خلاف گواہی دینے کا مطلب ہے اپنے اوپر حقوق کا اقرار کرنا ہے پھر والدین کا ذکر فرمایا، کیونکہ ان کے ساتھ نیکی کرنا واجب ہے اور ان کی قدر بہت عظیم ہے پھر قریبی رشتہ داروں کا ذکر فرمایا، کیونکہ وہ مودت اور تعصب کی جگہ ہیں، اجنبی شخص تو زیادہ اس بات کا لائق ہے کہ اس پر انصاف کو قائم کیا جائے اور اس کے خلاف سچی گواہی دی جائے۔ اسی سورت میں مخلوق کے حقوق جو اموال میں ہیں ان کی حفاظت پر

کلام آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے احکام کی صحت میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور بچے کی شہادت والدین کے خلاف نافذ ہے اور والدین سے حسن سلوک اس سے مانع نہیں ہے بلکہ ان کے خلاف گواہی دینا اور انہیں باطل سے بچانا ان سے حسن سلوک کرنے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: 6) اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ کا یہی معنی ہے۔ اگر بیٹا والدین کے لیے گواہی دے یا والدین بیٹے کے لیے گواہی دے تو یہ صورت ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس میں قدیم و جدید علماء میں اختلاف ہے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: سلف صالحین والدین اور بھائی کی شہادت کو جائز قرار دیتے تھے اور بطور دلیل یہ آیت پیش کرتے تھے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ سلف صالحین میں سے کوئی ایک بھی اس سلسلہ میں متہم نہیں کیا گیا۔

پھر لوگوں سے ایسے امور ظاہر ہوئے جنہوں نے والیوں کو ان کے اتہام پر ابھارا پس جس پر اتہام ہو سکتا ہے اس کی شہادت کو ترک کیا گیا اور یہ اس طرح ہو گیا کہ بچے، والد، بھائی، خاوند اور بیوی میں گواہی جائز نہیں۔ یہ حسن، نخعی، شعبی، شریح، امام مالک، امام ثوری، امام شافعی اور امام ابن حنبل کا مذہب ہے۔ اور ایک قوم نے ان کی آپس میں گواہی کو جائز قرار دیا جب کہ یہ عادل ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے اور اسحاق، ثوری اور مدنی کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا مذہب بھائی کی بھائی کے حق میں شہادت کے جواز کا مذہب ہے جب کہ وہ عادل ہو مگر نسب کے جھگڑا میں نہیں۔ ابن وہب نے ان سے روایت کیا ہے کہ بھائی کی بھائی کے حق میں گواہی جائز نہیں جب کہ وہ اس کے عیال میں ہو یا مال کے حصہ میں ہو جس کا وہ وارث ہو(1)۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے کہا: خاوند کی بیوی کے حق میں گواہی قبول نہ ہو گی، کیونکہ ان کے درمیان املاک کے منافع جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یہ محل شہادت ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میاں، بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی قبول ہے، کیونکہ دونوں اجنبی ہیں، ان کے درمیان زوجیت کا عقد ہے جو زائل ہونے والا ہے اور اصل شہادت کا قبول کرنا ہے مگر جہاں کسی مخصوص سے خاص کیا ہو پس یہ اصل پر باقی ہے۔ یہ ضعیف ہے کیونکہ زوجیت محبت، مواصلت، الفت، محبت کا موجب ہے(2)، پس اس میں تہمت قوی اور ظاہر ہے۔

ابوداؤد نے سلیمان بن موسیٰ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خائن مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی شہادت رد فرمائی اور جس کی اپنے بھائی سے دشمنی تھی اس کی شہادت اپنے بھائی کے خلاف رد فرمائی اور قانع (سائل) کی اپنے مالکوں کے حق میں گواہی رد فرمائی اور دوسرے لوگوں کے لیے جائز فرمائی(3)۔ خطابی نے کہا: ذوالغمرہ وہ ہوتا ہے جس کی اپنے مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی گئی ہے) سے دشمنی ظاہر ہو پس تہمت کی وجہ سے اس کی شہادت رد کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: دشمن کے خلاف اس کی گواہی قبول ہے جب کہ وہ عادل ہو۔ قانع سے مراد سائل اور کھانا طلب کرنے والا ہے۔ القنوع کی اصل سوال ہے۔ القانع کے بارے میں کہا جاتا ہے: جو قوم سے جدا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 507　2۔ ایضاً، صفحہ 508　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 151

ہو اور ان کی خدمت کرتا ہو اور ان کی ضروریات میں سے ہو۔ یہ اجیر یا وکیل کی طرح ہے۔ اس کی شہادت کے رد کی وجہ اپنی منفعت کی وجہ سے تہمت ہے، کیونکہ قانع اپنے مالکوں، موکلوں سے نفع پائے گا اس نفع سے جو انہیں پہنچے گا۔ ہر وہ شخص جو اپنی شہادت سے اپنی ذات کے لیے نفع حاصل کرے اس کی شہادت مردود ہے، جیسے کوئی شخص کسی کے حق میں گھر خریدنے کی گواہی دے جب کہ وہ خود شفیع ہو یا جس طرح کسی کے لیے کسی پر قرض کا فیصلہ کیا گیا جب کہ وہ مفلس ہے پھر وہ مفلس ایک شخص پر دین (قرض) وغیرہ کی گواہی دے۔ خطابی نے کہا: جس نے قانع کی شہادت کا مالکوں اور موکلوں کے حق میں رد ہونا منفعت کے حصول کی وجہ سے ہے، پس اس پر قیاس کر کے خاوند کی بیوی کے حق میں بھی شہادت رد ہونی چاہیے، کیونکہ ان کے درمیان منفعت کے حصول کی تہمت اس سے زیادہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہی نظریہ ہے۔ اور حدیث ان علماء کے خلاف حجت ہے جو باپ کی بیٹے کے حق میں شہادت کو جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ فطری محبت اور جبلی میلان کی وجہ سے وہ ان سے نفع حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کے مال کا مالک ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انت و مالك لابیك (1) تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک جن کی گواہی مردود ہے ان میں سے بدوی کی شہری کے خلاف گواہی ہے فرمایا: مگر یہ کہ وہ دیہات یا شہر میں ہو اور وہ جو شہر میں دیہاتی کو گواہ بناتا ہے اور اپنے پڑوسی شہریوں کو چھوڑتا ہے تو میرے نزدیک مشکوک ہے۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ بدوی (دیہاتی) کی گواہی شہری کے خلاف جائز نہیں" (2)۔ محمد بن عبدالحکم نے کہا: امام مالک نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ یہاں حقوق اور اموال میں شہادت مراد ہے لیکن خونوں میں اور جو معاملات اس کے ہم معنی ہیں جن کو مخلوق طلب کرتی ہے ان کے بارے اس کی شہادت رد نہ ہوگی۔ عام اہل علم نے کہا: بدوی کی شہادت جب کہ وہ عادل ہو تو وہ جو شہادت بھی دے جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

اس پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور مزید سورۂ براۃ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **شُهَدَآءَ لِلّٰهِ** اس کو نصب **قَوّٰمِیْنَ** کی نعت کے اعتبار سے ہے اگر تو چاہے تو خبر کے بعد خبر بنا دے۔ نحاس نے کہا: ان دونوں تراکیب سے بہتر یہ ہے کہ نصب حال کی بنا پر ہو اور ذوالحال وہ ہو جو **قَوّٰمِیْنَ** میں ایمان والوں کے ذکر میں سے ہے، کیونکہ وہ نفس معنی ہے یعنی: کونوا قوامین بالعدل عند شهادتكم۔ یعنی تم اپنی گواہی کے عدل کو قائم کرنے والے ہو۔ ابن عطیہ نے کہا: اس معنی میں اس میں حال ضعیف ہے، کیونکہ یہ شهادتكم کے معنی کی طرف عدل کو قائم کرنے کی تخفیف ہے۔ شہداء غیر منصرف ہے، کیونکہ اس میں الف تانیث ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لِلّٰهِ**۔ اس کا معنی ہے اللہ کی ذات کے لیے اور اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے ثواب کے لیے۔ **وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ**۔ یہ شہداء کے متعلق ہے۔ یہ وہ ظاہر مفہوم ہے جس کے ساتھ مفسرین نے تفسیر کی ہے اور یہ مذکورہ شہادت حقوق میں ہے پس اس شہادت کے ذریعے حقوق والوں کے حقوق کو وہ قریب کرے گا۔ اپنے نفس پر شہادت کے قیام کا یہی معنی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس کے ساتھ ادب سکھایا ہے، جیسا کہ حضرت ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ماللرجل من مال ولدہ، صفحہ 167	2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، صفحہ 173-172

عباس نے فرمایا: انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ حق بات کہیں اگرچہ اپنے ہی خلاف ہو(1)۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کا معنی ہو اللہ کی وحدانیت کے گواہ بنو۔ اور وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ کا تعلق قَوّٰمِیْنَ کے ساتھ ہو۔ پہلی تاویل زیادہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ کلام میں اضمار ہے اور وہ کان کا اسم ہے یعنی ان یکن الطالب او المشهود علیه غنیا۔ یعنی اگر گواہی طلب کرنے والا یا جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے وہ غنی ہو تو اس کی غنا کا خیال نہیں کیا جائے گا اور اس سے ڈرا نہیں جائے گا اور اگر وہ فقیر ہو تو اس پر مہربانی کرنے کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ (فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا) یعنی جو اس نے ان کے لیے فقر اور غنا میں سے جو اختیار کیا ہے وہ ان کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ سدی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک غنی اور فقیر نے جھگڑا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان فقیر کے ساتھ ہوا اور آپ نے خیال کیا کہ فقیر غنی پر ظلم نہیں کرتا تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔

مسئلہ نمبر 7۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے بِهِمَا فرمایا بہ نہیں فرمایا اگرچہ او ایک کے حصول پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں میں سے ہر ایک کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ اخفش نے کہا: او کبھی بمعنی واو ہوتا ہے۔ یعنی ان یکن غنیا و فقیرا فالله اولی بالخصمین کیفما کانا۔ اگر وہ غنی ہو یا فقیر ہو اللہ تعالیٰ جھگڑنے والوں کا زیادہ خیر خواہ ہے جیسے بھی ہوں۔ اس میں ضعف ہے۔ بعض نے فرمایا: بِهِمَا فرمایا، کیونکہ ان دونوں کا ذکر پہلے گزرا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ۔

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ یہ ہلاک کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص:26) پس فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی، وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے۔

کیونکہ خواہش نفس کی اتباع ناحق شہادت پر ابھارتی ہے اور حکم میں ظلم پر برانگیختہ کرتی ہے۔ شعبی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حکام سے تین چیزوں کا عہد لیا (۱) کہ وہ خواہشات نفس کی پیروی نہ کریں (۲) لوگوں سے نہ ڈریں اور صرف اللہ سے ڈریں (۳) اللہ تعالیٰ کی آیات کو قلیل ثمن کے عوض نہ بیچیں۔ اَنْ تَعْدِلُوْا محل نصب میں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا۔ وان تلووا بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ لویت فلانا حقه لیاً سے مشتق ہو گا جس کا معنی ہے میں نے اسے اس کا حق دیا۔ اس سے فعل لوی ہے اصل میں لَوَیَ تھا یا کو الف سے بدلا، کیونکہ یا متحرک ماقبل مفتوح تھا۔ اور مصدر لیا ہے اصل میں لَوْیًا تھا اور لیانا اصل میں لویانا تھا پھر واؤ کو یا میں ادغام کیا گیا۔ قتبی نے کہا: تلووا، اللیی سے ہے یعنی شہادت میں ہیر پھیر کرنا اور کسی ایک خصم کی طرف میل ہونا۔ ابن عامر اور کوفیوں نے تلوا پڑھا ہے اس نے ارادہ کیا کہ اس کے امر کے لیے کھڑے ہو اور پھر اعراض کرو۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: ولیت الامر۔ میں نے کام سپرد کیا۔ اس صورت میں کلام میں امر کے قیام سے اعراض کی وجہ سے توبیخ کا معنی ہو گا۔ بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 373 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 535

تلوا کا معنی ہے اعراض کرنا۔ پس لام کے ضمہ کے ساتھ قرأت دو معانی کو مفید ہے ولایت اور اعراض اور دو واؤ کی قرأت ایک معنی کے لیے مفید ہے اور وہ اعراض کرنا ہے۔ بعض نحویوں نے کہا: جس نے تَلُوا پڑھا اس نے غلطی کی، کیونکہ یہاں ولایت کے معنی کے لیے نہیں ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا: یہ لازم نہیں آتا بلکہ تَلُوا بمعنی تَلْوُدا ہوگا۔ اور تَلُوْا کی اصل تَلْوُدا ہے ضمہ اس واؤ پر دشوار تھا جس کے بعد دوسری واؤ ہے تو اس کی حرکت لام کو دی گئی اور التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک واو حذف کی گئی۔ یہ لام ساکن اور دو واؤ کی قرأت کی طرح ہے یہ مکی نے ذکر کیا ہے۔

زجاج نے کہا: یہ اپنی قرأت پر وان تلنوا تھا۔ پھر پہلی واؤ کو ہمزہ دیا پھر لام پر اس کی حرکت دینے کی وجہ ہمزہ میں تخفیف کی گئی تو تلوا ہو گیا اصل میں تلووا تھا۔ اس تقدیر پر دونوں قرأتیں متفق ہو گئیں۔ یہ نحاس، مکی اور ابن عربی وغیرہم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا یہ معنی ہے دو خصم قاضی کے سامنے بیٹھیں پھر قاضی ایک کی طرف میلان کرے اور دوسرے سے اعراض کرے (1)۔ اس اعتبار سے الّیّ کا معنی ہوگا کلام میں ٹال مٹول کرنا اور اس کو کھینچنا تاکہ حق کا فیصلہ فوت ہو جائے اور فیصلہ اس کے حق میں نافذ کرے جس کی طرف قاضی کا میلان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے بعض قاضیوں کو دیکھا وہ ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کے لیے کافی ہے (2)۔

حضرت ابن عباس، سدی، ابن زید، ضحاک اور مجاہد نے کہا: یہ گواہوں کے بارے میں ہے، گواہ اپنی زبان سے ہیر پھیر کرے اور سچی گواہی نہ دے یا حق کی ادائیگی سے اعراض کرے۔ آیت کا لفظ عام ہے قاضیوں اور گواہوں کو شامل ہے ہر انسان کو عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے "مال والے کا حق کی ادائیگی سے ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور عقوبت کو حلال کرتا ہے" (3)۔ ابن اعرابی نے کہا: عقوبت سے مراد اس کو قید کرنا ہے اور عرض سے مراد اس کی شکایت ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ بعض علماء نے اس آیت سے غلام کی شہادت رد کرنے سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حاکم کو شاہد (گواہ) بنایا ہے اور یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ غلام اہل شہادت میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس سے مقصود اس مہم کے ساتھ مستقل ہونا ہے جب حاجت اس کا تقاضا کرے اور یہ غلام سے اصلاً ممکن نہیں ہے پس اس کی شہادت رد ہوگی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے اور جو کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی

1۔ تفسیر ابن عباس، جلد 1، صفحہ 289، دار التراث الاسلامی
2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 123
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 155

کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا یہ تمام مومنین کے متعلق نازل ہوئی معنی یہ ہے کہ اے تصدیق کرنے والو! اپنی تصدیق پر قائم رہو اور اس پر ڈٹے رہو۔ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ، الْكِتٰبِ سے مراد قرآن ہے۔ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ اس سے کتاب مراد ہے جو انبیاء کرام پر نازل ہوئی۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے نُزِّلَ اور اُنْزِلَ (ضمہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ نَزَّلَ اور انزل پڑھا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پر ایمان لائے تھے۔ بعض نے فرمایا: یہ منافقین کو خطاب ہے(1)، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اے ظاہراً ایمان لانے والو اللہ کے لیے اخلاص کا مظاہرہ کرو۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مشرکین ہیں معنی یہ ہے اے لات وعزیٰ اور طاغوت پر ایمان لانے والو! اللہ پر ایمان لاؤ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کی کتب کی تصدیق کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر بڑھتے گئے کفر میں نہیں ہے سنت الٰہی ان کے متعلق کہ بخش دے انہیں اور نہ (یہ) کہ پہنچائے انہیں راہ (راست) تک''۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عزیز علیہ السلام کا انکار کیا پھر حضرت عزیز علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار میں بڑھتے گئے۔ بعض علماء نے کہا: وہ لوگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان پھر حضرت عزیر علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضرت عزیر علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، نصاریٰ نے اس کا انکار کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جو آپ لے کر آئے تھے اس کے انکار میں بڑھتے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کفر کو تو بخشتا ہی نہیں پھر کیسے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر جب ایمان لاتا ہے تو اس کے کفر کو معاف کر دیا جاتا ہے پھر جب وہ کفر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر اس کے پہلے کفر کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہ اس طرح ہے جس طرح مسلم میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے فرمایا: کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہم سے ان اعمال کا مواخذہ ہوگا جو ہم زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تم میں سے اسلام میں اچھے اعمال کیے تو اس سے زمانہ جاہلیت کے اعمال کا مواخذہ نہ کیا جائے گا اور جو پھر کفر کرے گا تو اس سے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کے اعمال کا مواخذہ کیا جائے گا''(2)۔ ایک روایت میں ہے من اساء فی الاسلام اخذ بالاول والاخر(3) جو اسلام میں کفر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124 — 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 75

3۔ صحیح بخاری، باب اثم من اشرک باللہ، حدیث نمبر 6410، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرے گا اس سے پہلے زمانہ اور پچھلے زمانہ کے اعمال کا مواخذہ ہو گا۔

یہاں الاساءۃ (برائی) کا معنی کفر ہے کیوں کہ برائی کا ارتکاب مراد لینا یہاں صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسلام اپنے سے پہلے گناہوں کو ساقط نہیں کرتا ہے مگر جو تمام گناہوں سے محفوظ رہا مگر موت کے وقت۔ اور یہ بالاجماع باطل ہے۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا کا معنی ہے کفر پر اصرار کیا۔ لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی نہیں کرتا۔ سَبِيْلًا جنت کا راستہ۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ انہیں توفیق سے خاص نہیں کرتا جس طرح اپنے اولیاء کو خاص کرتا ہے۔ اس آیت میں اہل قدر پر رد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ کافروں کو خیر کے راستے کی ہدایت نہیں دیتا تا کہ انسان جان لے کہ وہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہدایت سے محروم ہوتا ہے۔ یہ آیت مرتدین کے حکم کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ مرتدین کے متعلق گفتگو سورۂ بقرہ میں وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ (بقرہ: 217) کے تحت گزر چکی ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾

"خوشخبری سنا دو منافقوں کو کہ بلاشبہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

التبشیر اس خبر کو کہتے ہیں جس کا اثر چہرے پر ظاہر ہو اس کا بیان پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور نفاق کا معنی بھی گزر چکا ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

"وہ منافق جو بناتے ہیں کافروں کو (اپنا) دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو (وہ سن لیں) عزت تو صرف اللہ کے لیے ہے سب کی سب"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

الَّذِيْنَ، المنافقین کی صفت ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسلمانوں میں جو معصیت کا ارتکاب کرے وہ منافق نہیں ہے، کیونکہ وہ کفار کو دوست نہیں بناتا۔ اس آیت کے ضمن میں کفار سے دوستی کی ممانعت بھی ہے اور وہ اعمال جو دین سے متعلق ہیں ان پر کافروں سے مدد لینا بھی منع ہے۔ صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ مشرکوں میں سے ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ وہ آپ کی معیت میں جہاد میں شریک ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تو واپس چلا جا ہم مشرک سے مدد حاصل نہیں کرتے" (1)۔ العزۃ اس کا معنی غلبہ ہے۔ عزّہ يعزّہ عزّا جب کوئی کسی پر غالب آجائے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا غلبہ اور قوت اللہ کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: يَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمْ اس سے مراد بنی قینقاع ہیں، کیونکہ ابن ابی نے بنی قینقاع سے دوستی لگائی تھی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 118

وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَاۨ ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۡ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جارہا ہے ان کا اور مذاق اڑایا جارہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (کفر واستہزاء کرنے والوں) کے ساتھ یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں، ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہوگے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں۔ وہ جو انتظار کررہے ہیں تمہارے (انجام) کا تو اگر ہو جائے تمہیں فتح اللہ کی طرف سے (تو) کہتے ہیں: کیا نہیں تھے ہم بھی تمہارے ساتھ؟ اور اگر ہو کافروں کے لیے کچھ حصہ (کامیابی سے) کہتے ہیں: کیا نہیں غالب آگئے تھے ہم تم پر؟ اور (اس کے باوجود) کیا نہیں بچایا تھا ہم نے تم کو مومنوں سے؟ پس (اے اہل نفاق!) اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ''۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا۔ یہ ان تمام لوگوں کو خطاب ہے جس نے ایمان کا اظہار کیا خواہ وہ سچا مسلمان ہے یا منافق ہے، کیونکہ جب اس نے ایمان کا اظہار کیا تو اسے کتاب اللہ کے احکام کی پیروی کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (انعام:68) یہ اس لیے نازل ہوا کہ منافقین یہودی علماء کے پاس بیٹھتے تھے اور قرآن کا مذاق اڑاتے تھے، عاصم اور یعقوب نے وقد نزّل نون اور زا کے فتحہ کے ساتھ اور زا کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اسم جلالت پہلے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ میں گزر چکا ہے۔ حمید نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے زا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے نُزِّلَ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ عاصم اور یعقوب کی قرأت پر محل نصب میں ہے، کیونکہ اس پر فعل واقع ہے اور باقی قراء کی قرأت پر محل رفع میں ہے، کیونکہ یہ فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے۔ يُكْفَرُ بِهَا یعنی جب تم آیات الٰہی کا استہزا اور کفر سنو۔ سماع کو آیات پر واقع کیا ہے مراد کفر اور استہزا کا سماع ہے جیسے تو کہتا ہے: سمعت عبد اللہ یلام یعنی میں نے عبداللہ کی ملامت سنی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ۔ کفر کے علاوہ۔ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ برائی کا

ارتکاب کرنے والوں سے اجتناب کرنے کی یہ دلیل ہے، جب ان سے کسی برائی کا ظہور ہو، کیونکہ جس نے ان سے اجتناب نہیں کیا وہ ان کے فعل سے راضی ہے اور کفر پر رضا بھی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ جو کسی بری مجلس میں بیٹھا اور ان پر انکار نہ کیا تو گناہ میں ان سے برابر کا شریک ہوگا اور جب وہ برا کلام کریں اور برائی کا عمل کریں تو ان پر انکار کرنا چاہیے اگر انکار کی طاقت نہیں ہے تو ان سے اٹھ جانا چاہیے تا کہ اس آیت کے مصداق سے نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک قوم کو شراب پیتے ہوئے پکڑا، تو انہیں ایک شخص کے بارے بتایا گیا کہ وہ روزہ دار ہے آپ نے اسے بھی تادیب کا حکم دیا اور پھر یہ آیت پڑھی (1): اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ یعنی معصیت (برائی) پر رضا بھی معصیت ہے اسی وجہ سے برائی کرنے والے اور اس پر راضی سب سے مواخذہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ تمام ہلاک ہو گئے۔ یہ مماثلت تمام صفات میں نہیں ہے بلکہ اتصاف کی وجہ سے ظاہر حکم کے ساتھ مشابہت کا الزام ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فکل قرین بالمقارن یقتدی (2)

یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ جب ثابت ہو گیا کہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں سے اجتناب کرنا چاہیے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، تو تمام بدعتی اور گمراہ فرقوں سے اجتناب اولیٰ ہے۔ کلبی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ منسوخ ہے اس ارشاد سے مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانعام:69) نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے ان کفاروں کے حساب سے کچھ بوجھ۔

عام مفسرین نے فرمایا: یہ محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔ جویبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے فرمایا: اس آیت میں قیامت تک ہر دین میں بدعت نکالنے والا داخل ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ اصل میں جامع تنوین کے ساتھ تھا۔ استخفافاً تنوین کو حذف کیا گیا۔ یہ بمعنی یجمع ہے۔ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ اس سے مراد منافقین ہیں یعنی منافقین تم پر گردش زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ یہود پر تمہیں غلبہ مل جائے اور مال غنیمت حاصل ہو تو قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ ہمیں بھی مال غنیمت عطا کرو۔ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ اگر کافروں کو کامیابی ملے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ تو کہتے ہیں: کیا ہم غالب نہیں آ گئے تھے تم پر؟ حتیٰ کہ مسلمان تم سے ڈر گئے تھے اور ہم نے انہیں تم سے رسوا کیا تھا۔ کہا جاتا ہے: استحوذ علی کذا۔ یعنی وہ اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے ہے: استحوذ علیھم الشیطان یعنی شیطان ان پر غالب آ گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الاستحواذ کا اصل معنی گھیرنا ہے۔ حاذہ یحوز حوزاً جب کوئی کسی کا احاطہ کر لے۔ یہ فعل اپنی اصل پر آیا ہے اگر اس میں تعلیل کی جاتی تو یہ الم نستحذ ہوتا۔ اور اعلال کی صورت میں فعل استحاذ یستحیذ ہوتا ہے اور بغیر اعلال کے استحوذ یستحوذ ہوتا ہے۔

وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی ہم نے انہیں تم سے دور کیا اور ہم نے انہیں تمہارے ارادے سے جدا کر دیا۔ یہ آیت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 175

دلالت کرتی ہے کہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں نکلتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (الحدید:14) اور یہ دلالت کرتی ہے کہ مسلمان انہیں غنیمت نہیں دیتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے مال غنیمت طلب کیا اور کہا: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ مسلمان پر بطور احسان جتلانا ہو یعنی ہم تمہیں ان کی باتیں بتاتے تھے اور ہم تمہارے مددگار تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اس میں علماء کی پانچ تاویلات ہیں۔ (۱) یسیع خضرمی سے روایت ہے اس نے کہا: میں حضرت علی بن ابی طالب کے پاس حاضر تھا، ایک شخص نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ یہ کیسے ہے؟ بعض اوقات ہم سے جنگ کرتے ہیں اور ہم پر غالب آجاتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا معنی قیامت کے دن اور فیصلہ کا دن ہے (1)۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ قیامت کے دن ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا: تمام اہل تاویل نے یہ کہا ہے (2)۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے، کیونکہ اس میں خبر کا فائدہ نہیں ہے اگرچہ کلام کی ابتدا میں اس مفہوم کا ذکر ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حکم کو قیامت تک مؤخر فرمایا اور دنیا میں معاملہ اسی طرح فرمایا کہ کبھی کفار غالب آتے ہیں اور کبھی مسلمان غالب آتے ہیں، جیسی اس کی حکمت ہوتی ہے اور جیسا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا اس نے وہم کیا ہے جس نے کہا ہے کہ آخری کلام پہلے کلام کی طرف راجع ہے، یہ اس کے فائدہ کو گرا دیتی ہے، کیونکہ یہ تکرار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے کوئی ایسا راستہ نہیں بنائے گا کہ وہ مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر دیں اور ان کے آثار ختم کر دیں اور ان کی ملت کو مباح کر دیں جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے فرمایا: ''میں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کرے اور ان پر اپنے سوا دشمن کو مسلط نہ کرے کہ وہ ان کی ملت کو مباح کر دے اور میرے رب نے فرمایا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو اسے رد نہیں کیا جاتا اور میں نے تجھے تیری امت کے لیے یہ عطا کیا کہ میں انہیں قحط سالی میں مبتلا کر کے ہلاک نہیں کروں گا اور میں ان پر، ان کے اپنے سوا دشمن کو مسلط نہیں کروں گا کہ وہ ان کی ملت کو مباح کر دے اگرچہ ان پر ہر طرف کے لوگ بھی جمع ہو جائیں حتیٰ کہ یہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور یہ ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے''۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مومنین پر غلبہ کی کوئی راہ نہیں بنائے گا مگر یہ کہ باطل کا حکم دینا شروع کر دیں برائی سے نہ رکیں اور توبہ نہ کریں تو دشمن ان کی اپنی طرف سے ان پر غالب آئے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ:30) اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ بہت نفیس قول ہے۔

1۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 139 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 124

میں کہتا ہوں: اس پر دلیل حضرت ثوبان کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: حتی یکون بعضهم یهلك بعضا ویسبی بعضهم بعضا یعنی حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ (حتیٰ) غایت کے لیے ہے پس ظاہر کلام اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دشمن ان پر غالب نہیں آئے گا کہ وہ انہیں مباح کر دے مگر یہ کہ جب مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے۔ اس زمانہ میں جو مسلمانوں کے درمیان جنگیں واقع ہوئی ہیں اس میں یہ پایا گیا ہے کافروں کی شوکت سخت ہوگئی ہے اور وہ مسلمانوں کے شہروں پر غالب آ گئے حتیٰ کہ بہت کم شہر (ملک) ایسے ہیں جن پر کافروں کا معنوی طور پر غلبہ نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے عفو، نصرت اور لطف کے ساتھ ہم پر کرم فرمائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر کافروں کے لیے کوئی شریعت نہیں بنائی۔ جو کافروں کی طرف سے ہوگا وہ شرع کے خلاف ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مومنین پر کوئی حجت عقلیہ اور شرعیہ نہیں بنائی جس کے ذریعے وہ غالب آ جائیں مگر اللہ تعالیٰ اسے باطل کر دے گا اور اس حجت کو نیست و نابود کر دے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے علماء نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ کافر مسلمان غلام کا مالک نہیں ہوتا یہی قول اشہب اور امام شافعی کا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافر کے لیے مسلمان پر سبیل کی نفی فرمائی ہے اور خریدنے کے ساتھ ملکیت بھی سبیل ہے پس یہ اس کے لیے جائز نہ ہوگا اس کی عقد منعقد نہ ہوگی۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ الخ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے دائمی ملک کا راستہ نہیں بنایا، کیونکہ دیکھتے ہیں کہ کافر کو ابتداءً مسلمان پر ملکیت ہوتی ہے اور وہ میراث کے لیے ذریعے ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کافر غلام، کافر کی ملکیت میں مسلمان ہو جائے تو اس پر بیع کا فیصلہ لازم ہوتا ہے اور اس کی بیع کا حکم قبول کیا جاتا ہے، کوئی شخص فوت ہو اور کافر کا وارث، مسلمان غلام کا وارث ہو جائے۔ یہ ایسا سبیل ہے جو قہراً ثابت ہے، اس میں قصد و ارادہ نہیں ہے اور خریدنے کے ساتھ ملکیت نیت کے قصد کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، اس میں کافر نے اپنے اختیار سے ملک کا ارادہ کیا ہے اگر اس کی بیع کے عقد کا حکم لگایا جائے اور اس کی ملکیت کے ثبوت کا حکم لگایا جائے تو اس میں اس کا قصد ثابت ہوگا اور اس نے اس پر سبیل بنالیا (1)۔ ابو عمر نے کہا: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نصرانی اور یہودی کا مسلمان غلام کو آزاد کرنا صحیح ہے اور اس پر نافذ ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ جب کسی کافر کا غلام مسلمان ہو جائے تو اسے بیچا جائے گا اور اس کی قیمت کافر کو دی جائے گی۔ یہ دلیل ہے کہ یہ اس کی ملک پر بیع ہے اور اس کی ملک پر آزادی ثابت ہوئی ہے مگر یہ ملکیت غیر مستقر ہے، کیونکہ اس پر اس کا بیچنا واجب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا اس سے مراد غلام بنانا، ملکیت حاصل کرنا اور عبودیت ہے جو دائمی اور مستقل ہو۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 510

علماء کا اختلاف ہے کہ کافر کا مسلمان غلام کو خریدنے کا حکم کیا ہے؟ اس میں دو قول ہیں (۱) اس کی بیع فسخ ہے (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بیع صحیح ہے اور مشتری پر اس کو بیچا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ ایک نصرانی نے اپنے نصرانی غلام کو مدبر بنایا پھر وہ غلام مسلمان ہو گیا۔ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ اس کے اور غلام کے درمیان حائل ہوا جائے گا اور وہ اپنے نصرانی سردار پر نکالا جائے گا اور اسے اس پر بیچا نہیں جائے گا حتیٰ کہ اس کا امر واضح ہو جائے۔ اگر نصرانی ہلاک ہو گیا اور اس پر قرضہ تھا تو مدبر غلام کی ثمن سے اس کا قرضہ ادا کیا جائے گا مگر یہ کہ اس نے اتنا مال چھوڑا ہو جس سے اس کا قرضہ اتارا جا سکتا ہو تو مدبر آزاد ہو جائے گا۔

امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اسے اس پر بیچا جائے گا جب وہ مسلمان ہوگا۔ اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے، کیونکہ مدبر وصیت ہے اور مسلمان کو مشرک کی ملکیت میں چھوڑنا جائز نہیں کہ وہ اسے ذلیل کرے اور اسے میراث میں نکالے۔ اسلام کی وجہ سے وہ اس کا دشمن بن گیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: نصرانی غلام مسلمان سے بیچا گیا پھر مسلمان نے اسے آزاد کر دیا اور ولاء اس کی ہوگی جس نے اس کو خریدا اور آزاد کیا اور نصرانی کو غلام کی قیمت دی جائے گی۔ سفیان اور کوفیوں نے کہا: جب نصرانی کا مدبر غلام مسلمان ہو جائے تو اس کی قیمت لگائی جائے گی اور وہ غلام اپنی قیمت کما کر دے گا اگر نصرانی مدبر کی سعایت (مال کی ادائیگی کے لیے کوشش) سے فارغ ہونے سے پہلے مر گیا تو غلام آزاد ہو جائے گا اور سعایت باطل ہو جائے گی۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

”بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (وہ بھی عبادت کی نیت سے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑی دیر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ الخدع کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ کی طرف سے خداع کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور رسل کو دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس کی سزا دیتا ہے حسن نے کہا: مومن، منافق ہر شخص کو قیامت کے دن نور دیا جائے گا منافقین خوش ہوں گے اور یہ گمان کریں گے کہ وہ نجات پا گئے لیکن جب وہ پل صراط پر آئیں گے تو ہر منافق کا نور بجھ جائے گا(1)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اسی کا ذکر ہے: اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید:13)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یعنی وہ ریاکاری کے لیے نماز پڑھتے ہیں، وہ سستی اور کاہلی میں نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ نماز کے ترک پر سزا کا اعتقاد رکھتے ہیں، کیونکہ عشاء کی نماز کا وقت ہوتا تو وہ دن کے کام سے تھک چکے ہوتے تھے اور ان پر اس کا قیام ثقیل ہوتا تھا اور صبح کی نماز کا وقت ہوتا تو انہیں نیند بہت پیاری ہوتی (2)۔ اگر

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 374
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 511

انہیں تلوار کا ڈر نہ ہوتا تو وہ کبھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔

ریا کا معنی خوبصورتی کا اظہار ہے تاکہ لوگ اسے دیکھیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کے لیے نہیں اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وصف بیان کیا کہ خوف اور ریا کاری کے ساتھ ساتھ ذکر بھی بہت کم کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے نماز میں تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ منافقین کی نماز ہے''۔ تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا۔ ''ان میں سے کوئی بیٹھا ہوا سورج کو تاڑتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے یا فرمایا شیطان کے دو سینگوں کے اوپر ہوتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے۔ (مرغ کی طرح) چار چونچیں مارتا ہے اور اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر بہت تھوڑا'' (1)۔ اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے منافقین کا وصف قلت ذکر کے ساتھ کیا، کیونکہ وہ قرأت اور تسبیح کے ساتھ اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے وہ تکبیر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قلت کے ساتھ ان کا وصف بیان فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا۔ بعض نے فرمایا: اس میں اخلاص نہیں ہوتا اس لیے قلت سے تعبیر فرمایا۔

یہاں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی نماز کو بیان فرمایا اور اس کے رسول مکرم حضرت محمد ﷺ نے بھی ان کی نماز کو بیان فرمایا، فرمایا: ''جو ان کی نماز کی طرح نماز پڑھے گا اور جس نے ان کے ذکر کی طرح ذکر کیا وہ عدم قبولیت میں ان کے ساتھ لاحق ہوگا''۔ یہ اس ارشاد، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿﴾ (المومنون) کے مقتضی سے خارج ہے اس کا بیان آگے آئے گا مگر جس کو عذر ہو اور وہ صرف فرض کی ادائیگی پر اکتفا کرے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اعرابی کو سکھایا جب آپ نے اسے نماز صحیح نہ پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو مکمل وضو کر پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر جو قرآن پڑھنا ممکن ہو وہ پڑھ پھر رکوع کر حتیٰ کہ مطمئن ہو کر رکوع کرے پھر سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ اطمینان سے سجدہ کرے پھر سر اٹھا حتیٰ کہ اطمینان سے بیٹھ جائے پھر پوری نماز میں اس طرح کر'' (2)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لا صلاة لمن لم یقرء بام القرآن (3) اس کی نماز (مکمل) نہیں جس نے الحمد شریف نہ پڑھی اور فرمایا: ''نماز جائز نہیں جس میں آدمی اپنی پیٹھ کو رکوع اور سجود میں سیدھا نہ کرے'' (4)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور بعد والے علماء کا اس پر عمل ہے۔ عطا فرماتے ہیں: آدمی رکوع و سجود میں پیٹھ کو سیدھا کرے۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: جو رکوع و سجود میں پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نماز جائز نہیں جس میں آدمی رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا'' (5)۔ ابن عربی نے کہا: ابن القاسم اور امام ابو

1۔ صحیح مسلم، المساجد و مواضع الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 225 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 170

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 169 4۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 36 5۔ ایضاً

حنیفہ نے کہا: طمانینت فرض نہیں، یہ عراقی روایت ہے، مالکیوں میں سے کسی کے لیے اس سے مشغول ہونا مناسب نہیں۔ یہ مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عربی نے کہا: جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی تا کہ وہ اسے دیکھیں اور اس کے لیے ایمان کی گواہی دیں یا اس نے شہادت کی قبولیت اور امامت کے جواز کے لیے مرتبہ اور ظہور کو طلب کرنے کا ارادہ کیا تو یہ وہ ریا نہیں ہوگا جس سے منع کیا گیا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریا جو گناہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو شکار کرے اور اس کے ذریعے خوراک حاصل کرے۔ یہ نیت جائز نہیں ہے اور اس پر اعادہ لازم ہے۔

میں کہتا ہوں: شہادت کی قبولیت کے لیے ظہور اور مرتبہ طلب کرنے کا ارادہ کیا ہو، اس قول میں نظر ہے۔ اس کا بیان سورۂ نساء میں گزر چکا ہے۔ وہاں اس میں غور کرو۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ریا فرض اور نفل میں داخل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا یہ عام ہے۔ ایک قوم نے کہا: خاص نفل میں داخل ہے، کیونکہ فرض تمام لوگوں پر واجب ہے اور نفل اس کی اپنی طرف سے ہے۔ بعض نے اس کے برعکس فرمایا، کیونکہ نوافل نہ بھی پڑھے تو اس پر مؤاخذہ نہیں۔

مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾

''ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان نہ ادھر کے نہ ادھر کے اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے ہدایت کا راستہ''۔

المذبذب وہ شخص جو دو امروں کے درمیان متردد ہو۔ الذبذبة کا معنی اضطراب ہے۔ کہا جاتا ہے: ذبذبته فتذبذب۔ اسی سے نابغہ کا قول ہے:

ألم تر أنّ الله أعطاك سَوْرَة ترى كلّ مَلْك دو نها يَتَذَبْذَبُ(1)

ایک اور شاعر نے کہا:

خيال لأم السَّلْسَبِيل ودونها مَسيرة شَهْر للبريد المذَبْذِبِ(2)

اسی طرح دوسرے ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ابن جنی نے کہا: یعنی حرکت کرنے والا پریشان جو ٹھہرتا نہ ہو، نہ آرام کرتا ہو، یہ منافقین، مومنین اور مشرکین کے درمیان متردد تھے نہ خالص ایمان لانے والے تھے اور نہ صراحۃً کفر کا اقرار کرنے والے تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان متردد ہوتی ہے کبھی ایک کی طرف جاتی ہے کبھی دوسرے کی طرف جاتی ہے''(3)۔ ایک روایت میں تعیر کی جگہ تکر ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 389 2۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 127 3۔ صحیح مسلم، صفات المنافقین و احکامہم، جلد 2، صفحہ 370

جمہور علماء نے مذبذبین میم کے ضمہ اور دونوں ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے دوسری ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت ابی کے حرف میں متذبذبین ہے(1)۔ اس قرأت پر ادغام جائز ہے یعنی مذبذبین پہلی ذال کی تشدید کے ساتھ اور دوسری کے کسرہ کے ساتھ۔ ابوالحسن سے میم کے فتحہ اور دو ذالوں کے ساتھ مروی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

''اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنا دو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف واضح دلیل؟''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ، الکافرین اور اولیاء دو مفعول ہیں یعنی کافروں کو اپنے خاص دوست اور راز دان نہ بناؤ۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿﴾ یعنی کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے عذاب دینے کے لیے خود ہی اپنے خلاف حجت قائم کرو؟ جب کہ اس نے تمہیں منع کیا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

''بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے اور پر ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الدَّرْكِ کوفیوں نے را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے لیکن پہلا قول افصح ہے، کیونکہ جمع میں ادراک کہا جاتا ہے جیسے جمل کی جمع اجمال ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ ابوعلی نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الشمع اور الشمع اور اس کی جمع ادراک ہے۔ بعض نے فرمایا: الدرک کی جمع ادرُک ہے جیسے فلس کی جمع افلس ہے۔ دوزخ کے سات طبقات ہیں مگر پستی کی جانب درجات کو عرب ادراک کہتے ہیں: کہا جاتا ہے: کوئیں کے لیے ادراک ہیں اور بلندی کی جانب درجات کو درجات کہتے ہیں۔ جنت کے لیے درجات ہیں اور آگ کے لیے درکات ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

منافق نچلے طبقہ میں ہوں گے یہ ہاویہ ہے۔ کیونکہ ان کا کفر زیادہ غلیظ ہے اور ان کا دھوکا بہت زیادہ ہے اور مومنین کو اذیت دینا بہت کثیر ہے۔ او پر والا آگ کا درجہ جہنم ہے پھر لظی ہے پھر حطمہ ہے پھر سعیر ہے پھر سقر ہے پھر جحیم ہے پھر ہاویہ ہے۔ ان تمام کو پہلے طبقہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے احسان اور کرم سے ہمیں ان تمام طبقات سے محفوظ فرمائے۔ حضرت ابن مسعود سے فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کی تفسیر یہ مروی ہے کہ آگ میں لوہے کے تابوت ہیں جو منافقین پر بند کیے جائیں گے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: قیامت کے روز سخت عذاب تین قسم کے لوگوں کو ہوگا۔ (۱) منافقین (۲) اصحاب مائدہ میں سے جنہوں نے انکار کیا (۳) آل فرعون۔ اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ اور اصحاب مائدہ کے بارے فرمایا: فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ

1۔ البحر الوجیز، جلد 2، صفحہ 127

الْغٰلِبِیْنَ۝ (المائدہ) اور آل فرعون کے بارے فرمایا: اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝ (غافر) (داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَ سَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا۝

''مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ کے لیے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور عطا فرمائے گا اللہ تعالیٰ مومنوں کو اجر عظیم''۔

یہ منافقین سے استثنا ہے۔ نفاق سے توبہ کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل کی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے یعنی ذات باری تعالیٰ کو ملجا و معاذ بنائے اور اپنے دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرے جیسا کہ اس آیت نے واضح کیا ہے ورنہ توبہ کرنے والا نہ ہوگا۔ اس وجہ سے منافقین کے مومنین سے ملنے کی وجہ سے ان کا اجر مومنین کے اجر کے برابر ذکر فرمایا۔ بخاری میں اسود سے مروی ہے فرمایا: ہم عبداللہ کے حلقہ میں بیٹھے تھے حضرت حذیفہ آئے حتیٰ کہ ہمارے اوپر کھڑے ہوئے پھر سلام کیا پھر کہا: نفاق تم سے بہتر قوم پر نازل ہوا تھا۔ اسود نے کہا: سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں۔ حضرت عبداللہ مسکرائے اور حضرت حذیفہ مسجد کے ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت عبداللہ اٹھے تو ان کے شاگرد بکھر گئے حضرت حذیفہ نے مجھے کنکری ماری تو میں ان کی طرف آیا حضرت حذیفہ نے کہا: مجھے حضرت عبداللہ کے ہنسنے سے تعجب ہوا ہے جو میں نے کہا تھا وہ جان گئے تھے، بے شک اس قوم پر نفاق نازل ہوا تھا جو تم سے بہتر تھی، پھر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی (1)۔

فراء نے کہا: فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ کا معنی ہے من المومنین۔ یہ نہیں فرمایا: ہم المومنون (وہ مومن ہیں)۔ یُؤْتِ سے جس طرح یا بولنے میں حذف ہوتی ہے لکھنے میں بھی حذف کی گئی، کیونکہ یا بھی ساکن ہے اور اس کے بعد لام بھی ساکن ہے، اس کی مثال: یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ، سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ اور یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ ہے۔ واو اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف کی گئی ہے۔

مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا۝

''کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان ہے سب کچھ جاننے والا ہے''۔

استفہام بمعنی تقریر ہے منافقین کے لیے۔ تقدیر یہ ہے تمہیں عذاب دینے میں اس کے لیے کیا منفعت ہے اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ وہ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا۔ اس کا اپنے بندوں کو عذاب دینا اس کی بادشاہی میں اضافہ نہیں کرتا اور ان کے برے افعال پر ان کو عذاب نہ دینا اس کی سلطنت میں کمی نہیں کرتا۔ مکحول نے کہا: جس

1۔ صحیح بخاری، تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 662

میں یہ چار چیزیں ہوں اس کے حق میں یہ ہیں اور جس میں یہ تین چیزیں ہوں وہ اس کے خلاف ہیں۔ چار چیزیں جو انسان کے حق میں ہوتی ہیں (۱) شکر (۲) ایمان (۳) دعا (۴) استغفار۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (الانفال) اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ تشریف فرما ہیں ان میں اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:77) آپ فرمایئے: کیا پروا ہے تمہاری میرے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔

اور وہ تین چیزیں جو انسان کے خلاف ہوتی ہیں وہ یہ ہیں (۱) دھوکا (۲) بغاوت (۳) عہد شکنی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ (الفتح:10) پس جس نے توڑ دیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر:43) نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازیوں کے۔ اور فرمایا: اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (یونس:23)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قدردانی فرماتا ہے جب وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ یشکرھم کا معنی ہے وہ انہیں ثواب دیتا ہے اور تھوڑے سے عمل کو قبول فرماتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔ یہ اطاعت پر اس کی طرف سے شکر ہے۔ لغت میں شکر کا معنی ظہور ہے۔ کہا جاتا ہے: دابة شکور۔ جو اپنے چارے سے زیادہ موٹا پا ظاہر کرے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیلاً گزر چکا ہے۔ عرب ضرب المثل کے طور پر کہتے ہیں: اَشْكَرُ مِنْ بَرْوَقَه وہ تو زمین کے پہلے سبزہ سے بھی زیادہ ظاہر ہونے والا ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے: پہلا سبزہ بادل کے سایہ سے ہی سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے بغیر بارش کے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝
اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

"نہیں پسند کرتا اللہ تعالیٰ کہ برملا کہی جائے بری بات مگر (اس سے) جس پر ظلم ہوا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ اگر تم ظاہر کرو کوئی نیکی یا پوشیدہ رکھو اسے یا درگزر کرو (کسی کی) برائی سے تو بے شک اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا قدرت والا ہے"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کلام یہاں مکمل ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا مَنْ ظُلِمَ یہ استثنا پہلی کلام سے نہیں ہے۔ یہ محل نصب میں ہے یعنی جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے یہ کہنا جائز ہے کہ فلاں نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو تقدیر کلام اس طرح ہو: لا یحب اللہ ان یجھر احد بالسوء الا من ظلم۔

جمہور علماء کی قرأت ظُلِمَ ظاء کے ضمہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ اور لام کا ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ اور جن علماء نے ظَلَمَ ظا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ زید بن اسلم، ابن ابی اسحاق وغیرہما ہیں اور فتحہ کی خفت کی وجہ سے لام کو ساکن کرنا جائز نہیں پس پہلی قرأت پر ایک طائفہ نے کہا: اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ کوئی برملا بری بات کہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو تو اس کے لیے اپنی مظلومیت کی داستان سنانا مکروہ نہیں۔ پھر برملا بری بات کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں سے جو مباح ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: ایک شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف دعا نہ کرے بلکہ اس طرح کہے: اللھم أعِنّي عليه، اللھم أستخرج حقي، اللھم حُلْ بينه و بين ما يريد من ظلمي (1) اے اللہ اس کے خلاف میری مدد فرما، اے اللہ میرا حق نکال دے، اے اللہ اس کے اور جو وہ مجھ پر ظلم کا ارادہ کرتا ہے اس کے درمیان حائل ہو جا۔ یہ مدافعت کی دعا ہے اور یہ سوء کی کم سے کم منزل ہے۔

حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس کے لیے مباح ہے جس پر ظلم کیا گیا ہے کہ وہ ظالم کے خلاف بددعا کرے (2)، اگر وہ صبر کرے تو اس کے لیے بہتر ہے، یہ ظالم کے خلاف دعا کی نوع میں اطلاق ہے۔ سدی اور حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی ہے کہ جس پر ظلم کیا گیا ہے اس کے لیے ظالم پر اس کے ظلم کی مثل ظلم کرنا اور اس کی برائی بیان کرنا جائز ہے (3)۔ ابن مستنیر نے کہا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ کا معنی ہے جس کو کفر یا اسی جیسی بری بات پر مجبور کیا گیا ہو۔ یہ مباح ہے۔ اس مفہوم پر آیت اکراہ کے بارے میں ہوگی (4)۔ اور اسی طرح قطرب نے کہا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ سے مراد مکرہ (جس کو مجبور کیا گیا ہو) ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہوتا ہے، وہ اگرچہ کفر یہ کلمہ بھی کہہ دے تو اس پر گرفت نہیں ہے۔ فرمایا: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ کا معنی بدل کی حیثیت سے بھی جائز ہے گویا یوں فرمایا: لایحب اللہ الا من ظلم۔ یعنی اللہ تعالیٰ ظالم کو پسند نہیں کرتا گویا وہ فرماتا ہے: وہ مظلوم کو اجر دیتا ہے۔ اس قول پر تقدیر اس طرح ہوگی: لایحب اللہ ذا الجھر بالسوٓ الا من ظلم یہ بدل کے اعتبار سے ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ ضیافت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اسے یہ کہنے کی رخصت دی گئی ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو صحرا میں کسی شخص کا مہمان بنا تو اس نے اس کی مہمان نوازی نہ کی تو یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ۔ اس روایت کو ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا: یہ آیت ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کسی کے پاس سے گزرا تو اس نے اس کی مہمان نوازی نہ کی تو اسے یہ کہنے کی رخصت دی گئی کہ اس نے میری اچھے طریقہ سے ضیافت نہیں کی (5)۔ جن علماء نے ضیافت کو واجب قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: کیونکہ ظلم ممنوع ہے پس یہ ضیافت کے وجوب پر دلیل ہے۔ لیث بن سعد کا یہی قول ہے۔

جمہور علماء کہتے ہیں: ضیافت (مہمان نوازی) یہ مکارم اخلاق میں سے ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ ہود میں آئے گا۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 375
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 539
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 540
4۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 129
5۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 540

ظاہر آیت کا مقتضا یہ ہے کہ مظلوم مناسب حد تک ظالم سے بدلہ لے سکتا ہے اگر وہ مومن ہے جیسا کہ حضرت حسن نے فرمایا: قذف کے مقابلہ میں قذف ہو تو یہ درست نہیں۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اگر وہ کافر ہے تو پھر اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دے اور اس کے لیے ہلاکت، ہر دعا جو چاہے مانگ لے جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی ''اے اللہ! مضر قبیلہ کو روند ڈال، ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ جیسے قحط میں مبتلا کر دے (1)'' اور عرض کی: ''اے اللہ! فلاں کو اپنی گرفت میں لے لے، فلاں کو اپنی گرفت میں لے لے''۔ آپ نے قریش کے نام لیے۔ اگر وہ سر عام ظلم کرنے والا ہے تو اس کے خلاف بددعا بھی جہراً ہوگی، نہ اس کی عزت محترم ہوگی، نہ اس کا بدن محترم ہوگا، نہ اس کا مال محترم ہوگا۔ ابو داؤد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرمایا: ان کی کوئی چیز چوری کی گئی تھی میں چور کے خلاف دعا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''اپنی بددعا کے ساتھ اس کی سزا میں تخفیف نہ کر'' (2)۔

عمرو بن شرید نے اپنے باپ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''قرض کی ادائیگی پر قادر شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کرتا ہے'' (3)۔ ابن مبارک نے کہا: اس کی عزت کو حلال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے سخت کلامی کی جاتی ہے اور اس کی سزا کے حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قید کیا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے ''غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (4)'' خوشحال قادر شخص سے جب ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے اور وہ ٹال مٹول کرے تو یہ ظلم ہے یہ اس کی عزت کو مباح کر دیتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے: فلاں لوگوں سے ٹال مٹول کرتا ہے، لوگوں کے حقوق روکتا ہے۔ امام کے لیے اس کو ادب سکھانا اور اس کو تعزیر لگانا مباح کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عمل سے اجتناب کرے۔ یہی معنی سفیان سے بھی مروی ہے۔ یہی ابن المبارک کے قول کا معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس باب سے وہ نہیں ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عباس کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہما کے متعلق ہے جو انہوں نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کی موجودگی میں کہا تھا: اے امیر المومنین! میرے اور اس جھوٹے گنہگار، غادر خائن کے درمیان جو جھگڑا ہے اس کا فیصلہ کیجئے۔ کسی نے بھی ان پر بات کو لوٹایا نہیں، کیونکہ یہ فیصلہ تھا اور حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک اپنے آپ کو سچا اور صحیح سمجھتا تھا حتیٰ کہ حضرت عمر نے ان پر جو واجب تھا وہ نافذ کر دیا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ اس صورت میں ہے جب مقامات و مراتب برابر ہوں، لیکن جب مراتب میں فرق ہو تو کمتر لوگوں کو فضلاء پر زبان کھولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی (5)، بلکہ ان کا حق صرف دعویٰ کے ساتھ طلب کیا جائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عباس کی طرف سے جو گفتگو تھی وہ غصے میں تھی کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ قول اپنے چچا ہونے کی حیثیت سے بولا، کیونکہ چچا باپ کی مثل ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں باپ جب بیٹے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 946
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، جلد 2، صفحہ 316۔ ایضاً، حدیث 1279، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، جلد 2، صفحہ 155
4۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 513

کے بارے میں ان الفاظ کا اطلاق کرتا ہے تو اس میں سختی اور جھڑ کنے میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے نہ کہ بیٹا واقعی ان امور سے موصوف ہوتا ہے، نیز وہ ایک دینی ولایت کے جھگڑے میں تھے حضرت عباس کا خیال تھا کہ ان کی اس میں مخالفت جائز نہیں اور ان کی اس مسئلہ میں مخالفت کو مخالف ان امور سے متصف کر دیتا ہے پس آپ نے ان وجوہ کی بنا پر غصہ کی وجہ سے ایسا کہا تھا، جب حاضرین نے یہ جان لیا تھا تو کسی نے حضرت عباس پر انکار نہ کیا۔ یہ مازری اور قاضی عیاض وغیرہما کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جس نے ظَلَمَ پڑھا یعنی ظاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ زید بن اسلم کی قرأت ہے یہ محمد بن کعب قرظی کے بعد مدینہ میں قرآن جاننے والے علماء میں سے تھے اور یہ ابن ابی اسحاق، ضحاک، حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور عطا السائب کی قرأت ہے یعنی جس نے قول یا فعل میں ظلم کیا تو اس کی سرعام برائی بیان کرو۔ معنی میں فعل سے نہی ہے اور اسے زجر و توبیخ کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا کہ جو نفاق سے توبہ کرے پھر اسے کہا جائے کہ کیا تو پہلے منافق نہیں تھا؟ الا ظلم مگر جو نفاق پر قائم رہے۔ اس پر دلیل یہ قول ہے۔ الا الذین تابوا۔ ابن زید نے کہا: یہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق خبر دی کہ دوزخ کے نچلے طبقہ میں، پس تو جہراً ان کی برائی کا بیان تھا پھر اس کے بعد ان کے متعلق فرمایا: ما یفعل اللہ بعذابکم یہ ان کو مانوس کرنا اور شکر و ایمان کی طرف بلانا ہے پھر مومنین کو فرمایا: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ یعنی جو مسلمان ہو جائے تو اسے منافق نہ کہو مگر وہ جو نفاق پر قائم ہو اسے کہا جائے گا کیا تو منافق، کافر نہیں ہے، تیرے لیے آگ کا نچلا طبقہ ہے اس جیسا اور کوئی قول۔ ایک قوم نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا کہ کسی کی سرعام برائی بیان کی جائے پھر استثنا منقطع ذکر فرمایا لیکن جو ظلم کرے وہ ظلم و زیادتی کرتے ہوئے مظلوم کی عزت کو بھی تار تار کرے جب کہ وہ ہے بھی ظالم۔

میں کہتا ہوں: یہ اکثر ظالموں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے ظلم کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے گالی گلوچ بھی دیتے ہیں اور مظلوم کی عزت کو بھی تار تار کرتے ہیں جس کو ان پر حرام کیا گیا تھا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: اِلَّا مَنْ ظَلَمَ جس نے بری بات کہی مناسب ہے کہ ہم اس کے ہاتھ کو پکڑیں۔ یہ پہلی کلام سے استثنا نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں: اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں ایک حدیث یہ ہے خذوا علی ایدی سفہائکم (1)۔ تم اپنے بے وقوفوں کے ہاتھوں کو پکڑو۔ اور ارشاد ہے ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو'' (2)۔ صحابہ نے کہا: یہ مظلوم ہم اس کی تو مدد کریں گے، ظالم کی مدد کیسے کریں؟ فرمایا: ''تم اسے ظلم سے روکو''۔ فراء نے کہا: اِلَّا مَنْ ظَلَمَ یعنی ولا من ظلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ ظالم کو ڈرایا گیا ہے تا کہ وہ ظلم نہ کرے اور مظلوم کو اس جملہ سے ڈرایا گیا ہے کہ وہ انتقام لینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ پھر اس کے بعد فرمایا: اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ۔ عفو و درگزر کی رغبت دلائی۔ العفو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس کا مطلب ہے انتقام پر قدرت ہوتے ہوئے معاف کرنا۔ آل عمران میں وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: 134) کے تحت یہ مفہوم گزر چکا ہے۔ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ان

1۔ شعب الایمان، فی الامر بالمعروف، جلد 6، صفحہ 92

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، جلد 2، صفحہ 1028

تھوڑے سے الفاظ میں بہت سے معانی موجود ہیں۔ بعض نے کہا: اگر تو معاف کرے گا تو اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے گا۔ ابن المبارک نے روایت کیا ہے فرمایا: مجھے اس نے بتایا جس نے حسن سے سنا تھا کہ جب ساری امتیں قیامت کے روز رب العالمین کے سامنے گری پڑی ہوں گی تو آواز دی جائے گی: وہ کھڑا ہو جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، تو وہ کھڑا ہو گا جس نے دنیا میں معاف کیا ہو گا۔ اس حدیث کی تصدیق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے: فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ: 40)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝

"بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں بعض رسولوں پر اور ہم کفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ اختیار کرلیں کفر و ایمان کے درمیان کوئی (تیسری) راہ، یہی لوگ کافر ہیں حقیقت میں اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا"۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ پہلے مشرکین و منافقین کا ذکر فرمایا تو اب اہل کتاب میں سے کفار کا ذکر فرمایا، کیونکہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار تمام انبیاء کا انکار ہے۔ کیونکہ ہر نبی نے اپنی قوم کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کا حکم فرمایا۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے رسل پر ایمان لانے میں فرق کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسل پر ایمان لانے میں فرق کرنا کفر ہے۔ یہ اس لیے کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اس طریقہ پر عبادت کرنا فرض کیا جو اس نے اپنے رسل کی زبانوں پر شروع کیا تھا، جب انہوں نے رسولوں کا انکار کیا اور ان کی شریعتوں کو رد کیا اور ان سے ان کی شریعتوں کو قبول نہ کیا تو وہ عبودیت کے التزام سے انکاری ہو گئے جس کے التزام کا انہیں حکم دیا گیا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے انکاری کی طرح ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کا انکار کفر ہے، کیونکہ اس میں عبودیت اور طاعت کے التزام کا ترک کفر ہے اور اسی طرح رسولوں پر ایمان لانے میں تفریق کرنا بھی کفر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ اس سے مراد یہود ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ یہ قول سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ وہ اپنی عوام سے کہتے تھے: ہم اپنی کتب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں پاتے۔ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝ یعنی وہ ایمان اور کفر کے درمیان راستہ بنانا چاہتے ہیں یعنی اسلام اور یہودیت کے درمیان نیا دین بنانا چاہتے ہیں،

ذالک فرمایا، ذینك نہیں فرمایا، کیونکہ ذالک تثنیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اگر ذینك ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا جب پہلے ذکر فرمایا کہ وہ کہتے ہیں: نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں، تو اس سے ان کے ایمان کا شبہ ہوتا تھا تو اس شبہ کو زائل کر دیا تاکید اً فرمایا کہ یہ کافر ہیں۔ بعض پر ایمان لانا انہیں کچھ مفید نہیں جب کہ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا جب انہوں نے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بھی انکار کیا اور اس رسول کا بھی انکار کیا جس نے اس رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اسی وجہ سے یقینی طور پر یہ کافر ہیں۔ لِلْكٰفِرِيْنَ یہ اعتدنا کے مفعول ثانی کے قائم مقام ہے یعنی کافروں کی تمام اقسام کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۵۲

''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور اس کے (تمام) رسولوں کے ساتھ اور نہیں فرق کیا انہوں نے کسی میں ان سے یہی لوگ ہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت ہے۔

يَسْــَٔـلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۵۳

''مطالبہ کرتے ہیں آپ سے اہل کتاب کہ آپ اتروا دیں ان پر کتاب آسمان سے سو وہ تو سوال کر چکے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کا۔ انہوں نے کہا تھا: (اے موسیٰ!) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا تو پکڑ لیا تھا انہیں بجلی کی کڑک نے بسبب ان کے ظلم کے پھر بنا لیا انہوں نے بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد کہ آچکی تھیں ان کے پاس کھلی دلیلیں پھر بھی ہم نے بخش دیا ان کا یہ (سنگین) جرم اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو واضح غلبہ''۔

یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور یکبارگی کتاب لے آئیں جو آپ کی سچائی کی مدعی ہو جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لائے تھے، یہ انہوں نے آپ سے مطالبہ حجت بازی کے لیے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو آگاہ کیا کہ ان کے آباء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بڑی حجت بازی کی تھی انہوں نے کہا تھا: ہمیں اللہ کھلم کھلا دکھاؤ۔ یہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ **جهرة** مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی **رؤية جهرة** تو انہیں بجلی کی کڑک کے ساتھ سزا دی گئی، کیونکہ انہوں نے معجزات دیکھنے کے بعد بڑا سوال کیا اور اپنے اوپر ظلم کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ کلام میں حذف ہے اس کی تقدیر یوں ہے پھر ہم نے انہیں زندہ کیا اور زندہ

رہے پھر انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ تفصیلاً گزر چکا ہے مزید ذکر سورۂ طٰہٰ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ براہین، دلائل، ظاہری معجزات، ید بیضا، عصا، سمندر کا پھٹنا وغیرہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پھر یہ سارے دلائل دیکھنے کے بعد۔ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ اس ہٹ دھری کے باوجود ہم نے انہیں معاف کر دیا۔

وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا۝ یعنی واضح حجت۔ یہ وہ آیات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ ان کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ جو ان آیات کو لے کر آیا تھا وہ حجت کے ساتھ غالب آیا تھا اور یہ آیات دلوں کو غالب کرنی والی تھیں یعنی وہ جانتے تھے کہ انسان کی قوت میں اس کی مثل لانا ممکن نہیں۔

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا۝

"اور ہم نے بلند کیا ان کے اوپر طور کو ان سے پختہ وعدہ لینے کیلئے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ داخل ہو جاؤ اس دروازہ سے سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ حد سے نہ بڑھنا سبت میں اور ہم نے لیا تھا ان سے پختہ وعدہ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ یعنی ان کے میثاق توڑنے کے سبب ہم نے ان پر طور کو بلند کیا اور وہ میثاق تورات پر عمل کرنا تھا۔ پہاڑ کے بلند کرنے اور ان کے دروازہ سے داخل ہونے کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ سُجَّدًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ ورش نے وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ میں عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عدا یعدو عدوًا وعُدوانا وعدوا وعداء سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ یعنی مچھلیاں پکڑنے کے ساتھ حد سے نہ بڑھو، جیسا کہ سورہ میں گزر چکا ہے۔ اصل میں تعتدوا تھا۔ تا کو دال میں ادغام کیا گیا۔ نحاس نے کہا: عین کا ساکن کرنا جائز نہیں، اس میں دو ساکنوں کو جمع نہ کیا جائے گا۔ اور جس نے اس طرح پڑھا ہے اس نے خطا کی ہے۔ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا۝ یعنی وہ عہد جو ان سے تورات کے بارے میں لیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عہد قسم کے ساتھ مؤکد ہے اس لیے اس کو غلیظ کہا گیا ہے۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا۝ وَّبِكُفۡرِهِمۡ وَقَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا۝

"(ان پر پھٹکار کی) وجہ یہ تھی کہ انہوں نے توڑ دیا اپنے وعدہ کو۔ اور انہوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا۔ اور انہوں نے قتل کیا انبیاء کو ناحق انہوں نے یہ (گستاخانہ) بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں (یوں نہیں) بلکہ مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ ان کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑی سی تعداد اور ان کے کفر کے باعث اور مریم پر بہتان عظیم باندھنے کے باعث"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ، نَقۡضِهِمۡ کو جر باکی وجہ سے ہے اور (ما) زائدہ موکدہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: 159) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ با محذوف کے متعلق ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: فبنقضھم میثاقھم لعناھم۔ یہ قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔ سامع کے علم کی وجہ سے فعل کو حذف کیا گیا۔ ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی نے کہا: یہ ماقبل کے متعلق ہے معنی یہ ہے انہیں بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے۔ فرمایا: ان کے ظلم کی تفسیر بیان فرمائی جس کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے انہیں پکڑ لیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے عہد کو توڑا اور انبیاء کو قتل کیا اور باقی تمام ان کے اعمال قبیحہ جن میں انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ان تمام افعال کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے انہیں پکڑ لیا۔ طبری وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ بجلی کی کڑک میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں گرفتار ہوئے تھے اور جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا اور حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بعد تھے، پس جنہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا وہ بجلی کی کڑک میں گرفتار نہیں ہوئے تھے۔

مہدوی وغیرہ نے کہا: یہ لازم نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے خبر ان کے متعلق دی ہو اور مراد ان کے آباء ہوں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ زجاج نے کہا: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ کا معنی ہے ہم نے ان کے پختہ عہد توڑنے کی وجہ سے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں، کیونکہ یہ قصہ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا تک طویل ہے اور وہ میثاق جو انہوں نے توڑا تھا وہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کریں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے عہد توڑنے، ان کے ایسا ایسا کرنے کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے۔ اور فاء مقحمہ ہے۔ كُفْرِهِمْ اور قَتْلِهِمُ اس پر معطوف ہیں۔ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد ان کی کتب کی آیات ہیں جن میں انہوں نے تبدیلی کی۔ غُلْفٌ، غلاف کی جمع ہے یعنی انہوں نے کہا: ہمارے دل پہلے ہی علم کے برتن ہیں، ہمارے پاس جو علم ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی علم کی ضرورت ہی نہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ اغلف کی جمع ہے جو غلاف کے ساتھ ڈھانپا گیا یعنی ہمارے دل پردوں میں ہیں جو آپ کہتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ (حم السجدہ: 5) یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے ان کا مقصود رسولوں کی حجت کو دور کرنا ہے۔ طبع کا معنی مہر لگانا ہے۔ یہ بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ بِكُفْرِهِمْ یعنی ان کے کفر پر ان کے لیے جزا ہے جس طرح فرمایا: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ) یعنی ایمانا قلیلاً تھوڑا ایمان یعنی بعض انبیاء پر ایمان لائے اور یہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے پھر دوبارہ فرمایا: بِكُفْرِهِمْ یہ اس لیے تاکہ وہ خبر دے کہ انہوں نے کفر کے بعد کفر کیا۔ بعض نے فرمایا: وَّبِكُفْرِهِمْ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار ہے، مابعد کی دلالت کی وجہ سے اس کو حذف کیا گیا۔ بِكُفْرِهِمْ میں عامل وہ ہے جو فَبِمَا نَقْضِهِمْ کا ہے کیونکہ یہ اس پر معطوف ہے، اس میں عامل طَبَعَ ہونا جائز نہیں۔ اور بہتان عظیم جو انہوں نے حضرت مریم علیہ السلام پر باندھا کہ یوسف نجار سے وہ ملی ہیں، حالانکہ یوسف نجار نیک لوگوں میں سے تھے۔ بہتان ایسے جھوٹ کو کہتے جس سے تعجب ہو یہ پہلے گزر چکا ہے واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَ

لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۗ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

''اور ان کے اس قول سے کہ ہم نے قتل کر دیا ہے مسیح عیسیٰ علیہ السلام فرزند مریم کو جو اللہ کا رسول ہے، حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھا سکے بلکہ مشتبہ ہو گئی ان کے لیے (حقیقت) اور یقیناً جنہوں نے اختلاف کیا ان کے بارے میں وہ بھی شک وشبہ میں ہیں ان کے متعلق نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی اور نہیں قتل کیا انہوں نے اسے یقیناً، بلکہ اٹھا لیا ہے اسے اللہ نے اپنی طرف اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ، اِنَّ کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ قول کے بعد اس سے ابتدا کی گئی ہے اور لغۃً اس سے کلام شروع ہو رہی ہے۔ سورۂ آل عمران میں لفظ الْمَسِيْحَ کا اشتقاق گزر چکا ہے۔ رَسُوْلَ اللّٰهِ بدل ہے اگر تو چاہے تو اس سے پہلے اعنی کا اعتبار کر لے۔ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ یہ ان کے قول کا رد ہے۔ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ یعنی ان کی شبیہ کسی دوسرے پر ڈالی گئی جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا: وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو نہیں جانتے تھے انہوں نے اسے قتل کر دیا جسے قتل کیا جب کہ انہیں اس میں شک تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ۔ بعض نے فرمایا: ان کے علماء کا اختلاف تھا۔ بعض نے فرمایا: تمام کی طرف سے اختلاف تھا۔ بعض نے فرمایا: صرف عوام کا اختلاف تھا، ان کے اختلاف کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہیں۔ بعض نے کہا: وہ ابن اللہ ہے۔ یہ حسن کا قول ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ ان کی عوام نے کہا: ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ اور جنہوں نے آسمان کی طرف بلند ہوتا انہیں دیکھا انہوں نے کہا: ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ بعض نے کہا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ نسطوریہ نصاریٰ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناسوت کی جہت سولی چڑھایا گیا، لاہوت کی جہت سے نہیں۔ ملکانیہ نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سولی اور قتل ناسوت ولاہوت دونوں جہتوں سے جاری ہوا۔ بعض نے کہا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ انہوں نے کہا: اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں اور اگر یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہمارا ساتھی کہاں ہے (2)؟ بعض نے فرمایا: ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہود نے کہا: ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے، کیونکہ یہوذا جو یہود کا سردار تھا یہ وہ شخص تھا جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سعی کی تھی۔ نصاریٰ کے ایک طائفہ نے کہا: بلکہ ہم نے اسے قتل کیا ہے، ان میں سے ایک طائفہ نے کہا: بلکہ انہیں اللہ نے آسمان کی طرف اٹھا لیا ہے اور ہم اس کی طرف دیکھ رہے تھے (3)۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ مِن زائدہ ہے اور کلام یہاں مکمل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ یہ پہلے سے استثنا نہیں یہ محل نصب میں ہے اور بدل کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے یعنی مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 376 2۔ زاد المسیر فی علم التفسیر، جلد 1، صفحہ 148 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 184

سیبویہ نے یہ شعر بطور استشہاد پیش کیا ہے

وبلدة　ليس　بها　أنِيسُ　إلاَّ　اليعافير　ولا　العِيسُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۞ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس کا معنی ہے ما قتلوا ظنهم يقينا جس طرح تیرا قول ہے: قتلته علما جب تجھے مکمل طور پر علم ہو(1)۔ (ہ) ضمیر کا مرجع الظن ہے۔ ابوعبید نے کہا: اگر یہ معنی ہوتا وما قتلو عیسی یقینا تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وما قتلوہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وما قتلوا الذی شبه لهم انه عیسی یقینا اس مفہوم پر يَقِيْنًا پر وقف ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وما قتلوا عیسی اس مفہوم پر وَ مَا قَتَلُوْهُ پر وقف ہوگا اور يَقِيْنًا مصدر محذوف کی صفت ہوگا اس میں دو تقدیریں ہوں گی (۱) قالوا هذا قولاً يقينا یا قال الله هذا قولاً يقينا (۲) معنی ہوگا وما علموه علما يقينا۔ نحاس نے کہا: اگر تم یہ معنی مقدر کرو بل رفعه الله اليه يقينا تو یہ خطا ہے، کیونکہ بل کا مابعد اس کے ضعف کی وجہ سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ ابن انباری نے مَا قَتَلُوْهُ پر وقف کی اجازت دی ہے اس بنا پر کہ يَقِيْنًا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جو جواب قسم ہے تقدیر اس طرح ہوگی ولقد صدقتم يقينا یعنی صدقا يقينا اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ نئی کلام ہے یعنی اللہ نے انہیں آسمان کی طرف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ مکان سے پاک اور بلند ہے۔ اس کے اٹھانے کی کیفیت سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا یعنی اللہ تعالیٰ یہود سے انتقام لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطرس بن اُستیسانوس رومی کو ان پر مسلط کر دیا، اس نے ان سے بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ حَكِيْمًا اس نے یہود پر لعنت اور غضب کا فیصلہ فرمایا۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۞

''اور کوئی ایسا نہیں ہوگا اہل کتاب سے مگر وہ ضرور ایمان لائے گا مسیح پر ان کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوں گے ان پر گواہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے ہر کتابی اپنی موت سے پہلے مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا(2)، پہلی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور دوسری ضمیر کا مرجع کتابی ہے۔ ہر یہودی اور نصرانی جب موت کے فرشتے کو دیکھتا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے، لیکن ایسا ایمان نفع بخش نہیں ہوتا، کیونکہ یہ مایوسی کے وقت کا ایمان ہے اور موت کی حالت سے متصل ایمان ہے۔ ہر یہودی اس وقت اقرار کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں اور ہر نصرانی اقرار کرتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول تھے۔

روایت ہے کہ حجاج نے شہر بن حوشب سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: میں ایک یہود و نصاریٰ سے قیدی لاتا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 544　2۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 378

ہوں اور اس کی گردن مارنے کا حکم دیتا ہوں پھر میں اس وقت اسے دیکھتا ہوں تو میں اس سے ایمان نہیں دیکھتا۔ شہر بن حوشب نے اسے کہا: جب وہ آخرت کے امر کو دیکھتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، وہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے لیکن ایمان اسے فائدہ نہیں دیتا۔ حجاج نے شہر بن حوشب سے پوچھا: تو نے یہ قول کہاں سے لیا ہے۔ شہر نے کہا: میں نے یہ محمد بن حنیفہ سے لیا ہے، تو حجاج نے کہا: تو نے یہ چشمہ صافی سے لیا ہے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ ان سے پوچھا گیا: اگر وہ غرق ہو جائے یا جل جائے یا اسے درندے کھا جائیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ بعض علماء نے فرمایا: دونوں ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں، معنی یہ ہیں کہ قرب قیامت کے وقت جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو جو عیسائی زندہ ہوگا وہ آپ پر ایمان لے آئے گا۔ یہ قتادہ، ابن زید وغیرہما کا قول ہے۔ اور طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔

یزید بن زریع نے ایک شخص سے، انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ سے مراد قبل موت عیسیٰ ہے۔ اللہ کی قسم! اب وہ اللہ کی بارگاہ میں زندہ ہیں لیکن وہ زمین پر اتریں گے تو سب ان پر ایمان لے آئیں گے (1)۔ ضحاک اور سعید بن جبیر سے اسی طرح مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ، ہ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے، کیونکہ یہ تمام واقعات آپ پر نازل ہوئے اور مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو متضمن ہے، کیونکہ ان کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یعنی ہر کتابی موت سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا لیکن حقیقت دیکھنے کے وقت ایمان اسے نفع نہیں دے گا۔ پہلی دو تاویلیں زیادہ ظاہر ہیں۔ زہری نے سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے، دجال کو قتل کریں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے اور سجدہ صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہوگا'' (2)۔ پھر حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو: وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔

حضرت ابو ہریرہ نے کہا: اس سے مراد قبل موت عیسیٰ ہے۔ آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔ سیبویہ کے نزدیک آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وان من اهل الکتاب احد الا لیؤمنن به اور کوفیوں کی تقدیر اس طرح ہے: وان من اهل الکتاب الا مَنْ لیؤمنن به۔ اس میں قبح ہے، کیونکہ اس میں موصول کا حذف ہے اور صلہ موصول کا بعض ہوتا ہے گویا بعض اسم حذف کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿﴾ یعنی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرے گا اس کی تکذیب کی گواہی دیں گے اور جو تصدیق کرے گا اس کی تصدیق کی گواہی دیں گے۔

1۔ تفسیر الحسن البصری، جلد 2، صفحہ 378

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل انبیاء، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

''سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کردیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کیلئے اور بوجہ روکنے یہود کے اللہ کے راستے سے بہت لوگوں کو اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے اور بوجہ ان کے کھانے کے لوگوں کے مال ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کیلئے ان میں سے عذاب دردناک''۔

اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا۔ زجاج نے کہا: یہ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ سے بدل ہے۔ اور طَيِّبٰتٍ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِيۡ ظُفُرٍ (الانعام:146) اور ظلم کو تحریم پر مقدم فرمایا، کیونکہ ظلم کے متعلق خبر دینے کا مقصود یہی بیان کرنا ہے کہ یہ تحریم کا سبب ہے۔ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے روکتے ہیں۔ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ۔ یہ سب اس ظلم کی تفسیر ہے جو وہ کیا کرتے تھے، اور اسی طرح جو پہلے گزر چکا ہے کہ وہ عہد کو توڑتے تھے اور جو بعد میں آئے گا۔ آل عمران میں گزر چکا ہے کہ تحریم کے سبب میں علماء کے مختلف تین اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عربی نے کہا: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ کفار مخاطب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ انہیں سود کھانے سے اور لوگوں کے ناحق مال کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ اس کے متعلق خبر ہے جو قرآن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ خطاب میں داخل ہیں تو بھی بہتر ہے اور اگر یہ خبر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات میں نازل فرمایا اور انہوں نے احکامات کو بدلا، اور تحریف کی اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت اور نافرمانی کی تو کیا ہمارے لیے ان کے معاملات جائز ہیں جب کہ وہ قوم اپنے دین میں اپنے اموال کو خراب کرچکی ہے یا نہیں؟ ایک طائفہ نے کہا: ان کا معاملہ جائز نہیں، کیونکہ ان کے اموال میں یہ فساد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے سود اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، اس پر قرآن وسنت سے قطعی دلیل قائم ہوچکی ہے وَطَعَامُ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمۡ (المائدہ:5) یہ نص ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے معاملات کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی جو اپنے عیال کے لیے جو لینے کے لیے رہن رکھی تھی۔

شک اور خلاف کی بیماری کو جڑ سے ختم کرنے والی چیز امت کا اہل حرب کے ساتھ تجارت کرنے کے جواز پر اتفاق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی خاطر ان کی طرف سفر کیا تھا، اس سفر سے قطعی طور پر ثابت ہوا کہ ان کی طرف سفر کرنا اور ان کے ساتھ تجارت کرنا جائز ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ نبوت سے پہلے کا سفر تھا تو ہم کہیں گے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت سے پہلے بھی کسی حرام کا ارتکاب نہیں کیا اور یہ تواتر سے ثابت ہے اور نہ بعثت کے بعد آپ نے کوئی عذر پیش کیا اور نہ اعلان نبوت

کے بعد آپ سے منع ثابت ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اور نہ آپ کے وصال کے بعد کسی نے اہل کتاب کی طرف سفر کو ترک کیا بلکہ صحابہ کرام قیدیوں کو چھڑانے کے لیے سفر کرتے تھے اور یہ واجب ہے اور صلح میں حضرت عثمان کو بھیجا گیا تھا۔ اور کبھی یہ سفر واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب، رہا صرف تجارت کی خاطر اہل کتاب کی طرف سفر کرنا تو وہ مباح ہے (1)۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

”لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان سے (وہ بھی) اور (جو) مسلمان ہیں ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور صحیح ادا کرنے والے نماز کے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان لانے والے اللہ اور روز آخرت کے ساتھ یہی ہیں جنہیں عنقریب ہم دیں گے اجر عظیم“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ اہل کتاب کے مومنوں کی استثنا فرمائی۔ یہود انکار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ اشیاء اصل میں حرام تھیں اور آپ انہیں حلال کرتے ہیں اور یہ ہمارے ظلم کی وجہ سے حرام نہیں ہوئی ہیں تو یہ ارشاد نازل ہوا: لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ، الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ سے مراد کتاب کا علم رکھنے والا ہے۔ الرسوخ سے مراد ثبوت ہے۔ یہ آل عمران میں گزر چکا ہے، اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور ان جیسے دوسرے علماء ہیں۔ والمومنون سے مراد مہاجرین وانصار ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے۔

وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ حسن، مالک بن دینار اور ایک جماعت نے الْمُؤْمِنُوْنَ پر عطف کی بنا پر المقیمون پڑھا ہے اسی طرح حضرت عبداللہ کی قرأت میں ہے اور ابی کی قرأت میں والمقیمین ہے جیسا کہ مصاحف میں ہے۔ اس کے نصب میں چھ اقوال ہیں اصح قول سیبویہ کا ہے کہ مدح کی بنا پر منصوب ہے یعنی اعنی المقیمین اور سیبویہ نے کہا: تعظیم کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ المقیمین الصلوٰۃ اسی بنا پر منصوب ہے۔

وكل قومٍ أطاعوا أمر سيدِهم   إلا نميرا أطاعت أمر غاويها

أمر مرشدهم بھی مروی ہے۔

الظاعنين ولما يُظْعِنُوا أحداً   والقائلون لِمَن دارٌ نُخَلِّيها

ایک اور شاعر نے کہا:

ولا يَبْعَدَنْ قومي الَّذين هُمُ   سُمُّ العُداةِ وآفَةُ الجُزْرِ

النّازِلِين بِكُلِّ مُعْتَرَكٍ   والطَّيِّبُونَ مَعَاقِدَ الأُزُرِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 515

نحاس نے کہا: المقیمین میں جو کہا گیا ہے اس میں سے اصح قول یہی ہے کہ تعظیم کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ کسائی نے کہا: المقیمین کا عطف (ما) پر ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش کا قول ہے کہ یہ بعید ہے، کیوں کہ معنی یہ ہو جائے گا یومنون بالمقیمین۔ یعنی وہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں پر ایمان لاتے ہیں۔ محمد بن جریر نے حکایت کیا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ یہاں المقیمین سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ وہ ہمیشہ نماز، تسبیح اور استغفار میں رہتے ہیں۔ جریر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اس نے حکایت کیا ہے مدح کی بنا پر نصب بعید ہے، کیونکہ مدح خبر کے مکمل ہونے کے بعد ہوتی ہے اور الرّٰسِخُوْنَ کی خبر اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ہے پس الْمُقِيْمِيْنَ کو نصب مدح پر نہیں ہے، نحاس نے کہا: الْمُؤْتُوْنَ میں سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اور دوسرے علماء نے کہا: مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے یعنی وہ زکوٰہ دینے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: المقیمین کا عطف قبلك کی کاف پر ہے یعنی من قبلك و من قبل المقیمین۔ بعض نے فرمایا: الیك میں جو کاف ہے اس پر عطف ہے۔ بعض نے فرمایا: منهم میں ها اور میم پر عطف ہے یعنی منهم و من المقیمین یہ تینوں جوابات جائز نہیں، کیونکہ ان میں اسم ظاہر کا عطف مجرور مضمر اسم پر ہے۔ چھٹا جواب وہ ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ سے اس آیت کے متعلق اور اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ اور الصّٰبِـُٔوْنَ جو سورہ مائدہ میں ہے، ان کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سائل سے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کاتبوں نے غلطی کی ہے۔ ابان بن عثمان نے کہا: کاتب کو لکھایا جاتا تھا پس وہ لکھتا تھا، اس نے لکھا: لكن الراسخون في العلم منهم والمومنون پھر اس نے کہا: اب کیا لکھوں؟ تو اسے کہا گیا: تم لکھو وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ پھر یہاں اسی طرح واقع ہوا (☆)۔

قشیری نے کہا: یہ مسلک باطل ہے، کیونکہ جنہوں نے کتاب کو جمع لکھا وہ لغت میں اسوہ تھے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرآن میں وہ داخل کرتے تھے جو نازل نہیں ہوا تھا۔ ان اقوال میں سے اصح ترین قول سیبویہ کا ہے اور وہی خلیل کا قول ہے اور کسائی کا قول وہ ہے جسے قفال اور طبری نے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

"بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے وحی بھیجی ہم نے نوح کی طرف اور ان نبیوں کی طرف جو نوح کے بعد آئے اور (جیسے) وحی بھیجی ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے عطا فرمائی داؤد کو زبور"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ یہ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ

☆ باقلانی نے کہا جس طرح نکت الانتصار لنقل القرآن کے صفحہ 129 پر ہے "حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ قول کہ یہ کاتب کی غلطی ہے تو ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں" کیونکہ قرآن وہ ہے جو نقل متواتر سے ثابت ہے۔

السَّمَآءِ کے کلام سے متصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حضرت محمد ﷺ کا معاملہ بھی پہلے انبیاء کے معاملہ کی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ یہ یہود کی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سکین اور عدی بن زید تھا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی کی طرف وحی نہیں کی پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کی۔ وحی کا معنی خفیہ طور آگاہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: وحی الیه بالکلام یحی وحیاً، واوحی یوحی ایحاءً (اِلٰی نُوْحٍ) ان کو مقدم فرمایا کیونکہ یہ پہلے نبی تھے ان کی زبان پر شریعت جاری ہوئی بعض کے اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

زبیر بن بکار نے ذکر کیا ہے کہ مجھے ابوالحسن علی بن مغیرہ نے بیان کیا، انہوں نے ہشام بن محمد بن سائب سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: پہلے نبی جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر مبعوث فرمایا وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے ان کا اسم اخنوخ ہے، پھر رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے نوح بن لمک بن متوشلخ بن اخنوخ کو مبعوث فرمایا۔ سام بن نوح نبی تھا، پھر رسولوں کا سلسلہ ختم ہوا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی مبعوث فرمایا اور اسے خلیل بنایا۔ وہ حضرت ابراہیم بن تارخ ہے اور تارخ کا اسم آزر ہے پھر حضرت اسماعیل بن ابراہیم کو مبعوث فرمایا پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کا وصال مکہ میں ہوا پھر حضرت اسحٰق بن ابراہیم مبعوث ہوئے، پس وہ شام میں فوت ہوئے پھر حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے چچا تھے پھر حضرت یعقوب علیہ السلام مبعوث ہوئے وہ حضرت اسرائیل بن اسحٰق ہے۔ پھر حضرت یوسف بن یعقوب مبعوث ہوئے پھر حضرت شعیب بن یوبب پھر ہود بن عبداللہ مبعوث ہوئے پھر حضرت صالح بن آسف مبعوث ہوئے پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون، ابنا عمران مبعوث ہوئے۔ پھر حضرت ایوب پھر حضرت خضر یہ خضرون ہیں پھر حضرت داؤد بن ایشا مبعوث ہوئے پھر حضرت سلیمان بن داؤد پھر حضرت یونس بن متی پھر حضرت الیاس، پھر حضرت ذوالکفل مبعوث ہوئے۔ اور ان کا اسم عویدنا ہے یہ یہوذا ابن یعقوب کی اولاد سے تھے۔ حضرت زبیر نے کہا حضرت موسیٰ بن عمران اور حضرت مریم بنت عمران ام عیسیٰ کے درمیان سترہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اور یہ دونوں سبط میں سے نہیں تھے۔ پھر حضرت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب النبی ﷺ مبعوث ہوئے۔ حضرت زبیر نے کہا: ہر نبی جن کا قرآن میں ذکر ہے وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے سوائے حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کے۔ عربوں میں سے صرف پانچ انبیاء تھے حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت شعیب اور حضرت محمد ﷺ وعلیہم اجمعین۔ ان کو عرب کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے علاوہ کسی نے عربی نہیں بولی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یہ تمام انبیاء کو شامل ہے پھر فرمایا: وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ۔ بعض لوگوں کا ذکر فرمایا ان کے شرف کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ (بقرہ: 98) پھر فرمایا: وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان انبیاء سے مقدم فرمایا جو ان سے پہلے تھے، کیونکہ واو ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص یہود کا رد ہے۔ اس آیت میں ہمارے نبی مکرم ﷺ کی شان اور شرف پر تنبیہ ہے، کیونکہ انبیاء پر آپ کے ذکر کو مقدم فرمایا۔ اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ

(الاحزاب: 7) نُوۡحٍ، النوح سے مشتق ہے۔ آل عمران میں ان کا ذکر گزر چکا ہے یہ منصرف ہے یہ عجمی اسم ہے اس کے تین حروف ہیں پس تخفیف کی گئی۔ ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق یہ عجمی اسماء ہیں یہ معرفہ بھی ہیں اس لیے غیر منصرف ہیں اسی طرح یعقوب، عیسیٰ اور موسیٰ ہیں مگر عیسیٰ اور موسیٰ جائز ہے کہ ان میں الف تانیث کے لیے ہو پس یہ نہ معرفہ میں منصرف ہوں گے اور نہ نکرہ میں منصرف ہوں گے۔ یونس اور یوسف، حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے نون کے کسرہ کے ساتھ یونِس پڑھا ہے اسی طرح یوسِف پڑھا ہے ان کو آنس اور آسف سے بنایا ہے۔ اس بنا پر ان کا منصرف ہونا اور ہمزہ سے ہونا واجب ہے اور ان کا جمع یآنس اور یآسف ہوگا اور جنہوں نے ہمزہ نہیں دیا انہوں نے یوانس و یواسف۔ ابو زید نے حکایت کیا ہے کہ یونس اور یوسف نون اور سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مہدوی نے کہا: یونِس گویا اصل میں معروف کا صیغہ ہے اور یونَس مجہول کا صیغہ ہے، ان کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۝۱۶۳، الزبور، حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب تھی اس میں ایک سو پچاس سورتیں تھیں اس میں نہ حکم تھا، نہ حلال تھا، نہ حرام تھا۔ اس میں حکمتیں اور مواعظ تھے۔ زبیر کا معنی کتابت ہے اور زبور بمعنی مذبور ہے یعنی المکتوب جیسے الرسول، الرکوب، الحلوب بمعنی المفعول ہیں۔ حمزہ نے زبوراً زا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ زبر کی جمع ہے جیسے فلس اور فلوس اور زبر بمعنی المذبور ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ھذا الدرھم ضرب الامیر۔ یہاں ضرب بمعنی مضروب ہے اصل میں توثیق کے کلمہ میں استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: بئر مزبورۃ یعنی پتھروں کے ساتھ لپٹا ہوا کنواں۔ کتاب کو زبور کہا جاتا ہے اس پر وثوق کی وجہ سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی بہت خوبصورت آواز تھی جب آپ زبور کی قرأت شروع کرتے تھے تو ان کی آواز کی خوبصورتی کی وجہ سے انسان، جن، پرندے اور وحشی جمع ہو جاتے تھے۔ آپ متواضع تھے اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتے تھے۔ ابو بکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں ابو اسامہ نے بتایا، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام لوگوں کو خطاب کرتے تھے جب کہ ان کے ہاتھ میں کھجور کے پتوں کی گٹھڑی ہوتی تھی جب وہ فارغ ہوتے تو قریب والا شخص ان سے لے لیتا اور اسے بیچتا، آپ زرہیں بناتے تھے اور حدیث میں ہے "آنکھ میں نیلا رنگ برکت ہے" اور داؤد علیہ السلام کی آنکھیں نیلی تھیں۔

وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۝۱۶۴ۚ

"اور (جیسے وحی بھیجی) دوسرے رسولوں پر جن کا حال بیان کر دیا ہے ہم نے آپ سے اس سے پہلے اور ان رسولوں پر جن کا ذکر ہم نے اب تک آپ سے نہیں کیا اور کلام فرمایا اللہ نے موسیٰ سے خاص کلام"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ یعنی مکہ میں اور رُسُلًا کی نصب فعل مضمر کی وجہ سے ہے یعنی وارسلنا رسلاً۔ کیونکہ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ کا معنی ہے وارسلنا نوحا۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر قَصَصۡنٰهُمۡ دلالت کر رہا ہے یعنی قصصنا رسلاً اس کی مثل سیبویہ نے اس شعر سے دی ہے:

أصبحتُ لا أحملُ السّلاحَ ولا أملكُ رأسَ البعيرِ إنْ نَفَرا
والذِّئبَ أخشاه إن مررتُ بِهِ وَحْدِي وأخشى الرياحَ والمطرا

یعنی اخشی الذئب۔ اور حضرت ابی کی قرأت میں ورُسُلٌ رفع کے ساتھ ہے اس کی تقدیر یہ ہے منهم رسلٌ۔ پھر فرمایا گیا: اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب میں بعض انبیاء کے اسماء ذکر فرمائے اور بعض کے ذکر نہ فرمائے تو جن کا ذکر فرمایا ان کو فضیلت ہے ان پر جن کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہود نے کہا: محمد نے انبیاء کا ذکر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، تَكْلِيْمًا مصدر ہے اس کا معنی تاکید ہے یہ اس کے قول کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جو کہتا ہے: اس نے درخت میں اپنے لیے کلام تخلیق کی پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے سن لیا۔ بلکہ یہ وہ حقیقی کلام ہے جس کے ساتھ متکلم، متکلم ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: نحویوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب فعل مصدر کے ساتھ مؤکد ہوتا ہے تو وہ مجاز نہیں ہوتا اور شاعر کے قول میں یہ جائز نہیں:

امتلاء الحوض وقال قطني

کہ قال قولاً اسی طرح جب تَكْلِيْمًا فرمایا تو یہ اس حقیقی کلام پر محمول ہوگا جو سمجھی جاتی ہے۔

وہب بن منبہ نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! مجھے تو نے کیوں کلیم بنایا؟ انہوں نے وہ عمل طلب کیا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں سعادت عطا فرمائے تاکہ وہ اس عمل کو زیادہ کریں، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: کیا تجھے یاد ہے جب کوئی بکری کا بچہ بھاگ جاتا ہے پھر تو دن کا اکثر حصہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور وہ تجھے تھکا دیتا ہے پھر تو اسے پکڑتا ہے اور اسے بوسہ دیتا ہے پھر اسے اپنے سینے سے لگاتا ہے اور تو اسے کہتا ہے: تو نے مجھے بھی تھکایا اور اپنے آپ کو بھی تھکایا اور تو اس پر غصے نہیں ہوتا اس وجہ سے میں نے تجھے کلیم بنایا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

''(بھیجے ہم نے یہ سارے) رسول خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں کوئی عذر رسولوں کے (آنے کے) بعد اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ، رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ سے بدل کی بنا پر منصوب ہے اور فعل کے اضمار پر منصوب ہونا جائز ہے اور حال کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ رسلاً۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ تو نے ہماری طرف کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ تو نے ہم پر کوئی کتاب نازل کی۔ اور قرآن حکیم میں ہے: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طہٰ: 134) ان تمام آیات میں دلیل ہے کہ عقل کی طرف سے کوئی چیز واجب نہیں۔ کعب الاحبار سے مروی

ہے فرمایا کہ بارہ لاکھ انبیاء کرام تشریف لائے تھے۔ مقاتل نے کہا: چودہ لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تھے۔ حضرت انس بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: ''میں آٹھ ہزار انبیاء کے بعد مبعوث کیا گیا ان میں سے چار ہزار بنی اسرائیل سے تھے'' (1)۔ یہ ابو اللیث سمرقندی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے، پھر شعبہ عن ابی اسحٰق عن الحارث الاعور بن ابی ذر الغفاری کی سند سے ذکر فرمایا کہ حضرت ابوذر نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! انبیاء کتنے تھے اور رسول کتنے تھے؟ فرمایا: ''انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے اور تین سو تیرہ رسول تھے'' (2)۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ترین قول ہے۔ الاجری، ابو حاتم البستی نے اپنی مسند صحیح میں اس قول کو ذکر کیا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

''(کوئی تسلیم نہ کرے تو اس کی مرضی) لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس کتاب کے ذریعے جو اس نے آپ کی طرف اتاری کہ اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ بطور گواہ''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ ابتدا کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے اگر تو چاہے تو نون کو شد دے اور اسم جلالت کو نصب دے۔ کلام میں حذف ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہا ہے گویا کفار نے کہا: اے محمد! ہم تیرے لیے گواہی نہیں دیتے اس کے بارے میں جو تو کہتا ہے تو پھر تیرے لیے کون گواہی دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لیکن اللہ گواہی دیتا ہے۔ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کے اہل ہے کہ تجھ پر قرآن نازل ہو۔ یہ آیت دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ جانتا ہے۔ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ملائکہ کی شہادت کا ذکر فرمایا تا کہ اس کے ساتھ کفار کی شہادت کی نفی ہو جائے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾۔ اس میں با زائدہ ہے معنی ہے کفی اللہ شاہداً۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہی میں بہت دور نکل گئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی یہود۔ وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سے لوگوں کو اپنے اس قول سے روکا کہ ہم اپنی کتاب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو نہیں پاتے، نبوت، حضرت داؤد اور حضرت ہارون کی اولاد میں ہے اور تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہ ہوگی۔ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ کیونکہ انہوں نے کفر کیا اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو انہوں نے اسلام سے منع کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 482، حدیث نمبر 32276
2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 482، حدیث نمبر 32280

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ بخش دے انہیں اور نہ یہ کہ دکھائے انہیں (سیدھی) راہ۔ بجز جہنم کی راہ کے ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا یعنی یہودی۔ یعنی حضرت محمد ﷺ کی شان چھپا کر انہوں نے محمد ﷺ پر ظلم کیا اور اپنے نفسوں پر ظلم کیا جب کفر کیا اور لوگوں پر ظلم کیا جب انہیں چھپایا۔ لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ یہ اس کے بارے میں ہے جو اپنے کفر پر مرا اور توبہ نہ کی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

''اے لوگو! تحقیق آ گیا تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے پس تم ایمان لاؤ یہ بہتر ہے تمہارے لیے، اور اگر تم انکار کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ یہ تمام لوگوں کو خطاب ہے۔ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ اس سے مراد حضرت محمد علیہ الصلوۃ والسلام ہیں۔ بِالْحَقِّ سے مراد قرآن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد دین حق ہے۔ بعض نے کہا: بِالْحَقِّ سے مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے بعض نے فرمایا: با تعدیہ کے لیے ہے یعنی جاء کم و معہ الحق اور یہ حال کی جگہ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ کلام میں اضمار ہے یعنی واتوا خیرا لکم یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور فراء کے قول پر یہ محذوف کی صفت ہے یعنی ایمانا خیرا لکم۔ ابو عبیدہ کے قول پر یکن خیرا لکم ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۱۷۱

''اے اہل کتاب نہ غلو کرو اپنے دین میں نہ کہو اللہ تعالیٰ کے متعلق مگر سچی بات بے شک مسیح عیسیٰ پسر مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف، اور ایک روح تھی اس کی طرف سے، پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور نہ کہو تین (خدا ہیں) باز آ جاؤ (ایسا کہنے سے) یہ بہتر ہے تمہارے لیے بے شک اللہ تعالیٰ تو معبود واحد ہی ہے پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کا کوئی لڑکا اسی کا (ملک) ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غلو سے منع کیا گیا ہے۔ الغلو کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

اسی سے ہے: غلا السعر یغلو غلاء قیمت حد سے بڑھ گئی۔ وغلا الرجل فی الامر غلواً آدمی معاملہ میں حد سے بڑھ گیا۔ غلا بالجاریہ لحمھا وعظمھا۔ جب عورت جلدی جوانی چڑھی اور دوسرے بچوں سے تجاوز کر گئی۔

مفسرین نے جو ذکر کیا ہے وہ یہ ہے: یہود کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے یہ غلو تھا کہ انہوں نے حضرت مریم پر تہمت لگائی اور نصاریٰ کا غلو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنا دیا، افراط اور تفریط گناہ اور کفر ہے، اسی وجہ سے مطرف بن عبداللہ نے کہا: نیکی دونوں برائیوں (افراط وتفریط) کے درمیان ہے۔ شاعر نے کہا

أوفِ ولا تستوفِ حقّك كلّه　　وصافح فلم يستوف قطُّ كريمُ

ولا تَغْلُ في شيْئٍ من الأمر واقتصدْ　　كِلَا طرفَيْ قصدِ الأمورِ ذَمِيمُ

پورا حق دو اور اپنا حق پورا نہ لو اور درگزر کر، کریم کبھی پورا وصول نہیں کرتا۔ کسی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کر اور میانہ روی اختیار کر میانہ روی کی دونوں طرفیں مذموم ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

عليك بأوساطِ الأمور فإنها　　نجاةٌ ولا تركبْ ذَلولاً وصَعْباً

درمیانی امر کو لازم پکڑو کیونکہ یہ نجات ہے اور نہ بالکل نرم اور نہ بالکل سخت ہو کر سوار ہو۔

صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''میری تعریف میں حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں حد سے تجاوز کیا تم کہو عبداللہ ورسولہ'' (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ یعنی یہ نہ کہو کہ اس کا شریک ہے یا اس کے بیٹے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی حالت اور صفت کو بیان فرمایا اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ ابتدا کی وجہ سے مسیح کو رفع دیا گیا ہے اور عیسیٰ اس سے بدل ہے اسی طرح ابن مریم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا کی خبر ہو۔ یہ معنی ہو المسیح ابن مریم، مسیح مریم کے فرزند ہیں۔ اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ یعنی جو اپنی والدہ کی طرف منسوب ہو وہ الٰہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الٰہ کا حق یہ ہے کہ وہ قدیم ہو، حادث نہ ہو۔ اور رسول اللہ خبر کے بعد خبر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کا ذکر نہیں کیا اور کسی عورت کو اس کے نام کے ساتھ اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا سوائے مریم بنت عمران کے۔ تقریباً تیس جگہوں پر خاص حکمتوں کی وجہ سے حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا جن حکمتوں کا بعض مشائخ نے ذکر کیا ہے۔ ملوک اور اشراف اپنی آزاد عورتوں کا مجمع میں ذکر نہیں کرتے تھے اور ان کے اسماء استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ عرس، اہل اور عیال کے لفظ استعمال کرتے تھے اگر لونڈیوں کا ذکر کرتے تو کنایۃً نہ کرتے اور نہ ان کے صراحۃً

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 490۔ ایضاً، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسماء کے ذکر سے حفاظت کرتے تھے۔ جب حضرت مریم کے بارے میں نصاریٰ نے کہا جو انہوں نے کہا اور ان کے بیٹے کے بارے میں کہا تو اللہ تعالیٰ نے صراحۃً حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا، امومت اور عبودیت جو ان کی صفت تھی ان کا ذکر نہیں کیا اور لونڈیوں کے ذکر میں عربوں کی جو عادت تھی اس پر کلام کو جاری فرمایا۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں ہے۔ جب ان کا اسم ماں کی طرف منسوب کر کے بار بار ذکر فرمایا تو دلوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باپ کی نفی کا عقیدہ کا واجب ہونا محسوس کر لیا اور یہود کی طرف سے لگائی گئی تہمت سے ان کی والدہ کی پاکیزگی کا عقیدہ دلوں میں راسخ ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وہ کن کے کلمہ سے بنائے گئے تھے گویا آپ بغیر باپ کے بشر تھے۔ عرب کسی چیز کو اس چیز سے تعبیر کر دیتے ہیں جب وہ اس سے صادر ہو۔ بعض نے فرمایا: كَلِمَتُهٗ سے مراد اللہ کی طرف سے حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی بشارت تھی جو جبریل کے ذریعے دی گئی۔ اس سے یہ مراد ہے: اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (آل عمران: 45) بعض علماء نے فرمایا: الكلمة سے یہاں مراد الاية ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا (التحریم: 12) مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان: 27) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار اسماء تھے۔ (۱) مسیح (۲) عیسیٰ (۳) کلمۃ (۴) روح۔ اس کے علاوہ بھی نام ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ کا معنی ہے مریم نے اس کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ رُوْحٌ مِّنْهُ۔ اس چیز نے نصاریٰ کو گمراہی میں ڈالا۔ انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جز ہیں پس وہ جاہل بنے اور گمراہ ہوئے۔ اس کے آٹھ جواب ہیں (۱) حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ارواح کو پیدا فرمایا جب ان سے پختہ عہد لیا پھر ان روحوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ کی طرف لوٹایا اور حضرت عیسیٰ کی روح کو اپنے پاس روک لیا جب ان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو اس روح کو حضرت مریم کی طرف بھیجا پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے تھے۔ اسی وجہ سے فرمایا: وَ رُوْحٌ مِّنْهُ۔ بعض نے فرمایا: یہ اضافت تفضیل کے لیے ہے اگرچہ تمام روحیں اس کی تخلیق سے ہیں یہ اس طرح ہے جیسے فرمایا: وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ (الحج: 26) بعض نے فرمایا: جس سے عجیب چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اسے روح کہا جاتا ہے اور اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: ھذا روح من اللہ یعنی وہ اللہ کی تخلیق سے ہے، جس طرح نعمت کے بارے کہا جاتا ہے: انھا من اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کے مریض کو درست کرتے تھے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے پس یہ اس اسم کے مستحق ہوئے۔ بعض نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے جبریل کے روح پھونکنے کے سبب۔ نفخ (پھونکنا) کو روح کہا جاتا ہے، کیونکہ ریح (ہوا) روح سے نکلی ہے۔ شاعر نے کہا:

فقلتُ له ارْفَعْها إليكَ وأحْيِها بِرُوحِكَ واقتَتْهُ لها قِيتَةً قَدْرا

وارد ہے کہ حضرت جبریل نے حضرت مریم علیہا السلام کی قمیص میں پھونک ماری تو وہ اللہ کے اذن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہو گئیں اسی وجہ سے وَ رُوْحٌ مِّنْهُ اس مضمر پر معطوف ہوگا جو اللہ کا اسم اَلْقٰىهَاۤ میں ہے تقدیر عبارت اس طرح

ہوگی: القی اللہ و جبریل الکلمۃ الی مریم۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ رُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد ہے اس کی تخلیق سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) یعنی من خلقہ۔ بعض نے فرمایا: رُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد اس کی طرف سے رحمت۔ حضرت عیسیٰ اپنے متبعین کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت تھے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ: 22) یعنی اپنی رحمت سے۔ پڑھا گیا ہے فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ (الواقعہ: 89) بعض علماء نے فرمایا: رُوْحٌ مِّنْهُ کا مطلب ہے برھان منہ۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم پر برہان اور حجت تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ یعنی ایمان لاؤ کہ اللہ ایک ہے، مسیح کا خالق اور اس کو بھیجنے والا ہے اور اللہ کے رسل پر ایمان لاؤ اور ان میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں پس ان کو الٰہ نہ بناؤ۔ وَ لَا تَقُوْلُوْا یہ نہ کہو کہ ہمارے خدا ثَلٰثَةٌ ہیں۔ پس یہ زجاج سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: تثلیث سے مراد اللہ تعالیٰ، حضرت مریم اور ان کا بیٹا ہے، فراء اور ابو عبیدہ نے کہا: تم یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ (الکہف: 22) ابو علی نے کہا: اس کی تقدیر یہ ہے ولا تقولوا ھو ثالث ثلاثۃ۔ یعنی یہ نہ کہو کہ وہ تین میں سے تیسرا ہے، پس مبتدا اور مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ نصاریٰ کے سارے فرقے اس پر جمع ہیں کہ تین خدا ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایک جوہر ہے اور اس کے تین اقانیم ہیں اب، ابن اور روح القدس، اب سے مراد وجود لیتے تھے، روح سے مراد حیات اور ابن سے مراد مسیح لیتے تھے۔ ان کے کلام میں اس مسئلہ میں تخبط ہے جس کا بیان اصول دین میں ہے۔ ان کی کلام کا خلاصہ یہ ہے وہ سب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ پر خوارق للعادت کام جاری فرمائے جیسا کہ اس کا ارادہ اور مقتضیٰ تھا۔ انہوں نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ یہ امور انسانی قدرت سے خارج ہیں پس جو ان پر قادر ہے وہ الوہیت سے موصوف ہوگا۔ ان کو کہا جائے گا: اگر یہ ان کی قدرت میں ہوتا اور مستقل ہوتا تو پھر دشمنوں سے اپنے نفس کو بچانے اور اپنے آپ سے شر کو دور کرنا ان کی مقدورات سے ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے اگر نصاریٰ اس کا اعتراف کریں تو ان کا قول اور دعویٰ ساقط ہو جائے گا کہ وہ مستقل بالذات ایسا کرتے تھے۔ اگر وہ اس کو تسلیم نہ کریں تو ان کے لیے کوئی حجت نہ ہوگی، کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جو ان کے ہاتھوں پر بڑے بڑے امور جاری ہوئے تھے اس سے معارض تھے مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، سمندر کا پھٹنا، ید بیضا، من وسلویٰ وغیرہ، اسی طرح انبیاء کے ہاتھوں پر جو معجزات جاری ہوئے تھے۔ اگر وہ ان کا انکار کریں تو ہم بھی اس کا انکار کریں گے جو وہ دعویٰ کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئے تھے۔ پس پھر تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کسی چیز کا ثابت کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک اثبات کا طریق قرآن کی نصوص ہیں جب کہ وہ قرآن کا انکار کرتے ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں جو وہ لے کر آیا پس ان کے لیے اخبار تواتر کے ساتھ اس کا ثبوت ممکن نہ ہوگا۔

بعض علماء نے کہا: نصاریٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے اکیاسی سال بعد تک دین اسلام پر قائم رہے، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، رمضان کے مہینہ کے روزے رکھتے تھے حتیٰ کہ ان کے اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی، یہود میں ایک بہادر شخص تھا جس کو بولس کہا جاتا تھا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کی ایک جماعت کو قتل کر

دیا اور کہا: اگر حق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو ہم نے کفر کیا اور ہم نے انکار کیا اور آگ کی طرف ہمارا لوٹنا ہے ہم خسارے میں ہوں گے، اگر وہ جنت میں داخل ہوئے اور ہم آگ میں داخل ہوئے، میں ان میں ایک سازش کرتا ہوں میں انہیں گمراہ کروں گا پس وہ دوزخ میں داخل ہوں گے، اس کا ایک گھوڑا تھا جس کو عقاب کہا جاتا تھا اس نے ندامت کا اظہار کیا اور اپنے سر پر مٹی ڈالی، اس نے نصاریٰ کو کہا: میں تمہارا دشمن بولس ہوں، آسمان سے آواز آئی کہ تیرے لیے توبہ نہیں ہے مگر یہ کہ نصرانی ہو جائے۔ نصاریٰ نے اسے کنیسہ کے ایک کمرے میں داخل کیا پس وہ اس میں سے باہر نکلا اور کہا: آسمان سے مجھے ندا آئی کہ اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول کر لی ہے۔ نصاریٰ نے اس کی تصدیق کی اور اس سے محبت کی پھر وہ بیت المقدس کی طرف چلا گیا اس نے ان پر نسطورا کو خلیفہ بنایا اور اسے بتایا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم خدا تھا پھر روم کی طرف گیا اور انہیں لاہوت اور ناسوت سکھایا اور کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان نہیں تھے پھر وہ انسان بنے اور نہ جسم تھے پھر وہ جسم بنے لیکن وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ اس نے ایک شخص کو سکھایا جس کو یعقوب کہا جاتا تھا، پھر اس نے ایک شخص کو بلایا جس کو الملک کہا جاتا تھا، اس نے اسے کہا: الٰہ ہمیشہ سے تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہمیشہ رہیں گے جب ان پر اس نے مکمل قدرت حاصل کر لی تو اس نے ان تینوں افراد کو علیحدہ علیحدہ بلایا، اس نے ہر ایک کو کہا: تو میرا خالص ساتھی ہے۔ میں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو نیند میں دیکھا وہ مجھ سے راضی تھے، اس نے ان میں سے ہر ایک کو کہا: میں کل اپنے آپ کو ذبح کر ڈالوں گا اور اس طرح میں قرب حاصل کروں گا پھر وہ مذبح میں داخل ہوا اور اپنے آپ کو ذبح کر دیا، جب تیسرا دن تھا تو ہر ایک نے اپنے نحلۃ (مذہب) کی طرف بلایا، پس ان میں سے ہر ایک کی ایک طائفہ نے اتباع کی، پس وہ آپس میں جھگڑنے لگے اور آج تک اختلاف کر رہے ہیں، تمام نصاریٰ تین فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں یہ ان کے شرک کا سبب تھا۔ واللہ اعلم۔ یہ واقعہ: فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (المائدہ: 14) کے تحت روایت کیا گیا ہے۔ مزید ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ سیبویہ کے نزدیک فعل مضمر کے ساتھ خیرًا منصوب ہے، گویا فرمایا: أنتوا خیرًا لکم (1)، کیونکہ جب اس نے انہیں شرک سے منع کیا تو انہیں اس چیز کے لانے کا حکم دیا جو ان کے لیے بہتر تھی۔ سیبویہ نے کہا: اس کو فعل کے اضمار پر نصب دی جاتی ہے جس کا اظہار متروک ہوتا ہے۔ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ کیونکہ جب تو کہتا ہے: أمتہ، تو تو ایک امر سے اسے نکالتا ہے اور دوسرے امر میں اسے داخل کرتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فواعدیہ سَرْحَتَيْ مَالِكٍ أو الرُّبَا بينهما أسْهَلَا (2)

اور ابو عبیدہ کا مذہب ہے: انتھوا یکن خیرًا لکم محمد بن یزید نے کہا: یہ خطا ہے، کیونکہ وہ شرط اور جواب شرط کو مضمر کرتا ہے اور یہ کلام عرب میں نہیں پایا جاتا۔ اور فراء کا مذہب ہے کہ یہ محذوف مصدر کی نعت ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ فحش غلطی ہے، کیونکہ معنی ہوگا انتھوا الانتھاء الذی ھو خیر لکم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یہ مبتدا خبر ہے اور واحد، الٰہ کی صفت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ الٰہ م

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 137 2۔ ایضاً

جلالت سے بدل ہو اور واحد خبر ہو تقدیر اس طرح ہوگی انما المعبود واحدٌ۔ معبود ایک ہے۔

سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ یَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ۔ اللہ تعالیٰ بیٹے سے پاک ہے، جب عن ساقط ہو گیا تو اَن حرف جر کے نزع کے ساتھ محل نصب میں ہوگا یعنی اس کے لیے بیٹا کیسے ہوگا؟ آدمی کا بیٹا اس کے مشابہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کوئی شبیہ نہیں ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام بھی ان چیزوں میں سے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان میں ہے مخلوق ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام الہ کیسے ہوں گے جب کہ وہ مخلوق ہیں؟ اگر اس کا بچہ جائز ہو تو اس کی اولاد جائز ہونی چاہیے حتیٰ کہ جس کے ہاتھ سے معجزہ ظاہر ہو وہ اس کا بیٹا ہو۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیۡلًا۝ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے لیے کافی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

لَنۡ یَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَمَنۡ یَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَیَسۡتَكۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُهُمۡ اِلَیۡهِ جَمِیۡعًا۝ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَیَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡتَنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَیُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۙ وَّلَا یَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا۝

''ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔ پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اجر اور زیادہ بھی دے گا انہیں اپنے فضل (وکرم) سے لیکن جنہوں نے عار سمجھا (بندہ بننے کو) اور تکبر کیا تو عذاب دے گا انہیں دردناک عذاب۔ اور نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَنۡ یَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِیۡحُ۔ یعنی ہرگز عار نہیں سمجھیں گے۔ اَنۡ یَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ۔ اللہ کا بندہ ہونے سے۔ یہ محل نصب میں ہے۔ حسن نے اِن یکون پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، ان نافیہ ہے بمعنی ما ہے معنی یہ ہے اس کے لیے بیٹا نہیں ہے یکون کو رفع مناسب ہے، رواۃ نے یہ ذکر نہیں کیا ہے۔

وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ یعنی اللہ کی رحمت اور رضا سے۔ یہ دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں اسی طرح وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَكُمۡ اِنِّیۡ مَلَكٌ (الانعام: 50) سورہ بقرہ میں اس مفہوم کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ وَمَنۡ یَّسۡتَنۡكِفۡ جو عار سمجھے گا۔ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَیَسۡتَكۡبِرۡ اس کی عبادت کو اور اس کی عبادت نہیں کرے گا۔ فَسَیَحۡشُرُهُمۡ اِلَیۡهِ یعنی محشر کی طرف انہیں اللہ جمع کرے گا۔ جَمِیۡعًا۝ سب کو۔ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا دے گا جیسا کہ اس کے بعد آیت میں فرمایا: فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَیَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡتَنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَیُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۙ وَّلَا یَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا۝ پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا

انہیں ان کے اجر اور زیادہ بھی دے گا انہیں اپنے فضل (وکرم) سے۔ یَسْتَنْكِفُ کی اصل نکف ہے یا سین اور تا زائد ہیں۔

کہا جاتا ہے: نکفت من الشئ واستنکفت منه، وانکفته۔ میں نے اسے اس سے پاک کیا جس سے اسے عار تھی۔ اسی سے حدیث ہے: سبحان اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہر برائی سے اللہ تعالیٰ کو پاک کرنا یعنی انداد اور اولاد سے اسے پاک کرنا'' (1)۔ زجاج نے کہا: استنکف یعنی عار سمجھا، یہ نکفت الدمع سے ماخوذ ہے جب تو اپنی انگلی سے اپنے رخسار سے آنسو کو دور کرے۔ اسی سے حدیث ہے: جاء بجیش لا ینکف اخراہ (2)۔ وہ لشکر کے ساتھ آیا جس کا آخر ختم نہیں ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ النکف سے ہے جس کا معنی عیب ہے۔ کہا جاتا ہے: ما علیه فی هذا الامر نکف ولا وکفٌ اس معاملہ میں اس پر کوئی عیب نہیں ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز عبادت سے نہیں رکیں گے، عبودیت سے کبھی دور نہ ہوں گے کبھی اس سے جدا نہ ہوں گے اور ہرگز اس کو عیب نہیں سمجھیں گے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۝

''اے لوگو! آچکی ہے تمہارے پاس ایک (روشن) دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف نور درخشاں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی حضرت محمد ﷺ۔ یہ ثوری سے مروی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کو برہان فرمایا، کیونکہ آپ کے ساتھ برہان تھی اور وہ معجزہ تھا۔ مجاہد نے کہا: یہاں برہان سے مراد حجت ہے، معنی متقارب ہے کیونکہ معجزات نبی کریم ﷺ کی حجت تھے اور النور جو نازل کیا گیا وہ قرآن ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ اس کو اللہ نے نور فرمایا، کیونکہ اس کے ساتھ احکام واضح ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہی سے ہدایت ملتی ہے وہ نور مبین ہے یعنی بالکل واضح ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۝

''تو جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ (کی رسی) کو تو عنقریب داخل کرے گا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچائے گا انہیں اپنی طرف لے جانے والی سیدھی راہ پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ یعنی گناہوں سے اجتناب کیا اور قرآن کو مضبوطی سے پکڑا جب کتاب کو مضبوطی سے پکڑا تو کتاب اور نبی کریم ﷺ کو مضبوطی سے پکڑا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑا۔ العصمة کا معنی رکنا ہے۔ یہ مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ يَهْدِيْهِمْ یعنی وہ انہیں ہدایت دے گا ھو کو مضمر کر دیا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ کلام کا ماقبل سے تعلق نہیں ہے۔ الیه یعنی اس کے ثواب کی طرف۔ بعض علماء نے فرمایا: حق کی طرف تاکہ وہ اس کو پہچان لیں۔ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۝ یعنی دینا مستقیما۔ صراط فعل کے اضمار کی وجہ منصوب ہے جس پر

1۔ اخرجہ الخطابی فی غریبہ، جلد 1، صفحہ 140

2۔ الفائق للزمخشری، جلد 1، صفحہ 264

یهدیهم دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ویعرفهم صراطا مستقیما یعنی وہ انہیں صراط مستقیم کی پہچان کراتا ہے۔
بعض نے فرمایا: یهدیهم الی ثوابه صراطا مستقیما کی تقدیر پر دوسرا مفعول ہوگا۔ بعض نے فرمایا: یہ حال ہے اور الیہ میں ضمیر بعض علماء نے فرمایا: قرآن کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: فضل کے لیے ہے۔ بعض نے فرمایا: رحمت کے لیے ہے، کیونکہ یہ دونوں ثواب کے معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: مضاف کے حذف پر اللہ کے لیے ہے جیسا کہ گزر چکا ہے کہ اس کا معنی ہے یهدیهم الی ثوابه۔ ابوعلی نے کہا: اسم جلالت جو پہلے گزر چکا ہے اس کی طرف راجع ہے، معنی ہے یهدیهم الی صراطه جب ہم صراطاً مستقیما کو حال کی بنا پر نصب دیں گے تو اس محذوف سے حال ہوگا اور وفضل میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ثواب کے ساتھ فضل فرماتا ہے، کیونکہ اگر یہ عمل کے مقابلہ میں ہوتا تو فضل نہ ہوتا۔ واللہ اعلم

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

"(اے میرے رسول) فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے، آپ فرمایئے: اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں کلالہ (کی میراث) کے بارے میں اگر کوئی ایسا آدمی فوت ہو جائے، نہ ہو جس کی کوئی اولاد اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ سے اور وہ وارث ہوگا اپنی بہن کا اگر نہ ہو اس کی بہن کی کوئی اولاد۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا اور اگر وارث ہوں بہن، بھائی مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصہ کے برابر ہے، صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت براء بن عازب نے فرمایا: یہ آخری آیت ہے جو قرآن سے نازل ہوئی۔ اسی طرح مسلم کی کتاب میں ہے(1) اور یہ آیت نازل ہوئی جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کی تیاری کر رہے تھے اور یہ حضرت جابر کے سبب نازل ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا: میں بیمار تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میری عیادت کے لیے تشریف لے آئے، مجھ پر غشی طاری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا، پھر اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا تو مجھے افاقہ ہو گیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنے مال کا کیسے فیصلہ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہ دیا حتیٰ کہ آیت میراث نازل ہوئی: يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)، اور فرمایا: آخری آیت یہ نازل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، باب میراث الأخوات والاخوة، حدیث نمبر 6247، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الفرائض، حدیث نمبر 6228، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوئی: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (بقرہ: 281) یہ پہلے گزر چکی ہے۔ سورت کی ابتدا میں کلالہ کے متعلق تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور یہاں الاخوۃ سے مراد سگے بھائی ہیں یا باپ کی طرف سے بھائی ہیں اور حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ یعنی جس کا نہ بیٹا ہو، نہ باپ ہو۔ ایک کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ جرجانی نے کہا: الولد کے لفظ کا اطلاق والد اور مولود دونوں پر ہوتا ہے۔ والد کو والد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پیدا کرتا ہے اور مولود کو ولد کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ پیدا کیا جاتا ہے جیسے ذریۃ یہ ذرا سے مشتق ہے پھر اس کا اطلاق مولود اور والد پر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ (یٰسین)

مسئلہ نمبر 3۔ صحابہ اور تابعین میں سے جمہور علماء بہنوں کو بیٹوں کا عصبہ بناتے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ بھائی نہ ہو۔ سوائے حضرت ابن عباس کے وہ بہنوں کو بیٹیوں کا عصبہ نہیں بناتے۔ یہی نظریہ داؤد اور ایک گروہ کا ہے اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظاہر ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ الخ اور بہن وارث نہ ہوگی مگر جب میت کی اولاد نہ ہو۔ یہ عطا فرماتے ہیں: یہ معلوم ہے کہ بیٹی، اولاد سے ہے پس بیٹی کے ہوتے ہوئے بہن وارث نہ ہو۔ حضرت ابن زبیر اس مسئلہ میں حضرت ابن عباس کے موافق تھے حتیٰ کہ اسود بن یزید نے اس کے متعلق خبر دی کہ حضرت معاذ نے بیٹی اور بہن میں فیصلہ فرمایا اور مال کو نصف، نصف ان کے درمیان تقسیم کیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت کو آیۃ الصیف بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ الصیف (گرمی) کے زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! میں کوئی چیز نہیں چھوڑتا جو کلالہ کے امر سے زیادہ اہم ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ نے مجھ پر اتنی کسی چیز میں سختی نہیں فرمائی جتنی کہ اس کے بارے فرمائی حتیٰ کہ اپنی انگلی سے میرے پہلو میں یا میرے سینے میں ٹھوکا دیا، پھر فرمایا: ''اے عمر! کیا تیرے لیے آیت الصیف کافی نہیں (1) جو سورۂ نساء کے آخر میں نازل ہوئی''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں بیان فرماتے تو میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھیں: کلالہ، سود، خلافت، ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں روایت کیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 5۔ بعض رافضیوں نے حضرت عمر کے اس قول واللہ لا ادع پر طعن کیا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا کسائی نے کہا: اس کا معنی ہے یبین اللہ لکم لئلا تضلوا۔ ابو عبید نے کہا: میں نے کسائی سے وہ حدیث بیان کی جو حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنی اولاد کو بددعا نہ دے کہیں اللہ کی طرف سے قبولیت موافق نہ ہو جائے''۔ تو کسائی نے اس کو اچھا سمجھا۔ نحاس نے کہا: ابو عبید کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے قبولیت کی موافقت نہ ہو جائے۔ یہ قول بصریوں کے نزدیک خطا ہے، کیونکہ وہ لا کا اضمار جائز قرار نہیں دیتے ان کے نزدیک اس کا معنی ہے یبین اللہ لکم کراھۃ ان تضلوا پھر حذف کیا گیا۔ جیسے فرمایا: واسال القریۃ اس حدیث کا معنی ہے کراھیۃ ان یوافق من اللہ اجابۃ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ یہ کئی دفعہ گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ سورۃ النساء مکمل ہوئی۔

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفرائض، جلد 1، صفحہ 201 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً